



سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

فروری 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

معلم ثانی: اس مسلمان مفکر کی حالاتِ زیست جس نے عالمی پیمانے پر فکر تبدیل کر دی

شعلہ صفت: اسے ٹھوکر نصیب تھی لیکن اپنی محنت سے اس نے شہرت کا تاج حاصل کر لیا

بری عورت: کیا ہنس کر بات کرنے والی ہر عورت بری ہوتی ہے؟ ایک دلچسپ سچ بیانی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 01 ❖ فروری 2018ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ ظہیر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن
ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ
کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط وکتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

قارئین کرام!
السلام علیکم!

آج مجھے ایک منی کہانی شدت سے یاد آرہی ہے۔ وہ کہانی کچھ اس طرح ہے۔ ”سلمان روز شام کو دفتر سے آنے کے بعد ٹاک شو ضرور دیکھا کرتا تھا۔ اس نے جیسے ہی ٹی وی کھولا ایک چینل پر زور و شور سے بحث چل رہی تھی کہ شہر میں آوارہ کتوں کے کاٹنے سے دس لوگ زخمی ہوچکے ہیں۔ ایک حکومتی لیڈر جواب میں کہہ رہا تھا کہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگ اب کتوں کو جھوٹا کھانا نہیں دیتے ہیں وہ بھوک کی وجہ سے ذہنی توازن کھو رہے ہیں۔ اگر کتوں کو کھانا ملتا رہے تو وہ ایسی حرکتیں کیوں کریں گے۔ ہم جلد ان کے لیے امداد کی فراہمی کی سفارش کرنے والے ہیں۔“ سلمان چینل بدلتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا ”اپنے لیے راتب مہیا کر رہا ہے بدمعاش کہیں کا۔“ دوسرے چینل سے رپورٹر زور و شور سے چیخ رہا تھا ”چار ڈاکوؤں کو پولیس نے مقابلے کے بعد مار گرایا۔ ان کے پاس سے بھاری اسلحہ اور بارود برآمد ہوا جبکہ محلے والوں کا کہنا ہے کہ یہ چاروں اسی محلے کے لڑکے تھے۔ شہر میں بڑھتی ہوئی وارداتوں کے سبب چوکیداری کی نیت سے یہ لوگ رات گئے تک گلی کے نکڑ پر بیٹھ کر لوڈو کھیلتے تھے۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں خبروں میں یکسانیت کیوں لگ رہی ہے۔ پھر وہ بڑبڑایا کہ اصل مجرم یہ ٹی وی والے ہیں جنہوں نے دونوں خبروں کو ایک وقت میں نشر کیا۔“

اس کہانی میں یکسانیت ہے یا نہیں اس پر بحث نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ معاشرے میں انصاف کا قتل ہوگا تو ڈاکوؤں کی تعداد بڑھتی ہی رہے گی۔ حکمران وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ فرات کنارے ایک کتا بھی بھوکا رہے گا تو مجرم میں ٹھہروں گا.... اور ایک حکمران آج کے ہیں اور ایسا صرف اس لیے کہ ہم اسلامی طرزِ حکومت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے اسلاف حکومتی کام ختم کرکے چراغ تک بجھا دیا کرتے تھے کہ یہ بیت المال کے تیل سے جل رہا ہے اور ہم اپنے بچوں کے ٹہلانے اور اہلِ خانہ کی تفریح و خریداریوں کے لیے بھی سرکاری گاڑی استعمال کرتے ہیں تو پھر معاشرہ ایسا ہی ہوگا نا؟

معراج رسول

مزاح نگار

24 دسمبر 1892ء میں یوپی کے ایک گاؤں مڑیاہو میں اس نے جنم لیا۔ اس وقت رواج یہ تھا کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم گھر میں دی جاتی تھی سواسے بھی پڑھنے کے لیے قاعدہ دے دیا گیا۔ ابھی وہ سن شعور پر پہنچا بھی نہ تھا کہ والد جون پور منتقل ہوگئے۔ جون پور شہر میں علم و ادب کو خوب پذیرائی حاصل تھی۔ شاہانِ شرقی نے اس شہر کو علم و ادب کا گہوارا بنا دیا تھا۔ اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کا دستور تھا معلم کو گھر بلایا جائے۔ اسے بھی پڑھانے کو ایک مولوی صاحب آتے تھے جو اسے قاعدہ بغدادی پڑھاتے، کلام پاک کی تعلیم دیتے، تختی لکھواتے تھے۔ قاعدہ بغدادی ختم ہوا تو ایک دوسرے مولوی صاحب آنے لگے۔ وہ اسے فارسی پڑھاتے۔ ان کے بعد ایک اور مولوی صاحب کی خدمت حاصل کی گئی جو اسے عربی پڑھاتے دراصل یہ طریقہ اس لیے اپنایا جاتا تھا کہ مولوی صاحبان کی پرورش ہوتی رہے۔ اردو، عربی، فارسی کے بعد اسے حساب سیکھنے بٹھایا گیا۔ تھوڑی بہت حساب آگئی تو اسے اسکول بھیجا جانے لگا۔ اسکول میں ہندو اساتذہ کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں ایک کٹر برہمن بھی تھے جو اردو پڑھایا کرتے۔ وہ اتنی عجیب فطرت کے تھے کہ کبھی کسی بچے کی کتاب یا کاپی کو ہاتھ نہ لگاتے۔ چھوت چھات کے سخت پابند تھے۔ جس چھڑی سے کسی بچے کی سرزنش کرتے اس چھڑی کو باہر پھینک دیتے کہ اسے دوبارہ ہاتھ نہ لگانا پڑے۔ ایسے استاد سے تعلیم کیسی ملے گی اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر وہ تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بچپن سے ہی وہ کمزور تھا آئے دن بیمار رہا کرتا اور انہی ماسٹر صاحب کے سبجیکٹ میں زیادہ نمبر لیتا رہا۔ اس کے گھر والے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا گناہ سمجھتے۔ جیسے ہی وہ بیمار ہوتا اس کے گھر عاملوں، مولویوں کی قطار لگ جاتی۔ جھاڑ پھونک کا بازار گرم ہوجاتا اور بیماری و صحت یابی کی دوڑ لگ جاتی۔ وہ دن اسکول جاتا تو چار دن ناغہ کرتا اسی طرح وقت گزرتا ہوا ہائی اسکول پاس کرگیا۔ میٹرک کے بعد اس نے دیوانی عدالت میں کلرکی کرلی۔ اس دور میں کلرکی کو عزت و وقار کا باعث سمجھا جاتا تھا لیکن اس وقار کا بوجھ وہ زیادہ دن اٹھا نہ سکا۔ اس نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دے دی اور علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کالج کے مجلہ علی گڑھ منتھلی میں لکھنا بھی شروع کردیا۔ لکھنے کے لیے اس نے مزاح کے انداز کو اپنایا تھا۔ اس کا یہ انداز خاصہ پسند کیا گیا۔ ان دنوں علی گڑھ کالج برصغیر کے مسلمانوں کا مرکز تھا۔ دور دراز کے مسلمان بھی اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیجنا شان سمجھتے، یہی وجہ تھی کہ علی گڑھ مختلف انداز کی اردو کا گڑھ بن گیا تھا۔ عجیب عجیب لب و لہجے میں اردو بولی جاتی تھی، وہ ان کی اردو کو اپنے کرداروں کی زبان سے ادا کراتا تو پڑھنے والے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ وہ خود پر فخر کرتا کہ وہ اہلِ زبان ہے اس لیے اس کی تحریر سند ہے لیکن جب وہ علامہ اقبال سے ملنے لاہور پہنچا تو ان کا تلفظ سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ اسے اپنی سوچ کلیتاً غلط لگی کہ تلفظ لب و لہجہ اور چیز ہے، فن پر دسترس اور ہے۔ اس دن سے اس نے تلفظ کی نقل سے توبہ کرلی۔ اب شاذ و نادر وہ اپنی تحریر میں کسی علاقے کے تلفظ کو بطور ہجو استعمال کرتا لیکن رگِ ظرافت تو پھڑکتی تھی اس لیے وہ اپنے مضامین میں الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے لگا۔ وہ مستند مزاح نگار مانا جاتا تھا اس وجہ سے لوگ اس کی تحریر کو اہمیت دیتے۔ جب اس کے مضامین کا مجموعہ ”مضامین رشید“ بازار.... میں آیا تو اسے خوب پذیرائی ملی تھی۔ یہی نہیں ”غالب کی شخصیت اور شاعری“ ”گنجہائے گراں مایہ“ ”خنداں“ اور ”آشفتہ بیانی میری“ کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ مزاح کے اس شہسوار کو ہم پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام سے پہچانتے ہیں جو 15 جنوری 1977ء کو اس دنیا سے روٹھ گئے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیرِ اعلیٰ

☆ اعجاز حسین لدھیانہ کی کاوش خوب ہے۔ ”محترم معراج رسول کی بات درست ہے کہ سرگزشت واقعی عام پرچہ نہیں ہے۔ جیسے سرگزشت آپ کو عزیز ہے، بالکل اسی طرح یہ ہمیں بھی پیارا ہے۔ اور مہنگائی کے بارے میں بھی آپ درست فرما رہے ہیں اور دس روپے کا اضافہ بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بس سرگزشت کی یہ خوب صورت محفل اسی طرح سجی رہے (آمین)۔ پچھلی سرگزشت میں ایرانی شاعرہ کے بارے میں پڑھا۔ ماشاء اللہ ”شہرِ خیال“ کی محفل میں بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ناصر حسین رند اس دفعہ کرسیِ صدارت کے مکین ٹھہرے (گڈ جاب) ساتھ ہی جناب نصیر اللہ خان داؤ خیل میانوالی، مرزا طاہر الدین بیگ۔ نزاہت الشان مہرو فتح جنگ اٹک، سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا، ابو احمد کراچی، ڈاکٹر آر ایم ای سعودی عرب، امیر حمزہ اشرف کوٹ رب نواز ملتان سے موجود ہیں۔ سب دوستوں نے اچھے تبصرے کیے ہیں۔ سدرہ نوناگوری کراچی ٹھیک کہتی ہیں کہ ہم خود ہی اپنے وطن کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ حنیف ادیب لاہور سے تشریف لائے ہیں اور ہمارے پیارے اعجاز حسین سنھار نور پور تھل سے ہمیشہ کی طرح طویل خط کے ساتھ موجود ہیں۔ سنھار صاحب جس شمارے میں آپ غیر حاضر ہوتے ہیں اس میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہمیں سرگزشت اور سنھار صاحب لازم و ملزوم لگتے ہیں۔ ماشاء اللہ جناب آپ بھی ہمارے دل میں رہتے ہیں اور جو دل میں رہتے ہیں ان کی قدر و قیمت آپ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ منشی عزیز کے مذہن و مزاح پورے سال کے تجزیے کے ساتھ ہیں۔ عزیز صاحب آپ کے نہ کیا کہیں جتنی عرق ریزی سے یہ ساری تفصیل جمع کی ہے وہ بذاتِ خود ایک محنت طلب کام ہے۔ کوئی بھی چیز مس نہیں ہے۔ جگ جگ جیو۔ اب چلتے ہیں باقی شمارے کی طرف۔ ”دانشور“ میں فیثا غورث کے بارے میں کبھی ریاضی میں پڑھتے تھے اب سرگزشت میں پڑھ رہے ہیں۔ دنیا عام طور پر ایسے لوگوں کے خیالات سے آسانی سے اتفاق نہیں کرتی ہے۔ ”مرگِ درویش“ میں جنید جمشید کے بارے میں معلومات ملیں۔ کہاں وہ دل دل پاکستان والا کھلنڈرا نوجوان اور کہاں پابندِ صوم و صلوٰۃ کا پابند جنید جمشید، واقعی جسے اللہ نوازدے اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔ ناکام گلوکار بھی اچھی تحریر ہے۔ اظہار قاضی واقعی اچھے اداکار تھے۔ ”چاند گرہن“ میں زویا اعجاز نے جس طرح پروین شاکر کی زندگی کو سمویا ہے وہ واقعی لائقِ تحسین ہے۔ پروین نے واقعی پہلی دفعہ نسائی شاعری کی بنیاد رکھی ہے اور اس میں کوئی بھی ان کا ہمسر نہیں۔ پروین واقعی پروین تھی، کتنی دکھ بھری زندگی تھی۔ ”جاسوسہ“ بھی بہت زبردست تحریر تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ”جواں مرگ“ میں نابغہ روزگار ہستیوں کے بارے میں بیش بہا معلومات ملیں۔ ”خودکشی“ بھی اچھی تحریر تھی واقعی فنکار بہت حساس ہوتے ہیں۔ ”قاتل باؤنسر“ ایک ایسا باؤنسر تھا جس نے کرکٹ کی دنیا میں بھونچال برپا کر دیا اور فل ہیوز جیسا ابھرتا کھلاڑی بھری جوانی میں قاتل باؤنسر کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے کلین بولڈ ہو گیا۔ ”ارسطو دوراں“ میں پہلی دفعہ آنس معین کے بارے میں پڑھا، کیسے کیسے لوگ اس عالمِ ناپائیدار میں آکے چلے گئے ہیں۔ ”مرگِ گل“ میں طاہرہ نقوی کے بارے میں پڑھا کیا اداکارہ تھی۔ کینسر نے ان کی زندگی کی کتنی جلدی فل اسٹاپ لگا دیا۔ ”معصوم“ اچھی تحریر تھی۔ ”مرگِ فنکار“ میں طلیل قیصر جیسے ہدایت کار، سلطان راہی اور نغمہ جیسے فنکاروں کے بارے میں پڑھا۔ حسبِ سابق ”شمشال سے نور ستو“ اپنے پورے جوبن پر تھی، ندیم اقبال صاحب زندہ و خوش رہو آباد رہو۔ ”منھی کلی“ ارفع کریم تمہیں ہم کیسے بھلا سکتے ہیں تم جیسے ہونہار لوگ ہی ہمارے ملک کا اصل چہرہ ہیں۔ ”مرگِ برگ“ نہایت عمدہ تحریر تھی۔ واقعی ہم انسان کتنے بھلکڑ ہیں جو خالقِ کائنات کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو بھولے ہوئے ہیں اور غرور و تکبر اور بشری کمزوریوں کے ہاتھوں گمراہیوں میں غرق ہو گئے ہیں۔ ”بنجارہ“ بھی اچھی تحریر تھی۔ واقعی دنیا عارضی قیام گاہ ہے جو آیا ہے اسے جانا ہے۔ ”چھوٹی سی جان“ مختصر لیکن پُراثر تحریر تھی۔ ”ذمہ دار“ ہمارے معاشرے کے کھوکھلے معاملات اور نوجوان نسل کے جنون لیوا مشغلے کے بارے میں آگاہی دیتی تحریر تھی۔ میری گڑیا دل کو چھوتی تحریر تھی۔ بیٹیاں آنکھوں کا نور ہوتی ہیں بابا کی جان ہوتی ہیں ان سے بے پناہ محبت کرو۔ ”خونِ ناحق“ بھی ہمارے معاشرے اور معاشرتی حالات کا احاطہ کرتی تحریر تھی۔ ”رحم بے رحم“ انسان میں چھپی فرعونیت اور بربریت کے بارے میں بتاتی تحریر تھی کیسے ہم اپنی چھوٹی سی خوشی کی خاطر گھروں کے گھر اجاڑ دیتے۔ آخر میں سرگزشت کے تمام اسٹاف کو ڈھیروں مبارک باد۔ اگلے شمارے کے لیے اور آخری ایک درخواست ہے کہ جیسے ہمارا پیارا پاکستان دہشت گردی کا شکار ہے اور جس جواں مردی سے ہماری فورسز اس عفریت سے نمٹنے کے لیے لڑ رہی ہیں۔ ہمارے ان بہادر ہیروز کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے

ہر ماہ کسی ایک ہیرو شہید یا غازی کے حالاتِ زندگی پر تحریر لازمی شائع کروائیں (آپ کا مشورہ قابلِ قدر ہے۔ ایک مصنف کو یہ ٹاسک دے دیا ہے۔)“

☆ خالد شیخ طاہری کا تبصرہ چامشورو سے۔ ”سرگزشت سے ہماری دوستی زیادہ پرانی تو نہیں ہے مگر آپ زویا اعجاز اور سرو سیم بن اشرف کی تحریروں نے سرگزشت سے ہماری یاری بنادی۔ جب سے سنا اور پڑھا کہ سال کا آخری شمارہ مرگ نمبر ایک یادگار رسالہ ہوگا تب سے بے چینی شروع ہوئی یا چلا کہ اس تاریخ کو آئے گا دو دن پہلے سے ہی بک اسٹال پر چکر لگانا شروع ہو گئے۔ جب ہم پہنچے کہانیوں کی لسٹ پر تو اپنے پسندیدہ لکھاریوں کے ساتھ کبیر عباسی صاحب کی تحریر اور باقی اسٹوریوں اور سچ بیانیاں، کچھ کر اندازہ ہو گیا کہ اندر بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ اب آتے ہیں رسالے کے اندر کم عمری میں موت کے آگے سر جھکانے والی ایرانی شاعرہ کا احوال پڑھ کر جب ہم اندر پہنچے تو سب سے پہلے آپا زویا اعجاز کی خوشبو بھری اسٹوری چاند گرہن کھولی۔ خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر کے حالات و شاعری تو بہت پڑھی تھیں لیکن آپا نے بہت خوبصورت انداز اور خوب صورت لفظوں سے پروین شاکر سے ملاقات کرائی۔ آپا کے اندازِ تحریر سے پروین شاکر کے حالات و واقعات پڑھ کر چاروں طرف خوشبو ہی مہکتی محسوس ہوئی۔ چھبیس دسمبر کے دن کا ذکر آنکھوں کو نم کر گیا کیونکہ اسی دن شاعری کی دنیا سے شاعری کی خوشبو ہم سے جدا ہوئی تھی۔ ابھی پروین شاکر کی خوشبو کے حصار سے آزاد ہونے بھی نہیں پائے تھے کہ وسیم بن اشرف نے اپنی اسٹوری خودکشی میں ایک اور شاعر سے ملوا دیا۔ شاعر ثروت حسین کی اسٹوری پڑھ کر پہلے تو سرو سیم کو داد دی جنہوں نے اپنے ہی لوگوں کے رویے اور منافقت کے ستائے ہوئے ایک شاعر کے حالاتِ زندگی کو اس طرح ہم تک پہنچایا۔ پڑھ کر دکھ کی لہر دل میں اٹھتی محسوس ہوئی۔ پہلی بار خودکشی کی کوشش کے نتیجے میں معذور ہونے والے اور پھر دل منافق لوگوں کے ستائے اور اپنی زندگی سے دل برداشتہ ثروت حسین کی کم عمری میں اس طرح کی موت یہ سب پڑھ کر ایک دم پھر دکھی ہو گئے۔ اس کے بعد ہم پہنچے کرکٹ کے سٹیڈیم میں جہاں کبیر عباسی ایک اور دکھ لیے قاتل باؤنسر کے ساتھ کھڑے تھے۔ برناڈ شا کا مقولہ پڑھا۔ ”وہ مقام جہاں خواہش تھی اور فرض بھی ان حدود مل جائیں“ سے خوش بخت کہتے ہیں۔ ”کرکٹ کی تاریخ میں پڑھا علاوہ یوں کی اموات میں ایک موت آسٹریلیا کے فل جوزف ہیوز کی بھی تھی۔ کبیر عباسی صاحب کی تحقیق اور ہیوز کی زندگی اور موت کے بارے میں پڑھ کر حیران ہوتا گیا۔ کبیر عباسی نے تحقیق میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھا جو عام بھائی فالتو سمجھ کر چھوڑ دیتا۔ ہیوز کی بارہ سال کی عمر فرسٹ کلاس کرکٹ اور پھر انٹرنیشنل کرکٹ تک کی کارکردگی کو اتنی تفصیل سے ہم تک پہنچایا کہ بے اختیار کبیر عباسی صاحب کو داد دینی پڑی۔ پچیس نومبر کے دن جب ہیوز کو قاتل باؤنسر لگا اور ستائیس نومبر دو ہزار چودہ کے دن کے ذکر نے ایک پھر دکھی کر دیا۔ ہیوز کی المناک موت کا سوگ مناتے ہوئے جب ہم پہنچے منظر امام صاحب کی ایک ایسی اسٹوری پر جہاں ایک معلومات کا خزانہ دفن تھا اور ہم رک گئے جواں مرگ خزانے کو کھو دینے کا کھو جانے تو ہمیں ایڈگرایلن پو، انٹیفن کرین، این برونٹے، قتیل جیمیری، شکیب جلالی اور مصطفیٰ زیدی جیسے نایاب جوہر ملے جن کے حالاتِ زندگی اور کارنامے پڑھ کر ہمارے علم میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس اضافے میں اسی وقت اور اضافہ ہو گیا جب ہم نے ڈاکٹر ساجدہ کی دانشور کو کھولا۔ یونان کے ایک دانشور کی زندگی کے حالات و واقعات ان کے پیدا ہونے سے بھوک اور پیاس سے موت کو گلے لگانے تک کا جو احوال ڈاکٹر ساجدہ نے ہمیں دیا پڑھ کر ان کے قلم کی داد دینی پڑی۔ تنویر ریاض صاحب ”مرگِ درویش“ کے ساتھ موجود تھے۔ خوبصورت آنکھوں والے جنید دل دل پاکستان کی طرح ہمارے دل و دماغ میں بسے ہیں۔ سات دسمبر کے منحوس حادثے کو ڈاکٹر تنویر صاحب نے اس انداز سے ہم تک پہنچایا کہ آنکھوں کو کئی بار نم ہونے سے روکا۔ ہماری زندگی میں اگر صحیح وقت پر اچھے دوستوں کا مشورہ مل جائے تو ہماری زندگی کامیابی کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے، ایسا ہی ناکام گلوکار اور کامیاب اداکار اظہار قاضی کے ساتھ بھی ہوا۔ ہمیں یہ بات پتا بھی نہیں چلتی اگر مرگ کا شمارہ نمبر ہم تک نہ پہنچتا۔ شاہد حنیف صاحب کی بہت زبردست کاوش تھی۔ عزم و حوصلے کی پیکر نور کیا کہیے جاسوسہ پڑھ کر اپنا پٹھان قوم پر فخر سا ہونے لگا۔ فخر ہونا بھی چاہیے ہماری پٹھان قوم کا جذبہ حب الوطنی کسی شک و شبے سے بالاتر ہے۔ نور کی خدمات تاریخ میں اس کے کارنامے دلیری زندگی کے ہر رخ جاؤ اور پھر بیک وقت قبل از موت اور موت سے پہلے بدترین تشدد کا پڑھ کر اس عظیم جاسوسہ کو بے اختیار خراجِ تحسین دینے کو دل چاہا۔ مرگ کا شمارہ نمبر اگر نہ پڑھتے تو ایسی ہستی کو شاید ہم کبھی نہ جان پاتے بہت۔ علی عبداللہ، محمد حسن صاحب زبردست کاوش۔ مرگِ فنکار ان فلمی ستاروں کی داستان جو سب ہم میں نہیں ہیں۔ آہ قیصر خلیل، سلطان راہی، رفیع خاور (ننھا) جنہیں عشق نے قتل کیا یا زمانے کی ستم ظریفی نے۔ ”شمشال سے نور ستو“ ندیم اقبال۔ ”دسوز“ از ڈاکٹر عبدالرب بھٹی۔ یہ دونوں سلسلے بھی شروع کیے ہیں جیسے جیسے کہانی اور سفر آگے بڑھتا جائے گا۔ دماغ کچھ سوچنے کے اور ہم کچھ تبصرہ لکھنے کے قابل ہوتے جائیں گے۔ بس اتنا کہنا ہے، کیوں اتنے عرصے سرگزشت سے دور رہے خیر اب قریب آگئے ہیں، دوستی نبھائیں گے۔ مرگِ دفور رحمت وفا راجپوت۔ ”ذمے دار“ یہ طرز شاہین ایسی تحریریں جو پڑھنے کے لائق ہیں۔ کاش نئی نسل والدین سرگزشت کا یہ شمارہ پڑھیں۔ رحم بے رحم، پڑھ کر تو دل بجھ سا گیا اور یہ تحریر بہت کچھ یاد دلا گئی اس منحوس دسمبر کی جو سکندر رمیاتی کی زبردست کاوش۔ ”مرگِ برگ“ بشریٰ شوکت، ایک ایسی سچ بیانی جو خوب صورت لفظوں سے سجی ہے۔ جسے پڑھ کر یہ ذہن سے چپک سی گئی ہے شاید بہت عرصے تک یاد رہے۔ کس کس تحریر کا ذکر کروں۔ زرخ ثر کا عشق گزیدہ کا، میری گڑیا کا، ان تحریروں نے تو دل جیسے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ ہر لکھاری نے اس طرح اپنی اپنی تحریروں کو زبردست تحقیق کر کے مکمل لکھی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ رہا ہی نہیں۔ جے ڈی پی کا بہت بہت شکریہ جس نے اتنا زبردست رسالہ ہم تک پہنچایا۔“

☆ نزاہت الشان کا تجزیہ مہرو تحصیل فتح جنگ سے۔ ”مرگِ ناگہاں“ نمبر نئے سال کا پہلا تحفہ اور ہر لحاظ سے معیاری نمبر ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نامور ریاضی دان فیثا غورث کے حالاتِ زندگی پر بہت ہی زبردست تحریر لائے۔ ”مرگِ درویش“ اور ”ناکام گلوکار“ دونوں نابغہ روزگار شخصیتوں کے حالاتِ زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ زویا اعجاز نے پروین شاکر پر بہت ہی زبردست لکھا۔ پروین شاکر واقعی منفرد لب و لہجے کی بہت خوب صورت شاعرہ تھیں۔ ”جاسوسہ“ میں پختون دوشیزہ نے اپنی روایتی بہادری کی لاج رکھی اور فرنگیوں پر واضح کیا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ ”جواں مرگ“ منظر امام نے انگلش اور اردو ادب کے نامور کم عمر

شاعروں کا بہت ہی خوب صورت انداز میں ذکر کیا۔ جان کیٹس کی بعض نظمیں میں نے پڑھی ہیں خصوصاً کیٹس کی آخری عمر کی شاعری بہت خوب صورت ہے۔ انعام اللہ یقین مرزا مظہر جاناں کے عہد کے بہت ہی زود گو شاعر تھے لیکن حیرت ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں ان کے حوالے سے کوئی مفصل معلومات نہیں دیں۔ شکیب جلالی نے اس وقت اپنے آپ کو موت کے حوالے کیا جب وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے عروج پر تھے۔ اسی طرح اسرار الحق مجاز کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اگر مجاز بے وقت موت کا شکار نہ ہوتا تو وہ اقبال کے ہم پایہ ہوتا۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح حیات میں مجاز کے بارے میں تفصیلاً لکھا ہے۔ مصطفیٰ زیدی 1950ء کی دہائی کے بعد سب سے اچھا لکھنے والوں میں سے تھے۔ مصطفیٰ زیدی کو جوش صاحب کا قریبی ہونے کی وجہ سے اکثر ادبی حلقوں نے نظر انداز کیا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مجموعہ کلام ''کوہِ ندا'' کے دیباچے میں بھی کیا۔ فیض اور ناصر کاظمی کے بعد بلاشبہ مصطفیٰ زیدی غزل کے نامور شاعر تسلیم کیے گئے۔ نامور افسانہ نگار منٹو نے بھی گویا کم عمر پائی لیکن افسانہ نگاری کی تاریخ منٹو کے بغیر نامکمل رہے گی۔ منٹو میٹرک میں تین بار فیل ہوا تھا لیکن ایسے تخلیقی لوگ نصابی تعلیم کے محتاج نہیں ہوتے جیسا کہ احسان دانش صرف چار جماعتیں پاس تھے۔ حفیظ جالندھری صرف سات، مولانا مودودی صرف میٹرک اور ناصر کاظمی بھی ایف اے تھے مگر آج ان لوگوں کی کتابیں ہمارے نصابِ تعلیم کا حصہ ہیں۔ ''معصوم'' میں ایک ذہین لڑکی کا جرمنوں کے ہاتھ قتل ہونا اداس کر گیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اور ساتھ ہی فرنگی معاشرے کے عکس بہت خوب صورتی سے عیاں کر رہی ہے۔ آخر میں کہنا چاہوں گا کہ ''مرگِ ناگہاں نمبر'' میں ناصر کاظمی (1925-1972) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (1885-1918) اور سلیم بے تاب کا ذکر نہیں تھا حالانکہ ان کا شمار بھی کم عمر شعراء میں ہوتا ہے (ناصر کاظمی پر مفصل سرگزشت آچکی ہے)۔''

☆ سید ذیشان حیدر کاظمی نارووال سے رقم طراز ہیں۔ ''جاسوسی ڈائجسٹ سے تو میرا رشتہ بہت پرانا ہے لیکن سرگزشت ڈائجسٹ لینے اور پڑھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ سے مرگِ ناگہاں نمبر کا ذکر سنتا آ رہا تھا اس لیے پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ ''معمہ خیال'' کے باسیوں کو میں جانتا تو نہیں لیکن عزیز مے اور ناصر صاحب کی محبت نے اتنا متاثر کیا کہ یوں لگا جیسے میں نے بھی سارے سال کے شمارے پڑھ رکھے ہیں۔ فہرست میں کافی جانے پہچانے اور معتبر نام نظر آئے۔ آغاز ''چاند گرہن'' سے کیا۔ پروین شاکر کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بہت اچھی شاعرہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ اور مصیبت و آزمائشیں تھیں اس کا اندازہ تحریر پڑھ کر ہوا۔ وسیم بن اشرف صاحب کی ''خودکشی'' بھی دھیمے اسلوب پر لکھی گئی اچھی کہانی تھی۔ جنید جمشید کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ ان کی دردناک موت ہم سب کے دلوں پر لگا ایک زخم ہے۔ مرکزی پہلوؤں کا احاطہ کرتی یہ تحریر بھی پسند آئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے لیڈا فورث سے متعارف کروایا۔ منظر امام کا مختلف شخصیات کے متعلق مختصر نامہ بھی کافی اچھا تھا۔ کبیر عباسی کے ''قاتل ہاؤسز'' کا انداز بیان بھلا لگا۔ ''ننھی کلی'' میں ارتج کریم کی زندگی کا احاطہ کیا گیا لیکن تحریر میری توقعات پر پوری نہیں اتری۔ معصوم ایک مختصر سی تحریر تھی لیکن اس کا تاثر بہت گہرا تھا۔ سچ بیانیوں میں ''مرگ برگ'' نے کچھ لمحوں کے لیے بالکل دنگ کر دیا۔ انداز تحریر کافی پختہ اور تکنیک بہت اسٹرونگ تھا۔''

☆ قیصر خان کا بھکر سے تبصرہ۔ ''اداریہ میں قیمت کے اضافہ پر دلائل بہت مضبوط تھے۔ بہت بڑی شاعرہ کے بارے میں ایک صفحہ میں پڑھا۔ کرسی صدارت پر ناصر حسین رند تھے۔ بہت مبارک باد۔ منشی صاحب سالانہ تجزیہ کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت خوب صورت تبصرہ تھا، پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ تجزیہ بہت باریک بینی سے کیا گیا تھا۔ پہلا مضمون ڈاکٹر ساجد امجد کا شاہکار تھا۔ لیڈا فورث ریاضی دان کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا کہ اتنے بڑے عالم کا یہ حال ہوا۔ ''مرگِ درویش'' ایک خوب صورت اور مشہور گلوکار کے بارے میں بہت خوب صورت مضمون تھا۔ ''ناکام گلوکار'' ایک منفرد تحریر تھی۔ ''چاند گرہن'' میں اس مشہور شاعرہ کے بارے میں بہت سنا کہ وہ کسی کو پسند کرتی تھیں لیکن کوئی خاص ثبوت نہیں ملا (آپ ''چاند گرہن'' اور ''خودکشی'' کو ملا کر پڑھیں)۔ ''جاسوسہ'' ایک بہادر لڑکی کی داستان جو کمزور اعصابی طاقت کی وجہ سے ان فٹ تھی لیکن اللہ کے حکم سے اور جرأت سے اس نے وہ کر دکھایا کہ آج بھی تاریخ میں سورج کی طرح روشن ہے۔ ''خودکشی'' اتنے بڑے شاعر کا یہ حال ہوا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اسلوب دوراں آنس معین کے ساتھ بھی خودکشی والا واقعہ ہوا ہے اللہ ان کی مغفرت کرے۔''

☆ ظفر ندیم دہرہ کا تبصرہ حیدرآباد سے۔ ''سرگزشت کا خاص نمبر ''مرگِ ناگہاں'' کی صورت میں سامنے آیا۔ بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا۔ آپ نے درست فرمایا کہ یہ پرچہ ماہنامہ پرچہ نہیں ہے بلکہ معلومات کا خزانہ ہے۔ آدمی کے ظاہر و باطن کی طرح رسالے کے ظاہر و باطن میں اگر کوئی بے ربطی نظر نہ آئے تو جی خوش ہوتا ہے۔ میں آپ کو سرگزشت کے ظاہری حسن اہتمام اور معنوی حسن ترتیب دونوں پر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ آپ اسے خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ پروین شاکر کی شاعری اور نجی زندگی سے متعلق آرٹیکل ''چاند گرہن'' پڑھ کر انسان اور دنیا کی بے ثباتی پر رونا آ گیا۔ ڈاکٹر نصیر نے محض چند مفروضوں کی غلط بنیاد پر ان کی زندگی میں تلخیاں گھول دیں۔ جس سے روح مجروح ہو گئی لیکن تمام تر زیادتیوں اور ناانصافیوں کے باوجود ان کا رویہ قابلِ تحسین رہا۔ راحت وفا کی کہانی ''مرگِ گل'' اس لیے اچھی لگی کہ انہوں نے ڈسکہ کی مٹی کو اٹھایا ہے اور کہانی میں بکھیرا ہے۔ یہ پوری کہانی ایک خوب صورت غزل کی مانند ہے جس میں حزن و ملال بھی ہے اور حقیقت حال بھی۔ کہانی کا بہاؤ ایسا ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار ڈوب جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر لکھنے والے کی باریک بینی اور مشاہدہ گہرا ہے تو اس کی مہارت خود بخود ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ طاہرہ نقوی بلاشبہ ایک منفرد اور دور شناس اداکارہ تھیں۔ ''مرگ برگ'' کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ خودکردہ را علاجے نیست۔''

☆ عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''محبت فنا کو امر کر دیتی ہے، آدمی کو انسان بنا دیتی ہے، عام سا قاری لکھاری بن جاتا ہے۔ انسان عام

طور پر کوئی نہ کوئی وہم پالے رکھتا ہے، کسی کو وہم ہوتا ہے کہ وہ فوڈ انجوائے کرتا ہے جب کہ درحقیقت وہ صرف اپنے آپ کو فیڈ کرتا ہے، کسی کو میوزک سمجھنے کا گمان ہوتا ہے تو کسی کو شاعری کی سمجھ بوجھ کا، بالکل اسی طرح کچھ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ وہ محبت کرتے ہیں لیکن صاحب یہ ہر کسی کا کام نہیں، یہ جادو سب کے دل پر نہیں چھاتا۔ احساس، شفقت، نرمی، نصیب، خلوص نیت اور جانے کون کون سے لطیف جذبات ایک خاص تناسب کے ساتھ دل و دماغ میں یکجا ہوں تو محبت کا پودا نمو پاتا ہے۔ لیکن ندیم صاحب یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے محبت کی ہے، اپنی زندگی کے ساتھ بیوی بچوں کے ساتھ، نسرین کے ساتھ اور سعد کے ساتھ۔ پہلے نسرین کا اپنے وطن واپس جانے پر تیار نہ ہونا جس کی وجہ سے ندیم فکرمند ہے پھر نسرین کا خاص انداز سے تیار ہونا اور کہنا کہ تمہاری فیملی کے یہاں آنے سے قبل واپس چلی جاؤں گی۔ الف کمال کر دیا، ندیم اقبال بھائی دل چھو لیا ''شمشال سے ٹورنٹو'' نے۔ بہت کچھ یاد دلا دیا۔ سدا خوش رہیں۔''

☆ اریشہ کا سمندری سے تجزیہ۔ ''سرگزشت کے ''مرگِ ناگہاں'' نمبر کا جانے کب سے انتظار تھا۔ انتظار کی گھڑیاں بائیس دسمبر کو ختم ہوئیں اور ڈائجسٹ ہاتھ میں آیا۔ ایک علمی سرگزشت فروغ فرخ زاد کی تھی۔ پابندیوں میں جکڑی اس دلیر خاتون نے مختصر زندگی میں اپنے خواب جیے اور امر ہو گئی۔ ''مرگِ درویش'' میں جنید جمشید کے حالاتِ زندگی، تبدیلی اور موت کے متعلق معلومات ملیں۔ ناکام گلوکاری کی جدوجہد پڑھتے ہوئے چاند گرہن کی وادی میں قدم رکھا۔ پروین شاکر کی شاعری کے تو ہم مداح تھے ہی ان کی کٹھن زندگی اور جدوجہد نے دل میں ان کے لیے عزت کئی گنا بڑھا دی۔ پروردگار انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ جاسوسہ جواں مرگ، خودکشی نے متاثر کیا۔ ''قاتل ہاؤسز'' میں کبیر عباسی نے قلب ہیوز سے متعارف کروایا۔ ''مرگِ گل'' اور معصوم قدرے مختصر تھیں لیکن پُراثر تھیں۔ ''ننھی کلی'' میں زیادہ تر فوکس اظہاری انٹرویو کے سوالات پر رہا لیکن گزارہ ہو گیا بس۔ زرغش نے بھی معلومات میں اچھا اضافہ کیا۔ سلطان راہی کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔ سچ بیانیوں میں ''مرگ برگ'' ٹاپ پر رہی۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تحریر تھی۔ اس بہترین شمارے کے لیے مدیر اور تمام رائٹرز کو ڈھیروں مبارک باد۔''

☆ احمد خان توحیدی نے راولپنڈی سے تبصرہ کیا ہے۔ ''مرگِ ناگہاں'' کا بے چینی سے انتظار تھا۔ قریبی بک اسٹال کا چار دن تک صبح شام چکر لگانے کے باوجود نہ ملا، مجبوراً 23 دسمبر کو کرایہ خرچ کر کے صدر سے لایا۔ سردیوں کی طویل راتیں جیسے آنکھ کھلی پڑھنا شروع کر دیا۔ برادرم معراج رسول آپ گھما پھرا کر بات کرتے ہیں۔ دس روپے اضافہ کون سی قیامت ہے۔ دس روپے میں کیا ملتا ہے؟ اچھا صرف یہ ہے کہ سرگزشت میں ''ناسور'' نہ ہو تو بہتر ہے۔ ''معمہ خیال'' میں چھلانگ لگائی۔ ناصر رند طویل تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر، مبارکاں جی۔ منشی عزیز مے کا طویل تبصرہ سال بھر شمولیت والوں کی حاضری لگانے پر شکریہ۔ رانا شاہد، اعجاز سحر، صدرہ ناگوری، امتیاز بخاری، نزہت افشاں تبصرے اچھے مگر طویل تھے۔ بھائی منشی عزیز مے ندیم ڈوگر کے سوا سب بھول گئے، یہ زمانے کا چلن ہے۔ ''مرگِ ناگہاں نمبر'' کی تمام کہانیاں اچھی ہیں۔''

☆ امیر حمزہ اشرف نے کوٹ رب نواز ملتان سے لکھا ہے۔ ''دوستوں سرگزشت 24 دسمبر کو ملا۔ کرسی صدارت پر پُراسرار کہانیوں کے شیدائی ناصر حسین رند کو براجمان پایا۔ وسیم بیگ جناب، بھائی رانا محمد شاہد ہم آپ کے دکھ کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں صرف نو سال کا تھا جب میرے والد صاحب 2008ء کی ایک سرد شام کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ماں نے کبھی بھی والد صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 12 اپریل 2015ء کو میری والدہ بھی خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ سالانہ تجزیہ بقلم منشی عزیز مے محنت و جانفشانی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ویلڈن جناب۔ ''چاند گرہن'' پروین شاکر کی شخصیت سازی میں عسکری صاحب اور والدین کا کردار اہم رہا۔ شاعرہ کے حالاتِ زندگی جان کر اچھا لگا۔ بیچ بیچ میں زرین قمر کے مراسلات نے معلومات میں اضافہ کیا۔ ''معصوم'' وہ معصوم خواہشات رکھنے والی پیاری سی لڑکی این فرینک واقعی معصوم تھی۔ ''عشق گزیدہ'' بے شک اس حقیقت سے انکار نہیں کہ گرودت اور گیتا رائے خود اپنی تباہی و بربادی کا سبب بنے۔ مرگِ گل، ننھی کلی، خودکشی اور جاسوسہ بھی اچھی تحریریں تھیں۔''

☆ رضا احمد اعوان کا تجزیہ بھکر سے۔ ''طاہرہ نقوی پر راحت وفا راجپوت کی ''مرگِ گل'' خاصے کی چیز تھی۔ 25 سال کی مختصر زندگی میں لازوال کامیابیاں حاصل کیں۔ طویل دورانیہ کے کھیل ''زندگی بندگی'' اور کامیاب سیریل ''وارث'' میں لاجواب اداکاری کر کے انمٹ نقوش چھوڑے۔ انور فرہاد کے مضمون ''مرگِ فنکار'' میں ہدایت کار خلیل قیصر، اداکار نعما اور نادرہ کے بارے میں پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ وحید مراد کے متعلق تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ان کی موت پُراسرار حالات میں ہوئی تھی۔ اس پردے کے پیچھے چھپے حقائق کو جاننے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اس بار ''بیت بازی'' شامل نہیں تھی (خاص شمارے میں نہیں دی جاتی) معروف شاعرہ پروین شاکر پر زویا اعجاز کا مضمون ''چاند گرہن'' بہترین اور مفصل تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہترین سفرنامہ ہے۔ سچ بیانیوں میں عالیہ کی ''چھوٹی سی جان'' احمد توقیر کی ''میری گڑیا'' اور حماد سکندر عباسی کی ''زخم بے رحم'' بالترتیب پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہیں۔ رانا محمد شاہد، نصیر اللہ خان اور نزہت افشاں کے تبصرے دلچسپ اور خوب تھے۔''

☆ اعجاز حسین سحار لور پورتھل کا تبصرہ۔ ''نئے سال کے پہلے شمارہ کا ٹائٹل دیکھ کر خاص نمبر کا پتا چل رہا ہے۔ اتنی بیش بہا معلومات، آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں پڑھ لینے سے جو مزہ حاصل ہوتا ہے بھلا اس کے سامنے دس روپے کی کیا اہمیت ہے۔ بہرحال وضاحت ہم نے قبول کر لی۔ منشی محمد عزیز مے نے پورے سال کا ریکارڈ محنت اور ذہانت سے ترتیب دیا۔ شکریہ قبول کیجیے۔ میرے عزیز بھائی میں نے پورے بارہ خط لکھے وہ محکمہ ڈاک کی بے پروائی کی نذر ہو گئے۔ ''مرگِ درویش'' میں جنید جمشید کی کامیابیوں اور پھر راہ بدلنے کا احوال پڑھ کر ٹی وی پر دیکھے لائیو مناظر یاد آ گئے۔ انسان کے منصوبے کئی دہائیوں تک کے ہوتے ہیں لیکن

آنے والی صبح دیکھنا کسے نصیب ہو یہ صرف اللہ کی ذات جانتی ہے۔ "چاند گرہن" میں پروین شاکر سے متعلق میرے لیے نئی معلومات تھیں۔ خاوند سے علیحدگی، والدین کی بیماری اور بیٹے کی دوری جیسے دکھوں نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا عزم تھا لیکن مشیتِ ایزدی سے کون ٹکر لے سکتا ہے۔ "جواں مرگ" اور "مرگ ناگاہ" میں کس کس کی بے وقت موت کا ماتم کیا جائے، زندہ رہتے تو کتنی تخلیقات ہمارے دل بہلاتیں، کتنے شاہکار صفحۂ قرطاس پر بکھرتے اور کتنی نسلیں محظوظ ہوتیں لیکن موت کا وار نہایت کاری پڑا کہ سارے خواب بھیانک عذاب بن گئے۔ "شمشال سے تورتنو" میں ندیم اقبال مکمل جزئیات کے ساتھ بیتے دنوں کی یادیں دہرا رہے ہیں۔ ان کے انداز تحریر کے ساتھ یادداشت بھی قابل داد ہے۔ سچ بیانیوں میں "مرگ برگ" الگ انداز کی کہانی ہے۔"

☆ طاہر الدین کا خلوص نامہ میرپور خاص سے۔ "بہت عمدہ تبصرہ پڑھنے کو ملے۔ قبلہ منشی صاحب نے سالانہ رپورٹ بڑی جانفشانی سے مرتب کی، بہت خوب۔ منظر امام صاحب نے زبردست محنت کی اور کافی عمدہ مواد جمع کر کے اسے خاص طور پر شاعر صاحبان پر خوب ہی لکھا۔ آپ نے یہ نمبر نکال کر کمال کر دیا۔ بہت ہی شاندار نمبر ہو۔ اس میں جو مرحومین آپ نے جمع کیے ہوں جس طرح تھا آپ کو زبردست خراج تحسین۔ یہ نمبر کارنامہ ہے سرگزشت والوں کی طرف سے ہم جیسے لوگوں کے لیے۔ خلیل قیصر، سلطان راہی کی اموات کس طرح ہوئی بعد میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ خلیل قیصر کے گھر میں گھسے اور دشمن تاک میں تھے، ان کا قتل ہو گیا۔ سلطان راہی اپنی کار میں پڑے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کا ڈرائیور اور ان کا سیکریٹری کہاں تھے جہاں دونوں سانحات کا کوئی حل نہیں نکلا (افسوس اسی بے حسی کا ہے۔)"

☆ بالکل آخری لمحے پر آیا عبدالجبار رومی انصاری کا خط۔ "برزدنے کا اس میں احوال ہے تبھی تو کہتے ہیں سرگزشت کمال ہے اور سرگزشت واقعی کمال ہے جس میں دنیا بھر کا احوال ہے۔ نزہت انتظار کہہ رہی ہیں کہ کون ونڈ ویلکم کرے گا، ارے بھئی آپ آئیں اور چھا جائیں اب ویلکم کی کسر تو باقی ہی نہیں رہی۔ بہت بہت مبارک ہو اور ویلکم۔ خالد محمود، آفتاب احمد نصیر اشرفی، ارشد محمد عامر ہمدرد، نوید گوری کے تبصرے عجیب اور اچھے رہے اور رانا محمد شاہد کا خلوص نامہ بھی عمدہ رہا۔ جی رانا صاحب میں تصور میں ہی ملتا ہوں اب۔ خیر جلد ہی بوریوالا میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ "ناسور" کی پچھلی قسط میں تو ہی سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جیسے روزی کے گھر میں کیبل والے لڑکے کو باندھنا، عزیز اینڈ گنڈز کمپنی پر دھاوا بولنا اور رانا بشیر کے معاملے میں جتھے سے الجھنا۔ "شمشال سے تورتنو" میں پچھلی دفعہ سعدی کی سائمرہ کی وجہ سے نسرین کی قربت تو خوب میسر آئی تھی مگر اس قربت کی ڈور ٹھیک طرح سے بندھ ہی نہ ٹوٹ سکی۔ پرنس جمال کا مسئلہ بھی حل ہوا اور کینیڈا میں بچوں کے سکول کے معاملات جان کر حیرت ہوئی یہ بھی ایک طرح سے بچوں کی بہتر تعلیم اور ان کے تحفظ کی وجہ سے ہے۔ آخر میں سعدی کے فون نے ہی چپ کروا دیا۔ سفرنامے کا احوال بہت اچھا جا رہا ہے۔"

☆ منشی محمد عزیز میمن نے لندن وہ زنیا سے لکھا ہے۔ "مرگِ ناگہاں نمبر بڑے ہی طویل انتظار کے بعد 23 دسمبر کو ملا۔ سب سے پہلے تو اپنا سالانہ تجزیاتی جائزے پر نظر ڈالی، بہت شکریہ کہ آپ نے میری محنت کو قبول کیا۔ سرگزشت کے 25 سالہ ریکارڈ کے لیے کیا کسی خاص ادا میں نمبر کی ضرورت ہے؟ (کچھ اور انتظار کریں) "شہرِ خیال" میں ناصر حسین رند کی بھرپور انداز سے واپسی ہوئی، ویلکم بیک جناب۔ تبصرہ بھرپور تھا۔ مرزا طاہر الدین بیگ DP سے وابستہ کافی پرانا ساتھ ہے۔ آپ بھی طویل غیر حاضری کے بعد جلوہ افروز تھے۔ نزہت انتظار اور رانا محمد شاہد کی محبت کے کیا کہنے۔ آپ دوستوں کی محبت ہی تو ہے۔ جو ہمیں کھینچ کر "شہرِ خیال" میں لاتی ہے۔ ڈاکٹر آر ایم اے بیرون ملک سے "شہرِ خیال" میں تشریف فرما تھے۔ ان کا نام پڑھ کر محترمہ بھی رحمٰن صاحبہ یاد آ گئیں۔ احمد خان توجیدی، ایم اے خاتون بھٹی، روبینہ نفیس انصاری، بشریٰ افضل، قرۃ العین زینب وغیرہ کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں۔ شوکت رحمٰن خٹک کا نام لیٹ کرز میں دیکھ کر دلی افسوس ہوا۔ فیثا غورث کا انجام رنجیدہ کر گیا۔ تنویر ریاض مرگ درویش کے عنوان سے جنید جمشید پہ مفصل مضمون لے کر حاضر تھے۔ نامکمل گو کار میرے پسندیدہ اداکار اظہار قاضی پر شاہد لطیف نے مختصر سا مضمون تھا پھر بھی اچھا لگا۔ زویا اعجاز نے پروین شاکر کے حالات زندگی اور شاعری پر بھرپور مضمون لکھا۔ نہ واقعی لحاظ سے پروین شاکر بدنصیب ہی رہیں کہ ان کے جذبات کو سمجھنے والا مرد یعنی شوہر نہ ملا۔ ڈاکٹر نصیر بھی ایک روایتی شوہر ثابت ہوا۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ تو خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ نسرین کی اداسی کا پڑھ کر سر ندیم اقبال پر "معصومہ سانحہ" آتا ہے۔ آخر میں بڑا سسپنس پیدا ہو گیا ہے کہ نہ جانے ایسا کیا ہو گیا ہے جس نے ندیم صاحب کو پریشان کر دیا ہے۔"

☆ محمد ابراہیم درانی نے ڈی جی خان سے لکھا ہے۔ "میں کافی عرصے سے آپ کا خاموش قاری ہوں مگر اب میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو چکا ہوں۔ دو مرتبہ آپ کو خط لکھا تھا اور آپ سے پذیرائی بھی ملی تھی۔ میاں جی کی کہانیاں شائع کریں۔ اگر پہلے شائع کر چکے ہیں تو براہ کرم دوبارہ شائع کر دیں تاکہ نئے پڑھنے والوں کے علم میں اضافہ ہو (میاں صاحب کا انتقال ہوئے زمانہ گزر گیا۔ ان کی تمام کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ ہم چھپی ہوئی کہانیوں کو دوبارہ شائع نہیں کرتے۔)"

☆ عبدالودود عامر کی شکایت یونی گلر سیداں راولپنڈی سے۔ "جنوری دو ہزار اٹھارہ کا پہلا شمارہ بلاشبہ مجلد کروا کے محفوظ کرنے والا شاہکار شمارہ ہے۔ "مرگِ ناگہاں نمبر" اس کا انتظار اس بار بے تابی سے تھا اس لیے ہر بار دکاندار سے اس کو پوچھ رہا تھا۔ آخر جس دن آیا اس دن اس نے خود ہی اطلاع دے دی کہ شمارہ پہنچ گیا۔ معراج رسول صاحب کاغذ کے مہنگا ہونے کے سبب شمارہ مہنگا ہونے کی نوید دے رہے تھے آگے بڑھے تو شہرِ خیال آنکھوں کے سامنے جگمگا رہا تھا اور سرفہرست ناصر حسین رند کا نام تھا جو پورے ایک سال بعد حاضری دے رہے تھے بلاشبہ ان کا خط اس قابل تھا کہ سرفہرست رکھا جائے۔ سید امتیاز حسین بخاری شمارہ دیر سے ملنے کی شکایت کر رہے تھے شادی مبارک ہو۔ دکھ ہوا۔ اس کے علاوہ ہمدرد اعجاز حسین سحار کا تبصرہ بھی پسند آیا اور سالانہ تجزیہ تو لاجواب تھا۔ ان کے

بعد امید کا رخ کیا تو اس بار ایک جہاں سرگزشت اپنے اندر سموئے ہوئے تھا ہر سرگزشت لاجواب تھی۔ فیثا غورث کے مسئلوں نے ہمیشہ تنگ کیے رکھا اس بار جب "دانشور" میں اس کی داستان پڑھی تو محسوس ہوا کہ کتنی عظیم شخصیت تھی وہ۔ "چاند گرہن" آہ، خوشبوؤں اور پھولوں کی شاعرہ کی داستان زویا اعجاز کے قلم کا فسوں سر چڑھ کر بولا۔ وہ اس معاشرے کے اندر عورت کے جذبات و احساسات کو سرِعام بیان کرتی تھی جس معاشرے میں آج بھی بیوہ عورت کو ستی کرنے کا رواج ہے جہاں پر ونی جیسی قبیح رسمیں آج بھی موجود ہیں۔ جہاں پہ جرگوں کے فیصلے بیٹیوں کے سودوں سے طے ہوتے ہیں جہاں پہ جائیداد بچانے کے لیے بیٹی کا نکاح قرآن پاک سے یا پھر کسی درخت سے کر دیا جاتا ہے اور خود کو بڑے فخر سے مسلمان اور اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی کہتے ہیں جو نبی خود عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ "جاسوسہ" ایک صوفی کی بیٹی تھی جس کے بارے میں تاثر عام تھا کہ بزدل ہے بات بات پہ رو پڑتی ہے مگر جب آزمائش کا وقت آیا تو ہزار مردوں سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ "قاتل باؤنسر" کبیر عباسی کسی بھی رنگ میں ہمیں پسند آتا ہے۔ اگرچہ مجھے کرکٹ سے اتنی دلچسپی نہیں لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو بے اختیار پڑھتا چلا گیا۔ "ننھی کلی" ارفع کریم رندھاوا۔ ذہانت کی مکمل تصویر۔ افسوس کہ اس کو نہ جانے کس کی نظر کھا گئی ورنہ پاکستان کا ایک روشن چہرہ تھی۔ "زخم ش" روایات اور رسوم کے اندر جکڑے ہوئے بھی اس نے ثابت کیا کہ انسان کے اندر جذبہ اور صلاحیت ہو تو دنیا کی کوئی زنجیر اس کو قید نہیں کر سکتی کوئی غم اور دکھ شکست نہیں دے سکتا۔ "مرگ برگ" انسان کے ارادے اور تقدیر کے کھیل کی داستان تھی انسان کیا سوچتا ہے کیا پلان کرتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے اور ایک دن موت تمام تر منصوبوں کو تمام تر خواہشات کو نگل لیتی ہے۔ باقی شمارہ بھی بلاشبہ کمال ہے اور یقیناً یہ شمارہ اس قابل ہے کہ اسے مجلد کروا کر رکھا جائے۔"

☆ شاہد ذوالفقار کا خلوص نامہ ہری پور، ہزارہ سے۔ "تحریروں میں سب سے پہلے کبیر عباسی کی "قاتل باؤنسر" پڑھی۔ کرکٹ کا مجھے زیادہ شوق نہیں اور پاکستانی کھلاڑیوں کے علاوہ تو کسی کے متعلق جاننے کا بالکل بھی شوق نہیں مگر اس کے باوجود یہ تحریر پڑھ کے بہت مزہ آیا۔ مجھے شاعروں اور فلمی ستاروں کے بارے میں جاننے کا بہت زیادہ شوق ہے۔ پروین شاکر میری پسندیدہ شاعرہ ہیں۔ زویا اعجاز نے ان پر بہت خوبصورت تحریر لکھی، پڑھ کے مزہ آ گیا۔ اپنی پسندیدہ شاعرہ کی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کی موت نے بہت دکھی کیا۔ وسیم بن اشرف نے ثروت حسین پر "خودکش" لکھی۔ اس تحریر نے بہت دکھی کیا۔ منظر امام نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی ناگہانی موت کے متعلق لکھا۔ پڑھ کے جہاں معلومات میں اضافہ ہوا وہاں اتنے بڑے لوگوں کی جواں مرگ موت نے بہت افسردہ کیا۔ انس معین کی شاعری ان کے نام سے پہلی بار پڑھی تو بہت اچھی لگی۔ گوگل سے ان کی مزید شاعری ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھی۔ کیا کمال کے شاعر تھے مگر سمجھوتا نہیں کر سکے۔ طاہر نقوی کی داستان حیات بھی بہت اچھے انداز میں پیش کی گئی، پسند آئی۔ انور فرہاد نے فلمی ستاروں کی جواں مرگ پر مضمون لکھا۔ یہ مضمون بھی بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر خلیل قیصر کا نام پہلی بار سنا مگر ان کی زندگی کا احوال انتہائی متاثر کن رہا۔ ان جیسے ہدایتکار کی اب پاکستانی فلم انڈسٹری کو بہت ضرورت ہے۔ سلطان راہی پر لکھا گیا مضمون تھوڑا بے ربط لگا البتہ نغمہ والا مضمون بہت پسند آیا۔ حیرانی ہوئی کہ وہ سچ مچ سیدھے سادے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت واقعی ٹیلنٹ دیکھا جاتا تھا اسی لیے پاکستانی فلمیں ہٹ ہوتی تھیں۔ جاسوسہ بھی بہت اچھی تحریر رہی، ایسا لگا سرگزشت کے بجائے کوئی جاسوسی کہانی پڑھ رہا ہوں لیکن حقیقی کردار ہونے کی وجہ سے مزہ خیالی کہانی سے زیادہ آیا۔ عشق گزیدہ مختلف انداز میں پیش کی گئی، اچھی لگی یہ تحریر بھی، بس مختصر بہت زیادہ تھی۔ زرین قمر کی ننھی کلی نے بہت رلایا۔ پہلے انہوں نے ارفع کریم کے کردار کو ایسے پیش کیا کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ ایک ننھی سی پاکستانی بچی نے چھوٹی سی عمر میں اتنے بڑے کارنامے سرانجام دیے اور بعد میں اس کی موت سے ایسے آنسو بندھا کہ آنسو روکنا مشکل ہو گیا۔ زرین مہدی کی "زخم ش" بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ اتنی پابندیوں کے باوجود زبیدہ خاتون نے ہمت نہیں ہاری۔ ایسے لوگ کم کم پیدا ہوتے ہیں لیکن پتہ نہیں اتنی جلدی مر کیوں جاتے ہیں۔ سچ بیانیوں میں پہلی سچ بیانی مرگ برگ نے تو دل چیر لیا۔ آئینہ دکھاتی اس تحریر کے انجام نے جہاں دکھی کیا وہاں بہت بڑا سبق بھی دیا۔ حماد سکندر عباسی کی رسم بے رحم نے بہت رلایا۔ ایک خونی رسم نے ماں سے بیٹا اور بہن سے بھائی چھین لیا۔ کیسے برداشت کیا ہوگا انہوں نے عامر کی موت کا دکھ۔ "بنجارا" نے بھی بہت اداس کیا۔ "چھوٹی سی جان" اور "سیری گڑیا" بھی مختصر مگر پُراثر کہانیاں تھیں۔ "خون ناحق" کا پیش کرنے کا انداز بہت پسند آیا۔ پہلی بار سرگزشت لیا مگر یہ اتنا زیادہ اچھا اور معلوماتی لگا کہ افسوس ہونے لگا ہے کہ پہلے کبھی یہ کیوں نہیں لیا۔ انشاء اللہ اب یہ بھی جاسوسی کی طرح ہر مہینے لیا کروں گا۔"

☆ کوثر اسلام، صوابی سے لکھتے ہیں۔ "دو سال کے طویل وقفے کے بعد خاص نمبر کے اعلان نے آتشِ شوق کو بھڑکا دیا۔ بالآخر یکم جنوری 2018 کو جو مسلسل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا معراج رسول صاحب کی بات سو فیصد درست ہے کہ سرگزشت کوئی عام سا پرچا نہیں بلکہ یہ نفاذ میڈیو میگزین ہے۔ مرگ ناگہاں کے حوالے سے یک ملکی سرگزشت میں فرخ فرزانہ کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ صرف 32 سالہ زندگی میں اس نے بہت نام کمایا۔ "شہرِ خیال" میں ایک سال کے وقفے کے بعد ناصر حسین کی پوری آب و تاب سے واپسی ہوئی پراسرار کہانی کے حوالے سے ہم بھی ناصر بھائی کے ساتھ متفق ہیں۔ منشی عزیز نے پورے سال کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ کیا۔ جس پر وہ داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد! ڈاکٹر صاحب جب بھی لکھتے ہیں کمال کا لکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے سرگزشت میں نے ان ہی کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس بار انہوں نے جہاں فیثا غورث کی زندگی پر روشنی ڈالی وہاں دیگر اہم معلومات سے مستفید کیا۔ ڈیلفی کا مندر، کاہنہ، تھالیس، سورج گرہن، فیثا غورث کے درس گاہ اور طریقہ تعلیم نے کافی متاثر کیا۔ تنویر ریاض کی سادہ الفاظ میں لکھی گئی "مرگ درویش" اور زویا اعجاز کی "چاند گرہن" لاجواب تحریریں ہیں۔ زویا اعجاز نے جہاں پروین شاکر کی زندگی کے مخفی گوشوں سے روشناس کیا وہاں اس نے عورت کا مقدمہ بھی بخوبی لڑا۔ مضمون کے آخری حصے نے بہت اداس کر دیا۔ "جواں مرگ" منظر امام کی ایک عمدہ تحریر تھی۔ "خودکش" کی صورت میں وسیم بن اشرف ایک گوہر نایاب لانے میں کامیاب ہوئے۔ ادیب بہت حساس ہوتے ہیں۔ منافق معاشرے کی دوغلی پالیسیوں کے ساتھ وہ نہیں چل سکتے۔ "قاتل باؤنسر" کے ساتھ

کبیر عباسی بھی اس یادگار شمارے کی زینت بنے۔ بچپن، ڈومیسٹک، فرسٹ کلاس اور کیریئر کے ریکارڈز سے ہوتے ہوئے فلپ ہیوز کی زندگی کے آخری لمحات اس انداز میں بیان کیے گویا وہ مناظر کسی فلم کی صورت آنکھوں کے سامنے چل رہے ہیں۔ ہیوز کی موت کا حادثہ واقعی المناک تھا۔ ندیم اقبال کے مسحور کن لہجے میں "شمشال سے نورننو" بہت اچھا جا رہا ہے۔ انداز تحریر کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری اور منظر کشی بہت عمدہ ہے۔ "ناسور" گھن گرج کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ کرداروں کی بہت زیادہ بہتات ہوگئی ہے۔ نوری ایک بار پھر مشکل میں ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہیرو کو کچھ نہیں ہوتا۔ "مرگ برگ" پہلی سچ بیانی تھی جس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ابلیس واقعی ہر لعنت کے بعد اپنا وعدہ پورا کرنے چلا آتا ہے لیکن انسان اپنا وعدہ بھول جاتا ہے۔ ظلم، حسد، بدگمانی اور غرور انسان کو پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے۔ "بنجارہ" نے آبدیدہ کر دیا۔ "چھوٹی سی جان" حیران کن آپ بیتی ہے۔ "ذمے دار" ایک سبق آموز روداد تھی۔ وِن ویلنگ نے کئی گھر اجاڑ دیے۔ حکام کو اس کے بارے میں سخت قانون سازی کرنی چاہیے۔ یہ خاص نمبر ہر لحاظ سے ایک شاندار نمبر تھا میں اسے مجلد کرا کے رکھوں گا۔ پوری ٹیم اور ادارے کو بہت مبارکباد۔"

☆ شبینہ گل کا خلوص نامہ راولپنڈی سے۔ "مرگ درویش" از تنویر ریاض، مضمون کے طرز میں لکھی گئی تحریر جو جنید جمشید سے متعلق تھی اس میں میوزک کیریئر کے حوالے سے کافی تفصیلات شامل تھیں لیکن انقلاب اور اسکے بعد کے تفاصیل میں تشنگی رہی۔ جنید جمشید نے تبلیغی جماعت سے وابستہ ہونے کے بعد میوزک چھوڑا تھا لیکن ایک بار پھر وہ میوزک کی دنیا میں واپس گھسیٹ لیے گئے تھے اور مولانا طارق جمیل نے پھر از سر نو محنت کر کے انہیں واپس نکالا اس سب کی کوئی تفصیل نہیں جبکہ یہ بہت اہم پوائنٹ تھا۔ "ناکام گلوکار" از شاہد لطیف انکبار قاضی کے حوالے سے یہ تحریر بھرپور رہی ان کی ناگہانی موت کے احوال نے دل دہلا دیا۔ "چاند گرہن" پروین شاکر کا احوال جو زویا اعجاز نے بے حد خوبصورت افسانے کی طرح لفظ لفظ موتی پرو کر لکھا۔ یہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔ یوں لگا جیسے میں پروین شاکر پر بنی کوئی فلم دیکھ رہی ہوں۔ اتنا ایک ایک دکھ ایک ایک خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ میں اس تحریر میں ایسی کھوئی کہ وقت گزرنے کا احساس مٹ گیا۔ زویا نے انکی زندگی کے ایک ایک اہم باب کو مکمل تفصیل سے لکھا۔ میں ریٹنگ کروں تو اس تحریر کو ٹاپ پر رکھوں گی۔ "جواں مرگ" از منظر امام نے چیدہ چیدہ مشہور شخصیات کی زیست کا احوال انکی جواں مرگی کے سانحے سمیت لکھا۔ "مرگ گل" از راحت وفا راجپوت طاہرہ نقوی کا مختصر سا احوال اچھا لگا۔ "مرگ فنکار" از انور فرہاد انہوں نے فلمی اداکاروں کی اموات کا احوال بتایا جیسے مرگ فنکار کے بجائے مرگ عبرت کا عنوان زیادہ موزوں ہوگا۔ "ننھی کلی" از زرین قمر، ارفع کریم رندھاوا کی ننھی سی زندگی کا احوال۔ زویا اعجاز کے ساتھ ساتھ میں اس تحریر کو بھی اول درجہ دوں گی۔ اس قدر پیارے انداز میں زرین قمر نے لکھا کہ انکے ہاتھ چوم لینے کو دل کرتا ہے۔ اب باری آتی ہے سچ بیانیوں کی۔ "مرگ برگ" از بشریٰ شوکت، میرے حساب سے سب سے بہترین سچ بیانی دل فگار اور پر درد عبرت انگیز اور حساس ترین۔ واقعی انسان کا تکبر غرور اسے تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ "بنجارہ" از نعیم الحسن یہ سچ بیانی بھی اچھی تھی۔ قابل ذکر اور قابل تعریف وہ موت کا خوف یاد دلاتی نظم گلی جوڑ کا سناتا ہے۔ "چھوٹی سی جان" از عالیہ اگر ان تک میرا پیغام پہنچے تو بس اتنا کہوں گی کہ معصوم بچے کی موت پر صبر کرنے سے اللہ پاک اس ماں کے لیے جنت میں ایک گھر بنوا دیتے ہیں جس کا نام ہے بیت الحمد۔ "ذمے دار" از عاطر شاہین بنجابی اہم مسئلہ جس پر میں ہمیشہ کڑھتی ہوں جب سڑک پر بچوں کو ون ویلنگ کرتے دیکھتی ہوں۔ "مرگ ناگہاں" کے طور پر فوزیہ عظیم عرف قندیل بلوچ کا تذکرہ حاشیوں میں پڑھا۔ گو کہ وہ پاکستان کیلیے قابل فخر ہستی نہیں تھی مگر بطور عبرت ہی سہی اس پر بھی تفصیل سے لکھا جانا چاہیے تھا۔"

☆ سیف خان کا موتیوں بھرے الفاظ کا تحفہ کوئٹہ سے۔ "ایک عرصے سے سرگزشت کے کسی خاص نمبر کا انتظار تھا اور جن دنوں پرویز بلگرامی صاحب نے شمارے کے "مرگ ناگہاں" نمبر کا اعلان کیا تو یہ مجھ جیسے اور حیت کے شائقین اور "پراسرار نمبر" کی توقع رکھنے والے قارئین کے لیے اچنبھے کی سی بات ہوگئی تھی۔ توقع یہی تھی کہ خاص نمبر کلا بھی تو خوف و مسٹری کی آمیزش لیے ہوگا تاہم مرگ ناگہاں کی جب مزید تفصیل بتائی گئی تو مزید دلچسپی بڑھنے لگی اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ اس خاص نمبر کا انتظار مزید دشوار ہوتا گیا اور سرگزشت کی خیر خبر رکھنے والے احباب کا دروازہ کھٹکا کر پوچھتے کہ "ابھی مرگ ناگہاں کا پرچہ آیا؟" خدا خدا کر کے وہ گھڑی آگئی اور خاص نمبر نئے سال کے نئے شب و روز کو خاص بناتا آپہنچا۔ سب سے پہلے تو میں اس قدر منفرد نمبر اس قدر محنت و کامیابی سے پیش کرنے پر سرگزشت کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ سرگزشت کا شمارہ ایک طویل عرصے بعد لینا پڑا جن دنوں کاشف زبیر صاحب کے ناول سراب کی آخری قسط آئی تو امید بھی بندھی کہ سرگزشت تاوان اور سراب کی زبردست شاہکار روایت کو جاری رکھتے ہوئے ایک اچھوتے موضوع پہ اچھوتا قسط وار ناول شائع کرنا شروع کرے گا لیکن ناسور کی شکل میں روایتی اور ابتدا ہی سے املا کی غلطیوں سے بھری پڑی تحریر کی پہلی قسط پڑھ کر صدمہ، مایوسی ہوئی اور کہانی دوسرگزشت کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اداریے میں 10 روپے قیمت کے اضافے کی وجہ موجود تھی۔ سوال قیمت کی کمی بیشی کا نہیں معیار کا ہے۔ پرچہ معیاری ہونا چاہیے قیمت جتنی بھی ہو۔ ہم جو توقع لنگر پر چہ لیتے ہیں وہ پوری ہو تو ستر اسی روپے کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ "شاعرہ" کے نام سے پہلے صفحے نے ہی دل گرفتہ کیا اور گویا اس ایک صفحی سرگزشت نے پورے شمارے کے خدوخال واضح کر دیے۔ فرخزاد کے شعر اکثر میں ہمارے اردو کے لیکچرار سناتے تھے۔ اس مختصری تحریر نے بہت سی یادیں تازہ کر دیں اور دل کو غم سے بھر دیا۔ جاسوسی کی محفل چھٹی کتنی کے بعد چونکہ کسی بھی محفل کے لیے لکھا جانے والا یہ میرا پہلا خط ہے اس لیے بھی شاید شہر خیال کے دوستوں کے نام اور تبصرہ کرنے کا الگ انداز ہے میری حاضری پوری نہ اترے کیونکہ یہاں جس شدومد کے ساتھ انتہائی بکھرے بکھرے تبصرے لکھے جاتے ہیں وہ بلاشبہ اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ اس بار محفل میں ناصر حسین رند صاحب کے خیالات و احساسات کی بھولی بسری یادوں پہ مشتمل تھے۔ "شہر خیال" کا یہ خط خاص نمبر کے موضوع کے ساتھ بھی خاص مطابقت رکھتا تھا اس لیے بھی دل کو چھو گیا۔ سال بھر کی پراسرار تحریروں کے حوالہ جات اور ان پہ تبصروں نے فوراً سے وہ تمام مضامین کی کھوج پہ لگا دیا۔ رند صاحب کے بعد منشی عزیز بیگ کے تبصرے نے فکر کے در وا کر دیے۔ اتنی محنت، اتنی محبت، اتنی عرق ریزی کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس تبصرے کی ستائش کے لیے کم از کم مجھے تو کچھ بھی الفاظ نہیں سوجھ رہے۔ شمارے کا پہلا مضمون ساجد امجد صاحب کا کینیا غوری پر تھا۔ یہ نام

آٹھویں جماعت کی ریاضی سے مسلسل پڑھتا اور سنتا چلا آیا۔ آج ان کے بارے میں مکمل جاننے کا موقع ملا۔ انسانیت جہل و گمراہی سے کتنی تکالیف اور قربانیاں دے کر نکل آئی ہے اس کا اندازہ یہ آرٹیکل پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ "چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں بلکہ یہ سورج کی منعکس روشنی ہے۔" اس حقیقت کے داعی شاید ہی جانتے ہوں کہ یہ نظریہ سب سے پہلے انا غورس نے پیش کیا جس کے پاداش میں اسے بھوکا پیاسا رہ کر اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہی ایک آرٹیکل پڑھ کر ہماری قیمت وصول ہوگئی تھی۔ "جاسوسہ" میں مصنف نے جنگ عظیم کے ایک گمنام نام کو زندہ کر کے دکھایا۔ نازیوں کے خلاف برطانوی جاسوسی ادارے کا ایف سیکشن.. ایجنٹ نور کی دلیری اور بی بی سی جیسے براڈکاسٹنگ ادارے کے ذریعے جاسوسی پیغامات کی ترسیل نے حیرت زدہ سا کر دیا۔ کسی بھی جنگ کی جیت نور جیسے گمنام سپاہیوں کی نازوں پلی قربانیوں سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ یہ مضمون بھی بہترین رہا۔ "جواں مرگ" میں منظر امام صاحب نے ادب سے منسلک ملکی و غیر ملکی ادیبوں کا ذکر کیا۔ "قاتل باؤنسر" میں کبیر عباسی نے آسٹریلوی بیٹسمین فلپ ہیوز کی دل شکن موت کو اپنا موضوع بنایا اور ابتدا سے لے کر انتہا تک پوری دیانتداری سے مضمون کے لوازمات پورے کر دیے۔ "مرگ فنکار" میں پہلی بار پاکستان فلم انڈسٹری کے چند پراسرار ناگہانی اموات کے بارے میں پڑھنے کا موقع ملا لیکن مضمون میں تحقیقی رنگ کی بجائے ذاتی تبصرے کی زیادہ جھلک دکھائی دی۔ سلطان راہی صاحب کی موت کی تاریخ نہ پا کر تشنگی برقرار رہی۔ آخر میں ذکر خاص نمبر کی دو خاص الخاص تحریروں کا۔ زرین قمر صاحبہ کی تحریر "ننھی کلی" کی ایک ایک لائن نے دل و دماغ ساکت کر دیے۔ ارفع کریم کی ناگہانی موت نے صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر کے آئی ٹی ماہرین کو سکتہ کر دیا تھا۔ ان سے عالمی ماہرین کو بہت توقعات تھیں۔ وہ ادارے ملک و قوم کا نام ستارے کی طرح چمکا دیتیں اگر انہیں کچھ فرصتیں مزید ملتیں۔ قمر صاحبہ کا موضوع انتخاب اور طرز تحریر، دونوں نے آنکھیں بھگو دیں۔ "مرگ ناگہاں" کی یہ واحد تحریر تھی جس نے دیر افسردگی طاری کر دی۔ اس کے بعد ذکر شمارے کی سب سے خاص تحریر (میری نظر میں) کا، چاند گرہن میں زویا اعجاز کا طرز، ذخیرہ الفاظ، مضمون کا اسلوب اور سب سے بڑھ کر پروین شاکر صاحبہ جیسی ہر دلعزیز شاعرہ کا انتخاب۔ سب کچھ دل کو چھو لینے والا تھا۔ جاسوسی ڈائجسٹ میں زویا اعجاز کی کہانیوں میں رطب اللسان ہوتے ہوتے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کا لکھا کوئی آرٹیکل پڑھ کر اب ایسے ہی جائیں گے اور تعریف و توصیف کی زباں ہی گنگ ہو کر رہ جائے گی۔ پروین صاحبہ کی زندگی کا مکمل احاطہ اور موقع کی مناسبت سے ان کے کلام سے استفادہ مضمون کو بالکل نئی جہت دے رہا تھا۔ سچ بیانیاں ابھی تک زیر مطالعہ ہیں ان کے بنیادی پالیسی اور تھیم بھی خاص نمبر کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ عماد سکندر عباسی نے رحم بے رحم ہوائی فائرنگ پر لکھا جس کی زد میں آ کر کئی معصوم زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔ آخر میں ایک بار پھر پوری ٹیم کو تہہ دل سے مبارکباد دینا چاہوں گا۔ فی زمانہ ڈائجسٹ کتابوں اور دیگر پرنٹ میڈیا کے حوالے سے پڑھنے کی شرح شدید زبوں حالی کی شکار ہے ایسے میں آپ جیسے صاحب ذوق احباب بچے کھچے پڑھنے کے شائقین کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمت و استقامت عطا فرمائے۔

☆ ایمان نے زارا شاہ کی شگفتہ بیانی اسلام آباد سے۔ "سرگزشت جنوری کے خاص الخاص نمبر کی اتنی تشہیر کے بعد اسے پڑھنا لازم ہوگیا تھا لیکن اس سے نابلد ہونے کی بنا پر کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہاں سے پڑھنا شروع کیا جائے اس لیے سب سے آسان طریقہ منتخب کیا یعنی ترتیب سے ورق گردانی۔ لہٰذا "شاعرہ" نے فوراً سے توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ پروین شاکر کے بعد کسی خاتون شاعرہ کا پہلی مرتبہ اس انداز میں ذکر سنا۔ ایرانی شاعرہ "فروغ فرخزاد" کی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق جان کر اچھا لگا لیکن ابراہیم گلستان کا انکی موت کے 50 سال بعد محبت کا اعتراف کرنا سمجھ میں نہیں آیا! "دانشور" از ڈاکٹر ساجد امجد کیتھا فورٹ کی زندگی پر لکھی کہانی نہایت دلچسپ انداز بیان کی وجہ سے بڑھتی چلی گئی اور جوں جوں اس کے کارناموں و تھیوریز کو پڑھتی گئی تو حقیقت آشکار ہوئی کہ انگریزی میں کچھ اور نام ہے جس کی وجہ سے میری کنفیوژن ختم ہوئی۔ فلکیات، فلسفہ، منطق جیسے دلچسپی کے حامل مضامین ہرگز نہیں جتنا لکھاری نے عمدہ انداز سے پیش کیا۔ "مرگ درویش" از تنویر ریاض جنید جمشید کی زندگی کے تغیرات کو اس سے اچھا قلمبند کرنا ممکن نہ تھا۔ اس تحریر نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ "حلال" و "حرام" کے معمولی سے فرق نے ایک گنہگار انسان کو کیسے تاریکی سے روشنی کی طرف پھیر دیا امیزنگ! "چاند گرہن" از زویا اعجاز۔ ایک عام سی کہانی کو بھی خاص بنانے کا کریڈٹ لکھاری کے قلم کو جاتا ہے اور یک خاص شخصیت "پروین شاکر" کے بارے میں اس قدر منفرد انداز میں لکھنا پڑھنے والوں کے لیے تحفہ ہے۔ لکھاری کے قلم کا افسوس اس قدر گہرا تھا کہ کئی موقعوں پر الفاظ نہیں موتی بکھرے ہوئے محسوس ہوئے اور ہر جذبے اور ہر درد کو خوبصورتی سے بیان کرتے رہے۔ "جاسوسہ" از احمد عبداللہ حسن کے قلم سے نور کی ہمت، جدوجہد اور بہادری کی داستان پڑھ کر دنگ رہ گئی، نہایت مختلف انداز میں لکھا گیا مضمون ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جو لڑکیوں کو نازک اندام و عقل سے پیدل سمجھ کر ریٹ کرتے ہیں! آہ رشتے گرل وار پرلیٹ اسکول! از رخ ش: از زرین مہدی، زاہدہ خاتون کی کہانی میں در اصل آزادی کے وقت جدوجہد میں شامل ان تمام خواتین کی ایک جھلک ہے جو کمزور ہوتے ہوئے بھی باہمت رہیں اور اپنا فرض خوب ادا کیا، وجہ قتل البتہ ان کے بھائی اور منگیتر دونوں کی شدید بخار سے موت ایک معمار تھی (اس دور میں ایسی موت عام تھی کیونکہ میڈیکل ترقی پر نہ تھا) "جواں مرگ" از منظر امام، ادب کے درخشندہ ستاروں کی اچانک موت پر مشتمل تحریر زبردست رہی۔ "قاتل باؤنسر" از کبیر عباسی، ہائے فلپ ہیوز۔ ایک بار پھر اس کی... یاد تازہ ہوگئی۔ آخری پیراگراف شاندار لکھا۔ 63 اور 408 کا ہندسہ اتنا ظالم نکلا کہ ایک کھلاڑی کی جان ہی لے لی: جب بھی کرکٹ کی بات ہوگی فلپ ہیوز تو یاد آئے گا۔ "ننھی کلی" از زرین قمر، ارفع کریم کی زندگی اور اس کے چیدہ چیدہ کارناموں کو اتنے متاثر کن انداز میں پیش کیا کہ موت کی سطور پڑھ کر آبدیدہ ہوگئی ہوں۔ "ذمے دار" میں ناموں کے گھپلے سے پڑھنے میں دقت ہوئی۔ کبھی ریحان تو کبھی زاہد، کبھی نبیل کو زاہد کہنا، باقی سچ بیانی آجکل کے ایڈونچر پسند نوجوانوں کے لیے اچھا سبق تھی اگر وہ سمجھیں تو۔ "رسم بے رحم" میں عامر کی فائرنگ کی زد میں آنے سے دردناک موت نے یہی اجاگر کیا ہے ایسی صورت میں اکثر غریب ہی شکار بنتے ہیں اور قانون کی کتاب ان کیسز میں ہمیشہ کے لیے چپ ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ سرگزشت کا یہ شمارہ ایک عرصے تک یاد رکھے جانے کے قابل ہے ہر ایک کہانی انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ رہی۔

اس بار تاخیر سے موصول خطوط کی تعداد اتنی ہے کہ صرف نام بھی دیا جائے تو ایک صفحہ بھر جائے۔ اس لیے معذرت خواہ ہیں۔



معلم ثانی

ڈاکٹر ساجد امجد

علم کی چاہ میں وہ دیار دیار پھرا مگر جب اس نے اپنی علمیت کا مظاہرہ کیا تو ایک عالم چونک اٹھا۔ اس نے نظریات کی اس طرح وضاحت کی۔ ایسی اصطلاحیں واضع کیں کہ دنیا حیران رہ گئی۔ عالم مثال اور مادی کائنات کو سمجھنے کے لیے اس نے کلیہ سمجھایا۔ وہ نہ صرف علم و افکار کا معلم تھا، موسیقی پر بھی کمال رکھتا تھا۔ ایک ہی لکڑی کے آلہ سے وہ ایسی موسیقی پیدا کرتا کہ لوگ زار زار روتے اور پھر اسی آلے میں ہلکی سی ردّوبدل کر کے موسیقی بجاتا کہ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے پھر وہ اسی آلے میں ردّوبدل کر کے بجاتا تو لوگ سو جاتے۔

بے نظیر و یکتا مفکر کہ وہ علم و فن کے معراج پر تھا

طرخان کئی روز بعد گھر آیا تھا اور اسی طرح گرجتا برستا گھر میں داخل ہوا تھا جس طرح وہ ہمیشہ آتا تھا۔ اس گھن گرج میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اس کی نظر اپنے بیٹے ابونصر پر پڑی جس کے ہاتھ میں اس وقت بھی ایک کتاب تھی جس طرح ہمیشہ ہوتی تھی۔ اس نے ابونصر کی پگڑی اپنی چھڑی سے نوچ ڈالی اور برسنے لگا۔

''تیرے ہاتھ میں تلوار کی بجائے کتاب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ تو طرخان کا بیٹا ہے سپاہی زادہ ہے۔ تیرا باپ ترکستان کے ایک قلعے کا کمان دار ہے اور تو ہے کہ عورتوں کی طرح کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا تجھے ابوبشیر تلوار کے ہاتھ سکھانے نہیں آئے تھے۔''

''آئے تھے اور ابھی ابھی رخصت ہوئے ہیں۔''

''ان کے جانے کے بعد تو تجھے یہ چاہیے تھا کہ تیر کمان ہاتھ میں لیتا اور نشانہ لگانے کی مشق کرتا۔''

''میرا نشانہ پکا ہو چکا ہے۔ اب مشق کی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ آپ کہتے ہیں تو وہ بھی کر لوں گا۔''

''اس طرح تو تجھے عربی کی مشق بھی خوب ہو چکی۔ کتابیں پڑھنے لگا ہے پھر کیوں مشق کرتا ہے۔''

''میں ایک ہی کتاب نہیں پڑھتا۔ بدل بدل کر پڑھتا ہوں۔ یہ دیکھیے یہ افلاطون کے فلسفے پر ایک کتاب ہے اس نے تو میری آنکھیں ہی کھول دی ہیں۔''

''غلطی میری ہی تھی۔ میں نے تجھے گاؤں کے مکتب میں بٹھا دیا۔ وہاں کے مولوی نے تیرا دماغ خراب کر دیا۔ تیرے ہاتھ سے تلوار چھین کر کتاب تھما دی۔''

''آپ اپنے قلعے سے باہر نکلیں تو دیکھیں۔ ان کتابوں نے اسلامی دنیا کی کیسی خدمت کی ہے۔ تاریخ میں بادشاہوں کے سوا کسی کا نام محفوظ نہیں لیکن ایک ایک عالم کا نام زندہ ہے۔ ہمارے صوبہ فاراب ہی میں کیسے کیسے عالم موجود ہیں اور بخارا تو علوم و فنون کا مرکز ہے۔ مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ وہاں تین سو سے زائد مدارس ہیں جہاں فلسفہ، سائنس، ریاضی، منطق اور خدا جانے کیا کیا پڑھایا جاتا ہے۔ بازار سے گزرو تو گاہک کم عالم زیادہ نظر آتے ہیں اور ایک بخارا پر ہی کیا منحصر عراق، بغداد، شام، مصر، نیشاپور کتنے ہی علمی مراکز ہیں۔ ابا جان کیا سب تلواریں لیے گھوم

رہے ہیں؟ کچھ ہاتھوں میں کتابیں بھی ہیں۔ میرے ہاتھ میں کتاب رہنے دیں۔"

"جو عالم ہیں ان کا باپ بھی عالم ہوگا تو سپاہی کا بیٹا ہے تجھے سپاہی بننا ہے۔" ابونصر اب کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ اس کی ماں درمیان میں آگئی تھی۔

"تم تو ہمیشہ کانٹوں کی جھاڑیاں ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوتے ہو۔ آتے ہی میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئے۔"

"اس کی عادتیں تم ہی نے خراب کی ہیں۔"

"میں نے تو اس کو ایسا بنایا ہے کہ پورا قصبہ اس کی تعریف کرتا ہے۔ گھر سے باہر تک تو نکلتا نہیں ہے، رات کو بھی چراغ کی روشنی میں پڑھتا رہتا ہے، مجھے تو اس سے کوئی شکایت نہیں۔"

"شکایت تو ابوبشیر کو ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ تلوار بازی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا۔ کبھی کبھی تو سر درد کا بہانہ کر کے انہیں رخصت کر دیتا ہے۔ اس کی عمر کے دوسرے لڑکے فن سپہ گری کے تمام اصول سیکھ چکے اور یہ ہے کہ اب میں تم سے کیا کہوں۔"

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بچے کو وہ بننا چاہیے جس میں اس کا دماغ خوب چلتا ہو۔ میرے پاس فاراب کے چید عالم، ابونصر کی تعریف کی غرض سے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ابونصر کا دماغ فلسفہ اور منطق میں خوب چلتا ہے۔ اگر اسے علم و فن کی راہ پر ڈالا گیا تو یہ ارسطو اور افلاطون کے پائے کا عالم بنے گا۔"

"بن چکا عالم، میں اسے سپاہی بناؤں گا۔"

"تم میرے بیٹے کو میرے ہاتھ سے نکال دو گے۔ اسے فاراب میں ہی رہنے دو۔ اگر یہ تمہاری سختی سے گھر سے بھاگ گیا تو میں ویران ہو جاؤں گی۔"

"تم سے زیادہ مجھے اس کا مستقبل عزیز ہے۔ بس چپ کر کے بیٹھ جاؤ۔"

ابونصر کی ماں واقعی چپ ہو گئی۔ طرخان نے بھی اس وقت خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ کچھ دیر گھر میں رہنے کے بعد اپنا غصہ اتارنے کے لیے دوستوں سے ملنے چلا گیا۔ دوستوں سے مل کر آج اسے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ جس سے مل رہا تھا اپنے بیٹے کی تعریف سن رہا تھا۔ پورا قصبہ جیسے ابونصر کے گن گا رہا ہو۔ وہ رات گئے گھر کی طرف لوٹا تو اسے پھر ابونصر کا خیال آ گیا۔ اتنا اچھا لڑکا ہے اگر یہ سپہ گری میں طاق ہو جائے تو میرا کتنا نام روشن کرے گا۔ گھر میں داخل ہوا تو اس کا غصہ ایک مرتبہ پھر اس کی خوشی پر حاوی ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ابونصر چراغ کی مدھم روشنی میں ایک کتاب پر جھکا ہوا ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ لکھتا بھی جاتا ہے۔

"اتنی رات ہو گئی تم ابھی تک سوئے نہیں۔"

"آپ سو جائیں۔ میں یہ کتاب ختم کر کے سو جاؤں گا۔"

"کتاب بند کرو اور سونے کے لیے لیٹ جاؤ۔"

"جی ابا جان۔" ابونصر نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اپنے بستر پر چلا گیا۔

اس کے باپ نے تاروں کی چھاؤں میں اسے اٹھا دیا۔ "میں جب تک یہاں ہوں تم میرے ساتھ تلوار بازی کی مشق کیا کرو گے۔ جلدی اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔"

اس نے اس وقت بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دونوں باپ بیٹے مکان کے اس حصے میں چلے گئے جو تلوار بازی اور تیر اندازی کے لیے مخصوص تھا۔

دونوں نے جنگی لباس پہنا تاکہ کوئی ایک دوسرے کو زخمی نہ کر دے۔ تلواریں ہاتھ میں لیں اور ایک مصنوعی مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

طرخان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا جب اس نے ابونصر کو کسی ماہر جنگجو کی طرح وار کرتے اور وار روکتے دیکھا۔ کئی مرتبہ تو طرخان کو یہ احساس ہونے لگا جیسے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔

"تم تو بہت کچھ سیکھ چکے ہو۔" طرخان نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

"ابوبشیر نے مجھے تمام گُر سکھا دیے ہیں۔"

"اب تم مکمل فوجی بن سکتے ہو۔"

"میں اس فن کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"میں نہیں چاہوں گا کہ تم کتابی کیڑے بن کر رہ جاؤ۔"

یہ بحث ایک مرتبہ پھر اچھی خاصی تلخی پر ختم ہوئی۔

وہ گھر آیا تو اس کی ماں ناشتا تیار کر چکی تھی۔ وہ نہایت سادہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ غذا بھی بطور دوا استعمال کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور باپ کو بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ باہر گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ وہ بچپن ہی میں ماہر گھڑ سوار بن گیا تھا۔ اس نے گھوڑا بھگایا اور ابو ابراہیم کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ اب وہ

اپنے استاد کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا استاد اسے بتا رہا تھا۔

"عقل محض اور یقینی علم ایک ہی چیز ہیں۔ وحدت ہی علم اور حکمت ہے جو کہ ہر طرح کی کثافت سے پاک اور یقینی ہے۔ یہ علم، حکمت اور عقل کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ یہ درجہ انتہائی پاکیزہ اور سادہ ترین ہے۔ یہ درجہ علم، عقل اور حکمت کا طاقتور ترین درجہ ہے۔ اس کو صرف نیک اور پاکیزہ ذہن کے ساتھ ہی سوچا جا سکتا ہے۔"

جب انسان اس کو پاکیزہ روح اور پاکیزہ ذہن کے ساتھ سوچتا ہے تو یہ اس کی حکمت، علم اور عقل کا دوسرا درجہ ہے۔ اس درجہ پر انسان حقیقت اولیٰ اور اپنی ذات کے متعلق سوچتا ہے۔ اس کی یہ سوچ پہلے اور دوسرے درجے کے درمیان ہوتی ہے۔

اس خالص سوچ سے وہ کثافتوں کو دور کر دیتا اور حقیقت ثانیہ کو حاصل کر لیتا ہے۔

جس قدر انسان علم کا حامل ہوگا اسی قدر وہ نیک، دیانت دار اور فعال ہوگا۔ یہاں سے اٹھ کر وہ ایک دوسرے استاد کی خدمت میں پہنچ گیا۔

وہ استاد اسے بتا رہا تھا۔

انسان کی فہم و فراست، ذہانت اور بصیرت ہی اسے حیوان سے اعلیٰ تر بناتی ہے۔ عقل و فکر کا عنصر ایک ایسی طاقت ہے جو دوسروں کو بہت سے فوائد دے سکتا ہے اور خود بھی عقل سلیمہ کا حامل شخص اپنے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔

وہ اسی طرح دوسرے کئی علماء کی صحبت میں بیٹھ کر شام کے وقت گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو وہ ایک انوکھی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس سے پہلے اس کی یہ حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے اپنے سوال کا خود ہی جواب مل گیا۔ اس کشمکش کا جواب میرا باپ ہے جو مجھے فوجی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے کانوں میں استاد کے کہے ہوئے الفاظ گونجے۔ "جس قدر انسان علم کا حامل ہوگا اسی قدر وہ نیک دیانت دار اور فعال ہوگا۔"

مجھے دو پیشوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مجھے کسی حال میں فوجی نہیں بننا۔ مجھے فاراب میں موجود علماء سے بڑا عالم بننا ہے۔ ارسطو اور افلاطون کے نظریات بھی میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن مجھے انہیں سمجھنا ہے۔ تو کیا مجھے فاراب سے باہر جانا ہوگا؟ اگر جانا پڑا تو جاؤں گا لیکن میں ماں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ حصول علم کے لیے بھی نہیں؟ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا ابھی تو گھر چلوں۔

اس کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور وہ اتنا ہی سوچ سکتا تھا۔

سوچنے والا یہ لڑکا ابونصر فارابی تھا جسے دنیائے اسلام کا مشہور فلسفی بننا تھا اور ابونصر فارابی کے نام سے تاریخ محفوظ ہونی تھی۔

☆......☆

ابونصر فارابی 872ء بمطابق 259ھ میں ترکستان کے ایک صوبے "فاراب" کے ایک قصبے "واسج" میں پیدا ہوا اس کے والد ترکستان کے ایک چھوٹے سے قلعے کی فوج کے کمان دار تھے۔ روسی ترکستان میں "طرخان" عموماً اس معزز شخص کو کہا جاتا تھا جس کو حکومت کی طرف سے طرہ والی پگڑی کسی منصب کے لیے عطا کی گئی ہو۔

فاراب موجودہ ملک قازقستان میں واقع ہے۔ ابونصر فارابی ایرانی النسل تھا۔ اس کے آباؤ اجداد خراسان سے ہجرت کر کے ترکستان چلے گئے تھے۔ وہیں فاراب کے ایک قصبے "وسیج" میں پیدا ہوا۔ فاراب کی مناسبت سے اسے الفارابی کہا جانے لگا۔

اسے اپنے آبائی پیشہ سپاہ گری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ علوم و فنون کی طرف مائل تھا۔ اس نے تمام علوم پر نوجوانی میں ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس نے پچاس سے زیادہ زبانیں سیکھی تھیں۔ وہ غیر معمولی ذہن کا مالک تھا۔

جب الفارابی پیدا ہوا اس وقت وسطی ایشیا میں عربی زبان کی عمر دو سال ہو چکی تھی۔ فاراب کے باشندے عربی زبان اچھی طرح سمجھتے اور بولتے تھے۔ ترک بادشاہ عربی زبان کو اپنا چکے تھے۔ الفارابی کو بھی عربی زبان میں وہی قدرت حاصل تھی جو کسی اہل زبان کو ہوتی ہے۔ اس نے زندگی بھر فارسی یا ترکی کی زبان میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ جو کچھ لکھا وہ عربی زبان میں لکھا۔

اس نے اپنی طویل عمر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو کثیر التصانیف ثابت کیا۔ بعض مفکرین نے اس کی تصانیف کی تعداد تین سو تک بتائی ہے۔

وہ بہت سے علوم پر دسترس رکھتا تھا۔ خاص طور پر فلسفہ، منطق، طب، عمرانیات، ریاضی، طبیعات، الٰہیات، اخلاقیات، سیاسیات، سائنس، نفسیات اور موسیقی پر اس کی تصانیف سند کا درجہ رکھتی تھیں لیکن اب اس کی چند کتابیں اور

ان کے کچھ حصے بھی دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ سکے ہیں جن کے اصل مخطوطے ایران، استنبول، بیروت، جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔

وہ شاعر بھی تھا۔ اس کے اشعار کا مجموعہ عربی میں ہے۔ علامہ ابن خلکان نے اس کے کچھ شعروں کا سلیس عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کی اردو شکل یہ ہے۔

اے وہ ذات جو تمام اشیاء کی علت ہے
اور جس سے چشمہ فیض جاری ہے
اے تہ در تہ آسمانوں اور ان کے درمیان
جو زمین و سمندر ہیں ان کے مالک
میں تجھے تیری پناہ طلب کرنے والے
کی حیثیت سے پکارتا ہوں
تو مجھ گنہگار کی خطائیں معاف کر دے
اپنے فیض و رحمت سے میری طبیعت
کا غم دور کر دے

طرخان اس کی تعلیم کا مخالف نہیں تھا۔ اسے اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم دلوائی گئی تھی۔ اس کے ذہن رسا نے جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی انتہا تک پہنچا بھی دیا تھا لیکن طرخان اسے معلم یا مدرس نہیں بلکہ فوجی بنانا چاہتا تھا۔ اسی بحث و تمحیص میں تین سال مزید گزر گئے۔ اب وہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے کئی نظریات کو تحریری شکل دے کر محفوظ بھی کر لیا تھا۔ وہ شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت کے دستور کے مطابق فاراب سے نکلے اور دور دراز کے علاقوں کا سفر کرے اور مروجہ علوم کی بنیادی تعلیم بہترین اساتذہ سے حاصل کرے لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کی ماں بھی اسے آنکھوں سے دور نہیں ہونے دے گی۔ اب وہ اٹھارہ کا ہو چکا تھا۔ طرخان کا اصرار بڑھنے لگا تھا کہ قدرت نے اس کی مدد کی۔ اس کی ماں کسی بیماری کا شکار ہو گئی۔ وسائل کی کمی نہیں تھی۔ بہترین طبیب اس کے علاج کے لیے مقرر ہو گئے۔ ابونصر نے بھی قدرت گزاری میں کوئی کسر نہ رکھی۔ رات رات بھر جاگ کر ماں کی تیمارداری کرتا رہا لیکن اس کی ماں اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ تمام علوم حاصل کرنے کے باوجود اس نے طب کی تعلیم حاصل نہیں کی اگر اس نے طب کی تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ اپنی ماں کو بچا سکتا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ طب کی تعلیم ضرور حاصل کرے گا تاکہ انسانیت کی خدمت کر سکے۔

وہ کچھ دن بعد اس صدمے سے نکلا تو اسے اپنا مشن پورا کرنے کا خیال آیا۔ سوال یہ تھا کہ فاراب سے نکل کر کہاں جائے۔ اسے بخارا کی یاد آئی۔ اس وقت بخارا علوم و فنون کا مرکز تھا اور پوری دنیا سے علوم کے شائق بخارا کا رخ کیا کرتے تھے۔ اس وقت بخارا میں تین سو سے زیادہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس تھے۔ بخارا دولت مند بخارا بنا ہوا تھا۔ اہلِ حرفہ و حکمت دور دور سے کھنچے چلے آ رہے تھے۔ وہ بھی کسی ایسے قافلے کی تلاش میں مشغول ہو گیا جو اسے بخارا تک پہنچا دے۔ اس کی خوش قسمتی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ دو دن بعد بلخ سے بخارا جانے والا ایک قافلہ یہاں سے گزرے گا اگر وہ چاہے تو اس قافلے کے ساتھ بخارا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ طرخان اس وقت گھر پر نہیں تھا اور اگلے ایک ہفتے تک اس کے آنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ ابونصر نے ضروری تیاری کی۔ روانگی کی رات اس نے کتابوں کی ایک گٹھڑی اٹھائی اور قافلے کے سربراہ سے ملاقات کی اور قافلے میں شامل ہو گیا۔ اس نے بخارا جانے کی وجہ نوکری کی تلاش بتایا۔

وہ خبر اور بے خبری کے عالم میں قافلے کے ساتھ سفر کرتا ہوا بخارا تک پہنچ گیا۔

یہ رات کا وقت تھا۔ شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ قافلے والوں نے اسے شہر سے باہر چھوڑا اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو چار تاجر پیشہ اشخاص اور بھی قافلے سے جدا ہوئے تھے۔ وہ بھی اس کی طرح پریشان تھے کہ اب کہاں جائیں۔ پہرے داروں کی بہت خوشامد کی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے کتابوں کی گٹھڑی سرہانے رکھی اور کھلے میدان میں لیٹ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگوں نے بھی یہی کیا۔

رات رہ ہی کتنی گئی تھی۔ ابھی سورج نے جھانکا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اس نے کتابوں کی گٹھڑی اٹھائی اور شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پورا شہر صبح ہونے سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ دکانیں کھل گئی تھیں۔ خریداروں کے ہجوم بھی تھے۔ یا اللہ! کیا یہ لوگ سوتے نہیں ہیں، اگر سوئے تھے تو اتنی جلد جاگ کیسے گئے۔ اسے ان بازاروں سے کیا لینا تھا فی الحال تو کسی سرائے کو تلاش کرنا تھا جہاں وہ تھکن اتار سکے اور پھر کسی درسگاہ کی تلاش میں نکلے۔ اسے تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک شخص قریب آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس شخص

نے اس کے حلیے اور گھبراہٹ سے پہچان لیا تھا کہ وہ اجنبی بھی ہے اور مسافر بھی۔ اسے یقیناً کسی سرائے کی تلاش ہو گی۔

”آپ کہیں تو میں یہ سامان اٹھا لوں۔“ اس شخص نے اس کی گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ زحمت نہ کریں۔ اتنا وزن تو میں خود اٹھا سکتا ہوں۔“

”کیا آپ کو کسی سستے ٹھکانے کی تلاش نہیں؟“

”بالکل ہے۔“

”تو پھر آئیے میرے ساتھ۔ یہ گٹھڑی مجھے دیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا ضرور لیکن یہ گٹھڑی تمہیں نہیں دے سکتا۔“

”کیا اس میں بہت قیمتی سامان ہے؟“

”ہاں بہت قیمتی، اتنا قیمتی کہ اگر اس کے عوض بخارا بھی مجھے دو تب بھی نہ خرید سکو۔“

اس شخص نے یقیناً اسے کوئی خبطی نوجوان سمجھا ہو گا اس لیے اس نے اپنے کندھے اچکائے اور اسے ساتھ لے کر چلنے لگا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔“

”کیا تم واقعی کچھ نہیں سمجھے۔“

”نہیں۔“

”میں تمہیں ایک سرائے میں لے جا رہا ہوں۔ پسند آئے تو ٹھہر جانا نہیں تو آگے بڑھ جانا، کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔“

ابونصر سمجھ گیا کہ وہ شخص کون ہے لہٰذا خاموش ہو گیا۔ اب دونوں طرف خاموشی تھی۔ اس شخص نے پھر کچھ جاننا چاہا۔

”یہ تو بتاؤ تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو۔ تاجر ہو، روزگار کی تلاش میں آئے ہو یا یونہی گھومنے پھرنے چلے آئے ہو۔“

”بھائی میں طالب علم ہوں۔ طلب علم کی کشتی مجھے بخارا لے آئی ہے۔“ ابونصر نے اس خیال سے سچ بات بتا دی کہ شاید یہ شخص کسی درس گاہ کا پتا بتا دے۔

”اگر تم طالب علم ہو تو سمجھو تمہارا کام بن گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”سرائے کا مالک طالب علموں کی بہت قدر کرتا ہے۔ جب وہ سنے گا کہ تم طالب علم ہو تو وہ تم سے کرایہ بھی نہیں لے گا اور رات کو جلانے کے لیے تیل بھی دے گا تاکہ تمہیں دیر گئے تک پڑھنے میں آسانی ہو اور ہاں مجھے الگ سے انعام دے گا کہ میں اس کی سرائے میں ایک طالب علم کو لے کر آیا۔“

ابونصر حیران تھا کہ یہ کیسا علم پرور شہر ہے۔ جب ایک سرائے کا مالک اتنا مہربان ہے تو باقی لوگ بھی علم پرور ہوں گے۔

”یہاں تو سینکڑوں طالب علم آتے ہوں گے۔ تمہارا مالک کس کس کو ٹھہراتا ہو گا۔“

”بیشتر طالب علم تو مساجد میں ٹھہرتے ہیں۔ ایسے اساتذہ بھی ہیں جو بڑے بڑے محلات میں رہتے ہیں۔ من پسند اور قابل طالب علموں کو اپنے محلات میں جگہ دے دیتے ہیں اگر تم اپنا اعتبار قائم کر سکے تو تمہیں بھی کسی محل میں جگہ مل سکتی ہے۔“

شاید ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں لیکن سرائے کا دروازہ آ گیا۔ اس شخص نے ابونصر کو سرائے کے مالک کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

”قاضی صاحب! میں ایک طالب علم کو لے کر آیا ہوں۔“

”کہاں سے آ رہے ہو؟“ قاضی صاحب نے پوچھا۔

”میں ترکستان کے ضلع فاراب سے یہاں پہنچا ہوں۔“

”یہاں تمہاری کسی سے جان پہچان ہے؟“

”میں اس شہر کے لیے بالکل اجنبی ہوں۔“

”اس سرائے کو قیام گاہ سمجھو اور جب تک جی چاہے رہو۔“

قاضی نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ وہ اسے لے کر ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں دو طالب علم پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ ابونصر نے اپنی کتابیں ایک طرف رکھ دیں اور ان دو طالب علموں سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ طالب علم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے سامنے مستقبل کا عظیم ترین مفکر بیٹھا ہے۔

وہ ایک قصبے سے یہاں آیا تھا۔ اس شہر کی رونق کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کسی نمائش گاہ سے کم نہیں تھا۔ اسے قدم قدم پر مساجد و مدارس نظر آئے۔

اب اسے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ تکمیل علوم کے لیے اسے کس مدرسے اور کس استاد کے پاس جانا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مدارس کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں جس کا جی چاہے درس میں شریک ہوسکتا ہے۔ استاد لیکچر دیتا ہے اور طلبہ اسے لکھتے جاتے ہیں پھر جو طلبہ باصلاحیت ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے نئے نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔ استاد سے اتفاق کرتے ہیں یا اختلاف۔ بیشتر درس مسجدوں کے کھلے صحنوں میں ہوتے ہیں۔ ان دروس میں شرکت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

رہنے کا مفت ٹھکانا مل گیا تھا اب اسے کسی درس میں شامل ہونا تھا۔

وہ ایک مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ عصر کی اذان ہوگئی۔ وہ نماز کے لیے مسجد کے اندر چلا گیا۔ نماز سے فارغ ہوکر وہ صحن میں آیا تو اس نے کچھ لوگوں کو حلقہ بنائے بیٹھے دیکھا۔ معلوم ہوا شہر کے مشہور استاد ہیں جو یہاں درس دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع بڑھنے لگا اور صحن بھر گیا۔ درس شروع ہوا تو معلوم ہوا علم منطق پڑھایا جارہا ہے۔ وہ غور سے سنتا رہا۔ ایک جگہ اسے احساس ہوا کہ ایک نکتہ مولوی صاحب صحیح طرح سمجھا نہیں سکے ہیں۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا کہ درمیان میں ٹوکنا بے ادبی ہوتا لیکن جب درس ختم ہوا تو وہ استاد کے پاس پہنچ گیا اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کی اور اپنی دانست میں سمجھا بھی دیا کہ آپ نے کیا بتایا اور کیا ہونا چاہیے تھا۔ استاد حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''تم استاد ہو یا طالب علم؟''

''میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ فاراب سے یہاں حصول علم کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

''تم نے علم منطق کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟''

''میں نے اس موضوع پر کئی کتب پڑھی ہیں۔''

''میں تمہارے ذہن رسا کی داد دیتا ہوں۔ جب تم کتابوں سے اتنا کچھ سیکھ سکتے ہو تو کسی اچھے استاد کی صحبت تمہیں اس علم کی انتہا تک پہنچا سکتی ہے۔''

''اسی لیے تو آپ کے درس میں شریک ہوا ہوں۔''

''یہ تمہاری منزل نہیں۔ میں تمہیں اپنے استاد کے پاس بھیج رہا ہوں۔ وہ علم کا سمندر ہیں۔ ان کا ثانی دور دور تک نہیں۔ وہ تمہیں صیقل کردیں گے۔''

وہ دیے ہوئے پتے پر جا کر اس نئے استاد سے ملا اور منطق کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ یہ نیا استاد بھی اس کی ذہانت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسا دقیق مضمون وہ نہایت تیزی سے مکمل کررہا تھا۔ اس نئے استاد کی معرفت اسے فلسفے کے نکات سمجھنے کے لیے ایک اور استاد کے سپرد کردیا گیا۔ اس طرح وہ مختلف علوم کی تعلیم کے لیے مختلف اساتذہ کے پاس جاتا رہا۔ ایک استاد تو اس پر اتنا مہربان ہوا کہ اسے سرائے سے بلا کر اپنے شاندار محل میں جگہ دے دی۔ اس کے توسط سے اس کی رسائی شاہی کتب خانے تک ہوگئی۔

اس کتب خانے کے بلند اور عظیم دروازے میں قدم رکھتے ہی اس علمی خزانے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

وہ سونے کے چند گھنٹوں کو چھوڑ کر دن رات مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ یہاں اسے ایسی کتابیں ملیں جن کا نام بھی کبھی اس نے نہیں سنا تھا۔

وہ کسی حریص طالب علم کی طرح ان کتابوں میں مستغرق تھا اور یہ سوچ کر خوش بھی تھا کہ عام طالب علموں کو ان کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگ سکی ہوگی۔

ان کتابوں کی وجہ سے اس کا مطالعہ کسی ایک علم تک محدود نہ رہ سکا۔ جتنے علوم پر مبنی کتابیں یہاں موجود تھیں اس نے سب پڑھ لیں۔

کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوئے اس نوجوان کا قلم حرکت میں آیا۔ اس نے منطق اور فلسفے کو موضوع بنا کر ایک کتاب لکھنی شروع کردی۔ وہ اس کتاب میں مشغول تھا۔ کتب خانے میں کتابوں کے درمیان رات کو دیر تک بیٹھا رہتا۔ مختلف کتابوں سے استفادہ کرتا رہتا۔ اس کا قلم چلتا رہتا اور کتب خانے کے ملازمین نیند سے اونگھتے رہتے کہ کب وہ قلم رکھے اور کب ہمیں آرام کا موقع ملے۔

اس نے کتنی ہی راتیں اس کتب خانے میں گزار کر کئی کتب اور تراجم تصنیف و تالیف کرلیں۔

وہ کتابیں اتنی مشکل تھیں کہ جن کا سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اس نے اتنا عام فہم ترجمہ کیا جو عام آدمی کی سمجھ میں بھی بہ آسانی آسکتا تھا۔

اس کے یہ تراجم آنے والے وقت میں علمی دنیا میں تہلکہ مچانے والے تھے۔

بخارا میں نہ مدارس کی کمی تھی نہ اساتذہ کی۔ اس نے ان سب سے کسب فیض کیا۔ فلسفے میں نئی راہیں نکالیں۔ موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ طب اور سائنس کی مبادیات سے واقف ہوا۔

اس نے ان تمام علوم کی تکمیل اس شان سے کی تھی کہ پورے بخارا میں اس کا نام احترام سے لیا جانے لگا۔ بعض لوگ تو اسے ارسطو ثانی کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔ کوئی اسے صاحب المنطق کہتا تھا۔

بخارا میں رہتے ہوئے اس نے بے شمار علوم حاصل کر لیے تھے لیکن اس کی تشنگی تھی کہ بجھنے والی نہیں تھی۔ وہ جب بخارا کے مدارس کو اچھی طرح نچوڑ چکا تو اس نے بغداد کا رخ کیا۔

وہ بڑی اُمیدوں سے بغداد آیا تھا لیکن اسے چند ہی روز میں اندازہ ہوگیا کہ وہ یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکے گا۔ کئی روز کی جدوجہد کے بعد بھی اسے رہنے کا ٹھکانا میسر نہ آسکا۔ یہاں کوئی اس کے نام تک سے واقف نہیں تھا۔ مقام و مرتبہ کا تعین تو بڑی بات۔ وہ گھبرا کر دمشق آگیا۔ یہاں بھی مسئلہ وہی تھا جو بغداد میں پیش آیا تھا۔ کہاں قیام کرے اور پیٹ میں ایندھن کہاں سے ڈالے۔ لکھنے کا سامان اور کتابوں کی گٹھڑی اس کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسی عالم میں نانبائی کی دکان پر پہنچ گیا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک باغ کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا جارہا تھا۔ باغ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت للچا گئی۔ اس کی شاعرانہ طبیعت نے تقاضا کیا کہ وہ اس باغ کے اندر جائے اور اس کے نظارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ اتفاقات اس کا پیچھا کررہے تھے۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی خوش آمدید کہا۔ ''آؤ میرے دوست کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابونصر۔'' اس نے الفارابی جان بوجھ کر نہیں بتایا کہ کہیں پہچان نہ لیا جائے۔

''بہت اچھا نام ہے۔ آؤ میں تمہاری کوٹھری تمہیں دکھا دوں جہاں تمہیں دن کے وقت سونا ہوگا۔ تم اپنی یہ گٹھڑی بھی وہیں رکھ دینا۔ پھر مزید باتیں ہوں گی۔''

ابونصر حیران ہورہا تھا کہ اس کی اتنی آؤ بھگت کیوں ہورہی ہے۔ یہ شخص اسے کیا سمجھ رہا ہے۔ یہ راز بھی جلد ظاہر ہوگیا۔

''بھائی ابونصر، اچھا ہوا تم آگئے ورنہ مجھے تو کبھی چھٹی نہ ملتی۔''

''میرے آجانے سے تمہاری چھٹی کا کیا تعلق بھائی۔''

''مالک نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟''

''کون مالک؟ میری تو کسی سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ مجھے کسی نے کچھ بتایا۔''

''کیوں مذاق کرتے ہو۔ جب تمہیں کسی نے بھیجا نہیں تو تم یہاں آئے کیسے۔''

''میں اس شہر میں آج ہی آیا ہوں۔'' ابونصر نے کہا۔ ''گھومتے گھومتے اس باغ میں آیا اور سوچا اس باغ کو اندر سے دیکھ لوں۔ آیا ہی تھا کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔ تم نے یہ سمجھ لیا کہ مجھے کسی نے بھیجا ہے۔''

''کہیں تو ٹھہرے ہوئے ہوگے۔''

''میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔''

''اور نوکری؟''

''میں نے کہا نا کہ اس شہر میں آج ہی آیا ہوں۔''

''بس تو پھر سمجھو تمہارا کام بن گیا۔ نوکری کرو گے؟''

''بالکل کروں گا۔''

''میں یہ چوکیداری چھوڑ رہا ہوں۔ تم میری جگہ چوکیداری کرلو۔''

''تمہارا مالک مجھے رکھ لے گا۔ وہ تو مجھے جانتا تک نہیں ہوگا۔''

''میں اس سے کہوں گا تم میرے رشتے دار ہو۔ میری ضمانت پر وہ تمہیں رکھ لے گا۔''

''تم میری ضمانت کیسے لے سکتے ہو۔''

''تم مجھے اچھے اور سچے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں۔''

''تمہارا مالک کب آئے گا۔''

''جب بھی آئے گا۔ اب تمہیں کیا فکر ہے تم میرے ساتھ رہو۔''

وہ اس کی کوٹھری میں پاؤں پھیلانے کے لیے لیٹ گیا۔

باغ کا مالک اس دن تو نہیں آیا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح آدھمکا۔ چوکیدار نے اسے آتے ہی بتا دیا کہ اس نے اپنی جگہ اپنے ایک رشتے دار کو رکھ لیا ہے۔ ابونصر کو مالک کے سامنے پیش کیا گیا۔ باغ کا مالک اس کی گفتگو سن کر بہت متاثر ہوا۔

''تم عربی تو بہت اچھی بولتے ہو۔ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔''

''ایسی قسمت کہاں۔ بس اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ زبان صاف ہوگئی ہے۔''

''تم مجھے اچھے آدمی لگتے ہو۔ تم پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔''

اسے اس باغ میں چوکیدار رکھ لیا گیا۔

وہ رئیس کے باغ کے خوش نما اور خوش آواز طیور کی چہچہاہٹ میں مگن رہتا اور اپنے فلسفی ذہن سے خوب صورت نکات سوچتا، باغ کے خوش رنگ اور خوشبو دار پھولوں کی مہک اس کے ذہن کو معطر رکھتی اور وہ پُرشور دنیا سے دور اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ تنخواہ اتنی کم تھی کہ مشکل ہی سے گزارہ ہوتا تھا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے تو یہ خوشی تھی کہ یہاں اسے مکمل تنہائی مل رہی تھی اور وہ پوری یکسوئی سے مطالعہ و تصنیف میں مشغول تھا۔

اس نے اس باغ میں رہتے ہوئے کئی کتابیں تصنیف کیں لیکن اس نے کسی پر یہ عیاں نہ ہونے دیا کہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ اتنا پڑھا لکھا کہ کتابیں تصنیف کرسکتا ہے۔

اسے یہاں بظاہر کوئی تکلیف نہیں تھی لیکن اس کا علمی سفر رک گیا تھا۔ یہاں کوئی قابل ذکر استاد نہیں تھا جس سے وہ کچھ سیکھ سکتا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بغداد جانے کا ارادہ کرلیا۔ اسے معلوم تھا کہ باغ کا مالک اسے اتنی آسانی سے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔

وہ ایک دن چپکے سے وہاں سے نکلا اور دوبارہ بغداد آگیا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ بغداد میں اسے ایک بہترین قابل اور مخلص استاد کی رفاقت مل گئی۔ یہ ابوبشیر متی بن یونس تھا۔ ابوبشیر یونانی فلسفے کے مترجم اور شارح کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس نے یونانی فلاسفر خاص طور پر افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے عربی زبان میں تراجم کیے تھے اور ان پر سیر حاصل شرحیں بھی لکھی تھیں۔

الفارابی ایک عرصہ تک ابوبشیر کے حلقہ درس میں شامل رہا اور اس سے نحو، فلسفہ، منطق، ریاضی اور کئی سائنسی علوم حاصل کیے۔ یہاں اس نے ارسطو کی تمام کتابیں پڑھیں اور ان کو سمجھا۔

اس کے بعد وہ ایک اور استاد ابوبکر بن السراج کی خدمت میں پہنچا۔ اس سے اس نے علم فلکیات اور علم نجوم کی تعلیم حاصل کی۔

ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ استاد، شاگرد بن گیا۔ ابونصر کی علم منطق میں رسائی دیکھتے ہوئے اس نے درخواست کی کہ وہ اسے منطق پڑھایا کرے۔

اب اس کی شہرت اتنی ہوگئی تھی کہ اساتذہ وقت خود اس سے ملاقات کے متمنی رہتے تھے۔ وہ خود بھی ایسا حریص علم تھا کہ اساتذۂ فن کی تلاش میں رہتا تھا۔ انہی دنوں اس کی ملاقات یوحنا بن حیلان سے ہوئی۔ یوحنا بن حیلان فلسفہ اور حکمت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کے حلقہ درس میں بغداد کے بڑے بڑے روؤسا کے بیٹے شامل ہوتے تھے۔

یوحنا بن حیلان بغداد میں وہ پہلا شخص تھا جس نے ارسطو اور افلاطون کی کتابوں کے عربی میں تراجم کیے اور فلسفے کی تعلیم عام کردی۔

بغداد میں الفارابی کو بہترین اساتذہ، رفقا اور تلامذہ میسر تھے۔ وہ ارسطو اور افلاطون کی کتابوں پر جامع اور مفصل شرحیں لکھ رہا تھا اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی پر بہترین کتابیں تصنیف کررہا تھا۔ اس کے حلقہ دروس میں امراء اور شرفاء کے بیٹے شامل ہوتے تھے۔ یہ دور اس کی مالی آسودگی کا دور تھا۔ وہ افلاطون کی کتابوں پر جامع اور مفصل شرحیں لکھ رہا تھا اور منطق، فلسفہ، ریاضی اور موسیقی پر بہترین کتابیں تصنیف کررہا تھا۔ وہ بہترین ترکی لباس پہن کر بغداد کے باغوں کی سیر کیا کرتا تھا۔ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ اب اس کا علم و فضل کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر وقت مطالعہ و تحریر میں صرف کرتا۔

ایک دن وہ کسی باغ میں چہل قدمی کررہا تھا۔ اس کے دو شاگرد دائیں بائیں چل رہے تھے کہ اچانک ایک شخص باغ میں داخل ہوا۔ اس کی صورت بتا رہی تھی کہ وہ بغداد کا رہنے والا نہیں۔ اس کا لباس بھی اجنبی تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا تھا، آپ میں سے ابونصر الفارابی کون ہے۔ تعارف ہونے کے بعد اس نے ایک خط ابونصر کے حوالے کیا۔

''آپ کو ''رے'' شہر کے حکمران الصاحب بن عباد نے بصد التجا اپنے دربار میں طلب کیا ہے۔ زادِ راہ کے لیے رقم بھی روانہ کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ حکمران کے اشتیاق کو شرف ملاقات بخشیں گے۔''

الفارابی نے رقم لینے سے انکار کردیا۔

''الصاحب بن عباد سے میری جانب سے معذرت کرنا۔ ان سے عرض کرنا کہ میری مصروفیات ابھی مجھے بغداد سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتیں اگر کسی وقت ضرورت پیش آئی تو آپ کے دروازے پر ضرور دستک دوں گا۔ فی الحال معذرت۔''

اس کے شاگردوں نے اصرار بھی کیا کہ وہ اس سنہری

موقع کو ضائع نہ کرے لیکن وہ بغداد چھوڑنے پر تیار نہ ہوا اور قاصد کو مایوس لوٹا دیا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ حالات اچانک اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ سلگتی ہوئی آگ شعلہ بن گئی۔ بغداد فتنوں اور ہنگاموں کا مرکز بن گیا۔ یہ سب سیاسی اور مذہبی جھگڑوں کا نتیجہ تھا۔ ایک حادثہ ختم نہ ہوتا تھا کہ دوسرا رونما ہو جاتا تھا۔ یہ جھگڑے سیاسی بھی تھے اور مذہبی بھی۔

اس پُرآشوب دور میں بھی ابونصر الفارابی کا قلم جھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ رات گزر جاتی تھی اور اس کے گھر میں جلنے والے چراغ کی لو تھرتھرانے کا نام نہیں لیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اپنا کام مکمل کرکے دنیا سے رخصت ہونے کی تیاری کررہا ہو۔ اسلامی فلسفہ جس منزل تک پہنچ چکا تھا اسے وہ مزید آگے لے جانے کا خواہاں ہو۔ اس کے پس منظر میں اسلامی فلسفے کی شاندار تاریخ تھی۔ کیسے کیسے نام اس کی آنکھوں کے سامنے آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔

☆......☆

ظہور اسلام کو ابھی نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ دین اسلام کی برکات مشرق اوسط اور شمالی افریقا تک پہنچ گئیں اور اندلس سے لے کر وادی سندھ تک مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔

یہ تسلط ختم ہونے کے بعد بھی یعنی پندرہویں صدی تک مسلمانوں کے نکل جانے کے بعد بھی ہر وہ ملک جہاں اسلام پہنچا تھا اسلامی رنگ میں رنگ گیا۔ بہت سے ملک تو عربی قالب میں مکمل ڈھل گئے۔

مسلمانوں کے ہاتھوں عمل میں آنے والے اس سریع پھیلاؤ اور وسیع علاقے کی تسخیر کو ایک عرصہ درکار تھا جس کی بنا پر محروسہ مملکت کے باشندوں کو اسلامی طرز کی سوسائٹی کے اسلوب میں ڈھالا جاسکتا۔ اس وقت ایسے امور سے نمٹنا پڑ رہا تھا جن سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ حیات میں مسلمان عربوں کی جمعیت کو کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ ان میں انتظامی ضوابط اور حکومتی قواعد کی جستجو بھی تھی جو ایک شدید ضرورت تھی۔ اس کی بھی ضرورت پیش آرہی تھی کہ قرآنی احکام اور سنت رسول کو نئے حالات پر منطبق کیا جائے۔ خلفائے راشدین اور ان کے بعد دوسرے خلفائے اسلام نے فوری توجہ کے طالب مسائل کو حل کرنے میں اپنی کاوشوں کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ قرأت، تفسیر اور روایات سے علوم کو سہارا دیا۔ عربی زبان کے مطالعے کے لیے قواعد وضع کیے۔ یہ ضرورت اس لیے ضروری تھی کہ قرآن و حدیث کی زبان عربی تھی اور جس سے غیر عرب نومسلم ناواقف تھے۔

ان مسائل نے امویوں کو یوں الجھائے رکھا کہ وہ اس وسیع میراث کی جانب متوجہ ہی نہ ہوسکے جو مقدر نے مسلمانوں کی دسترس میں رکھ دی تھی۔ اس عہد میں یونانی اور سریانی زبان سے شاذ و نادر ہی کوئی کتاب عربی میں منتقل ہوئی ہو البتہ دینی علوم اور احادیث کو خوب استحکام نصیب ہوا۔

کوفہ اور بصرے میں نحوی مکاتب کے وجود میں آنے اور شاعروں کے ظہور پذیر ہونے کی بدولت عربی زبان نے خوب ترقی کی۔

وقت انتظار کررہا تھا کہ مسلمان قبل از اسلام کے اس خزانے کی جانب متوجہ ہوں جو حصار اسلام کی حدود میں جمع کردیا گیا تھا۔

ظہور اسلام سے قبل سکندریہ کے بہت سے اساتذہ کی تحریریں شامی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ وہاں سے انطاکیہ پہنچیں اور وہاں سے مزید مشرق کی سمت، سکندریہ اس دور میں یونانی، یہودی، بابلی اور مصری تمدنوں کا مقام اتصال تھا۔ کلیساؤں کی تفریق نے عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لیے جدا مدرسے اور تعلیمی ادارے استوار کریں اور اپنی زبان یعنی سریانی کو ترقی دینا پڑی تاکہ وہ سکندریائی کی سیادت سے آزاد ہوسکیں جن سے وہ علیحدہ ہوچکے تھے۔ ایرانی بادشاہوں نے جو قدرتاً بازنطینیوں کے مخالف تھے ان لوگوں کی طرف داری کی اس لیے کہ یہ ان کے دشمنوں کے مخالف تھے۔ اس حوصلہ افزائی کے باعث نسطوری سلطنت ایران کی حدود کے اندر دور تک سرائیت کرگئی۔ یہ طاقت اتنی بڑھی کہ وسطی ایشیا میں کلیسا بھی استوار ہوگئے۔ جہاں کہیں بھی یہ کلیسا پھیلے یونانی فلسفے کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ایرانی بادشاہوں نے بازنطینی علمی مراکز کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مکتب قائم کیا جہاں ہندی، مسیحی اور یہودی اہل فلسفہ و علوم تعلیم و تعلم کے لیے لاکر رکھے گئے۔ اسی مرکز میں ہندی و یونانی طب بھی گھل مل گئے۔ یہیں ہندی نجوم نے بھی ترقی کی۔ یونانی و بابلی کے علاوہ ہندی اور ایرانی علوم بھی محفوظ ہوگئے۔ ایران میں اسلامی سلطنت کے قیام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

جب ایک بار مسلمانوں نے علوم قبل از اسلام کی طرف ہاتھ بڑھائے تو ایسے افراد تلاش کیے جو ان مصادر کو عربی میں منتقل کر سکتے تھے۔ ان مراکز میں جو اسلامی دنیا کے اندر واقع تھے ایسے اصحاب دانش موجود تھے جن کی اکثریت عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل تھی۔ بعض ایرانی بھی تھے جو بلند پایہ عالم تھے اور جو یونانی، سریانی، پہلوی اور سنسکرت کے علاوہ عربی زبان بھی جانتے تھے لہٰذا وہ بہ سہولت تراجم کر سکتے تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب بغداد کے اندر جو خلافت کا صدر مقام تھا ماہر مترجمین بہ آسانی مل گئے۔ کتاب کسی بھی زبان میں ہو عربی میں ترجمہ ہو سکتی تھی۔

ابھی دو صدیاں گزری تھیں کہ فلسفیانہ اور سائنسی کتابوں کا ایک عظیم مجموعہ تصانیف یونانی، سریانی، پہلوی اور سنسکرت سے عربی میں منتقل ہو گیا۔

خلفائے اسلام نے ان تراجم کے لیے بڑے بڑے ادارے تعمیر کرائے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ غیر مسلموں خصوصاً یہودی مذہب کے علماء سے میل ملاپ شروع ہو چکا تھا۔ ان پر اسلامی عقائد کی حقانیت ثابت کرنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ قرآن و حدیث کے دلائل ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اور وہ اسلامی عقائد پر حملہ آور ہوتے وقت منطق اور فلسفیانہ دلیلوں سے کام لیتے تھے جن سے مسلمان ناواقف تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دین اسلام کو بھی ویسے ہی عقلی ہتھیاروں سے مسلح کیا جائے لہٰذا خلفاء خصوصاً مامون الرشید نے فلسفہ و علوم کی کتب کو عربی میں ترجمہ کرانے پر بہت زور دیا۔

یونانیوں، ایرانیوں اور ہندیوں کے علوم کے بہت سے حصے اور فلسفے کے دستیاب ہو جانے سے مسلمانوں نے ایسے رنگا رنگ علمی تناظر تخلیق کیے جو اسلام کے افق پر چھاتے چلے گئے۔

اموی حکومت کے بعد جب عباسی حکومت قائم ہوئی تو یہ حکمران خاندان کی تبدیلی نہ تھی بلکہ ایک ثقافتی انقلاب بھی تھا۔ ابوجعفر منصور کے عہد حکومت میں باقاعدہ علوم و فنون کا آغاز ہوا اور تصنیف و تالیف ہونے لگی۔ حدیث، فقہ اور تفسیر مرتب ہوئی اس کے علاوہ لغت، تاریخ اور عام لوگوں کے لیے کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ابوجعفر منصور نے قیصر روم کو ریاضی کی کتابیں ترجمہ کروا کے بھیجنے کے لیے لکھا تو اس نے اصول اقلیدس اور طبیعات کی کچھ کتابیں بھیجیں جنہیں مسلمانوں نے پڑھا اور ان کے مضمون سے واقفیت ہوئی اور اس طرح مسلمانوں میں فلسفہ و منطق کی کتابیں حاصل کرنے کے لیے شوق بڑھا۔ ابوجعفر خود بھی فلسفہ اور علم و نجوم میں کمال رکھتا تھا لہٰذا علماء کی سرپرستی اس سے بعید نہیں چنانچہ منطق میں سب سے پہلا شخص جو تصنیف و تالیف کے لیے مشہور ہوا وہ عبداللہ بن مقفع تھا جو مشہور ایرانی خطیب اور ابوجعفر منصور کا کاتب تھا۔

خلیفہ منصور نے سائنس اور فلسفہ کے علاوہ دیگر فنون کی کتابوں کو دربار میں جمع کیا اور ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کی۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دور اقتدار میں علوم و فنون کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ اس نے اہم عہدوں پر اطبا اور علماء کو تعینات کیا۔ اس نے بلاتخصیص مذہب قابل اور ذہین لوگوں کو دربار میں جگہ دی۔ اسی نے نسطوری مترجمین کی سرپرستی کی جنہوں نے یونانی اور سریانی زبان سے عربی میں منطق، فلسفہ، طب اور دیگر علوم کی کتب کے ترجمے کیے۔

ہارون الرشید اور رومیوں کے درمیان ایک جنگ کے دوران انقرہ اور عموریہ سے بہت سی یونانی کتابیں ہاتھ لگیں۔ اس نے ان کتابوں کا ترجمہ کرا کے شاہی لائبریری میں رکھوایا جہاں تک اس کے درباری علماء کی رسائی تھی۔

اس علم پرور خلیفہ کی بدولت بغداد فلسفے اور منطق کا مرکز بن گیا۔

مامون الرشید کے عہد میں تو یہ علمی سفر نہایت بلندیوں تک پہنچ گیا۔ اس نے علم کی تلاش و جستجو میں خوب توجہ دی۔ اس نے روم کے بادشاہوں سے خط و کتابت کی اور انہیں بیش قیمت تحفے بھیجے اور ان کے بدلے میں فلسفہ و سائنس کی کتابیں منگوائیں۔ روم کے بادشاہوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیوس جیسے فلسفہ کی کتابیں المامون کو بھیجیں۔ مامون نے ان کتابوں کے تراجم کے لیے ماہر علماء کو منتخب کیا۔ اس طرح اس کے زمانے میں سائنس اور فلسفہ ہر کہیں مشہور و مقبول ہو گیا۔ ایسے لوگوں کو امیر و گورنر مقرر کیا جنہوں نے اپنے علاقوں میں علماء کی سرپرستی کی اور فلسفہ و منطق پر کتابیں تصنیف کرائیں۔

ان خلفاء کی کوششوں سے بغداد اپنے زمانے کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا۔

☆......☆

خلفاء کی کوششوں، علماء کی کاوشوں اور طلبہ کے شوق نے بے شمار اہل کمال پیدا کیے اور بغداد اہل کمال کا مرکز بن گیا۔ ان برکتوں سے فیض یاب ہو کر جب الفارابی سامنے آیا اور اس کے کمال کا چرچا ہوا اور اس فلسفہ و منطق کو عروج پر پہنچا دیا تو ارسطو کا جانشین کہلائے گا۔ علمائے وقت نے اس کے کمال کی گواہیاں فراہم کیں۔

”ابونصر الفارابی مسلمان فلسفیوں میں پہلا فلسفی تھا جس کے پائے کا دوسرا فلسفی نہیں تھا۔“

”وہ مسلمان فلسفیوں میں حقیقی فلسفی تھے۔“

”منطق اور بالعد الطبعی مسائل جن کی تمہید الکندی وغیرہ نے اٹھائی تھی اس کو ابونصر الفارابی نے نقطۂ کمال تک پہنچایا۔

”الفارابی علم منطق و فلسفہ میں تمام مسلمانوں سے بڑھ گیا تھا اور اس نے سب سے زیادہ ان مسائل میں داد تحقیق دی۔ اس نے اس علم کے فرائض کو شرح کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے اسرار و رموز کو لکھ کر اس کی تعلیم کو آسان بنا دیا۔ اس نے علم منطق کے بارے میں ان تمام چیزوں کو جمع کر دیا جن سے علم منطق اور فلسفہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔“

”الفارابی کو ارسطو کا ایک بہت بڑا شارح اور مقلد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ارسطو کی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ یہ شرحیں اس کے بعد آنے والے اہل علم کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ اس نے ایسی کتابیں بھی تصنیف کیں جو فلسفے کو اسلامی فلسفہ بنانے میں معاون ہوئیں۔

اسے اسلامی فلسفہ سیاست کا بانی سمجھنا چاہیے۔ اس مسئلے پر اس نے اکثر افلاطون کے نظریات کا اتباع کیا جسے وہ امام فلسفہ قرار دیتا تھا۔ اس نے اپنی کئی کتابوں میں اس فلسفہ سیاست کو قلم بند کیا۔

”اس کو خصوصی شہرت موسیقی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ موسیقی کا نظری علم ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا تو اگر بھی تھا۔ اس موضوع پر وہ ایک ایسی تصنیف چھوڑ گیا جو قرون وسطیٰ کی موسیقی کے باب میں اہم ترین ہے یعنی ”کتاب موسیقی الکبیر“۔

الفارابی کی اختراع کردہ دھنیں مشرق میں ہر جگہ پھیل گئیں خاص طور پر صوفیہ میں خوب مقبول ہوئیں۔

تصوف کے ساتھ اس کا یہ ربط محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ وہ صوفیانہ طرز زندگی اور صوفیانہ روح کا مالک تھا۔ وہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی کو نفرت سے دیکھتا تھا۔ وہ اکثر وسطی ایشیا کا لباس، پوستین کی ایک بڑی ٹوپی سمیت زیب تن کیا کرتا تھا۔ اگر دربار میں ہوتا تو جب بھی لباس کے بارے میں رسوم و قواعد کی پروا نہ کرتا۔

”الفارابی کے فلسفے میں تمام رنگ موجود ہیں۔ وہ ایک بہت بڑا فلسفی بھی تھا، ایک بڑا متکلم بھی تھا اور عملی صوفی بھی۔ جس طرح فلسفے میں اس نے اپنی ایک خاص راہ نکالی تھی اسی طرح کلام میں اُس کا ایک اور جدا تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ الفارابی وہ شخص تھا جس نے فلسفے کے وسیلے سے دین کو سمجھا اور اس کی معرفت حاصل کی۔ وہ دین کو فلسفہ اور فلسفے کو دین سمجھتا تھا۔“

”الفارابی کا فلسفہ بالیدالطبیعات، افلاطون اور ارسطو کی، بعد الطبیعات سے ہی اخذ شدہ ہے لیکن اس نے اس فلسفے کو اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کیا۔ وہ اس کائنات کو 'احد' کہتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر اسی احد یا عقل محض سے ظہور میں آئے۔ دنیا کی تمام اشیاء اسی احد یا عقل محض کی پرچھائیاں ہیں۔

فلکیات کے حوالے سے الفارابی کے دو رسالے معروف ہیں۔ ان دونوں رسالوں میں اس نے کائنات اور اجرام فلکی اور ان اجرام فلکی کے درمیان پائی جانے والی قوت کو بیان کیا ہے۔

یہ بھی اس کے کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے کہ اس نے ستار، عود اور رباب ایجاد کیے جو آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔

وہ اپنی ایجادات اور نظریات کی تشکیل میں مشغول تھا۔ اسے بغداد میں رہتے ہوئے چالیس سال ہو گئے تھے کہ اچانک بغداد کے حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ مذہبی اور سیاسی قوتیں متصادم ہونے لگیں۔ یہ فتنہ انگیزیاں کچھ کم نہیں تھیں کہ ”قراطہ“ کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اپنے فرقے کی اعلانیہ دعوت شروع کر دی۔ اس فرقے نے اسلامی شریعت کو مذاق بنا کر رکھ دیا اور اپنی جماعت کو منظم کر کے حسار، قطیف اور بحرین پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے بصرئ اور کوفہ پر بھی حملے کیے۔ مکہ پر بھی حملہ کیا۔

مرکز خلافت بے بس اور کمزور تھا اس لیے پوری خلافت میں فتنے سر اٹھانے لگے۔

حضرت حسین بن منصور حلاج کو اسی دور میں گرفتار کر لیا گیا اور ایک طویل مقدمے کے بعد انہیں قتل کرا دیا گیا۔ یہ ایسا سانحہ تھا کہ بغداد ماتم کی سیاہ چادر میں چھپ گیا۔ بغداد میں ہنگامے شروع ہو گئے۔

خلیفہ مقتدر باللہ کے بعد خلیفہ راضی باللہ اور خلیفہ ملتقی باللہ مسند خلافت پر بیٹھے مگر کمزور ثابت ہوئے۔

بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

الفارابی نے اسی بغداد میں چالیس سال گزارے تھے۔ چھ خلفاء کا زمانہ دیکھا تھا۔ اپنے علم و فلسفہ کے حوالے سے شہرت حاصل کی لیکن اب اس پر یہ زمین تنگ ہوگئی۔

اسے یاد آیا کہ ''رے'' شہر کے حکمران الصاحب بن عباد نے اسے تحائف اور زادِ راہ بھیج کر اسے اپنے دربار میں طلب کیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تھا لیکن اب کی بات اور تھی۔ بغداد کی فتنہ انگیزیاں اس کی گوشہ گیر طبیعت کے منافی تھیں۔ وہ تو بحث و مباحث کے لیے بھی شہر کے ہنگاموں سے دور کسی ویرانے یا دریا کا کنارہ منتخب کرتا تھا لیکن اب کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ جان کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ وہ کوئی گمنام آدمی نہیں تھا کہ خاموش پڑا رہتا۔ وہ اتنا مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی بھی مسلمان دشمن تلوار اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کوئی ایسا سرپرست بھی نہیں تھا جو اس کی سانسوں کو بحال رکھ سکتا۔ بڑے بڑے تاجر اور معزز لوگ بغداد چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اسے بھی اس گھبراہٹ میں ''رے'' شہر یاد آیا۔ اس نے ایک رات بغداد کی گلیوں کو چھوڑا اور بے سر و سامانی کی حالت میں ایک قافلے کے ہمراہ ''رے'' پہنچ گیا۔

وہ جب الصاحب بن عباد کی مجلس میں پہنچا جو اس وقت ایک باغ میں بیٹھا تھا۔ وہ اس حال میں پہنچا کہ اس کی پگڑی اور عبا نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے۔ دور سے دیکھنے میں کوئی نیم پاگل یا دہقانی لگ رہا تھا۔ الصاحب اس وقت اپنے ندیموں اور مسخروں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ مسخرے اپنی حرکتوں سے الصاحب کو ہنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ جیسے ہی باغ میں داخل ہوا اور ایک مسخرے کی نظر اس پر پڑی تو اس نے آوازہ کسا۔

''اے بوڑھے پاگل! منہ تو تیرا گرد آلود ہے نظر ہی نہیں آرہا۔ کچھ ہے جو اٹھائے چلا آرہا ہے۔ کیا تیرے کپڑے گم ہو گئے ہیں جنہیں ڈھونڈتا ہوا تو یہاں چلا آیا ہے۔''

''کہیں گھاس میں منہ ڈال کر آیا ہے۔ داڑھی وہیں چھوڑ آیا، گھاس ساتھ لے آیا۔''

''اب چل جا ورنہ ہمارے گھوڑے تیرا منہ چبا لیں گے۔ ایسی گھاس انہیں کہاں ملی ہوگی۔''

الصاحب نے یہ آوازیں سنیں تو وہ اپنے ندیموں پر برس پڑا۔

''اب میری مجلس ایسی بے وقعت ہوگئی کہ اس جیسا بے حیثیت آدمی بھی داخلِ مجلس ہوگیا۔ اسے کس نے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔''

''حضور کوئی خبط الحواس ہے۔''

''فقیر معلوم ہوتا ہے۔''

''بہروپیا ہے۔''

الصاحب کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ طرح طرح سے اس کا مذاق اڑانے لگے۔ الفارابی سب کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک کونے میں اسے ایک بربط پڑا نظر آیا۔ اس نے وہ بربط اٹھایا۔ اس نے بربط کے تاروں کو اپنی انگلیوں سے چھیڑا۔ شرکائے مجلس اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بربط کے تاروں سے مدہوشی کا نغمہ پھوٹنے لگا۔ سننے والوں کا حال یہ ہوگیا جیسے وہ پتھر کے ہو گئے ہوں۔ پھر ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام شرکاء گہری نیند سو گئے۔

الفارابی نے قلم سے بربط پر لکھا۔ ''تمہارے پاس الفارابی آیا تھا۔ تم لوگوں نے اس کا استقبال مذاق اور تمسخر اڑا کر کیا لیکن الفارابی نے تمہیں اپنے بربط کی مدہوش موسیقی سے گہری نیند سلا دیا اور رخصت ہوگیا۔''

☆......☆

اس کے چلے جانے کے بعد الصاحب بن عباد اور اس کے مصاحب گہری نیند سے جاگے تو ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے اور پھر ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

''گھوڑے تو سب بندھے ہوئے ہیں ہم کیا بیچ کر سوئے تھے۔''

''یہ نشہ تھا یا نیند ہم سو کیسے گئے۔''

''ہم سو گئے تھے یا بے ہوش ہو گئے تھے۔''

''کچھ بھی تھا اب تو جاگ گئے۔''

''ارے وہ بوڑھا کہاں چلا گیا۔''

''اپنی اپنی جیبیں دیکھو۔ یقیناً کچھ چرا کر بھاگ گیا ہوگا۔''

ان میں سے ایک کی نظر بربط پر لکھی تحریر پر پڑی اور پوری بات سمجھ میں آ گئی۔

''جسے ہم پاگل سمجھ رہے تھے وہ مشہور فلسفی ابونصر

الفارابی تھا۔ اسی کے چھیڑے ہوئے مدہوشی کے نغمے کی وجہ سے ہم سو گئے تھے۔ کیسا با کمال ہے وہ۔''

''کیا کہا تم لوگوں نے۔ الفارابی تھا وہ۔ وہی الفارابی جسے ہم نے بڑی منتوں سے اپنے دربار میں بلایا تھا۔''

''ہاں ہاں شاید وہی تھا۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔''

''یہ دیکھیے اس بربط پر کیا لکھا ہے۔''

الصاحب نے تحریر پڑھی۔

''وہ یہاں آیا اور تم لوگوں نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جلدی جاؤ اور اسے تلاش کرو۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔''

اس کے مصاحبوں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ کسی کو نہیں ملا۔ ملتا بھی کہاں سے۔ وہ تو ایک قافلے کے ساتھ ''حران'' کی طرف جا رہا تھا۔

عراق کے شمالی حصے میں حران ایک قدیم شہر تھا۔ سکندر اعظم نے اسے یونانیوں کی ایک نوآبادی قرار دیا تھا جس کی وجہ سے یونان کے بہت سے لوگ اس میں آباد ہو گئے تھے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب رومی سلطنت کا سرکاری مذہب عیسائیت قرار پایا اور یورپ کے لوگ جوق در جوق عیسائی ہونے لگے تو جو یونانی اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے ان کی بڑی تعداد ترک وطن کر کے حران میں آباد ہوگئی۔ اسلامی دور کے آغاز میں عربوں اور ایرانیوں کی طرح حران کے یہ یونانی بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے مگر ان میں سے جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے انہوں نے صابی کا لقب اختیار کیا تاکہ ان کا شمار بھی اہلِ کتاب میں ہونے لگے کیونکہ یہود اور نصاریٰ کے ساتھ ساتھ صابیوں کا ذکر بھی قرآن پاک میں آیا ہے۔

صابیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مطالعہ افلاک کے بڑے شائق تھے اور اس لیے ستارہ پرست کہلاتے تھے۔ یہ خصوصیت کلدانیوں اور حرانیوں دونوں میں مشترک تھی۔

حران کو یونانی علوم بالخصوص فلسفہ، ریاضی اور ہیئت کے ایک علمی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے زمانے میں بھی قائم رہی جس کے باعث اسلامی دور میں بھی حران میں متعدد اہلِ دانش نے فروغ پایا اور حران ایک بڑا علمی مرکز بن گیا۔ ثابت بن قرہ حرانی، جابر حرانی اور محمد بن جابر بتانی جیسے دانشور پیدا ہوئے اور یہ سب کے سب کم و بیش الفارابی کے ہم عصر تھے۔

ثابت بن قرہ الفارابی سے کم و بیش بیس سال پہلے پیدا ہوا اور الفارابی کے دورِ شباب تک زندہ رہا۔ اس نے اپنی گزر اوقات کے لیے صرافی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا لیکن ریاضی اور ہیئت سے اسے بہت دلچسپی تھی اور فرصت کے لمحات میں وہ ان مضامین کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ بغداد کے عمائدین سلطنت میں سے ایک شخص محمد بن موسیٰ حران آیا تو اس کی ملاقات ثابت بن قرہ سے ہوئی وہ اس کی لیاقت علمی سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے اپنے ساتھ بغداد لے گیا۔

محمد بن موسیٰ علم و فضل میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ وہ ہیئت اور ریاضی میں بہت ماہر تھا۔ علاوہ ازیں وہ حکومت میں فوجی خدمات بھی انجام دیتا تھا۔ سائنس سے گہرا شغف رکھنے کے باعث وہ اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ علمی کاموں میں صرف کرتا تھا چنانچہ حبیش بن اسحاق سے اس نے متعدد یونانی کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا اور معاوضہ اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔

ثابت بن قرہ عربی زبانوں پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم میں بھی کامل دست گاہ رکھتا تھا۔ محمد بن موسیٰ نے اس کی قدر افزائی کرتے ہوئے مترجمین کے ایک بورڈ کا صدر بنا دیا۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے ارشمدش، اقلیدس، بطلیموس اور جالینوس کی متعدد کتابوں کے ترجمے کیے لیکن اس کی اصل شہرت ترجموں سے زیادہ اس کی سائنسی تحقیقات سے ہوئی۔

ریاضی میں اس نے جیومیٹری کی بعض اشکال سے متعلق ایسے مسائل دریافت کیے جو اس سے پہلے معلوم نہ تھے۔

حران کی طرف جاتے ہوئے اسے ایک اور ماہر ہیئت محمد بن جابر البتانی کا خیال آیا۔ یہ بھی اس کا ہم عصر ہی تھا۔ وہ 858ء میں حران میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے باپ سے حران میں پائی مگر جوان ہونے پر وہ رقہ میں جو دریائے فرات کے کنارے ایک شہر آباد ہو گیا۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی شہر میں گزرا۔ پچاس سال کی عمر میں وہ بغداد کے قریب سامرہ میں اٹھ آیا اور آخری عمر تک یہیں رہا اور یہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سال ہا سال کے مشاہدوں کے

بعد ہیئت کے نقشے نہایت صحت کے ساتھ مرتب کیے۔

ہیئت کے ان مشاہدات میں محمد بن جابر نے زاویوں کی جو پیمائشیں کیں وہ ہر طرح کامل اور صحیح تھیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ عملی ہیئت میں اس کی مہارت کس قدر بڑھی ہوئی تھی اور جو آلات اس کے استعمال میں آئے وہ کتنے اعلیٰ درجے کے تھے۔

اسی سفر کے دوران اس نے بغداد کی تاریخ پر بھی غور کیا۔

بغداد کی تعمیر عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد اور اس کے حکم پر ہوئی۔ یہ منصور کے عہد کا ایک اہم واقعہ ہے۔ عباسیوں نے چونکہ اہل عجم کی مدد سے امویوں کا تختہ الٹا تھا اس لیے وہ سیاسی مصالح کی بناء پر اپنا دارالخلافہ ایسے مقام میں رکھنا چاہتے تھے جو عجم میں ہو مگر عرب کی سرحد سے بھی بہت دور نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بغداد کا انتخاب کیا۔ یہ شہر یوں تو قدیم زمانے سے مشہور تھا چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس کی بناء ایران کے بادشاہ نوشیروان نے رکھی تھی اور اسے باغ داد یعنی عدل و انصاف کے باغ کا نام دیا تھا جو لب و لہجے کے اختلاف سے زبانوں پر بغداد مشہور ہوگیا لیکن یہ اس وقت ایک چھوٹا سا شہر تھا جس میں ایک عظیم اسلامی سلطنت کے دارالخلافہ کا بار اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔ اس وجہ سے خلیفہ منصور نے بغداد کے قدیم شہر سے ملحق ایک نیا شہر بنانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک ایرانی شخص نو بخت نے اس نئے شہر کا نقشہ بنایا جس پر عظیم بغداد کی تعمیر عمل میں آئی چونکہ آیندہ کئی صدیوں تک بغداد کو عروس البلاد کی حیثیت حاصل رہی اور مشرق و مغرب سے سیاح یہاں آتے رہے۔

منصور کے عہد کا ایک اور سائنس داں "ماشاء اللہ" تھا جس نے بغداد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ یہ شخص پہلے یہودی مذہب رکھتا تھا اور اس کا نام "شیا" تھا۔ وہ جب مشرف بہ اسلام ہوا تو اس کے پہلے نام شیا کی رعایت سے اس کا اسلامی نام ماشاءاللہ رکھا گیا۔ جب خلیفہ منصور نے بغداد کے نئے شہر کے لیے زمین کا سروے کرنے پر نو بخت کو مقرر کیا تھا تو ماشاءاللہ کو اس کے معاون کی حیثیت سے اس کے ساتھ تعینات کر دیا تھا۔

ان دونوں انجینئروں نے بغداد کے نئے شہر کا جو نقشہ بنایا وہ دائرہ نما تھا۔ اس کے وسط میں خلیفہ منصور کا محل تھا۔ جو قصر الخلد کے نام سے موسوم تھا۔ یہ محل اپنی خوب صورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے اس زمانے کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتا تھا۔ قصر الخلد کے گرد حکومت کے دفاتر کی عمارتیں تھیں۔ ان عمارتوں سے کچھ فاصلے پر اراکین سلطنت اور امراء کے محلات تھے اور ان کے گرد عام آدمی کے مکانات، بازار اور باغات تھے۔ پورے شہر کے گرد تقریباً ایک سو فٹ چوڑی فصیل تھی جو پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں آمد و رفت کے لیے چار بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ پھاٹک کے اوپر اونچے اونچے برج بنے ہوئے تھے۔

شہر کی آبادی میں ہر قبیلے اور ہر طبقے کے الگ الگ محلے اور مختلف چیزوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بازار تھے۔ تمام بازار، سڑکیں اور گلیاں اپنے اپنے ناموں سے مشہور تھیں اور دجلہ سے بہت سی نہریں کاٹ کاٹ کر شہر میں لائی گئی تھیں۔

جب آبادی بڑھی تو اصل شہر سے ملحقہ دو اضافی قصبے تعمیر کیے گئے جن میں سے ایک کا نام "کرخ" اور دوسرے کا نام "رصافہ" تھا۔

شہر کے مغرب میں فوج کے لیے بالکل الگ آبادی تھی۔

ایک مرتبہ خلیفہ منصور سخت بیمار پڑا اور جب بغداد کے اطباء اس کا علاج کرنے میں ناکام رہے تو جندے شاہ پور سے جرجیس نامی طبیب کو طلب کیا گیا۔

جندے شاہ پور کا محل وقوع ایران کے جنوب مغربی صوبے خوزستان کے قریب تھا۔ اس شہر کو ساسانی بادشاہ شاہ پور اوّل نے بسایا تھا۔

جرجیس کے علاج سے خلیفہ نے شفا پائی۔ خلیفہ منصور نے اسے اپنا شاہی طبیب بنا لیا۔ وہ چار سال تک بارگاہ خلافت میں رہا اور عباسی خلیفہ کی داد و دہش سے فیض یاب ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ رخصت لے کر جندے شاہ پور چلا گیا۔

منصور ہی کے زمانے میں اسلامی علوم و فنون کی اس تحریک کا آغاز ہوا جس نے اس کے نامور پوتے ہارون الرشید کے عہد میں وسعت پائی۔ منصور اپنی انتظامی خوبیوں کے علاوہ سائنس کا بھی سرپرست تھا۔ اس زمانے میں سائنس کی مشہور شاخیں ریاضی، ہیئت، کیمیا، طب اور حیاتیات تھیں جن میں سے ریاضی، ہیئت اور طب کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لیے پورے اسلامی دور میں جن سائنس دانوں نے علم کے دربار میں نام پایا ان کی اکثریت ریاضی، ہیئت اور طب ہی سے منسلک تھی۔

منصور کے عہد کا ایک علمی واقعہ اس کے دربار میں ایک ہندو عالم اور ہیئت دان یانک کی آمد ہے جس کا نام عرب مؤرخ منکہ لکھتے ہیں۔ یہ شخص سندھ کے راجا کا سفیر بن کر دربار خلافت میں آیا تھا اور کئی سال تک یہیں رہا۔ دیگر بہت سے تحائف کے ساتھ وہ اپنے ملک سے ایک سنسکرت کی کتاب بھی لایا تھا جس کا نام سدھانت تھا۔ یہ ریاضی اور ہیئت کی ایک معیاری تصنیف تھی۔ خلیفہ منصور نے اس کتاب کا عربی ترجمہ کروانے کی خواہش ظاہر کی اور اس کام پر محمد بن ابراہیم فرازی کو مامور کیا۔ اس نے منکہ کی مدد سے پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کا ترجمہ "سند ہند الکبیر" کے نام سے مکمل کیا۔

منصور کے بعد جب ہارون الرشید تخت پر بیٹھا تو اس نے ابراہیم فرازی کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔

یعقوب بن طارق کے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے اور ایران ہی میں اس کی ولادت ہوئی۔ اس نے ریاضی اور ہیئت کی اعلیٰ تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی پھر وہ بغداد آیا اور منصور کے ہیئت دانوں کی صف میں شامل ہو گیا یہاں اس نے اپنے علم و فضل کے باعث بہت جلد اپنے لیے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔

علمی ترقی کا وہ دور جو ہارون رشید کے زمانہ سلطنت میں شروع ہوا اس کے نامور فرزند اور جانشین مامون الرشید کے عہد میں اپنے کمال کو پہنچ گیا۔

مامون الرشید نہ صرف اہلِ علم کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ ریاضی اور علم ہیئت کا خود بھی عالم تھا۔ اس کا سب سے عظیم کارنامہ "بیت الحکمت" کا قیام تھا۔ یہ ایک قسم کی علمی اکیڈمی تھی جس کے تین شعبے تھے۔ ایک ترجمے کا شعبہ تھا۔ دوسرا شعبہ تصنیف و تالیف کا تھا اور تیسرا شعبہ، شعبہ عملی تھا جس کے ماتحت فلکیات کے عملی مشاہدے کیے جاتے تھے اور اس مقصد کے لیے ایک شاندار رصد گاہ قائم کی گئی تھی۔ دارالحکمت کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ تھا۔

بیت الحکمت میں جو فضلا غیر ملکی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور تھے۔ ان میں سب سے مشہور مترجم حنین بن اسحاق تھا۔ وہ اگرچہ بیت الحکمت میں سب سے آخر میں داخل ہوا مگر اپنے علم و فضل کی بدولت دوسرے مترجموں سے سبقت لے گیا۔ اس نے یونانی عالموں کی بہت سی معیاری کتب کو عربی کے قالب میں ڈھالا۔

اس نے نوّے سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کیے جس سے علمائے اہلِ بغداد نے فائدے حاصل کیے۔ ابو نصر فارابی بھی اس سے فائدے اٹھانے والوں میں شامل ہے۔

عہد عباسیہ کا ایک نامور سائنسداں یعقوب کندی تھا جو بصرے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اگرچہ طبقہ امراء میں تھا اور حکومت میں اعلیٰ مراتب پر فائز رہا لیکن یعقوب کندی نے کوئی سیاسی منصب پسند نہیں کیا بلکہ وہ صرف عالم کی حیثیت سے دربار خلافت سے منسلک رہا۔

یعقوب کندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا اس لیے اس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ریاضی، طبیعات، فلسفہ، ہیئت، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اس نے اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھیں۔

ابو نصر فارابی نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا اور اس کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا البتہ اسے اس کی شاگردی کا اعزاز حاصل نہ ہوا۔

ابو نصر فارابی اب حران کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اسے محمد بن ذکریا رازی کا خیال آیا کہ وہ بھی اس شہر میں پیدا ہوا تھا جس شہر کو الفارابی چھوڑ کر آرہا تھا۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ جس وقت الفارابی نے رے چھوڑا رازی وہاں موجود تھا اور فارابی اس سے مل نہ سکا۔

یہی سوچتا ہوا وہ حران میں داخل ہوگیا۔ حران اس وقت بھی علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں اس نے مختلف

جامع مسجد دلی کے قریب ایک قہوہ خانے میں کچھ شاعر بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے ایک شعر سنایا جس میں ان دونوں استادوں کے نام نظم ہوئے تھے۔ شعراء میں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سن کر کہنے لگے۔ "اس شعر میں بیخود اور سائل کے الفاظ صرف نامعلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں دونوں کے نام بھی نظم ہوتے اور اس کے باوجود تخلص نام معلوم نہ ہوتے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" کسی شاعر نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ اس طرح ممکن ہے۔" اور اتنا کہہ کر حیدر دہلوی نے چند لمحوں کے تامل کے بعد یہ شعر موزوں کر دیا

پڑا ہوں بے کدے کے در پہ اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے!

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

اساتذہ سے فلسفہ و منطق کے بعض اسباق پڑھے۔

اس کے اساتذہ پر تاریخ نے پردے ڈال دیے۔

اس کی مضطرب طبیعت نے اسے حران میں زیادہ دن نہیں رہنے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جائے۔ وہ کسی ایسے سرپرست کی تلاش میں تھا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے نظریات کو قرطاس و قلم کے سپرد کر سکے۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ اگر وہ اسی طرح شہر در شہر گھومتا رہا تو اس کے خیالات ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھیں بند ہوں وہ اپنا علمی کام آنے والی نسلوں کے سپرد کر دے۔ اس نے اس مرتبہ شام کا رخ کیا۔

اس وقت شمالی مغربی عراق کا حکمران سیف الدولہ تھا۔ اس کا پایۂ تخت ''حلب'' تھا۔ سیف الدولہ علوم و فنون سے محبت کرتا تھا اور وہ بہت سے علماء کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں فضلا کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ ابونصر کو دولت کا لالچ نہیں تھا۔ عملاً ایک صوفی تھا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ اسے سکون سے زندگی گزارنے کا موقع مل جائے۔ روزمرہ کے اخراجات پورے ہوں اور وہ دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو جائے۔ وہ اسی آرزو کا کشکول لیے شام پہنچ گیا۔

ایک دن ایک عجیب وضع کا شخص ترکی لباس پہنے سیف الدولہ کے دربار میں داخل ہوا اور بادشاہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ترکی لباس تھا لیکن چہرے پر عجیب سی روشنی تھی۔ سیف الدولہ اس شخص کو دیکھ کر مرعوب سا ہو گیا۔

''آپ کھڑے کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیں۔'' سیف الدولہ نے کہا۔

''کہاں بیٹھ جاؤں؟'' اجنبی نے پوچھا۔ ''اپنی حیثیت کے مطابق یا تمہاری حیثیت کے مطابق بیٹھوں۔''

''آپ اپنی حیثیت کا تعین کر کے بیٹھ جائیں۔''

وہ شخص آگے بڑھا اور سیف الدولہ کے تخت تک جا پہنچا اور سیف الدولہ کو اس کے کندھے سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانا چاہا تاکہ اسے ہٹا کر خود بیٹھے۔ ظاہر ہے یہ ایسی حرکت تھی جسے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ سیف الدولہ کو بھی ناگوار گزرا۔ اس نے اس شخص کا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنے ایک غلام سے کسی نامانوس زبان میں کہا۔ ''اس بوڑھے نے میری بے ادبی کی ہے۔''

''اگر حکم ہو تو ابھی اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دوں؟''

''نہیں ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے چند سوالات کروں گا اگر یہ درست جواب نہ دے سکا تو پھر میں اس کے گنوار پن کی اسے سزا دوں گا۔''

وہ شخص اس نامانوس زبان کو فوراً سمجھ گیا اور بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

''اے بادشاہ صبر کر! مجھے سزا دینے میں جلدی نہ کر جب کہ تو مجھے جانتا تک نہیں۔''

''کیا تم اس زبان کو جانتے ہو جس زبان میں، میں نے بات کی ہے؟'' سیف الدولہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں ستر سے زیادہ زبانیں جانتا ہوں۔''

''اس کے باوجود میرے دربار کے فضلا تجھ سے سوالات ضرور کریں گے تاکہ تیرے مقام کا تعین ہو۔''

''میں حاضر ہوں۔''

سیف الدولہ نے اشارہ کیا اور دوبارہ حکماء اور فضلا نے اس سے بہت سے علمی سوالات کیے۔ ہر سوال ایک الگ علم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ہر سوال کا مدلل جواب دے کر ثابت کیا کہ وہ بہت سے علوم پر حاوی ہے۔

''آپ بہت سے علوم کے عالم ہو۔'' سیف الدولہ نے کہا۔ ''اب اپنا تعارف کرائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آ رہے ہیں۔''

''میرا نام ابونصر الفارابی ہے۔''

''آپ کا نام میرے لیے اجنبی نہیں۔''

''میری صورت بہت سوں کو دھوکا دیتی ہے۔''

''اب فرمائیے کیسے آنا ہوا۔''

''میں نے سنا ہے آپ علم والوں کی قدر کرتے ہیں اس لیے میں بغداد سے ہجرت کر کے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ میں بے سروسامان ہوں۔ مجھے کسی قسم کی دولت درکار نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو عام کر دوں۔''

''میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ بغداد کی رونق میرے دربار میں آ گئی ہے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ سفر سے آ رہے ہیں کچھ تناول فرما لیں اس کے بعد باتیں ہوں گی۔''

''مجھے کچھ کھانے کی حاجت نہیں البتہ اگر آپ مجھے

اچھی سی موسیقی سنوا دیں تو میری تھکاوٹ دور ہو جائے۔''

سیف الدولہ نے اپنے دربار کے بہترین مغنیوں کا طائفہ طلب کیا۔ وہ تادیر گاتے بجاتے رہے لیکن الفارابی ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔

الفارابی نے اپنی جیب سے لکڑی کا عجیب و غریب ساز نکالا اور بجانا شروع کیا۔ اس نے اس ساز پر ایسا نغمہ چھیڑا کہ سیف الدولہ اور اس کے درباری مسحور ہو کر رہ گئے۔

جب وہ خوب اچھی طرح اپنا جادو جگا چکا تو اس نے اس ساز کی لکڑیوں کو ادل بدل کیا اور اس ساز سے طربیہ موسیقی چھیڑ دی۔ اس طربیہ موسیقی کی لے ایسی تھی کہ مجلس کا ہر فرد ہنسنے لگا۔ ہر شخص اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا لیکن ناکام رہا۔ یہاں تک کہ سب کے سب ہنستے ہنستے زمین پر لوٹنے لگے۔

الفارابی کو ان پر رحم آ گیا مگر یہ کیا۔ اس نے اس ساز کی لکڑیوں کو پھر ایک مرتبہ ایک اور ترتیب سے جوڑا اور بجانا شروع کیا۔ اب اس ساز سے ایک ایسا المیہ نغمہ نکلنے لگا کہ مجلس کے تمام لوگ زار و قطار رونے لگے۔ اس کے بعد اس نے اس ساز کو ایک ایسی ترتیب سے جوڑا اور بجانا شروع کیا کہ مجلس کے تمام لوگوں پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نوبت یہ آئی کہ سیف الدولہ نے آگے بڑھ کر الفارابی کو روک دیا۔

''اے عظیم فلسفی ہم نے سنا تو تھا کہ تو نے موسیقی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے لیکن آج دیکھ بھی لیا۔''

''میرے آقا، میں نے تو یہ نکتہ افلاطون کی تعلیمات سے لیا تھا کہ موسیقی روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہے اس لیے روح کی غذا ہے۔ میں نے بھی موسیقی کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنایا لیکن اس میں جدت یہ پیدا کی کہ اس کے سُر اور تال کو ریاضی کے خطوط پر ترتیب دیا۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مجھے فرصت دیں تو علم موسیقی پر ایک ایسی کتاب چھوڑ جاؤں جو رہتی دنیا تک قائم رہے۔''

''تمہیں اس کا پورا موقع دیا جائے گا مگر میں تمہارے علم سے ایک اور فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''میرے دربار میں عہدۂ قضا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

''مجھے انکار نہیں لیکن مجھے تصنیف و تالیف کے لیے فرصت درکار ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ عہدہ قضا کی ذمہ داریاں مجھ سے میری فرصت نہ چھین لے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ آپ پر مقدمات کا بار زیادہ نہ پڑے۔''

''میری ایک شرط اور ہے۔''

''بیان کیجیے۔''

''میں تنخواہ کے نام پر آپ سے چار درہم روزانہ لوں گا۔''

''یہ تو میری غیرت کے منافی ہو گا کہ میں اپنے کسی قاضی کو اتنی کم تنخواہ پر ملازم رکھوں۔''

''میں آپ کی عنایت سے کسی داد و دہش کا حق دار بننا نہیں چاہتا۔ عیش پسندی ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے اور میں ابھی مفلوج ہونا نہیں چاہتا۔ یہ چار درہم میرے روزمرہ کے لیے بہت ہوں گے۔''

''میرے دیے گئے تحائف کو قبول فرمائیں گے؟''

''صرف وہ تحفے جو ایک فقیر دوسرے فقیر کو دیتا ہے۔''

سیف الدولہ مسکرا کر چپ ہو گیا اور الفارابی عہدۂ قضا پر متمکن ہو گیا۔

اس کا دور قضا بھی خوب تھا سائلین کے آنے کے لیے نہ کوئی وقت مقرر تھا نہ داخلے پر پابندی۔ دروازے پر کوئی حاجب بھی مقرر نہیں تھا۔ سائل کسی بھی درجے اور مرتبے کا ہو ہر وقت اس کے پاس آ سکتا تھا۔ وہیں اس کی کتابیں کھلی پڑی رہتی تھیں۔ کبھی مطالعے میں معروف رہتا کبھی کچھ لکھنے بیٹھ جاتا۔ کوئی سائل آتا تو کتابیں ایک طرف رکھ کر اس کی بات سننے لگتا۔

عوام پر اس کی درویشی کا حال ظاہر ہوا تو ایسے لوگ بھی آنے لگے جو محض اس کی باتیں سننے آتے تھے۔ اس کے پاس لوگوں کی بھیڑ جمع رہنے لگی۔

سیف الدولہ بھی اس سے ایسا مانوس ہوا کہ ایک پل کے لیے آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے پاس طلب کرتا۔ کچھ وقت گزارتا اور رخصت کر دیتا۔ سلطنت کے کاموں سے فراغت کے بعد جب اسے فرصت ملتی اور اپنے ندیموں کے پاس بیٹھتا تو الفارابی کو بھی بلا لیتا۔ یہ محفلیں رات گئے تک جاری رہتیں اور فارابی کو مجبوراً سیف الدولہ کا ساتھ دینا پڑتا۔

وہ اس صورتِ حال سے تنگ آ چکا تھا لیکن واپسی کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا۔ بغداد اب بھی شورشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شمالی مشرقی عراق کے دیگر شہر بھی مذہبی اور سیاسی

شورشوں کے گڑھ بنے ہوئے تھے۔ شمالی مغربی عراق ہی وہ صوبہ تھا جہاں امن قائم تھا اور حلب تو مسکراتے ہوئے پھول کی طرح تروتازہ تھا۔ فارابی یہاں مصروف ضرور تھا لیکن پُرسکون تھا۔ بغداد کی شورشوں کو دبانا اس کے اختیار میں نہیں تھا لیکن حلب کی مصروفیات کو تو وہ رفع کر سکتا تھا۔ اس نے ایک روز سیف الدولہ کے مزاج کو اپنے حق میں دیکھتے ہوئے اس کے سامنے عہدۂ قضا کو چھوڑنے کا فیصلہ ظاہر کر دیا۔

سیف الدولہ کو تو اس کی ہم نشینی درکار تھی۔ اس نے فارابی کو قضا کا عہدہ اس لیے دیا تھا کہ وہ اس عہدے کے لیے دربار میں رکا رہے گا۔ اس وقت بھی اس نے فارابی سے یہی سوال کیا تھا کہ وہ حلب سے باہر جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن جب فارابی نے بہ اصرار کہا کہ وہ کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ اس عہدے کے باوجود بھی اس کے دربار سے وابستہ رہے گا تو سیف الدولہ نے یہ عہدہ اس سے واپس لے لیا۔

وہ اس رات سونے کے لیے بستر پر گیا تو بہت پُرسکون تھا۔ اسے وہ بہت سے کام یاد آرہے تھے جو ادھورے رہ گئے تھے جنہیں اب مکمل کرنا تھا۔ اسے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے نظریات کو ضابطہ تحریر میں لانا چاہتا تھا۔ اب اُسے اپنی فطری گوشہ نشینی پر عمل کرنا تھا۔ اپنے نظریۂ تعلیم، نظریۂ علم، نظریۂ سیاست، نظریۂ اشتراکیت وغیرہ کو وضاحت سے بیان کرنا تھا۔ علم موسیقی پر کتاب تحریر کرنی تھی۔ فلسفہ و منطق کو عام فہم بنانا تھا۔

وہ صبح سو کر اٹھا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر لکھنے بیٹھ گیا۔ اپنے نظریۂ تعلیم کو بیان کرنا شروع کیا۔

"تعلیم حاصل کرنا بھی ایک روحانی عمل ہے۔ علم اور فلسفہ کا فائدہ روحانی اور مادی طور پر خوشی حاصل کر کے اپنی ذات اور اس دنیا کے افراد کو خوشی سے مامور کرنا ہے۔ ہم اپنی تعلیم کو فلسفے کے ذریعے ہی مکمل کر سکتے ہیں۔ جب تک کوئی فرد فلسفے اور منطق میں درک حاصل نہیں کرتا اس وقت تک وہ مابعد الطبیعات اور الٰہیات جو کہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے کو نہیں سمجھ سکتا۔

اس کائنات کو سمجھنے کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے اور قرآن میں سے ہی سائنس کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انسان اگر کائنات کو اور اس کے فطری اصولوں کو جان لے تو اس علم سے وہ اپنی زندگی کے مقاصد کو جان کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہی علم اس کو یہ مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے گا کیونکہ اس طریق سے انسان بلاواسطہ طور پر عقل محض یا جوہر کائنات جو کہ عقل و علم کا منبع ہے سے منسلک ہو سکتا ہے۔ یہی طریقہ عقل محض یا اعلیٰ ترین عقل تک پہنچنے کا ہے۔

فلسفہ مذہب کی تشریح کر کے اس کی سچائی کے ثبوت فراہم کرتا ہے اس لیے فلسفہ اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔

تعلیم معاشرے کے افراد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے ابتدائی عمر میں ہی انسان کو اپنی روح سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دینی چاہیے تاکہ وہ معاشرے کا ایک فعال فرد بن سکے۔

اخلاقی خوبیاں بہت بڑی نعمت ہے۔ تعلیم انہی خوبیوں کو پیدا کرتی ہے۔ یہی وہ شے ہے جو معاشرے کے افراد کے رویوں کو مثبت بناتی ہے۔

تعلیم کا ایک مقصد معاشرے کے لیے سیاسی لیڈر شپ تخلیق کرنا ہے کیونکہ جہالت معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ تعلیم سے نابلد لوگ صرف زندہ رہنے کے لیے سوچتے ہیں۔ تعلیم ان تمام عناصر کا مجموعہ ہے جو فرد ہی تمام اچھی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ریاست کے ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ہونے چاہئیں۔ عام لوگ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں جب کہ سنجیدہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔"

تعلیم کی وضاحت کے بعد اسے یہ بھی بتانا تھا کہ خود علم کیا ہے۔ یہی وہ خیالات تھے جو نظریہ علم کہلائے۔ اس نے فلسفے کو اسلامی فلسفہ بناتے ہوئے وہ اصطلاحیں تبدیل کر دیں جو افلاطون اور ارسطو نے استعمال کی تھیں۔ اس کا کہنا تھا میرے نظریہ علم کو سمجھنے کے لیے عالم مثال اور مادی کائنات کو سمجھنا ضروری ہے۔

مادے اور روح پر بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مادی دنیا سے نجات پانے کا نام علم ہے۔ جب وہ مادی دنیا سے نجات پا لیتا ہے اور عقل محض کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو وہ عالم ہے جو افراد معاشرے میں اپنے علم کے اعلیٰ درجوں پر ہوں اور وہ کائناتی ذہانت سے منسلک ہوں اور خوبیوں اور نیکیوں کا اظہار اپنے علم سے کرتے ہوں تو ایسے لوگ ہی فلسفی کہلائیں گے۔"

اس کا سیاسی نظریہ بھی بے حد مقبول ہوا۔ وہ اپنے ارد گرد جو سیاسی ماحول دیکھ رہا تھا اس نے اسے مجبور کیا کہ وہ سیاست کے مقاصد کو بیان کرے۔

اس نے اپنے اس نظریے کو بھی اسلامی تہذیب کے حوالے سے بیان کیا۔ افلاطون اور ارسطو سے مدد ضرور لی لیکن اسے اسلامی تصور کا لباس پہنایا۔

"انسان کے علم کا مقصد خدا کے بارے میں اور اس کی صفات کے بارے میں علم حاصل کرنا ہے۔ یہ علم انسانی اخلاقیات اور کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی علم و فہم سے معاشرے کے افراد میں اتحاد پیدا ہوتا ہے اور پورا معاشرہ پورے شہر اور پورے ملک سے اتحاد کی قوت میں منسلک ہو جاتا ہے۔ افراد کی یہی ذہانت بصیرت، علم اور مذہبی روایات سیاسی حکومت کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

اس کا کہنا تھا "کسی حکمران کا کسی ملک پر حکومت کرنے کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کے افراد خود اپنے لیے حکمران کا انتخاب کریں۔ حکومت کے استحکام کے لیے تمام افراد ایک فرد کو تمام اختیارات دے کر حکمران بنا دیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان میں عقل فعال موجود ہو ورنہ فطری طور پر انسان اور حیوان میں کچھ فرق نہیں۔ انسان کی فہم و فراست، ذہانت اور بصیرت ہی اسے حیوان سے اعلیٰ تر بناتی ہے۔ انسان مدنی الطبع نہیں بلکہ انسان کا مدنی الطبع ہونا اس کی مجبوری ہے۔ انسان اکیلے طور پر رہنے کا عادی نہیں جب انسانی معاشرے میں رہتا ہے تو وہ بہت سے افراد سے مدد لیتا ہے۔

معاشرے میں جب کوئی خاص انسان دوسروں کی مدد کا محتاج نہیں رہتا تو وہ دوسروں کو اپنے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی دوسروں کی مدد کرتا ہے جب تک کہ وہ دوسروں کی مدد کے لیے مجبور نہ ہو جائے۔ ایسے انسان معاشرے کے لیے زیادہ سودمند نہیں ہوتے۔"

اس کا کہنا تھا کہ تمام دنیا کے باشندے ایک بڑے اجتماع کے مانند ہیں۔ اس طرح ایک شہر کے افراد بھی ایک چھوٹے اجتماع کے مانند ہیں۔ اس کے علاوہ گلی محلوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماع بھی چھوٹے معاشروں کی طرح ہیں۔ اس نے ان اجتماع کو دو حصوں میں تقسیم کیا اجتماع تام اور اجتماع ناقص۔

انسانی معاشروں کی تقسیم کر کے اس نے عمرانیات اور سیاسیات میں نئے نظریات کا اضافہ کیا۔

الفارابی جس وقت "سیاست" پر قلم اٹھا رہا تھا۔ عباسی حکومت کی شان و شوکت رخصت ہو چکی تھی اور رقبے کے لحاظ سے سمٹ چکی تھی۔ خلافت کے بہت سے صوبے علیحدہ ہو کر خودمختار ہو چکے تھے۔ افراد اور ریاست میں تناؤ تھا۔ ایک طرف یہ حال تھا دوسری طرف علوم و فنون کی سرپرستی کی جا رہی تھی۔ گویا معاشرہ دو عملی کا شکار تھا۔ فارابی پایہ تخت سے دور "حلب" میں تھا لیکن بغداد اور اس کے ارد گرد کی خودمختار ریاستوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہی وہ دن تھے جب وہ یونانی فلسفہ کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا اور تشریحات کر رہا تھا۔ اس کی نظر سے افلاطون کی جمہوریہ بھی گزری ہوگی۔ اسی لیے وہ بادشاہت (جس کی خرابیوں کا وہ مشاہدہ کر رہا تھا) سے زیادہ جمہوریت کا قائل نظر آتا ہے اسی لیے اس کے قلم سے نکلا "کسی ملک پر حکومت کرنے کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک کے افراد خود اپنے لیے حکمران کا انتخاب کریں۔"

اس میں شک نہیں کہ فارابی، ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے متاثر تھا لیکن جب وہ ان کے نظریات پر بحث کرنے لگا تو اس نے قدیم ایتھنز کو نظرانداز کر کے مدینۃ النبی کو آئیڈیل ریاست قرار دیا۔ اس کے خیال میں یونان اور روم کی ریاستیں مکمل طور پر جمہوری نہیں تھیں۔

"جب اسلامی دنیا کی پہلی ریاست مدینۃ النبی میں قائم ہوئی تو وہ ایک مثالی ریاست تھی کیونکہ اس کی انتظامیہ اور سربراہ مملکت اعلیٰ ترین انسانی خوبیوں اور علوم تامہ سے مزین تھے۔ اگر حکمران اب بھی ایسی مثالی ریاست قائم کرنا چاہیں تو ریاست کی انتظامیہ اور مقتدر اعلیٰ کو علوم تامہ اور اعلیٰ ترین خوبیوں کا حامل ہونا ہوگا۔"

الفارابی نے اپنے نظریۂ سیاست میں ریاست کی تعریف کرتے ہوئے ایک مثال دی ہے کہ ریاست ایک انسانی جسم کی طرح ہوتی ہے۔ جسم کے تمام اعضا مل کر جسم کے نظام کو چلاتے ہیں اور جب جسم کے کسی حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح ریاست بھی ایک جسم کی طرح ہے جس کو اعلیٰ ترین انسانی فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست کے تمام افراد ریاست کے وہ اعضاء ہیں جن کی بدولت ریاست اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔

ریاست ایک جہاز ہے جس طرح کوئی جہاز اپنے کپتان کے بغیر نہیں چل سکتا اسی طرح ریاست بھی مقتدر اعلیٰ کے بغیر نہیں چل سکتی مگر یہ کپتان اعلیٰ تعلیم یافتہ فلسفی لیڈر کی صورت میں ہو جو ایسی پالیسیاں مرتب کرے جن سے ریاست کے افراد اپنے اعمال کو بہتر بنا سکیں اور اپنے معاشی حالات کو مضبوط کر سکیں۔

ریاست کا سیاسی رہنما ایک ڈاکٹر کی طرح بھی ہوتا ہے جو اپنی سیاسی بصیرت سے ریاست کے افراد کی بداعمالیوں کا علاج کرتا ہے۔

کسی پُرسکون شہر کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ اس شہر کے افراد میں اخلاقی توازن انتہائی بہتر ہے۔ ایسا سکون ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رہنما ہی پیدا کرسکتا ہے جس کی روح خود ہر طرح سے پُرسکون ہو۔ جب کسی ریاست کے شہریوں کے اخلاق بگڑے ہوئے ہوں تو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ شہر کے حاکم بھی بگڑے ہوئے ہیں۔ اچھائی یا نیکی انسانی ذہن ہی میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کو عمل میں لانے کے لیے رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست کا رہنما اگر خود اعلیٰ خوبیوں کا مالک ہوگا تو ریاست کے شہری بھی ان خوبیوں کے مالک ہوں گے۔“

الفارابی نے صرف افلاطون اور ارسطو کا ہی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سے یونانی اور رومی مفکروں کے نظریات کو پڑھا تھا۔ ان کے تراجم کیے تھے۔ ان سے اختلاف کیا تھا۔ ان سے اتفاق کیا تھا۔ بہت سے ممالک کے سفر کرکے وہاں کے نظام حکومت کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ سیاسی حالات وواقعات کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ”سیاست مدینہ“ لکھی۔ یہ ایسی شاندار کتاب ہے جس نے اہل یورپ کو بھی متاثر کیا۔ اس کتاب میں اس نے ریاستی شہروں کی اقسام بیان کی ہیں۔

اس کے خیال میں مختلف معاشروں کے لوگ مختلف نظریات اور مختلف مقاصد کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں۔ الفارابی ایسے معاشرے کے افراد کے اجتماع کو شہری ریاست تسلیم کرتا ہے اور ان شہری ریاستوں کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کرتا ہے۔

☆ جس ریاست کے افراد غیر معیاری طرز زندگی رکھتے ہیں وہ ایسی ریاستوں کو جاہلوں کی ریاست کا نام دیتا ہے۔ ایسی ریاستوں میں اخلاقی معیار پست ہوتا ہے۔ جاہلانہ ریاست کے قیام کی وجوہات یہ ہوتی ہیں۔

☆ کسی خطے پر افراد کا ایسا اجتماع جو سیاسی طور پر بہت زیادہ طاقت حاصل کرلیتا ہے وہ معاشرے کے کمزور افراد کی مدافعت کی پروا کیے بغیر حکمران بن جاتا ہے۔

☆ لسانی اشتراک کی قوت: ایسی ریاست کے افراد ایک ہی قبیلے، قوم یا زبان رکھنے کی وجہ سے سیاسی قوت حاصل کرلیتے ہیں اور ریاست کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایسی ریاست کے کوئی خاص مقاصد نہیں ہوتے۔

☆ غیر سنجیدہ لوگ: کسی خطے کے وہ لوگ جو غیر سنجیدہ لوگوں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں وہ آپس میں اتحاد کرلیتے ہیں جو وقتی ہوتا ہے۔ اس اتحاد کے تحت حکومت قائم کرلیتے ہیں۔ ایسی حکومت میں وہ عوام کو نظرانداز کردیتے ہیں۔

☆ بدقماش لوگ: الفارابی کا کہنا ہے جب کسی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا ہے تو ایسے بعض بدقماش لوگ جو اپنے ہی جیسے بدقماش لوگوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ سلطنت کے کسی کمزور حصے پر قبضہ کرکے اپنی حکومت قائم کرلیتے ہیں ایسی حکومت ریاستی مفاد کے لیے نہیں اپنے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔

☆ غیر منظم لوگ: غیر منظم لوگ معاشرے کے کمزور افراد پر حکومت قائم تو کرلیتے ہیں لیکن ان کے کوئی مقاصد نہیں ہوتے اور ایسی حکومت بھی چندروزہ ہوتی ہے۔

☆ جابر لوگ: ایسے لوگ لالچی اور خود پسند ہوتے ہیں۔ اپنے جبر سے حکومت قائم کرکے عوام پر بھاری ٹیکس عائد کرتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسی حکومتیں لمبی عمر نہیں پاتیں۔

☆ آزاد لوگ: ایسے لوگ خود کسی حکومت کے ماتحت رہنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی حکومت منتشر اور بدحالی ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کے حکمران بے پروا اور نظم ونسق سے عاری ہوتے ہیں۔

☆ حقیر: ایسے لوگ (حکمران) کچھ نہ کچھ علوم وفنون تو رکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا اصل مقصد مال و دولت اکٹھا کرنا ہے۔ وہ اپنے مال و دولت کو بڑھاتے ہی رہتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے۔ ایسی ریاستوں کے افراد میں بھی کوئی نظم ونسق نہیں ہوتا اور اخلاقی معیار پست ہوتا ہے۔ ایسی ریاستوں کے لوگ اور حکمران صرف حصول دولت کی ہوس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس نے ایک مثالی ریاست کو مدینۃ الفاضلیہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کے برعکس کمزور ریاست کو مدینۃ الجاہلیہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

معاہدہ عمرانی جسے انگریزی میں سوشل کنٹریکٹ کہتے ہیں کا خالق الفارابی ہے۔ وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اس اصطلاح کو ”العقد“ کے نام سے پیش کیا۔ العقد کے معنی ریاست اور افراد کے درمیان بین الانسانی عقد قائم کرنا ہے

جو خاموشی کی زبان میں ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ جب ریاست وجود میں نہیں آئی تھی تو انسان گروہوں کی صورت میں منتشر تھے طاقتور لوگ کمزوروں پر ظلم کرتے تھے۔ اس مسلسل جنگ وجدال سے انسان تنگ آگئے تھے۔ اب وہ اطمینان سے مل جل کر رہنا چاہتے تھے تاکہ ظلم وستم کے بغیر زندگی گزاری جائے۔ تب انہوں نے اپنی مرضی سے ایک سردار کا انتخاب کرلیا جو ان کے حقوق کی حفاظت کرسکتا تھا۔ یہی پُرسکون معاشرہ طاقت ور سردار کی فہم وفراست سے تقویت پاکر ایک ریاست کے طور پر ابھرا۔ ایسی ریاست میں افراد کے بنیادی فطری حقوق ظالم وجابر لوگوں سے محفوظ ہوگئے۔

الفارابی نے معاہدۂ عمرانی کا یہ نظریہ نویں صدی عیسوی میں دیا تھا جب کہ یورپ میں اس وقت فلسفہ ومنطق کو پڑھنا اور سیکھنا مذہب کے خلاف قرار دیا تھا۔ یہ دور یورپ کا سیاہ دور تھا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اٹھارھویں صدی میں برطانیہ اور فرانس میں الفارابی کے نظریۂ معاہدہ عمرانی کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔

یورپی مفکرین نے اس کا سہرا اپنے سر باندھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا خالق ابونصر الفارابی تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جدید مفکرین نے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی کردی۔ ان مفکرین کے نظریۂ معاہدہ عمرانی میں جدید ریاست کے حوالے سے تفصیلات زیادہ ہیں لیکن بنیادی نکتہ وہی جو الفارابی نے پیش کیا تھا۔

ریاست کے ساتھ ساتھ الفارابی نے نوآبادیوں کا نظریہ بھی پیش کیا۔ وہ لکھتا ہے انسان فطری طور پر پُرسکون ماحول میں رہنا چاہتا ہے۔ اگر انسان کو آسودگی اور امن میسر نہ ہو تو ایسے ماحول میں اس کی زندگی تنگ ہوجاتی ہے۔ جب وہ ذہنی، روحانی اور قلبی سکون کو اپنے ماحول کی وجہ سے کھودیتا ہے تو ترک سکونت کرکے نئے خطوں کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ پھر وہ کوئی پُرسکون اور معاشی خوش حالی کی جگہ تلاش کرکے وہاں اپنی رہائش کرتا ہے اس طرح وہ جس نئی جگہ پر بسیرا کرے گا تو اس طرح کے دیگر افراد بھی وہاں بسنا شروع ہوجائیں گے اور اس طرح نئی بستیاں بسنا شروع ہوجائیں گی۔ ایسی نئی بستی ہی کو نوآبادی کہا جائے گا۔

الفارابی نوآبادیوں کے وجود میں آنے کی تین بنیادی وجوہات بیان کرتا ہے۔ معاشی حالات، جان لیوا وبائیں، کسی طاقت ور ریاست کا کمزور ریاست پر حملہ۔

کسی شہر یا ریاست میں رہتے ہوئے انسان جب معاشی بدحالی کا شکار ہوجائیں اور ان کے لیے رزق کا حصول مشکل ہوجائے تو ایسے حالات میں وہ اپنے معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے نئے شہروں یا نئی بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہی حال قحط زدہ لوگوں کا ہے۔

جب کسی خطہ زمین پر رہنے والے انسان جان لیوا وباؤں کی لپیٹ میں آجائیں تو اس صورت میں نقل مکانی کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ دور وسطیٰ میں طاعون اور متعدی امراض عام تھے۔ لوگ جان بچانے کے لیے نئی آبادیوں کا رخ کرتے تھے۔

اسی طرح نوآبادیاں اس وقت وجود میں آتی ہیں جب لوگ حملہ آوروں کے خوف سے پناہ کی تلاش میں نئی آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ یہ مثالیں بھی دور وسطیٰ میں عام تھیں۔ پڑوسی ریاستیں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں اور ان ریاستوں کے پرامن لوگ پناہ کی تلاش میں نئی بستیاں بسا لیتے تھے۔ الفارابی کا دور ایسی ہی افراتفری کا دور تھا۔

اس نے اپنی کتاب ”مدینۃ الفاضلیہ“ میں ایک مثالی ریاست کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اس کے سربراہ کے لیے بھی کچھ شرائط تجویز کیں۔

”مدینۃ الفاضلیہ“ کو ایک ایسے رئیس اوّل (سربراہ مملکت) کی ضرورت ہے جو اس ریاست کے عوام کو اپنی صلاحیتوں سے اعلیٰ اخلاق، انصاف، باہمی اتحاد اور ترقی و بہبود سے مزین کرسکے۔ جو علم وفن، اخلاق واقدار، شجاعت وبہادری، سخاوت اور ذکاوت کی صفات رکھتا ہو۔

کسی ریاست فاضلیہ کا رئیس اوّل ذہنی اور فکری لحاظ سے اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوگا تو وہ امور سلطنت اور سیاسی وسماجی حالات کو سمجھ کر ان کا مناسب حل تلاش کرے گا۔

رئیس اوّل کی یہ خوبی ہوگی کہ وہ عوام میں یکساں عدل وانصاف کا بول بالا کرے گا۔ عدل وانصاف کے لیے حکمران کا تعصب سے پاک ہونا ضروری ہے اگر وہ اقربا پروری اور جانب داری سے کام لے گا تو پورے ملک کا نظم ونسق بگڑ جائے گا۔

مدینۃ الفاضلیہ کا رئیس اوّل اپنی ذات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مفاد عامہ کے لیے ہر طرح کے اقدامات کرے گا۔ اگر وہ حرص ولالچ میں مبتلا ہوگا تو ملک کا نظام

معیشت بگڑ جائے گا۔ رئیس اوّل کی ذمہ داری ہے کہ وہ افراد کو انفرادی طور پر وہ تمام سہولیات فراہم کرے جو ان کا بنیادی حق ہے۔

رئیس اوّل پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ریاست کو اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھے۔ ایسا اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب رئیس اوّل عوام میں یکساں طور پر مقبول ہو۔ یہ مقبولیت اسے اپنی صلاحیتوں (اگر اس میں ہیں) کو مفادِ عامہ کے لیے استعمال کرے اور انہیں خوش حال زندگی دے ورنہ کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں اس کے عوام اسے چھوڑ جائیں گے۔ اسی لیے الفارابی نے کہا تھا رئیس اوّل سخی ہوتا کہ اس کی سخاوت سے عوام کو مادی اور معاشی فوائد حاصل ہو سکیں۔

☆......☆

الفارابی نے فلسفہ منطق میں بے پناہ کارنامے انجام دیے۔ اس کا یہ تمام کام ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے ماخوذ ہے۔ اس نے ان فلاسفر کے نظریات کی تشریح کی اور انہیں عام فہم بنایا اور جہاں جہاں اختلاف کر سکتا تھا اختلاف کیا اسی لیے اسے ''معلم ثانی'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کے یہ سب کارنامے اپنی جگہ لیکن اس کی اصل عظمت اس میں ہے کہ اس نے ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو اسلامی کلچر سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔

معلم اوّل ارسطو تھا اور معلم ثانی ابونصر الفارابی۔

الفارابی کے فلسفہ و منطق نے اس کے بعد آنے والے فلاسفر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان میں خاص طور پر بوعلی سینا، ابن رشد، ابن خلدون، جلال الدین رومی اور امام غزالی جیسے مفکرین متاثر ہوئے۔ دراصل الفارابی اسلامی فلسفہ و منطق کا بانی تھا۔

☆......☆

اس کی عمر اسّی سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن وہ نہ خود تھکا تھا نہ اس کے قلم نے ہار مانی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ دمشق روانہ ہوا۔ کتاب کی تلاش دوستوں سے ملاقات کا بہانہ بھی بن گئی۔ شب و روز جوانی کی یادوں اور موجودہ حالات کے موازنے میں گزرنے لگے۔ خوب محفلیں جمیں، علمی بحثوں اور گپ شپ میں کئی دن کٹ گئے۔ پھر اس نے رختِ سفر باندھا۔ گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اہلِ دمشق کو خدا حافظ کہا اور سوار ہو گئے۔

چلتے وقت یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ راہ میں رہزن ہیں اور راستے ہی میں رات بھی ہو جائے گی۔ آبادی سے نکل کر وہ ایک ویرانے میں داخل ہوئے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''بھائی جنگ کا زمانہ ہے۔ کوئی لشکر ادھر سے گزر رہا ہوگا۔''

''یہ آوازیں ہزاروں گھوڑوں کی نہیں چند گھوڑوں کی ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یہ علاقہ رہزنوں کے لیے مشہور ہے کہیں......''

''ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ آٹھ سے دس افراد ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ یہ کوئی لشکر نہیں رہزنوں کا گروہ ہے۔''

''تم لوگوں کے پاس جو کچھ ہے ہمارے سردار کے قدموں میں رکھ دو۔''

''کہاں ہے تمہارا سردار؟''

''اے بڈھے ان سب کا سردار میں ہوں۔''

''شاید تم اندھیرے میں پہچان نہ سکو۔ میں ابونصر الفارابی فلسفی ہوں۔''

''تم کوئی بھی ہو ہمیں مال چاہیے۔''

''ایک وعدہ کرو۔ ہمارے پاس قیمتی گھوڑے اور بیش قیمت کپڑے ہیں۔ یہ سب لے لو مگر میرے ساتھیوں کو کوئی گزند نہ پہنچانا۔''

''ٹھیک ہے۔''

مال و متاع سردار کے قدموں میں رکھ دیا گیا لیکن اس کے باوجود اسے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس نے بھی تلوار نکال لی اور مقابلہ کیا لیکن اپنے رفقاء سمیت رہزنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

کتنا قیمتی اثاثہ تھا جو رہزنوں نے لوٹ لیا۔

معلم ثانی کو 339ھ بمطابق 950ء کو بہ عمر 80 سال قتل کر دیا گیا۔

دمشق کی مٹی اس کی آخری آرام گاہ بنی۔

ماخذات:

ابونصر الفارابی۔ ملک اشفاق

نامور مسلم سائنس داں، حمید عسکری



شعلہ صفت

عبداللہ احمد حسن

زندگی آگ کا دریا تھی اور اسے ڈوب کے جانا تھا۔ وہ مسلسل سعی میں مصروف رہا۔ ہر دروازے پر دستک دیتا رہا کہ شاید یہی قسمت کا دروازہ ثابت ہو جائے لیکن ہالی ووڈ تو بے رحم فلم نگری ہے۔ اتنی آسانی سے کب کسی سے رام ہوتی ہے۔ اسے ناامیدی کے گھپ اندھیرے میں دھکیلا جانے لگا۔ تب اس کے ایک ہمدرد نے اسے ایک ایسا مشورہ دیا کہ کامیابی اس کے قدموں تلے کھنچ آئی۔ وہی لوگ جو اس کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ اس کے آگے دامن پھیلانے لگے۔

ایک عالمی شہرت یافتہ اداکار کے مد و جزر کا بیان

آس پاس مجمع نعرے لگا رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ ایک طرف کلین شیو چینی جوان تھا، جس نے کنگفو کا لباس پہنا ہوا تھا۔ کالی ٹراؤزر، سفید اپر اور کنگفو شوز۔ کمر پر کوئی بیلٹ یا شال نہیں بندھی تھی۔ سامنے مخالف بارعش امریکی گورا تھا۔ اس نے گی (Gi) پہنی ہوئی تھی (وہ لباس جو کراٹیکا پہنتے ہیں) کمر پر کالی بیلٹ باندھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک پرانا زخم کا لمبا سا نشان تھا جو بائیں آنکھ کے اوپر سے شروع ہو کر نیچے آدھے گال تک آ رہا

تھا۔ تاہم اس وقت اس کی حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ تازہ زخموں سے رستے خون میں سنا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں شیشے کے تیز دھار ٹکڑے تھے جو اس نے ابھی ابھی دو بوتلوں کو توڑ کر حاصل کیے تھے۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور نفرت ٹپک رہی تھی۔ صدر مجلس نے اسے آواز دی ''اوہارا''۔ مگر وہ کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چینی اس کی طرف بڑھا تو اس نے شیشوں سے حملہ کیا مگر چینی نے اپنی دائیں ٹانگ سے سائیڈ کک (side kick) مارتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے ٹکڑے گرا دیے۔ امریکی نے اپنی دائیں کک مارنی چاہی مگر چینی نے صفائی سے اسے اپنے بائیں ہاتھ سے روکتے ہوئے اس کی گردن پر راؤنڈ ہاؤس کک (roudhouse kick) ماری جس سے وہ نیچے گر کر چت ہو گیا۔ چینی نے مخصوص آواز نکالتے ہوئے ہوا میں اچھل کر امریکی کے سینے پر دونوں پاؤں مار کر زور دیا۔ اس وقت اس کے چہرے سے غم، غصہ اور نفرت کا اظہار بیک وقت ہو رہا تھا کیوں کہ وہ امریکی اس کی بہن کا قاتل تھا۔

یہ منظر فلم Enter the Dragon انٹر دا ڈریگن کا ہے۔ اور اس میں جس چینی جوان کا ذکر ہے اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ نامور مارشل آرٹسٹ (Martial Artist) اور اداکار بروس لی (Bruce Lee) ہے۔

......

پاکستان میں ٹیلی وژن ساٹھ کی دہائی میں آیا۔ اس وقت بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہوتا تھا جو بمشکل پانچ گھنٹے کی نشریات دیتا تھا جبکہ پیر کو ٹی وی کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس دن نشریات نہیں ہوتی تھیں۔ وہ پی ٹی وی کا سنہری دور تھا۔ اس قدر کم نشریات کے باوجود اس زمانے میں جو مقامی ڈرامے، فلمیں، ٹاک شوز وغیرہ دکھائے جاتے تھے، انہیں دیکھنے والے آج بھی انہیں بھلا نہیں پائے ہیں۔ ٹی وی مقامی پروگرامز کے علاوہ انگریزی پروگرام بھی دیتا تھا جن میں ہفتہ واری فلم کے علاوہ روزانہ کارٹون اور ڈراما سیریز دکھائی جاتی تھیں۔ اس وقت انگریزی ٹی وی سیریز بھی جس اعلیٰ معیار کی بنتی تھیں آج کی سیریز معیار میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ کون ہے جو The Danger Man، The Saint، The Avengers، Fury فیوری، Man from UNCLE، The Fugitive اور Daktari وغیرہ کو بھول سکتا ہے۔

ان میں جب دی ایونجرس آئی تو اس میں ڈیانا رگ نے ایما پیل کا کردار نبھایا تھا۔ ایما ہیروئن تھی اور مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ اس میں اس نے مارشل آرٹس کا مظاہرہ کیا جسے دیکھ کر پاکستان میں عام لوگ حیران رہ گئے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ عورت ہو کر کھڑی ہتھیلی مار کر آدمیوں کو گرا دیتی ہے۔ اس وقت تک پاکستان میں عام لوگ مارشل آرٹس سے واقف نہیں تھے۔ پاکستان میں مارشل آرٹس گرینڈ ماسٹر محمد اشرف طائی نے 1970 میں متعارف کروایا تھا جب انہوں نے اپنا پہلا Dojo ڈوجو کھولا تھا۔

اس موضوع پر مشرق بعید میں بھی محدود فلمیں بنتی تھیں۔ مگر جب بروس لی کی فلموں نے دھوم مچائی تو پوری دنیا میں مارشل آرٹس جنون کی طرح پھیل گیا۔ Hong Kong ان فلموں کا مرکز بن گیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ فلموں کی تعداد میں ہانگ کانگ جو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، بولی وڈ سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کامیابی کا سہرا بروس لی کے سر جاتا ہے جس نے اپنی فلموں سے مارشل آرٹس کو پوری دنیا سے متعارف کروایا۔

......

لی ہوئی چیون کا تعلق چین کے ہان خاندان سے تھا۔ وہ سان فرانسسکو کے چائنا ٹاؤن میں رہائش پزیر تھے۔ ان کی بیوی گریس ہو مخلوط النسل چینی تھی (چینی اور کاکیشیائی نسل) ان کے تین بچے تھے فیبی لی، ایگنس لیا اور پیٹر لی۔ 27 نومبر 1940 کو سان فرانسسکو کے چائنا ٹاؤن میں واقع چائنیز اسپتال میں ان کے ہاں چوتھے بچے کی پیدائش ہوئی جس کا چینی نام لی جن فان رکھا گیا۔ یہ چینی تقویم کے اعتبار سے ڈریگن کا سال تھا۔ اس لیے نرس نے اس کو لی ٹی لونگ یعنی چھوٹا ڈریگن کہہ کر مخاطب کیا۔ چین میں ڈریگن کے سال میں پیدا ہونے والوں کو بہت مضبوط طاقتور اور خوش قسمت سمجھا جاتا ہے۔ اسپتال کی ڈاکٹر میری گلوور (Mary Glover) جس نے ڈلیوری کروائی تھی اس کو بروس کا نام دیا۔ یہی نام تھا جو آگے چل کر اس کی پہچان بنا۔ بروس لی کے بعد اس کا ایک اور بھائی ہانگ کانگ میں پیدا ہوا تھا جسے روبرٹ لی کا نام دیا گیا تھا۔

......

لی ہوئی چیون تھیٹر کے ایک کامیاب اداکار تھے۔ ان کے ساتھ کے کئی لوگ امریکا میں رک گئے تھے مگر لی کو اپنے

وطن کی یاد ستا رہی تھی اس لیے ان کے خاندان نے رخت سفر باندھا اور ہانگ کانگ پہنچ گئے۔ تین ماہ کا ننھا بروس لی ان کے ساتھ تھا۔ بدقسمتی سے جب وہ ہانگ کانگ پہنچے تو انہی دنوں جاپان نے حملہ کر کے ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا۔ جو ساڑھے تین سال تک جاری رہا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد ہانگ کانگ کی تعمیر نو اور ترقی شروع ہوئی۔ حالات معمول پر آتے ہی لی نے اپنا کام پھر سے شروع کر دیا اور پہلے سے بھی مقبول اداکار کے طور پر ابھرے۔

اب ہانگ کانگ پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لی کی بیوی گریس ہو ہانگ کانگ کے ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں میاں بیوی مالی طور پر خاصے مستحکم تھے اس لیے انہوں نے بچوں کی پرورش بہت اچھے انداز سے کی تھی۔ مگر انہی دنوں چین میں اشتراکی نظام نافذ کر دیا گیا جس کے بعد مہاجرین کا ایک سیلاب ہانگ کانگ پر ٹوٹ پڑا۔ ان میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ کئی مجرمانہ ذہنیت کے لوگ بھی آ گئے تھے۔

بروس لی کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ وہ مزاج کا ذرا تیز تھا اس لیے عام طور پر آوارہ لڑکوں سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا، جس میں اکثر وہ پٹ کر آتا تھا کئی مرتبہ وہ زخمی بھی ہوا۔ تب اس کے والد نے فیصلہ کیا کہ اس کو مارشل آرٹس سے روشناس کروایا جائے۔ چونکہ لی خود بھی ووشو کے اسٹائل تائی چی چوان سے واقفیت رکھتے تھے اس لیے ابتدائی تربیت انہوں نے خود دی اور بروس کو بنیادی اصول سکھائے۔ اس کے بعد اس کی تربیت جاری رہی مگر اس کی زندگی میں ایک انقلاب تب آیا جب اسے ماسٹر Yip Maan کے پاس بھیجا گیا۔ اس وقت وہ سولہ سال کا تھا۔ ماسٹر ییپ مان ووشو کے ونگ چن اسٹائل کے ماہر تھے۔

یہاں جو قارئین مارشل آرٹس سے ناواقف ہیں ان کے لیے تھوڑی تفصیل پیش کرنا چاہوں گا تاکہ وہ ان باریکیوں کو سمجھ سکیں۔ عام لوگ جوڈو کراٹے کے نام سے واقف ہیں اور یہ دونوں نام ساتھ ساتھ لیتے ہیں جیسے فلاں جوڈو کراٹے سیکھ رہا ہے یا وہاں جوڈو کراٹے کا مظاہرہ ہوا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جوڈو ایک الگ آرٹ ہے اور کراٹے ایک الگ آرٹ ہے اسی طرح مارشل آرٹس کی کئی قسمیں ہیں جیسے ایکیڈو، تائیکوانڈو، کک بوکسنگ، ہیپ کیڈو، جیو جتسو، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان میں بھی اسٹائلز ہیں جیسے کراٹے میں شوتو کان، وانڈو، کیوکشن کائی وغیرہ ہیں اسی طرح کنگفو جسے ووشو کہا جاتا ہے میں بھی کئی اسٹائل ہیں۔

اس وضاحت کے بعد پھر آتے ہیں اپنی کہانی کی طرف۔

اس وقت بروس لی ذہنی طور پر خاصا منتشر تھا وہ کئی مقابلے ہار چکا تھا اور خود کو ایک ناکام فائیٹر تصور کر رہا تھا۔ ایسے میں ییپ مان نے اسے تسلی دی اور تربیت دینے کا بیڑا اٹھایا۔ ییپ مان کے کئی شاگرد تھے جنہیں وہ لڑنے کے علاوہ اچھے اخلاق بھی سکھاتا تھا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس کے شاگرد خوامخواہ میں گلیوں کے غنڈوں کی طرح الٹی سیدھی لڑائیاں لڑ کر اپنی توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے منظم طریقے سے لڑنے کا فن سیکھیں اور اسے صرف شدید ضرورت کے وقت اپنی یا کسی کی جان و مال کی حفاظت کے لیے استعمال کریں۔

اب بروس لی کو ماسٹر ییپ مان کے پاس تربیت لیتے ایک سال بیت چکا تھا۔ اس دوران اسے کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جب ییپ مان کے دیگر شاگردوں کو پتا چلا کہ بروس لی خالص نہیں بلکہ مخلوط النسل چینی ہے تو ان کے رویے میں فرق آ گیا۔ حالانکہ اس کا باپ خالص چینی تھا مگر ماں کے مخلوط النسل ہونے کی بنا پر اسے بھی ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پریکٹس کرنے سے کترانے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں چینی کسی غیر کو اپنے فنون حرب سکھانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ووشو پر صرف چینیوں کا حق ہے۔ ییپ مان نے بھی اپنے پورے دور میں بمشکل چھ ایسے لوگوں کو تربیت دی تھی جو غیر چینی تھے یا مخلوط النسل تھے۔ بروس لی کو اس فن سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اب اسے جنون سا ہو گیا تھا کہ وہ ونگ چن کنگفو میں مہارت حاصل کرے۔

ییپ مان نے اپنے ایک ہونہار شاگرد وونگ شن کو (جس نے بعد میں مارشل آرٹسٹ کے طور پر خاصا نام پیدا کیا تھا) بروس لی کو تربیت دینے اور مشق کروانے کی ذمہ داری سونپی۔ وونگ کے ایک اور شاگرد وان کام لیونگ (Wan Kam Leung) نے جو انہی دنوں اس کے پاس تربیت حاصل کر رہا تھا، بیان کیا ہے کہ ''میں نے بروس لی کو ماسٹر وونگ کے ساتھ لڑائی کی مشق کرتے دیکھا تو میں حیران رہ گیا، بروس لی کے ہاتھ اور پاؤں کسی تیز رفتار مشین کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کوئی انسان اتنی رفتار سے مکے اور لاتیں چلا سکتا ہے۔ اور یہ سب اندھا دھند نہیں تھا ہر حملہ نشانے پر تھا۔ بروس کے اندر قوت برداشت بھی بے پناہ تھی۔ وہ بہت ہی زیادہ طاقتور بھی تھا۔''

بروس لی کے خاندان کی رہائش 218 ناتھن روڈ، کولون میں تھی۔ اس کا داخلہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر واقع تاک سن اسکول میں کروایا گیا تھا۔ اس کے بعد بارہ سال کی عمر میں اسے لا سالے کالج میں داخل کروایا گیا۔ مگر اس وقت تک وہ ایک اچھا طالب علم نہیں تھا اس لیے اسے ایک دوسرے ادارے سینٹ فرانسس زاویئر کالج (یہ ایک ہائی اسکول تھا) میں بھیج دیا گیا۔ یہ ایک مشنری اسکول تھا۔ یہاں اس کی ملاقات برادر ایڈورڈ (Brother Edward) سے ہوئی۔ وہ اسکول میں پڑھاتے بھی تھے اور اسکول کی باکسنگ ٹیم کے کوچ بھی تھے۔

انہوں نے بروس لی کے دل میں تعلیم کا شوق پیدا کیا۔ بروس لی نے ان سے باکسنگ کے اصول اور تکنیک بھی سیکھی۔ 1958 بروس لی کے لیے ایک یادگار اور حوصلہ افزا سال تھا۔ اس نے اس سال ہونے والے ہانگ کانگ اسکولز باکسنگ ٹورنامنٹ میں حصہ لیا، اور فائنل راؤنڈ میں سابق چیمپئن کو ناک آؤٹ کرکے ٹائٹل اپنے نام کرلیا۔

بروس لی کے والد چونکہ ایک اداکار تھے اس لیے اسے بھی فلموں سے دلچسپی تھی۔ وہ چھ سال کی عمر میں ہی بچہ اداکار (چائلڈ آرٹسٹ) کے طور پر کیمرے کے سامنے آیا۔ اس کی پہلی فلم کا نام "گولڈن گیٹ گرل" تھا۔ وہ سولہ سال کی عمر کو پہنچنے تک چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر بیس فلموں میں کام کرچکا تھا۔ اسے ڈانس سے بھی دلچسپی تھی وہ چاچاچا کا دیوانہ تھا۔ 1955 میں اس نے ایک چاچاچا ڈانس مقابلے میں حصہ لیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔

1959 میں جب وہ 19 سال کا تھا تو آئے دن گلی کے غنڈوں سے اس کے جھگڑے ہونے لگے۔ ایک دن اس کا ایک بڑا جھگڑا ہوگیا۔ بروس لی اب وہ پہلے والا بروس لی نہیں تھا' اب وہ کنگفو کا ماہر تھا۔ ہانگ کانگ اسکول باکسنگ چیمپئن تھا۔ اس نے مدمقابل کو بہت بری طرح پیٹا۔ معاملہ بڑھا تو پولیس آگئی۔ اس کا مدمقابل ایک مجرمانہ پس منظر رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پولیس کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اسے کوئی جانی نقصان نہ پہنچادیں۔ اس کے والد نے پولیس کو یقین دلایا کہ وہ اسے منع کردیں گے، اب وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ایک پولیس آفیسر نے اس کے والد سے کہا کہ "آپ کا بیٹا اسکول میں اور سڑکوں پر آئے دن جھگڑے کرتا رہتا ہے۔ میں آپ کی ضمانت پر آخری بار اسے چھوڑ رہا ہوں۔ اب اگر اس نے کسی سے لڑائی کی تو میں اسے جیل بھیجنے پر مجبور ہوں گا۔"

"نہیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب وہ کسی سے نہیں لڑے گا۔"

"یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ دوسرے اسے کچھ دن تک باہر نہ نکلنے دیں وہ پٹنے والا لڑکا ایک گینگ لیڈر کا بیٹا ہے، کہیں وہ لوگ اسے نقصان نہ پہنچادیں۔"

اس کے والد نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تو انہیں بھی محسوس ہوا کہ اب جن لوگوں سے بروس لی نے جھگڑا مول لیا ہے وہ بہت خطرناک ہیں اور وہ اسے کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس نے گریس سے بات کی۔ "گریس اس بار معاملہ خاصا سنگین ہے وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

گریس نے تشویش سے کہا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا ہے کیا کرنا چاہیے؟"

"میرے خیال سے بروس کو امریکا اس کی بہن اگنیس کے پاس بھیج دیں۔ وہاں وہ محفوظ بھی رہے گا اور تعلیم بھی حاصل کرلے گا۔ وہاں اس کا مستقبل سنور جائے گا۔ اگر یہاں رہا تو یہی حرکتیں کرتا رہے گا اور زیادہ بگڑ جائے گا۔ کیا پتا کبھی اسے کوئی جانی نقصان پہنچ جائے۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ بہتر سمجھیں"۔

اس کی بہن اگنیس لی سان فرانسسکو میں چند خاندانی دوستوں کے ہمراہ رہتی تھی۔

بروس لی 1959 میں سان فرانسسکو پہنچا۔ چند ماہ اس نے اپنی بہن کے ساتھ گزارے پھر سیاٹل چلا گیا۔ یہاں اس نے کیپیٹل ہل میں واقع ایڈیسن ٹیکنیکل اسکول میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے جوڑلیا اور فارغ اوقات میں روبی چاؤ کے ریستوران پر کام کرنے لگا۔ روبی کا شوہر بروس لی کے والد کا دوست تھا اور ایک زمانے میں انہوں نے ساتھ کام بھی کیا تھا۔

بروس کے بھائی پیٹر لی کو مِنی سوٹا کے کالج میں داخلہ مل گیا تو وہ وہاں جانے سے پہلے سیاٹل آیا۔ انہوں نے چند دن ساتھ گزارے۔ پھر پیٹر منی سوٹا چلا گیا۔ 1960 میں بروس لی نے ہائی اسکول پاس کرلیا اسے ڈپلوما مل گیا۔

بروس لی نے ۱۹۵۹ میں سیاٹل میں ایک مارشل آرٹس انسٹیٹیوٹ کھولا۔ جس کا نام اس نے لی جن فان کنگفو رکھا۔ وہ وہاں ونگ چن اسٹائل سکھاتا تھا۔ اس نے پہلے پہل اپنے دوستوں کو سکھانا شروع کیا، پھر اس کو شاگرد ملتے چلے گئے۔ جیسی گلوور جو جوڈو کا ماہر تھا اس نے بھی بروس لی کی شاگردی اختیار کی۔ تاکی کیمورا اس کا قریبی چہیتا شاگرد تھا جسے بروس لی کا پہلا اسسٹنٹ ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اور بروس لی کی بے وقت موت کے بعد اسی نے انسٹیٹیوٹ کو چلایا۔ بروس لی مختلف اسکولوں میں جاکر کنگفو اور فلسفے کے موضوع پر لیکچر بھی دیا کرتا تھا اور اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں ایک بار وہ گارفیلڈ ہائی اسکول گیا۔ وہاں سے بھی کچھ طلبا و طالبات نے اس سے متاثر ہوکر اس کے ادارے میں داخلہ لے لیا ان میں خوبصورت سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی امریکی دوشیزہ لنڈا ایمرے بھی تھی۔ لنڈا ایک آئرش انگریز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

مارچ 1961 میں اس کو یونیورسٹی اوف واشنگٹن میں داخلہ مل گیا۔ اس نے اداکاری کے علاوہ فلاسفی سائیکولوجی اور چند دیگر مضامین کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد لنڈا بھی اسی یونیورسٹی میں آگئی، وہ شعبۂ تعلیم میں تھی۔ یوں ان کا وقت ساتھ گزرنے لگا۔ یونیورسٹی اور کنگفو کی کلاسیں ان دونوں کو قریب لانے کا سبب بن گئیں۔ بات بڑھ کر دوستی تک پہنچی اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب کیوپڈ نے اپنا تیر چلا دیا۔ جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخر ایک دن بروس لی حرف مدعا زبان پر لے آیا۔ "لنڈا آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟"

"وہ بات یہ ہے لنڈا کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" اس نے جھجکتے جھجکتے بالآخر کہہ ہی دیا۔

لنڈا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ "کیا کہا تم نے؟"

لنڈا کے تاثرات دیکھ کر بروس لی کے ارمانوں پر پانی پھر گیا۔ "دیکھو اگر تمہیں برا لگا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں"۔

اس بار لنڈا کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔ "برا تو لگے گا ہی نا، آج اتنے عرصے بعد تم وہ بات کہہ رہے ہو جو تمہیں پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔"

بروس لی چونک اٹھا، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ "کیا کہا تم نے، تم واقعی، کیا تم بھی۔" خوشی کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

لنڈا نے آنکھیں میچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں" کچھ توقف کے بعد "تو تم بالکل ٹھیک سمجھتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی وہ کھلکھلا

بروس لی کی دو نظمیں

مرتا ہوا سورج

مرتا ہوا سورج دور افق میں اداس ہے۔
خزاں کی ہوائیں بے رحمی سے چل رہی ہیں۔
پیلے پتے پہاڑ کی چوٹی سے گر رہے ہیں
دو چشمے نہ چاہتے ہوئے بھی دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔
ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں۔
سورج صبح پھر نکلے گا، پتے موسم بہار میں پھر سبز ہوجائیں گے۔
مگر کیا ہم بھی ان پہاڑی چشموں کی طرح
ہوں گے جو پھر کبھی نہیں مل سکیں گے۔

☆☆☆

واشنگٹن جھیل کے ساتھ اکیلے چلنا
کنارے پر پہلے سے ہی ہلکی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
دور آسمان اور جھیل کا ملنا یوں لگتا ہے
جیسے غروب آفتاب کی سرخی پھیل رہی ہے
جھیل کی گہری خاموشی مجھ سے ہر طرح کی
بے چینی دور کردیتی ہے۔
اکیلے کنارے کے ساتھ میں
دھیمے قدموں سے چل رہا ہوں۔
اکیلے بے چین مینڈک پریشانی کے عالم میں
تیز تیز بھاگ رہے ہیں
یہاں اور وہاں گھر ہیں
ان میں سے روشنیوں کے ٹھنڈے
موتیوں کے سے چشمے نکل رہے ہیں
ایک شاندار چاند آسمان کی تنہا گہرائیوں
میں چمک رہا ہے
چاند کی روشنی میں، میں آہستگی سے
کنگفو کے انداز میں حرکت کررہا ہوں
روح اور جسم مل کر ایک ہورہے ہیں

کر ہنس پڑی۔

اب بروس لی نے اپنی جیب سے ایک ڈبیا نکال کر پوچھا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟“

لنڈا نے شاہانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ لنڈا نے بھی خوش دلی سے اقرار محبت کرلیا تھا۔ بروس لی نے اس کو انگوٹھی پہنا دی۔ سترہ اگست 1964 کو انہوں نے شادی کرلی۔

1964 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد بروس لی نے اوکلینڈ جانے کا ارادہ کیا۔ اوکلینڈ میں وہ جیمس یم لی کے پاس گیا۔ جیمس ایک مشہور چینی مارشل آرٹسٹ تھا۔ وہ بروس لی سے بیس برس بڑا تھا۔ انہوں نے مل کر جن فان مارشل آرٹس کی دوسری شاخ اوکلینڈ میں کھولی۔ جیمس نے بروس کو امریکن مارشل آرٹسٹ ایڈ پارکر سے ملایا۔ ایڈ ایک آرگنائزر تھا۔ وہ لونگ بیچ انٹرنیشنل کراٹے چیمپئن شپ منعقد کرواتا تھا۔ اس سال ایڈ نے چیمپئن شپ منعقد کروائی تو بروس لی کو بھی دعوت بھیجی۔

اس نے دعوت قبول کی اور چیمپئن شپ میں حصہ لینے پہنچ گیا۔ اب اس کا نام خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ شرکاء اسے دیکھنے کے متمنی تھے مگر جب وہ اسٹیج پر آیا تو حاضرین کو اس کی شخصیت متاثر نہ کرسکی۔ اس کی جسامت پر بھی پھبتی کسی گئی لیکن جب اس نے فن کا مظاہرہ شروع کیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگ سانس روک کر اس کے فن کو دیکھنے لگے۔ یہ ایک ناقابل یقین مظاہرہ تھا۔ بروس لی نے ایک ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت پر پش اپس کرنے کا مظاہرہ کیا۔

حاضرین ابھی حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلے بھی نہ تھے کہ بروس لی نے ایک اور مظاہرہ کیا اس کے سامنے ایک مضبوط فائٹر جو بلیک بیلٹ تھا، جم کر کھڑا ہوگیا۔ بروس لی اس کے سامنے پہنچا اور اس طرح کھڑا ہوا کہ اس کا دایاں پاؤں آگے تھا گھٹنے ہلکے سے مڑے ہوئے تھے۔ اسی پوزیشن میں اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مٹھی بند تھی، ہاتھ مکے کی شکل میں تھا مگر اس نے مارنے کی بجائے آہستہ سے آگے بڑھا کر اپنے ہاتھ کو مدمقابل کے سینے سے ایک انچ دور روک لیا۔ اب اس کا ہاتھ کھلا تھا کہنی میں معمولی سا خم تھا اور انگلیاں حریف کے سینے کو چھو رہی تھیں۔ اس کی کمر نے حرکت کی اور ہاتھ نے ایک جھٹکے سے حرکت کی کہنی سیدھی ہوگئی اور حاضرین نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا کہ صرف ایک انچ کے فاصلے سے مارا ہوا وہ مکا اس قدر طاقتور تھا کہ سامنے کھڑا بلیک بیلٹ اڑ کر پیچھے رکھی کرسی پر گرا جو اسی مقصد سے رکھی گئی تھی کہ اسے چوٹ نہ لگے، اور وہ کرسی سمیت تقریباً پانچ میٹر تک پھسلتا چلا گیا۔ یہ ایک ناممکن عمل تھا مگر وہ بروس لی تھا جو ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا ہنر جانتا تھا۔ اس کا حریف بوب بیکر تھا۔ ایک مانا ہوا فائٹر۔ بعد میں اس نے بیان دیا ”میں نے بروس لی کو منع کیا ہے کہ برائے مہربانی آئندہ ایسے مظاہرے نہ کیا کرو“ اور کہا ”اس دن بروس لی نے ایک انچ کے فاصلے سے جب مکا مارا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مکا اس قدر طاقت رکھتا ہوگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی چٹان میرے سینے سے آ ٹکرائی ہو میرا دماغ چکرا گیا اور میں توازن کھو کر کرسی پر جا گرا۔ اس کے بعد میں کئی دن کام پر بھی نہیں جاسکا کیونکہ میرے سینے میں شدید درد تھا۔“

اس کے علاوہ اس نے چھ انچ کے فاصلے سے بھی ایسا ہی مکا مارنے کا مظاہرہ کیا تھا۔

اسی چیمپئن شپ کے دوران بروس لی کی ملاقات تائیکوانڈو کے ماہر جھون گورمی سے ہوئی۔ ان کے درمیان جلد ہی بہت اچھی دوستی ہوگئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو کچھ تیکنکس بھی سکھائیں۔

1965 کا سال اس کے لیے ایک طرف خوشی کی نوید لایا تو دوسری طرف آنسوؤں کا تحفہ بھی لایا۔ یکم فروری 1965 کو ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے اس کا نام برانڈن لی رکھا۔ بروس لی نے کہا۔ ”یہ بڑا ہوکر میرا نام روشن کرے گا۔ میں اسے خود تربیت دوں گا۔ یہ مجھ سے بھی بڑا مارشل آرٹسٹ بنے گا۔“

مگر جب وہ یہ سب کہہ رہا تھا تو تقدیر ایک جانب کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس خوشی کی خبر کے ٹھیک چھ دن بعد 7 فروری 1965 کو اسے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ اس کے والد لی ہوئی چیون کا انتقال ہوگیا ہے۔

1967 میں جب لونگ بیچ انٹرنیشنل کراٹے چیمپئن شپ کا انعقاد ہوا تو ایک بار پھر بروس لی وہاں کچھ نئے مظاہروں کے ساتھ موجود تھا۔ اس بار اس نے دعویٰ کیا کہ کوئی میرا مکا روک نہیں سکتا۔ اس نے کراٹے کے عالمی چیمپئن وک مور کو چیلنج دیا۔ ”میں تمہارے منہ پر ایک سیدھا مکا ماروں گا جسے تم روک کر دکھاؤ۔“

وک تیار ہوگیا۔ سامنے کھڑا ہوگیا کہ بروس لی چند قدم

پیچھے ہٹ گیا اور پنجوں پر اچھلتے ہوئے ..... اس نے آواز دی ”وک کیا تم تیار ہو؟“ وک نے کہا ”ہاں میں تیار ہوں تم حملہ کر سکتے ہو“۔ وک کی اجازت کے بعد وہ اچھلتے ہوئے دھیرے سے آگے بڑھا یہاں تک کہ وہ دونوں اتنے قریب آگئے جہاں سے ایک دوسرے پر مؤثر حملہ کیا جا سکتا تھا۔ بروس نے اچانک وک کے چہرے پر ایک سیدھا مکا مارا مگر چہرے سے چند سینٹی میٹر دور روک کر واپس کھینچ لیا۔ وک اسے نہیں روک سکا تھا۔ بروس لی نے اسے ایک اور موقع دیا مگر اب بھی وہ ناکام رہا یہاں تک کہ آٹھ بار ایسا ہی ہوا مگر وک مکا روکنے میں بالکل ناکام رہا۔

اس دوران امریکا میں رہائش پذیر چینیوں نے اس پر اعتراضات شروع کردیے کہ وہ غیر چینیوں کو اپنے انسٹیٹیوٹ میں کیوں داخلہ دیتا ہے اور انہیں کیوں کنگفو سکھا رہا ہے۔ بات یہاں تک بڑھی کہ اسے لڑنے کا چیلنج دے دیا گیا۔ اس نے چیلنج قبول کرلیا۔ مقابلے کی شرط یہ تھی کہ اگر بروس لی ہارا تو اسے اپنے ادارے بند کرنے پڑیں گے اور اگر وہ جیت گیا تو مخالفین خاموش ہو جائیں گے۔ وونگ جیک مان اس کا مدمقابل تھا۔ ان کا مقابلہ شروع ہوا جس میں ابتدا ہی سے بروس لی کا پلہ بھاری تھا۔ یہ مقابلہ بمشکل تین منٹ تک جاری رہا جس کے بعد وونگ گر گیا۔ بروس لی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم ہار مانتے ہو۔“

وونگ نے بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہاں میں ہار مانتا ہوں“۔ یوں بروس لی کے مخالفین خاموش ہو گئے اور وہ بلا تفریق رنگ و نسل سب کو کنگفو کی تربیت دیتا رہا۔

اسے بوکسنگ سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اس میں وہ محمد علی کا پرستار تھا، وہ محمد علی کے مقابلوں کی فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ ان سے اسے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اس نے عام مارشل آرٹسٹ کی طرح ایک جگہ جم کر لڑنے کے بجائے ایک نیا انداز متعارف کروایا جو بوکسنگ سے ملتا جلتا تھا۔ یہ پیروں کی حرکات تھیں جنہیں اصطلاحاً فٹ ورک کہا جاتا ہے۔ بروس لی کو کنگفو کے اسٹائل ونگ چن کا ماہر تھا مگر اسے اس میں کچھ چیزوں پر اعتراض بھی تھا، یہ چیز اسے اس طرف لے گئی جس سے اس نے تاریخ رقم کردی۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک ایسا آرٹ ہو جو عام زندگی میں لڑنے میں بھی اتنا ہی مؤثر ہو جتنا نمائشی مقابلوں میں ہوتا ہے۔ کیونکہ نمائشی مقابلوں میں قوانین کی پابندی کرنی پڑتی ہے جبکہ عام زندگی میں لڑائی کا کوئی اصول نہیں ہوتا جسے عرف عام میں اسٹریٹ فائٹ کہا جاتا ہے۔ اس نے مختلف مارشل آرٹس کا جائزہ لیا اور ان سے اچھی تیکنکس اخذ کیں۔ ان کے ذریعے اس نے 1965 میں ووشو یا کنگفو میں ایک نیا اسٹائل متعارف کروایا جس کا نام جیت کونڈو رکھا۔ اس کے اصول تھے، سخت محنت اور مسلسل مشق کی جائے جس سے قابلیت، قوت برداشت، رفتار اور جسمانی لچک میں اضافہ ہو۔ اس نے اس سلسلے میں بوکسنگ، تائیکوانڈو اور دیگر اسٹائلز سے بھی استفادہ کیا اور جو چیزیں بہتر لگیں ان سب کو اپنے اسٹائل میں شامل کیا۔ اسی لیے اس کا کہنا تھا کہ ہمارا اسٹائل کوئی مخصوص اسٹائل نہیں ہے۔ یہ ایک نیا انداز تھا۔ اس نے روایتی طریقوں سے ہٹ کر نئے طریقے متعارف کروائے جو عام روایتی حدود و قیود سے ماورا تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت کے مارشل آرٹسٹ اپنی روایتی مشقوں سے ہٹ کر کچھ کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے اس نے اپنے اسٹائل میں تن سازی کا بھی اضافہ کیا۔ وہ ویٹ لفٹنگ کے ذریعے تن سازی پر بھی زور دیتا تھا جس سے بعض پٹھے جو عام مشقوں سے طاقتور نہیں بنتے وہ بھی مضبوط ہو جاتے۔ مگر وہ تن سازی کو ایک حد تک ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ اگر پٹھے زیادہ بڑے ہو جائیں جیسے پیشہ ور تن سازوں کے ہوتے ہیں تو رفتار اور لچک کو متاثر کرتے ہیں۔ آپ بروس لی کا جسم دیکھیں اس میں آپ کو سارے ہی پٹھے نظر آئیں گے جیسے پیشہ ور تن سازوں کے ہوتے ہیں مگر وہ بڑے اور باہر نکلے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ وہ مراقبے پر بھی زور دیتا تھا جس سے ذہنی قوت اور ارتکاز میں اضافہ ہوتا ہے۔

بروس لی اپنی خوراک پر بہت توجہ دیتا تھا۔ وہ اضافی لحمیات (ہائی پروٹین) والے مشروبات، حیاتین (وٹامنز) معدنیات (منرلز) کا استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسی خوراک سے پرہیز کرتا تھا جس میں چٹخارہ ہو مگر غذائیت نہ ہو جسے عرف عام میں جنک فوڈ کہا جاتا ہے اور جو آج ہم بہ افراط لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بروس لی چھنے ہوئے آٹے اور بیکری کی بنی اشیاء سے بھی دور رہتا تھا۔ وہ چینی کھانوں کا شوقین تھا۔ اس کی غذا میں ہمیشہ سبزیاں مچھلی چاول اور تازہ دودھ شامل ہوتے تھے۔ اس کا ماننا تھا کہ اسے ایسی خوراک لینی چاہیے جو اس کے بدن کو طاقت دے اور مضبوط کرے ورنہ ایسی خوراک کا کیا فائدہ جو اسے نقصان پہنچائے۔

اسے شروع سے ہی فلموں سے دلچسپی تھی مگر امریکا میں پانچ سال یعنی 1959 تا 1964 اس کی توجہ اپنے فن پر مرکوز رہی اس لیے فلموں کا خیال تک نہیں آیا۔ 1964 میں جب

اس نے لونگ بیچ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو ولیم ڈوزیئر نامی ہدایتکار نے اسے دعوت دی کہ اس کے ٹی وی شو "نمبر ون سن" میں کام کرے۔ اس نے ہامی بھرلی اور اوڈیشن بھی دے دیا مگر بدقسمتی سے یہ شو نہیں بن سکا۔

اس کے بعد 1966 میں اسے ایک اور شو "دا گرین ہورنیٹ" میں کام کرنے کی دعوت ملی۔ مگر اس میں مرکزی کردار وین ولیمز کا تھا بروس لی کو اس کے ماتحت کاتو کا کردار دیا گیا تھا۔ یہ شو ایک سیزن چلا اور چھبیس اقساط نشر ہوئیں۔

اسی دوران اس کی ملاقات کراٹے چیمپئن چک نورس سے ہوئی۔ چک امریکن تھا اس کی تاریخ پیدائش 10 مارچ 1940 تھی یعنی وہ بروس لی کا ہم عمر تھا۔ چک نورس کئی طرح کے فنون حرب کا ماہر تھا جن میں کراٹے، تائیکوانڈو اور جیوجتسو شامل تھے۔ وہ امریکی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور اب فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک ادارہ بنا کر لوگوں کو کراٹے سکھا رہا تھا۔ جب ان کی ملاقات ہوئی تو بروس لی گرین ہورنیٹ کی فلمبندی میں مصروف تھا اور چک نورس وہاں ایک مقابلے میں حصہ لینے آیا تھا۔ ان کی ملاقات ہوئی، پہلے تو دونوں ذرا لیے دیئے رہے مگر تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ چک نورس اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، رات کو کھانے کے بعد ہم باہم گفتگو کرتے کرتے بارہ بجے لفٹ سے نکل کر بروس لی کے کمرے میں آئے ہمارے درمیان مارشل آرٹس اور فلسفے کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا، اچانک میں نے دستی گھڑی کی طرف دیکھا تو صبح کے سات بج رہے تھے اور مجھے دو گھنٹے بعد مقابلے کے لیے جانا تھا۔ رات کیسے گزری کچھ پتا ہی نہ چلا۔ رخصت ہوتے وقت بروس لی نے کہا "اب جب ہم ملیں گے تو ساتھ کام کریں گے"۔ اور وہ وقت تین چار سال بعد آیا۔

بروس لی نے وین ولیمز کے ساتھ بیٹ مین ٹی وی سیریز کی تین اقساط میں خصوصی کردار بھی ادا کیے۔ ان کے علاوہ بروس لی نے تین ڈراموں میں بطور مہمان اداکار کام کیا "آئرن سائڈ" 1967 "ہیئر کم دا برائڈز" 1969 اور "بلونڈی" 1969۔

1969 کا سال اس کے لیے ایک اور خوشی لایا۔ 19 مارچ 1969 کو ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی یوں ان کا خاندان مکمل ہو گیا۔ بیٹی کا نام انہوں نے شینن لی رکھا۔

بروس لی کے دو مارشل آرٹس کے شاگرد اسٹرلنگ سیلفینٹ (Stirling Silliphant) اور جیمس کوبرن ہولیووڈ میں کہانی کار (اسکرپٹ رائٹر) تھے۔ 1969 میں ان تینوں نے مل کر ایک فلم کی کہانی پر کام کیا جس کا نام انہوں نے "دا سائیلنٹ فلیوٹ" رکھا۔ مگر اس وقت یہ کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی اس لیے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، حالانکہ بعد ازاں 1976 میں اسی خیال پر ایک فلم "سرکل اوف آئرن" کے نام سے بنی۔ 1969 میں ہی بروس لی نے اسٹرلنگ سیلفینٹ کی کہانی پر بنی فلم "مارلو" میں ایک چھوٹا سا کردار نبھایا۔ اسی سال اس نے ڈین مارٹن کی فلم "دا ریکنگ کرو" میں لڑائی کے مناظر کی ہدایت کاری کی۔ 1970 میں اس نے ایک اور فلم "آ ووک اِن دا اسپرنگ رین" میں فائٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔

13 اگست 1970 کا دن اس کے لیے ایک ڈراؤنے خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس روز بروس لی ٹیلیوژن کی صبح کی نشریات میں جسمانی ورزشیں دکھا رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ایک پیشہ ور کھلاڑی تھا مگر اس دن اس سے ایک چوک ہو گئی۔ وزن اٹھانے یا سخت جسمانی مشقیں کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مناسب حد تک بدن کو گرم کر لیا جائے اس کے لیے مخصوص ورزشیں ہوتی ہیں جو اس دن اس نے نہیں کیں اور ٹھنڈے بدن کے ساتھ وزن اٹھا لیا۔ اس وقت اس کا وزن ساٹھ کلو تھا اس نے ساٹھ ہی کلو وزن آٹھ بار سر سے اونچا اٹھا کر نیچے رکھا، یہ پہلا سیٹ تھا۔ جب وہ دوسرا سیٹ کر رہا تھا تو معاً اس نے اپنی کمر میں کچھ ٹوٹنے جیسی آواز سنی اور اس کے ہاتھوں سے وزن چھوٹ گیا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ آیندہ چند روز تک اس نے مالش اور درد کش دواؤں سے کام چلانے کی کوشش کی مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ تب لنڈا بضد ہو کر اسے اسپتال لے گئی جہاں ڈاکٹرز نے معائنے کے بعد کہا کہ "تمہاری ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی ہے۔ پیڑو سے متعلق رگ کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب آیندہ چھ مہینے تمہیں بستر پر گزارنے ہوں گے"۔

"ڈاکٹر میں ٹھیک تو ہو جاؤں گا نا"۔

"اگر تم نے مکمل آرام کیا تو ممکن ہے کافی حد تک ٹھیک ہو جاؤ اور چلنے پھرنے لگو۔"

"اور اپنی ورزشیں اور مشقیں کب سے شروع کر سکتا ہوں؟"

"بروس میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ مجھے افسوس

ہے کہ اب تم کنگفو سے دور رہو گے۔ تم کسی بھی قسم کی سخت ورزش یا مشق نہیں کر سکو گے بلکہ مجھے تو شک ہے کہ شاید تم ٹھیک سے چل بھی نہ سکو۔"

بروس لی کے لیے یہ سب سننا ایسا تھا جیسے اسے سزائے موت سنا دی گئی ہو۔ وہ مایوس ہو گیا اور شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ ایسے میں لنڈا نے بیوی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ وہ ہر طرح کوشش کر کے اس کا دل بہلاتی اس سے باتیں کرتی، اپنے آنسو اندر ہی اندر پی کر اس کو بہلاتی رہتی۔ یوں چھ ماہ گزر گئے بروس لی نے زیادہ تر وقت ایک خاص بستر پر جو اس کے لیے بنوایا گیا تھا گزارا یا کچھ عرصے بعد جب ڈاکٹرز نے اجازت دی تو ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر لائبریری میں گزارا۔ ان دنوں اس نے بہت مطالعہ کیا۔ چھ ماہ بعد اس کی فزیوتھراپی کا آغاز ہوا۔ جلد ہی اس نے اپنی جسمانی فٹنیس دوبارہ حاصل کر لی۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی جسمانی صلاحیت میں اضافہ کیا اور ڈاکٹرز کی تمام پیشگوئیاں غلط ثابت کر دیں۔ وہ نہ صرف ٹھیک سے چلنے لگا بلکہ پوری طاقت سے ککس بھی استعمال کرنے لگا۔ اچھل کود کے علاوہ کمر کی لچک بھی حاصل کر لی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو کر اپنا سر گھٹنوں سے لگا دیتا تھا اس حالت میں اس کا جسم دوہرا ہو کر رانوں سے چپکا ہوتا تھا۔ ڈاکٹرز اسے دیکھ کر حیران رہ گئے ان کا کہنا تھا کہ ایسا کیس اس سے پہلے کبھی ان کے مشاہدے میں نہیں آیا۔

1971 میں بروس لی نے سیلفینٹ کی ایک ٹی وی سیریز "لونگ اسٹریٹ" (Longstreet) کی چار اقساط میں کام کیا۔ اس میں اس نے مرکزی کردار مائیک لونگ اسٹریٹ کے استاد کا کردار ادا کیا تھا جو مائیک کو مارشل آرٹس سکھاتا ہے۔ اس نے اس میں ناظرین تک اپنا پیغام بھی پہنچایا کہ مارشل آرٹس کیا ہے اس کے فوائد اور اس کا فلسفہ کیا ہے۔ اس نے اس سیریز کے ذریعے جیت کونڈو کے بارے میں نام لے کر سمجھایا کہ یہ کیا ہے۔

بروس لی نے وارنر برادرز سے مل کر ان کے سامنے ایک ٹی وی سیریز کا خیال پیش کیا جس کا نام اس نے "دا واریئر" سوچا تھا اور اس میں اسی کو مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ یہ ایک ایسے شخص کا کردار تھا جو نسلاً چینی اور کنگفو کا ماہر ہوتا ہے مگر کاؤبوائے بننے کے شوق میں امریکا آتا ہے۔ وارنر برادرز نے اس پر اعتراض کیا کہ کاؤبوائے کا موضوع اب پرانا ہو چکا ہے اس کو جدید انداز میں بنائیں گے۔ مگر بروس لی اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا موضوع بنیادی طور پر مارشل

بروس لی کی ایک نظم

اپنی بیوی لنڈا کے لیے

برف

نوجوان آدمی تمہارے وقت کی

ہر منٹ پر قبضہ کر لیتا ہے

دن تیزی سے گزر رہے ہیں

جلد تم بھی بڑی ہو جاؤ گی

اگر تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں تو صحن میں دیکھو

جو گھاس کبھی سبز تھی اس پر کس طرح سے

سرد سفید برف بے رحمی سے چمک رہی ہے

کیا تم نہیں دیکھتے کہ تم اور میں

ایسے ہیں جیسے ایک ہی درخت کی شاخیں

تمہاری خوشی سے میری ہنسی ہے

تمہاری اداسی

میری آنکھوں میں آنسو بھر دیتی ہے

کیا زندگی تمہارے اور میرے پیار کے

علاوہ کچھ ہو سکتی ہے

وہ بہت ہی اہم شخصیت جس کا میں شکریہ

ادا کرنا چاہوں گا

ایک معیاری انسان، سراپا عطا

پیار کرنے والی، وفادار

اس جانور بروس لی کو سمجھنے والی اور

اسے وہی رہنے دینے والی جو یہ اصل میں ہے۔

میری ساتھی جو ہمارے الگ مگر

متصل راستوں کی ہمراہی ہے

میری زندگی کا ایک مستحکم اور بنیادی پہلو

وہ عورت جسے میں پیار کرتا ہوں اور

جو میری خوش قسمتی ہے، وہ میری بیوی ہے

☆☆☆

آرٹس ہے۔ اس لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر وارنر برادرز والے نہ مانے۔ یوں یہ معاملہ بھی ٹھپ ہو گیا۔ مگر بعد میں وارنر برادرز نے بروس لی کے ہی خیال کو لے کر ایک ٹی وی سیریز Kung Fu کے نام سے بنائی اس میں مرکزی کردار ڈیوڈ کیراڈائن نے ادا کیا جو درحقیقت کنگفو نہیں جانتا تھا۔ وارنر برادرز نے اس میں کہیں بھی بروس لی کو اس کا کریڈٹ نہیں دیا۔ 1973 میں اسی موضوع پر ایک فلم "فائٹنگ فسٹس آف شنگھائی جو" بھی بنائی گئی تھی (یہ فلم پاکستان میں "فائٹنگ فسٹس" کے نام سے ریلیز ہوئی تھی) اس میں مرکزی کردار چن لی نے ادا کیا تھا۔

بروس لی اب ہالی ووڈ والوں کے متعصبانہ رویے سے تنگ آچکا تھا جو اسے کبھی کبھار ثانوی کردار دے رہے تھے۔ اس کے خواب اونچے تھے وہ ایک سپر اسٹار بننا چاہتا تھا۔ اسی لیے جب اس کے دوست فلمساز فریڈ وینٹروب نے اسے مشورہ دیا کہ "لی تم بہت اچھے اداکار ہو تمہارے اندر بہت صلاحیت ہے مگر یہاں تمہیں ضائع کیا جا رہا ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہانگ کانگ واپس جاؤ اور وہاں کی فلموں میں کام کرو۔ اور کوئی ایسی فلم بناؤ جس کی میں امریکا میں بھی نمائش کروا سکوں۔ اس کے بعد تم ایک کامیاب ہیرو کے طور پر واپس ہالی ووڈ آؤ۔"

بروس لی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ اس نے کہا "فریڈ، تم انتظار کرو، اور دیکھنا میں ایک دن دنیا کا سب سے بڑا چینی اسٹار بن کر دکھاؤں گا۔"

اس نے لنڈا سے بات کی اور بیوی بچوں کے ساتھ ہانگ کانگ کا رخ کیا۔

جب وہ ہانگ کانگ پہنچا تو وہاں ایک حیرت اس کی منتظر تھی اسے ایئرپورٹ پر ہی لوگوں نے پہچان کے کاتو کاتو کے نعرے لگانے شروع کر دیے، وہ اس کے ساتھ کسی ہیرو کی طرح برتاؤ کر رہے تھے۔ اس کی حیرانی تب دور ہوئی جب اسے بتایا گیا کہ اس کی ٹی وی سیریز "دا گرین ہورنیٹ" یہاں بھی چلی تھی اور بہت کامیاب رہی تھی۔ یہاں کے لوگ انگریزی سیریز میں اپنے ایک ہم وطن کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔

اس نے وہاں فلمساز اداروں سے بات کی اور گولڈن ہارویسٹ کے ساتھ دو فلموں کا معاہدہ کر لیا۔ اسے ان فلموں کا معاوضہ صرف پندرہ ہزار ڈالر فی فلم ملا۔ ان دونوں فلموں میں اس کا کردار ایک ناراض نوجوان کا تھا۔

اس سے پہلے ہانگ کانگ میں مارشل آرٹس کے موضوع پر جو فلمیں بنی تھیں ان میں اصلی مارشل آرٹس کے علاوہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ وہ لوگ بارہ مسالے کی چاٹ بناتے تھے۔ عجیب و غریب جنگیں محیر العقول واقعات، ایک ایک آدمی پوری پوری فوج سے اکیلا لڑ رہا ہے۔ چھلانگ لگاتا ہے تو سپرمین کی طرح اڑتا چلا جاتا ہے طلسمی واقعات وغیرہ وغیرہ۔

گولڈن ہارویسٹ کے ریمنڈ چاؤ نے بروس لی کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی فلم کی تجویز رکھی۔ مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

"چاؤ میں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ ایسی مسالا فلمیں بناؤں۔ میں لوگوں کو حقیقت دکھانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں لوگ مارشل آرٹس کو سمجھیں کہ وہ کیا ہے۔ یوں سمجھو میری فلمیں ایک طرح سے مارشل آرٹس کی ترویج کے لیے ہیں۔ اس کو دنیا سے متعارف کروانے کے لیے ہیں۔ اس لیے تم ایسی کہانی لاؤ جو حقیقت سے قریب تر ہو اور اس میں مارشل آرٹس کے اصلی مناظر دکھائے جاسکیں۔

چاؤ نے اس کی تجویز مان لی۔ مگر اس کے اصرار پر ان فلموں میں ایسے مناظر رکھنے پڑے جن میں ہیرو کو کئی کئی لوگوں سے اکیلے لڑتے دکھایا گیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود بروس لی کو اس کی اتنی بات ماننی پڑی۔ اس نے سوچا "یہ ابتداء ہے مجھے زیادہ بحث نہیں کرنی چاہیے جب میرے پیر جم جائیں گے پھر انہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔" اب بروس لی نے لووی کے ساتھ مل کر اپنی پہلی فلم کی کہانی لکھی۔ اس کا نام "دا بگ بوس" رکھا گیا۔

بگ باس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ چانگ چاؤ آن چین کا رہنے والا ایک ایسا نوجوان ہے جو کنگفو کا ماہر ہے اور بہت غصہ ور ہے۔ وہ کسی کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا، اس لیے اس کی ماں اسے اس کے رشتے کے بھائی کے پاس تھائی لینڈ بھیج دیتی ہے۔ جانے سے پہلے اس کے گلے میں ایک پتھر کا تعویز ڈال دیتی اور اس سے قسم لیتی ہے کہ وہ وہاں کسی سے نہیں لڑے گا اور خود کو کسی مشکل میں نہیں ڈالے گا۔ یہ تعویز اس قسم کی یاد دلاتا رہے گا۔ (یہاں تک یہ کہانی اس کی اصلی کہانی سے ملتی ہے۔ وہ بھی اپنی لڑائی مار کٹائی کی وجہ سے ہانگ کانگ سے امریکا بھیجا گیا تھا)۔ وہ تھائی لینڈ اپنے رشتے دار سوچن (جیمس تین) کے پاس آرہا تھا جو ایک برف کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ چانگ کو چھوڑنے اس کا ایک بزرگ ساتھ ہوتا ہے۔ تھائی لینڈ پہنچ کر وہ ایک اسٹال پر شربت پینے رک جاتے ہیں (شربت بیچنے والی کا کردار خوبرو چینی اداکارہ نورا

میاؤ نے ادا کیا تھا جو آیندہ دو فلموں میں اس کے ساتھ ہیروئن آئی تھی)۔ وہاں شربت پیتے ہوئے کچھ غنڈے آجاتے ہیں اور فوراً اسے بدتمیزی کرنے لگتے ہیں چانگ غصے سے اٹھنے لگتا ہے تو بزرگ اسے تعویز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی قسم یاد دلاتا ہے تو وہ مجبوراً بیٹھ جاتا ہے۔ اتنے میں سوچن کا چھوٹا بھائی بھی وہاں آجاتا ہے وہ غنڈے اس کا سامان بھی گرا دیتے ہیں اور مارنے لگتے ہیں۔ ابھی یہ سب چل رہا ہوتا ہے کہ سوچن وہاں آجاتا ہے اور غنڈوں کو مار بھگاتا ہے۔ یہاں ان کی ملاقات ہوتی ہے وہ بزرگ چانگ کو سوچن کے حوالے کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ سوچن ایک بڑے سے گھر میں رہتا ہے جہاں اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی، بہن چاؤ کی (ماریا یی) اور دیگر رشتہ دار رہتے ہیں جو اسی برف کے کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ سوچن چانگ کو بھی وہیں کام دلوا دیتا ہے۔ پہلے ہی دن چانگ کی غلطی سے برف کی ایک سل گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے دو رشتہ دار جو ساتھ کام کر رہے تھے ٹوٹی ہوئی سل کے پاس جاتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ سل میں سے پلاسٹک کی تھیلیاں نکلی ہیں جن میں سفید پاؤڈر بھرا ہوا ہے۔ ابھی وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ فورمین آکر تھیلیاں ان سے چھین لیتا ہے اور ڈانٹ کر کام پر جانے کو کہتا ہے۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو فورمین ان دونوں کو منیجر کا پیغام دیتا ہے کہ اس سے مل لیں۔ اصل میں یہ کارخانہ برف کی آڑ میں منشیات کی ترسیل کر رہا تھا۔ اس کا مالک سیاؤمی (ہان ینگ چی) تھا جو بگ باس کہلاتا تھا۔ منیجر ان دونوں کو برف کی آڑ میں منشیات کی ترسیل کے بارے میں بتاتے ہوئے تعاون کرنے کے لیے کہتا ہے اور بڑی رقم کی پیشکش کرتا ہے مگر وہ اس پر راضی نہیں ہوتے اور اٹھ کر جانے لگتے ہیں تو انہیں قتل کر کے لاشیں غائب کر دی جاتی ہیں۔ جب وہ واپس نہیں پہنچتے تو سوچن کو تشویش ہوتی ہے۔ وہ ان کی تلاش میں ایک اور کزن کے ساتھ بگ باس کے احاطے جا پہنچتا ہے۔ بگ باس انکار کرتا ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم مگر سوچن کو شبہ ہو جاتا ہے وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ اگر ان کا پتا نہیں چلا تو وہ پولیس سے رابطہ کرے گا۔ بگ باس اپنے آدمیوں کے ذریعے سوچن اور اس کے ساتھی کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ یہاں جب سب کو پتا چلتا ہے کہ سوچن بھی لاپتا ہو گیا ہے تو وہ کارخانے میں کام بند کر کے احتجاج شروع کر دیتے ہیں ان کو سبق سکھانے کے لیے بگ باس غنڈے بھیجتا ہے وہ مزدوروں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ چانگ الگ کھڑا سب دیکھ رہا ہوتا ہے مگر قسم کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے۔ لڑائی کے دوران اتفاق سے ایک شخص چانگ سے ٹکرا جاتا ہے جس سے اس کا تعویز ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر چانگ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے اور سب کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بالآخر یہ مسئلہ نمٹانے کے لیے چانگ کو فورمین بنا دیا جاتا ہے تو مزدور خوش ہو جاتے ہیں مگر منیجر چانگ کو دعوت پر بلا کر شراب پلا دیتا ہے اور ایک طوائف سون کے حوالے کر دیتا ہے۔ صبح ہوش میں آکر چانگ گھبرا کر وہاں سے نکلتا ہے تو چاؤ کی وہاں اسے دیکھ لیتی ہے۔ گھر میں سب چانگ سے ناراض ہو جاتے ہیں، وہ اسے طعنے دیتے ہیں کہ فورمین بن کر اس کا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے وہ سوچن کے لیے کچھ کرنے کے بجائے دشمنوں کے ساتھ عیاشی میں مصروف ہے۔ چانگ پریشان ہو کر طوائف سون کے پاس پہنچتا ہے، وہ ہمدردی میں اسے سمجھاتی ہے کہ بگ باس کے ساتھ رہنے میں اس کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے، وہ منشیات کا کام کرتا ہے۔ چانگ وہاں سے نکل جاتا ہے۔ چانگ کے جاتے ہی بگ بوس کا بیٹا چیون (ٹونی لیو) وہاں پہنچ کر سون کو قتل کر دیتا ہے اور اس کی لاش کو کارخانے میں برف میں چھپا دیتا ہے وہیں باقی کی چار لاشیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ چانگ سون کی بات کی تصدیق کے لیے رات کے وقت کارخانے میں داخل ہو کر برف جمانے والے شعبے میں گھس جاتا ہے۔ وہاں اس کو سب لاشیں مل جاتی ہیں۔ اسی وقت چیون سیاؤ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آجاتا ہے۔ چانگ غصے میں بھرا ہوا ان سے ٹکرا جاتا ہے اور سب کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے تو وہاں تقریباً سارے ہی لوگوں کی لاشیں اس کی منتظر ہوتی ہیں جبکہ چیاؤ کی غائب ہوتی ہے۔ وہ سیدھا بگ باس کے احاطے پر پہنچتا ہے اور اس کے آدمیوں کو قتل کرتے ہوئے اس تک پہنچتا ہے۔ اس دوران بگ باس کے ظلم سے اکتائی ہوئی ایک عورت چیاؤ کو آزاد کر دیتی ہے۔ چیاؤ سیدھی پولیس تک پہنچ کر انہیں لے آتی ہے مگر اس دوران چانگ بگ باس کو بھی ایک مشکل مقابلے کے بعد مار چکا ہوتا ہے۔ فلم کے آخری منظر میں وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔

بروس لی خود بھی فلم کے افتتاحی شو میں موجود تھا جب فلم کا آخری منظر ختم ہوا اور اختتام کے الفاظ نمودار ہوئے تو سنیما میں اتنی خاموشی تھی کہ اگر سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ بروس لی کے حواس گم ہونے لگے اس کا مطلب لوگوں کو فلم پسند نہیں آئی۔ چند منٹ یونہی گزرے اچانک ایک جانب سے

تالیوں کی آواز شروع ہوئی اور پھر تو جیسے ہال میں طوفان سا آ گیا۔ تالیاں سیٹیاں نعرے اتنا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لوگوں نے فلم کو پسندیدگی کی سند پہلے ہی شو میں دے دی۔ جب سب باہر نکلے تو ان کی نظر بروس لی پر پڑی جو ابھی تک وہاں موجود تھا بس پھر کیا تھا ہجوم ایک عالم وارفتگی پر آگے بڑھا اور انہوں نے بروس لی کو کندھوں پر اٹھا کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ لنڈا بھی ایک جانب کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے آخر آج اس کے محبوب شوہر کی آرزو پوری ہوئی تھی، اور وہ ایک عام اداکار سے بلند ہو کر سپر اسٹار بن گیا تھا۔

فلم ”دا بگ باس“ 1971 میں منظر عام پر آئی جس نے اسے راتوں رات مقبول ترین ستارہ بنا دیا۔ اس میں اس نے نہ صرف مارشل آرٹس کے جوہر دکھائے تھے بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ بہت اچھا اداکار بھی ہے۔ ”دا بگ باس“ نے ہر جگہ کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔

لووی بروس لی کا مقصد سمجھ چکا تھا کہ وہ کس قسم کی کہانی پسند کرتا ہے، اس لیے اگلی کہانی اس نے لکھ کر بروس لی سے مشاورت کی۔ بروس کو کہانی پسند آئی۔ اس کا نام ”فسٹ اوف فیوری“ تجویز ہوا۔ اس فلم میں سابقہ فلم میں مختصر کردار ادا کرنے والی نورا میاؤ کو ہیروئن کا کردار دیا گیا۔ نورا کا تعلق ہانگ کانگ سے تھا اور وہ گولڈن ہارویسٹ کی فلموں میں کام کرتی تھی۔ ٹونی لیو اور جیمس تین کو بھی اہم کردار دیے گئے۔ ان کے علاوہ اس میں بروس لی نے اپنے ایک دوست اور شاگرد روبرٹ بیکر کو بھی امریکا سے بلا کر ایک کردار دیا تھا۔ چونکہ فلم چینی زبان میں بن رہی تھی اس لیے بیکر کے مکالمے بروس لی نے اپنی آواز میں کینٹنیز زبان میں ڈب کروائے۔

اس فلم کی کہانی بیسویں صدی کے اوائل کے دور پر لکھی گئی تھی جب چین کمزور تھا اور جاپان نے اس پر پنجے گاڑ رکھے تھے۔

یہ فلم 1972 میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس نے بوکس آفس پر سابقہ فلم کا ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ لوگ اب اس کے دیوانے ہو چکے تھے۔ اس کا سپر اسٹار بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو چکا تھا۔ اب وہ کوئی عام سا اداکار نہیں تھا جو ثانوی کردار ادا کرتا۔۔۔اب وہ سپر اسٹار تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتے تھے۔

اس فلم کے ساتھ ہی اس کا معاہدہ گولڈن ہارویسٹ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب وہ اس حیثیت میں تھا کہ نیا معاہدہ اپنی منہ مانگی شرائط پر کر سکے۔ مگر بروس لی نے نیا معاہدہ گولڈن ہارویسٹ کے ساتھ کرنے کے بجائے اپنا فلمساز ادارہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو گولڈن ہارویسٹ کے ریمنڈ چاؤ نے اسے شراکت داری کی پیشکش کر دی۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے آمادگی کا اظہار کر دیا یوں وہ ایک بڑے فلمساز ادارے کا شریک بن گیا جس کا نام ”کونکورڈ پروڈکشن انکورپوریٹڈ“ رکھا گیا اور اس کے بینر تلے نئی فلم ”وے اوف دا ڈریگن“ کا اعلان کر دیا گیا۔

یہ پہلی فلم تھی جو پوری طرح اس کے اختیار میں تھی۔ وہ اس فلم کا فلمساز، ہدایت کار، کہانی کار، فائٹ ڈائریکٹر اور ہیرو تھا۔ صحیح معنوں میں اب اس کو موقع ملا تھا کہ اپنی مرضی کے مطابق فلم بنائے۔ اس فلم کی فلمبندی روم میں ہونا تھی اور آخری خصوصی مقابلہ کلوزیم میں ہونا تھا۔ یہ بہت اہم مقابلہ تھا اس لیے بروس لی نے اپنے دیرینہ دوست چک نورس کو یاد کیا۔

چک نورس کا کہنا ہے ”ہماری ملاقات کے قریباً تین سال بعد ایک دن مجھے ہانگ کانگ سے کال آئی۔“ ”ہائے چک میں بروس لی بول رہا ہوں“۔

”ہاں بروس کہو کیسے ہو اور کیا کر رہے ہو“۔

”کرنا کیا ہے بھئی وہی فلموں میں اداکاری۔ یہاں میں نے دو بلاک بسٹر فلمیں بنائی ہیں اور اب تیسری فلم بنانے جا رہا ہوں جس کا نام وے اوف دا ڈریگن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس میں تمہارے ساتھ ایک ایسا فائٹ سین کروں جو یادگار بن جائے۔“

”ضرور کیوں نہیں، اگر تم کہتے ہو تو میں تیار ہوں۔ اب تمہارے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑے گا۔“

اور بلاشبہ یہ ایک ایسا مقابلہ تھا جسے ہر وہ شخص جس نے یہ فلم دیکھی ہو، آج اتنے سال گزرنے پر بھی نہیں بھلا سکا۔ ایک انٹرویو میں چک نورس سے پوچھا گیا ”یہ فائٹ کس نے ترتیب دی تھی آپ نے یا بروس لی نے؟“

”ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے ہم نے جو سوچا ایک دوسرے کو بتا دیا، میں نے کہا میں یہ اور یہ کروں گا، بروس نے کہا ٹھیک ہے میں ایسے اور ایسے کروں گا۔ ہم نے ایک طرح سے فری اسپارنگ کی یعنی آزاد مقابلہ کیا۔“

یوں یہ مقابلہ فلم کی تاریخ کے چند یادگار ترین مقابلوں میں سے ایک بن گیا۔

چک نورس کے علاوہ اس کے سابقہ دو فلموں کے ساتھی اداکاروں میں ٹونی لیو اور نورا میاؤ اس میں بھی تھے۔ ان کے

علاوہ پچھلی فلم میں ترجمان کا کردار کرنے والے پولی وی بھی کو بھی ایک خاص کردار دیا گیا تھا، وہ مافیا بوس کا خاص ماتحت ہوتا ہے۔ اس کے بات کا انداز اور حرکتیں خواجہ سراؤں کی سی ہوتی ہیں۔ اس فلم کے لیے بروس لی نے ہولی ووڈ سے چک نورس کے علاوہ روبرٹ وال کو بھی بلایا تھا۔ روبرٹ ایک کراٹے چیمپئن تھا اس کا اپنا ادارہ تھا جسے بعدازاں اس نے چک نورس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس نے فلموں میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔

بروس لی نے اس فلم کی کہانی روم کے پس منظر میں لکھی تھی۔ اس سے پہلے کی دونوں فلموں میں وہ ناراض نوجوان کا کردار کر چکا تھا، وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایسے ہی کردار کرتا رہا تو ان کے لیے ہی مخصوص ہو کر رہ جائے گا اس لیے اس بار اس نے اپنے لیے ایک ایسا کردار لکھا جو سابقہ کرداروں سے کافی مختلف تھا ایک سیدھا سادہ گاؤں کا رہنے والا ان پڑھ مگر طاقتور اور ماہر لڑاکا۔ اس میں اس نے مزاح کی چاشنی بھی رکھی اور ایسے ایسے مناظر فلمائے جو فلم بین کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

یہ فلم 1972 میں نمائش پذیر ہوئی اور جیسا کہ توقع تھی، انتہائی کامیاب رہی۔ لوگوں نے اسے اس نئے انداز میں بھی بہت پسند کیا۔ اس فلم نے یادگار بزنس کیا اور بروس لی کا نام ایسا چھا کہ ہالی ووڈ میں بھی اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ وہی وورنر برادرز جنہوں نے ایک روز اسے مسترد کر دیا تھا اب اسے مرکزی کردار میں لے کر فلم بنانے کا منصوبہ بنانے لگے تھے۔

1972 کے اگست تا اکتوبر بروس لی اپنی نئی فلم کی عکسبندی میں مصروف رہا جس کا نام ”گیم اوف ڈیتھ“ رکھا گیا تھا۔ اس کی کہانی بھی بروس لی نے خود ہی لکھی تھی۔ اس نے اس فلم کے چند اہم مناظر اور اختتامی لڑائی کے مناظر فلمبند کر لیے تھے۔ جس میں سات فٹ دو انچ لمبے امریکی باسکٹ بول کھلاڑی کریم عبدالجبار کے ساتھ مقابلے کے مناظر بھی شامل تھے۔ کریم بھی اس کا شاگرد تھا۔ اس کے علاوہ اس کا دوسرا شاگرد ڈوان انوسانتو جو اس کے بعد اس کے ادارے کو چلانے والوں میں اہم حیثیت کا حامل تھا اور 7 ڈان ہیپ کیڈو ماسٹر ہان جائے ہی کے ساتھ مقابلے کے مناظر بھی شامل تھے۔ اس میں اس کے ساتھی کی حیثیت سے جیمس تین اور ایک اور اداکار ساتھ تھے۔

مگر اچانک نومبر 1972 میں امریکی ادارے وورنر برادرز نے ایک فلم کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انہوں نے گولڈن ہارویسٹ سے بات کی۔ ان کے درمیان مشترکہ فلمسازی کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس فلم کا نام ”انٹر دا ڈریگن“ رکھا گیا۔ اس میں امریکی اداکار جم کیلی، جون سیکسن اور روبرٹ وول بھی اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ منفی یعنی ویلن کا کردار شیھ کین نے ادا کیا تھا۔ جم کیلی ایک سیاہ فام امریکی تھا وہ مڈل ویٹ کراٹے چیمپئن رہ چکا تھا۔ اس کا اپنا ڈوجو تھا جہاں ہولیووڈ کے کئی لوگ اس سے کراٹے کی تربیت لینے آتے تھے۔ جون سیکسن ایک اطالوی نژاد امریکی تھا۔ اور کافی کم عمری سے فلموں میں کام کر رہا تھا (1978 میں جون نے ایک فلم شالیمار میں کام کیا تھا یہ ہالی ووڈ اور بولی ووڈ کی مشترکہ فلم تھی۔ اس کا ہیرو دھرمیندر تھا)۔

اس دن بروس لی بہت خوش تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر لنڈا کو بانہوں میں لے کر گھماتے ہوئے گنگنانا شروع کر دیا۔ لنڈا بولی۔ ”کیا بات ہے آج اتنے خوش نظر آ رہے ہو؟“

”ہاں آج میں بہت خوش ہوں بہت خوش۔“

”ایسا کیا ہو گیا۔“

”تمہیں یاد ہے جب ہم امریکا میں تھے تو میں۔۔۔ برادرز کو ایک سیریز بنانے کی پیشکش کی تھی؟“

”ہاں میں کیسے بھول سکتی ہوں تم اس دن بہت۔۔۔ تھے اور غصے میں بھی تھے۔“

”جانتی ہو، آج وہی وورنر برادرز ہانگ کانگ آئے ہیں میرے لیے۔ وہ مجھے فلم کی پیشکش کر رہے ہیں۔“

”سچ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

”ہاں یہ میرا دیرینہ خواب تھا جو اب پورا ہونے جا رہا ہے۔ یہ فلم مجھے دوبارہ امریکا پہنچا دے گی۔ میرے لیے ہالی ووڈ کے دروازے کھل گئے ہیں۔“

اس کی فلمبندی جنوری 1973 میں ہانگ کانگ میں شروع ہوئی۔ اس اہم منصوبے کی وجہ سے زیر تکمیل فلم گیم اوف ڈیتھ کو التواء میں ڈال دیا گیا۔

اینٹر دا ڈریگن کی کہانی مائیکل الین نے لکھی تھی۔

اینٹر دا ڈریگن کو تیزی سے مکمل کیا گیا۔ اس فلم پر 1973 میں آٹھ لاکھ پچاس ہزار ڈالر کی لاگت آئی تھی جو آج کے حساب سے کئی ملین بنتے ہیں۔ اس فلم کی نمائش کے لیے 26 جولائی 1973 کا دن مقرر کیا گیا۔ مگر بروس لی کے پاس جیون کی نقدی ختم ہو چکی تھی۔

10 مئی 1973 کو وہ ہانگ کانگ میں اینٹر دا ڈریگن کی ڈبنگ کر رہا تھا۔ آرام کے وقفے میں وہ ایک ریستوران

چلا گیا وہاں اچانک اس کے سر میں شدید درد اٹھا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ اسے فوری طور پر ہانگ کانگ کے بپٹسٹ اسپتال لے جایا گیا۔ وہ بے ہوش تھا، لنڈا اس کے ساتھ تھی۔ وہ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے اس کا معائنہ کیا، مختلف ٹیسٹ اور ایکس ریز کیے جس کے بعد اسے دماغی ورم تشخیص کیا۔ ڈاکٹرز نے میننول کے ذریعے ورم کم کرنے کی کوشش کی۔ جس سے اسے افاقہ محسوس ہوا۔ لنڈا نے ڈاکٹرز سے پوچھا کہ یہ تکلیف کس وجہ سے ہوئی ہے تو وہ یہ بتانے سے قاصر رہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے لنڈا کو بتایا "مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے [illegible] میں ہوں [illegible] سنائی [illegible]

[illegible]

[illegible] اس دن دو بجے وہ پھر [illegible]

[illegible] یہاں ان [illegible] گیم آف ڈیتھ [illegible] متعلق گفتگو ہوئی کہ اب اسے مکمل کرلینا چاہیے۔ وہ چار بجے تک وہاں رہے۔ اس کے بعد وہ دونوں بروس لی اور ریمنڈ چاؤ ہانگ کانگ میں مقیم تائیوان کی اداکارہ بیٹی تنگ پی کے ہاں پہنچے۔ وہاں تینوں گیم آف ڈیتھ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس فلم کی ہیروئن بیٹی تھی، مگر وہ رومینٹک ہیروئن نہیں تھی بلکہ وہ بروس لی کی بہن کا کردار کر رہی تھی۔ ویسے بھی دیکھیں تو ان پانچ فلموں میں سے صرف ایک فلم فسٹ آف فیوری ایسی تھی جس میں تھوڑا رومانس تھا۔ نورا میاؤ اس کی ہیروئن تھی۔ اس کے علاوہ کسی بھی فلم میں اس نے اپنا نہیں دکھایا ہیروئن ہوتی تھی تو اس سے محض دوستی یا رشتہ داری ہوتی تھی جس میں رومانس کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ وہ تینوں فلم کی کہانی پر کام کرتے رہے۔ پھر ریمنڈ چاؤ ڈنر کے لیے تیاری کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ "میں ذرا دیر میں تیار ہو کر ریسٹوران پہنچ جاؤں گا تم بھی وقت پر آجانا۔"

ساڑھے سات بجے اچانک بروس لی نے شدید سر درد کی شکایت کی تو بیٹی نے اسے اپنا ایکویجسک اور اینکوجسک کی گولیاں دیں۔ اس [illegible] میں اسپرین بھی تھی اور وہ مسکن بھی تھی۔ دوا کھا کر وہ آرام کرنے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ وقت پر ریسٹوران نہ پہنچا تو ریمنڈ چاؤ کو تشویش ہوئی اس نے بیٹی کو فون کیا تو بیٹی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ریمنڈ پریشانی کی حالت میں بیٹی کے گھر پہنچ گیا۔ انہوں نے بروس لی کو آوازیں دیں، اسے جھنجوڑا مگر وہ نہیں جاگا تب انہیں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ ریمنڈ نے فوراً ایک ڈاکٹر کو طلب کرلیا اس نے آکر بروس لی کا معائنہ کیا اور کہا "مجھے لگتا ہے یہ گہری بے ہوشی یا کوما میں ہے اسے فوراً اسپتال پہنچنا ہے۔" چاؤ نے ایمبولنس طلب کرلی، ساتھ ہی اس نے لنڈا کو بھی فون پر آگاہ کر [illegible] بے ہوش [illegible]

[illegible] ایمبولنس [illegible]

[illegible] ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

[illegible] آگاہ کیا [illegible]

[illegible] موت [illegible]

[illegible] تو اس نے جسم [illegible] واضح [illegible]

[illegible] ورم سے پتا چلا کہ [illegible] دماغ [illegible]

بڑا ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے جسمانی نظام پر [illegible] کا اثر بھی ملا۔ 15 اکتوبر 2005 کو ریمنڈ چاؤ نے ایک انٹرویو میں کہا کہ بروس لی کو مسکن دوا کے ری ایکشن نے موت کے منہ میں پہنچا دیا تھا۔

وہ اپنی کامیاب ترین فلم کی نمائش سے صرف چھ دن قبل اچانک موت کا شکار ہوگیا۔ یہ خبر پھیلتے ہی ہر طرف ایک کہرام سا مچ گیا۔ کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سچ ہے۔ ہانگ کانگ میں تو گویا ہر کسی پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی ہر لب پر نالے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا کا شور تھا۔ پہلے پہل سب نے بیٹی تنگ پی کو مورد الزام ٹھہرایا کہ اس نے بروس لی کو قتل کیا ہے۔ بیٹی کے لیے باہر نکلنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کی اچانک موت نے کئی طرح کی افواہوں کو بھی جنم دیا، کچھ کا کہنا تھا کہ اس کے قتل میں ہالی وڈ کے متعصب لوگوں کا ہاتھ ہے، کچھ کا کہنا تھا کہ جن لوگوں نے مختلف مقابلوں میں اس سے شکست کھائی ہے وہ اس کی موت میں ملوث ہیں۔ کچھ کا کہنا تھا اس کی بے پناہ قوت ہی اس کی دشمن ثابت ہوئی اس کا دماغ اس کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے کام چھوڑ گیا وغیرہ۔ مگر جیسا کہ اس کے گھر والوں کا ماننا ہے سچ یہی ہے کہ اس کی موت دوا کے ردعمل سے واقع ہوئی تھی۔

بروس لی کے تابوت کو تیار کرکے ہانگ کانگ میں دیدار عام کے لیے رکھ دیا گیا جہاں ہزاروں لوگوں نے قطار میں کھڑے ہو کر باری باری اپنے محبوب ہیرو کا آخری دیدار کیا۔ اس دن سارا ہانگ کانگ بند تھا ہر شخص کا رخ بروس لی کی رہائش گاہ کی طرف جارہا تھا۔ اس کی بیوہ لنڈا اور بچے آٹھ سالہ برانڈن اور چار سالہ شینن مخصوص لباس میں ملبوس ایک طرف بیٹھے تھے۔ سڑکوں پر عوام کا اور آخری دیدار کے لیے آنے والوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سب کا یہ حال تھا کہ آنکھیں نم تھیں کچھ سسکیاں بھر رہے تھے، کچھ زار و قطار رو رہے تھے۔ اس دن پتا چلا کہ لوگ اسے کس قدر چاہتے ہیں مگر افسوس یہ مناظر دیکھنے کے لیے وہ خود موجود نہیں تھا۔ یہ آخری دیدار کے مناظر اس کی آخری فلم گیم آف ڈیتھ میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد لنڈا بروس لی کی نعش کو سیاٹل لے گئی اور وہاں 25 جولائی 1973 کو لیک ویو قبرستان میں اس کی تدفین ہوئی۔ اس تدفین میں معروف فلمی، سماجی اور مارشل آرٹس سے متعلق شخصیات نے شرکت کی جن میں تاکی کیمورا، سٹیو میک کوئن، جیمس کوبرن، چک نورس، جارج لیزنبی، ڈان انوساٹو، پیٹر چن اور بروس لی کا بھائی رابرٹ لی بھی شامل تھے۔

انٹر دا ڈریگن ریلیز ہوئی اور اس نے تاریخی کامیابی حاصل کی امریکا میں سینماؤں پر کھڑکی توڑ رش تھا۔ لوگ یہ فلم دیکھ کر دیوانے سے ہوگئے تھے ہر جگہ بروس لی کے چرچے تھے اس کا مارشل آرٹ اور اس کی لاجواب اداکاری دیکھنے والوں پر سحر طاری کردیتی تھی۔ یہ امریکا میں ملنے والی وہ کامیابی تھی جس کے خواب بروس لی اپنی زندگی میں دیکھا کرتا تھا مگر افسوس کہ جب اس کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تو وہ یہ تاریخی لمحات دیکھنے کے لیے اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس فلم نے دنیا بھر سے دو سو ملین ڈالر سے زائد کمائے۔ اور دنیا بھر کو کنگ فو کا دیوانہ بنا دیا۔ چھوٹے سے جزیرے ہانگ کانگ کی فلمی صنعت نے اتنی ترقی کی کہ ایک وقت میں وہ ہالی وڈ سے بھی آگے نکل گیا۔ اس ساری کامیابی کے پیچھے بروس لی اور انٹر دا ڈریگن تھے جنہوں نے فلم بینوں کو مسحور کردیا تھا۔ ہانگ کانگ میں اس کی اچانک موت کی وجہ سے اس فلم کی نمائش ایک ماہ کی تاخیر سے کی گئی تھی۔

اب گولڈن ہارویسٹ کی توجہ گیم آف ڈیتھ کی طرف ہوگئی جس کی تقریباً سوفٹ کی شوٹنگ ہوچکی تھی۔ وہ انٹر دا ڈریگن کی طرح گیم آف ڈیتھ کا بھی سب کچھ بروس لی ہی تھا۔ کہانی بھی اسی نے لکھی تھی، اصل مسئلہ یہ ہوگیا کہ بروس لی کی لکھی کہانی نہیں مل رہی تھی۔ سب پریشان ہوگئے کہ کیا کریں۔ بالآخر انٹر دا ڈریگن کے ڈائریکٹر رابرٹ کلاؤز اور گولڈن ہارویسٹ نے مل کر سوچا اس فلم کو کسی طرح مکمل کرلیا جائے۔ بروس لی نے اس فلم کی کہانی کچھ اس طرح لکھی تھی۔ ہائی ٹن (بروس لی) ایک پیشہ ور مارشل آرٹسٹ ہے جو اب مقابلوں سے سبکدوشی اختیار کرچکا ہے۔ کوریا کے مجرموں کا گروہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ باس اسے ایک کہانی سناتا ہے اور فلم دکھاتا ہے کہ یہ ایک پانچ منزلہ پگوڈا ہے۔ جس کے سامنے اتنی ہی اونچی ایک بدھ کی مورت ہے۔ اس پگوڈا میں آتشی ہتھیار لے جانا منع ہے۔ اس کی ہر منزل پر ایک خطرناک مارشل آرٹسٹ پہرا دیتا ہے، جو کسی کو اوپر نہیں جانے دیتا۔ ہر منزل کا محافظ مختلف صلاحیتوں کا مالک ہے۔ آخری منزل پر کچھ چھپا ہے۔ اس تک پہنچنا ہے۔ (افسوس کہ جو صفحات بعد میں ملے ان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہاں کیا چھپا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہاں خزانہ ہوگا۔ اب یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ راز

قرآن مجید کا پہلا سندھی ترجمہ

892ء میں ایک ہندو راجا نے جس کا نام مہروک تھا، عبداللہ بن عمر ہباری سے درخواست کی کہ سندھی زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم لکھ کر بھیج دے، اس زمانے میں منصورہ میں عراق کا ایک عالم رہتا تھا، جس کی پرورش منصورہ میں ہوئی تھی، وہ بہت ذہین، سمجھ دار اور شاعر تھا اور یہاں کی مختلف زبانیں جانتا تھا، عبداللہ بن عمر ہباری نے راجا کی خواہش کا ذکر اس سے کیا، اس نے ان کی زبان میں ایک قصیدہ تیار کر کے راجا کو بھیج دیا۔ راجا نے اس قصیدے کو سنا تو بہت پسند کیا اور عبداللہ سے درخواست کی کہ اس شاعر کو اس کے دربار میں بھیج دیا جائے، چنانچہ عبداللہ نے اس کو بھجوا دیا، وہ راجا کے دربار میں تین برس رہا اور اس کی خواہش سے اس عالم نے قرآن مجید کا ترجمہ سندھی زبان میں کیا، راجا روزانہ ترجمہ سنتا تھا اور بے حد متاثر ہوتا تھا۔ قرآن مجید کا یہ پہلا ترجمہ تھا جو سب سے پہلے سندھی زبان میں ہوا۔ اس عالم کا یہ بھی بیان ہے کہ راجا نے چھ سو من سونا اسے تین دفعہ دیا۔

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڑکانہ

بھی بروس لی کے ساتھ ہی چڑھ گیا)۔ وہ بتاتا ہے کہ میں چاہتا ہوں ہم نے جو ٹیم اندر جانے کے لیے تشکیل دی ہے تم بھی اس کا حصہ بن جاؤ۔ یہ دوسری کوشش ہے اس سے پہلے ایک کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ ہائی سختی سے منع کر دیتا ہے۔ تو بوس ہائی کی بہن (بیٹی تنگ لی) اور چھوٹے بھائی کو اغوا کر لیتے ہیں۔ ہائی مجبور ہو جاتا ہے اور اس چار رکنی ٹیم کا حصہ بن جاتا ہے جن میں سے ایک بروس لی کی ابتدائی فلموں کا ساتھی جیمس تین اور دوسرا چین یوان تھا۔ یہ اس پگوڈا کی طرف جاتے ہیں۔ اس کی شوٹنگ کے لیے جنوبی کوریا میں موجود ایک لکڑی کے پگوڈا کا انتخاب کیا گیا۔ پگوڈا کے نیچے داخلی دروازے کے سامنے وہ کراٹے کے بلیک بیلٹ ماہر پہرہ دیتے ہیں۔ ان سے نمٹ کر اندر داخل ہوں تو ہر منزل پر ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک پہرے دار سے ٹکراؤ ہوگا۔ نیچے کے دس پہرے داروں کو مار کر یہ پہلی منزل پر پہنچتے ہیں جہاں ان کا ٹکراؤ پاسکل (ژان انوساتو) سے ہوتا ہے وہ لکڑی اور نن چکو کا ماہر ہے۔ وہ ہائی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ اگلی منزل پر کورین ہیپ کیڈو کے ماہر جی جائے سے مقابلہ ہوتا ہے اس لڑائی کے دوران چین یوان اوپر چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی لاش نیچے آ کر گرتی ہے۔ پھر جیمس تین اوپر جاتا ہے وہاں اس کا مقابلہ حکیم (کریم عبدالجبار) سے ہوتا ہے۔ جب تک ہائی جی ہان کو ختم کرتا ہے وہاں حکیم جیمس کو ختم کر دیتا ہے۔ اب ہائی اوپر جاتا ہے تو سات فٹ دو انچ کے دشمن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ان کا مقابلہ شروع ہوتا ہے اور ایک سخت مقابلے کے بعد ہائی حکیم کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہائی کھڑکی سے باہر بات کرتا ہے اور نیچے اتر جاتا ہے۔

اس سے اوپر کی شوٹنگ نہیں ہوئی اور بروس لی نے اپنے شاگرد اور نائب تاکی کیمورا کو بھی ایک منزل کے پہرے دار کا کردار دیا تھا جس کی شوٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ اس کے بعد کہانی کیا تھی وہ صفحے آج تک نہیں مل سکے۔ چند صفحات اور شوٹنگ میں جو کچھ ملا وہ اتنا ہی تھا۔ اس میں بروس لی نے کوئی مخصوص لباس پہننے کے بجائے پیلا ون پیس ٹریک سوٹ پہنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے مختلف فنون کے ماہرین سے مقابلہ کرنا ہے تو اس نے اپنے فلسفے کا عملی مظاہرہ کیا ہے کہ ہمارا اسٹائل وہ ہے جو کوئی اسٹائل نہیں ہے۔ اس میں بڑے مقابلوں کے دوران بھی وہ بولتا رہتا ہے اور اپنے اسٹائل جیت کونڈو کے اصول بتاتا رہتا ہے۔

اصل کہانی نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے فلم کی کہانی تبدیل کر دی اور ایک نئی کہانی اور کچھ نئے اداکاروں کے ساتھ اس فلم کو مکمل کیا۔ حالانکہ بروس لی تقریباً سو منٹ کی فلم بنا چکا تھا مگر نئی کہانی کے مطابق اس میں سے بمشکل پندرہ منٹ کی اصل فلم استعمال کی گئی باقی پوری شوٹنگ میں دو اداکاروں کم تائی چونگ اور یوان بیاؤ سے کام لیا گیا جو تھوڑا بہت بروس لی سے ملتے تھے اس کے علاوہ کچھ مناظر بروس لی کی پرانی فلموں سے لیے گئے ہیں۔ ایک جگہ تو انہوں نے بروس لی کا چہرہ گتے پر لگا کر کام چلا دیا یوں گیم اوف ڈیتھ مکمل ہوئی مگر یہ فلم کچھ کچھ بن کر تیار ہوئی۔

نئی کہانی یہ بنائی گئی کہ بلی لو ایک کامیاب اداکار اور مارشل آرٹسٹ ہوتا ہے اسے ایک مجرموں کا ٹولا اپنے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے اس کے انکار پر باس اس کے قتل کا حکم دے دیتا ہے۔ شوٹنگ کے دوران ایک منظر میں اس پر کچھ اوٹ گولیاں چلاتے ہیں ان میں مجرموں کا مقررہ قاتل شامل ہو جاتا ہے اور نقلی کی جگہ اصلی گولی چلا کر فرار ہو جاتا ہے۔ گولی اس کے چہرے پر لگتی ہے وہ بچ جاتا ہے مگر پلاسٹک سرجری کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنی موت کی جھوٹی خبر پھیلا دیتا ہے۔ (اس موقع پر بروس لی کا اصل تابوت اور ہانگ کانگ کی سڑکوں اور لوگوں کا حال دکھایا گیا ہے)۔ پلاسٹک سرجری کے بعد وہ انتقام لینے نکلتا ہے۔ کئی مختلف واقعات کے بعد بوس کے حکم پر اس کی منگیتر کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ جسے بچانے بلی لو آتا ہے۔ اب یہاں وہ مناظر جو بروس لی نے پگوڈا میں فلمائے تھے استعمال کیے گئے ہیں مگر پگوڈا کے بجائے بوس کی ملکیت ریڈ پیپر ریسٹورنٹ دکھایا گیا ہے جس کی منزلوں پر مختلف لوگوں سے لڑتے ہوئے وہ بالآخر باس تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ فلم 1978 میں مکمل ہو کر نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔

بروس لی کی موت کے پچیس سال بعد اس کے کاغذات نکالے گئے تو حیرت انگیز طور پر اس فلم کی کہانی اور منظر نامے کے کچھ حصے برآمد ہو گئے۔ مگر اب اتنے سال تک توجہ نہ دینے سے باقی فلم جو استعمال نہیں ہوئی تھی غائب تھی۔ مگر ڈھونڈنے والوں نے ہمت نہ ہاری اور پھر وہ بھی مل گئی یوں پچیس سال بعد پتا چلا کہ بروس لی کیا بنا رہا تھا اگرچہ اختتام کا اب بھی کچھ پتا نہیں کہ کیا تھا۔

بروس لی نے فنون حرب اور فلسفے پر قریب پینسٹھ کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ شاعر بھی تھا۔ مگر اس نے کبھی اپنی شاعری کو جمع کر کے شائع نہیں کیا۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ لنڈا لی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مختلف کاغذات پر لکھی اس کی شاعری اور اس کے اقوال کو جمع کر کے شائع

کروایا۔

آخر میں بروس لی کے بارے میں چند دلچسپ حقائق جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

1۔ بروس لی کی نظر کافی کمزور تھی اس لیے وہ عینک یا کونٹیکٹ لینسز کا استعمال کرتا تھا۔

2۔ اس کی ایک ٹانگ دوسری سے تھوڑی سی چھوٹی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ چلتے وقت کچھ جھولتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا مگر اس کمزوری کو اس نے لڑائی کے دوران ایک خوبی میں بدل دیا تھا۔

3۔ وہ کافی بزلہ سنج تھا۔ ہر جگہ چاہے دوستوں کی محفل ہو یا فلم کا سیٹ وہ ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔

4۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی رفتار انتہائی زیادہ تھی جس کی وجہ سے فلم بندی کے دوران مشکل پیش آتی تھی۔ اس کے لیے کیمرے کو خاص رفتار پر سیٹ کرنا پڑتا تھا۔

5۔ اس نے خاص قسم کے دستانے متعارف کروائے تھے جو باکسنگ کے دستانوں سے مختلف تھے۔ آج ہر قسم کے مارشل آرٹ میں یہ دستانے استعمال ہو رہے ہیں۔

6۔ وہ چاول یا دال کا دانہ اچھال کر اسے چوپ اسٹکس (Chop Stick) سے ہوا میں ہی پکڑ لیتا تھا۔

7۔ اس کا وزن قریب ساٹھ کلو گرام اور قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔

8۔ بروس لی کو نن چکو چلانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ نن چکو اس کے ہاتھ میں آ کر ایسی مشین بن جاتا تھا جس پر نظر ٹکانا ناممکن ہوتا تھا۔

اس کے پاس وقت کم تھا اس لیے وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے اس عمر میں اپنا اسٹائل بنایا جس عمر میں ابھی لوگ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اس نے کامیاب فلمیں دیں۔ اس نے مارشل آرٹس کو دنیا سے اس طرح متعارف کروایا کہ ایک عالم اس کا دیوانہ ہو گیا۔ آج دنیا میں ہر قسم کے مارشل آرٹ سیکھنے والوں کا جو ہجوم ہے بلاشبہ وہ بروس لی کا رہین منت ہے۔ اس نے مارشل آرٹس اور فلسفے کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ وہ شاعر تھا۔ اس نے فلم کی کہانیاں لکھیں، منظر نامہ تحریر کیا۔ وہ فلمساز تھا ہدایت کار تھا۔ غرض وہ ایک ہمہ جہت شخصیت تھا۔ وہ صرف بتیس برس کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ گیا، مگر آج اس کی موت کے چالیس برس بعد بھی لوگ اس کو یاد کرتے ہیں، اس کے دیوانے ہیں۔

اس کے چند اقوال درج ذیل ہیں۔

1۔ اگر کل میں مر جاؤں تو بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا، کیونکہ جو میں کرنا چاہتا تھا میں نے کر لیا ہے، تم زندگی سے اس سے زیادہ کیا توقع رکھ سکتے ہو۔

2۔ تمہیں پانی کی طرح ہونا چاہیے جس کا کوئی رنگ اور شکل نہیں ہوتی۔ اگر تم پانی کو کپ میں ڈالو تو وہ کپ بن جائے گا، اگر تم پانی کو بوتل میں ڈالو تو وہ بوتل بن جائے گا، اگر تم پانی کو کیتلی میں ڈالو گے تو وہ کیتلی بن جائے گا۔ پانی ٹپک بھی سکتا ہے اور دھماکے سے پھٹ بھی سکتا ہے۔ پانی کی طرح ہو جاؤ میرے دوست۔

3۔ مجھے اس آدمی کا ڈر نہیں جو دس ہزار لاتوں کی ایک ایک بار مشق کرے۔ بلکہ اس کا ڈر ہے جو ایک لات کی دس ہزار بار مشق کرے۔

4۔ صرف جاننا کافی نہیں، ہمیں عمل کرنا چاہیے۔ صرف خواہش کرنا کافی نہیں، ہمیں کوشش کرنا چاہیے۔

5۔ ہار ایک دماغی کیفیت کا نام ہے، کوئی نہیں ہارتا جب تک وہ ہار کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہ کرے۔

6۔ آسان زندگی کے لیے دعا نہ کرو، دعا کرو تو ہمت اور طاقت کے لیے جس سے زندگی کی مشکلیں برداشت کر سکو۔

7۔ غلطیاں قابل معافی ہیں اگر کوئی انہیں تسلیم کرنے کی ہمت رکھتا ہو تو۔

8۔ ہم جتنا زیادہ چیزوں کو اہمیت دیں گے اتنی ہی اپنی اہمیت کم کریں گے۔

9۔ اگر آپ زندگی سے پیار کرتے ہو تو وقت ضائع مت کرو کہ زندگی وقت پہ چلتی ہے۔

10۔ ایک کامیاب جنگجو وہ عام آدمی ہوتا ہے جس کا ارتکاز مضبوط ہو۔

11۔ سیکھنا ایسی تحریک ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔

12۔ ایک عقلمند آدمی کسی بے وقوف کے پوچھے گئے سوال سے اس سے زیادہ سیکھ سکتا ہے جتنا ایک بے وقوف ایک عقلمند کے جواب سے نہیں سیکھ سکتا۔

13۔ دوسروں پر تنقید کر کے انہیں نیچا دکھانا آسان ہے بہ نسبت اپنے کہ خود کو جاننے میں پوری زندگی گزر جاتی ہے۔

14۔ زندگی آپ کی استاد ہے۔ آپ مسلسل سیکھ رہے ہو۔

15۔ میں تمہیں کچھ سکھا نہیں رہا، میں تمہاری مدد کر رہا ہوں کہ تم خود کو دریافت کر سکو۔



شہر نامہ

ڈاکٹر اقبال ہاشمانی

قلمکاری ایک ایسا فن ہے جس کے بڑے پہلو ہیں۔ ایک اچھے قلمکار کی تعریف یہی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو تحریر کے سحر کا اسیر کرائے۔ زیر نظر فسوں ساز تحریر ماضی قریب کے کراچی کی تصویر ہے لیکن اس انداز سے کہ اس پر افسانے کا گمان ہو اور قاری پڑھتا ہی چلا جائے۔

ان مقامات کا تذکرہ جو ماضی کی قبر میں دفن ہو گئے

اس شام میں فریئر ہال میں پام کے درختوں میں گھری اپنی پسندیدہ بینچ پر بیٹھا تھا۔ فریئر ہال کا یہ تنہا گوشہ مجھے ہمیشہ اچھا لگتا۔ کبھی طالب علمی کے دور میں جب یہاں آتا تھا تو پڑھائی کے بعد اسی بینچ پر آ کر بیٹھ جایا کرتا اور فریئر ہال میں آتے ہوئے کرسچن جوڑوں اور پارسی بوڑھوں کو دیکھتا رہتا۔ شوخ و چنچل پیارے پیارے سے بچے پھولوں کے آس پاس کھیلتے ہوئے بہت ہی بھلے لگتے۔ میں سوچتا کہ دنیا بھر میں سارے بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ پل دو پل

روتے ہیں، پھر سب کچھ بھول کر زندگی کے کھیل میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے لیے دکھ، تکلیف، خوشی، مسرت وقتی جذبے ہوتے ہیں مگر دکھ، درد، رنج والم کو اپنی زندگی کا بنیادی جز بنا لیتے ہیں۔

ہر شام جب میں ان پارسی بوڑھوں کو فریئر ہال کی بینچوں پر سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا تو سوچتا کہ ساری زندگی دوڑ دھوپ کرنے کے بعد، زندگی کی شام ایسی ہی پُرسکون ہونی چاہیے۔ فریئر ہال کے وسط میں لیاقت لائبریری اور صادقین آرٹ گیلری کی چھت پر مرغ بادنما ڈھلتے سورج کی طرف منہ کیے ہوئے نظر آتا۔ دن بھر کے سفر کے بعد آگ برساتا، قہر ساماں سورج آہستہ آہستہ مغربی افق پر جھکنے لگتا۔ اب اس کی حدت میں کمی ہوتی۔ اس کی تمازت سرد پڑ چکی ہوتی مگر اس کے چہرے پر سرخروئی اب بھی نمایاں ہوتی کہ فطرت نے جو کام اسے سونپا تھا، وہ اسے بحسن وخوبی انجام دے کر غروب ہو رہا ہے۔ میں خود بھی اکثر سوچتا ہوں کہ جب میری زندگی کی شام ڈھلے گی تب کیا میرا دل بھی اسی قدر آسودہ ہوگا؟

اب بھی جب کبھی زندگی کے کسی موڑ پر کوئی اداسی آ کر گھیر لیتی ہے۔ جب کبھی دنیا کی مادی آسائشوں سے دل اکتا سا جاتا ہے۔ دل میں کوئی وحشت گھر کرنے لگتی ہے تو میں فریئر ہال کے پام کے درختوں میں گھری اس بینچ پر آ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ فریئر ہال کوئی آج کا تو ہے نہیں۔ اس کی تعمیر اگست 1863ء میں شروع ہوئی تھی اور تکمیل 10 اکتوبر 1865ء میں ہوئی تھی۔ اس کا نقشہ ہنری۔ سینٹ کلیئر وِلکنسن نے بنایا تھا جب کہ تاجِ برطانیہ کی جانب سے مقرر کردہ سندھ ایڈمنسٹریٹر ہنری بارٹل فریئر جنہوں نے سندھی زبان کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سندھ کی ترقی کے لیے کئی اہم اقدام کیے تھے۔ ان کے نام سے موسوم کیا گیا۔ تب سے یہ عوام وخواص میں پسندیدگی کا حامل رہا ہے۔ میں جب بھی وہاں پہنچتا ہوں تو پارک میں کھیلتے بچوں اور بینچوں پر بیٹھے بوڑھے پارسیوں کو دیکھ کر اپنی ریزہ ریزہ بکھری ذات کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ زندگی کی دو انتہاؤں کے درمیان کھوئے ہوئے مخفی انسان کو تلاش کرتا ہوں۔ یہ بوڑھے اپنے بچپن میں شاید اسی باغ میں کھیلتے رہے ہوں گے۔ یہ شوخ وشریر بچے ایک مدت کے بعد شاید اسی باغ میں، انہی بینچوں پر بیٹھے، اپنے رعشہ زدہ جسموں کو سنبھالا دے رہے ہوں گے۔ وقت کا ریلا سیلاب کی مانند آ کر گزر جاتا ہے اور اس سیلاب میں انسان کی پوری عمر بہہ جاتی ہے۔ اس سیلاب بلاخیز میں ہم جو لمحہ آج گزار رہے ہیں، وہی تو بس ہمارا ہے۔ باقی سب وقت کا سیلاب بہا کر لے جاتا ہے۔

اس شام میں اپنے اداس لمحوں کو منانے وہاں گیا تھا۔ اس بار ایک لمبی مدت کے بعد یہاں آیا تھا۔ شاید چار یا پانچ برسوں کے بعد۔ اس شام جب میں نے اپنی ذات کو ٹٹولا، تو حساب کتاب کا میزان ایک بار پھر کم نکلا۔ میں نے سوچا کہ ابھی بہت سارے کام کرنے سے رہ گئے ہیں۔ ابھی تو کسی کمزور اور لاغر جسم کو سہارا دینا باقی ہے۔ کسی زخموں سے چُور روح پر مرہم لگانا باقی ہے۔ ابھی تو کسی افسردہ چہرے پر مسکراہٹ کا تحفہ سجانا باقی ہے۔ فطرت نے جو کچھ دیا ہے اسے واپس لوٹانا باقی ہے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کی خوشبو، تتلیوں کے رنگ، چاند کی کرنیں، جھرنوں کا ترنم، شفق کی سرخی، تاروں کی نرمی، سورج کی حرارت، بارش کی رم جھم، مٹی کی مہک، ہواؤں کی سرگوشیاں، درختوں کے سائے، جگنوؤں کی روشنی اور اپنے ہی ہم جنس دیگر انسانوں کی طرف سے دیا ہوا پیار۔ یہ سب کچھ لوٹانا ہے۔ میں اب تک فطرت کی مہربانیوں کا مقروض ہوں۔ میں اب تک اپنی دھرتی ماں کے بے شمار احسانوں تلے دبا ہوا ہوں۔

نہ جانے اور کتنی دیر میں انہی خیالوں میں ڈوبا وہیں بیٹھا رہا۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ پارک میں پھیلے اندھیرے کو بجلی کے دو ایک بلب دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں دھیرے سروں میں ایک پرانا گیت گنگناتا، پارک کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ گیٹ پر ویرانی تھی۔ کبھی اس جگہ بگھیوں کی قطاریں کھڑی اپنی سواریوں کا انتظار کیا کرتی تھیں مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ کینٹ اسٹیشن سے آتی ہوئی یہ سڑک اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس سڑک پر نواب آف جوناگڑھ کی کوٹھی بھی ہے اور امریکن کلچر سینٹر بھی واقع ہے۔ آگے مسجد سے ذرا آگے، کرسچن کالونی ہے۔ میں خراماں خراماں سڑک کنارے چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی آتی اور میرے قریب سے گزر جاتی۔ سڑک کے آخری سرے پر فلیگ ہاؤس کی عمارت تھی۔ اب یہ قائداعظم میوزیم میں بدل گئی ہے۔ اسی چوراہے پر سامنے کی جانب ایک شادی ہال دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں کبھی پیلس سینما ہوا کرتا تھا۔ میری نظر میٹرو پول ہوٹل کی عمارت پر پڑی جو اب بالکل

ویران پڑی تھی۔ کبھی اس ہوٹل میں بڑے بڑے افراد ٹھہرا کرتے تھے۔ 1950ء میں شاہ ایران ٹھہرے۔ 1955ء میں اردن کے شاہ حسین، 1952ء میں ہز ہائنس آغا خان، اسپورٹ گرینگر اور ایوا گارڈنر سیٹو کی کانفرنس کے وقت (مارچ 1956ء) امریکی ودیگر مندوبین۔ اگر یہ قومی ورثہ قرار نہ پائی ہوتی تو یہ کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔ سڑک عبور کرکے میں وِلیج ریسٹورنٹ کی طرف آ گیا۔ اندر سے موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید کوئی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

سامنے والی فٹ پاتھ پر کونے پر پھولوں کی دکان تھی۔ میں اسی طرف آ گیا۔ فٹ پاتھ پر چلتا چلتا شیزان ایمبیسی کے قریب سے گزرتا ہوا سروسز کلب کی باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ صاف ستھرے فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ فٹ پاتھ پر دور تک درختوں کی قطار تھی۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اب میں ٹرینٹی چرچ تک آ گیا تھا۔ 1844ء میں برطانوی فوجیوں نے اسے قائم کیا تھا۔ اس کا ڈیزائن تیار کیا تھا بمبئی میں مقیم کیپٹن جون ہل نے نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ وہیں پر رکھی بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ سامنے کے چوراہے پر فوارہ چوک تھا۔ ٹریفک اس کے گرداگرد رواں دواں تھا۔ میری نظر چرچ کے بلند ٹاور پر پڑی۔ شاید یہ ٹاور متوحش نگاہوں سے اپنے کھوئے ہوئے بدیسی لوگوں کو تلاش کر رہا تھا کہ جن کے دور میں اس چرچ کی تعمیر ہوئی تھی اور اس کے ٹاور کو اس لیے اتنا اونچا بنایا گیا تھا کہ یہ دور سے بھی نظر آ سکے یا پھر لوگ اس کی عظمت سے متاثر ہو سکیں۔ رات بھیگ چلی تھی اور چرچ کے ٹاور کے اوپر سے چاند دھرتی کی طرف جھانک رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہروں کے دوش پر مجھے یوں لگا کہ جیسے چرچ کی عمارت سے موسیقی کے مدھم سروں میں کچھ آوازیں کورس کی شکل میں ترنم سے کچھ گا رہی ہیں۔ آوازیں دھیرے دھیرے واضح ہونے لگیں۔

گیت کی لے بلند ہونے لگی اور پھر مجھے یوں لگا کہ سامنے فوارہ چوک پر بنی ہر شے گردش کر رہی ہو۔ اردگرد کی ہر شے محوِ رقص ہو۔ وہی رقصِ طاؤس۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی اپنے محبوب شہر کی اس عظمت پارینہ کو سلام عشق پیش کروں۔ کراچی جو میرا ہی نہیں بہت سے لوگوں کا محبوب ہے۔ اس کے حضور دیوانہ وار رقص کروں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے اندر سے آواز آ رہی ہو۔

جب بھی فطرت انگڑائی لیتی ہے، رت گدرانے لگتی ہے، برکھا بہار گنگنانے لگتی ہے، رسیلی پھوار رم جھم اپنے لگتی ہے اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر سو پھیلنے لگتی ہے۔ تب دور کہیں کسی سندر سے بن میں، کسی گلپوش پہاڑی کے دامن میں، کسی حسین سی وادی کی آغوش میں، کسی سرسبز جنگل کے خوشنما سے گوشے میں، کسی خوب صورت نیلی سی جھیل کے کنارے، کسی جلترنگ بکھیرتے جھرنے کے آس پاس، صبح سویرے، شام اندھیرے، دن کے اجالوں میں، چاندنی راتوں میں، مست بہاروں میں کوئی مور اک عالم بے خودی وسرمستی میں کچھ ایسا والہانہ رقص کرنے لگتا ہے کہ اس کے ساتھ کائنات کی ہر شے وجد میں آ کر جھومنے لگتی ہے۔ فطرت کا سرِ نہاں عیاں ہونے لگتا ہے، رمزِ حیات سے پردہ اٹھنے لگتا ہے۔ فطرت کا یہی رقصِ طاؤس ہے جو کائنات کا حسین ترین راگ ہے۔ ابدی الفت کا ساز ہے۔ صبح ازل کا راز ہے۔ ہر ذی نفس کی زندگی میں یہ رقصِ فطرت چپکے سے در آتا ہے اور اپنی چھب دکھلا کر چلا جاتا ہے اور پھر ایام رقصِ طاؤس کی صرف یاد باقی رہ جاتی ہے۔ یہی یاد سرمایۂ حیات، متاعِ جاں ٹھہرتی ہے، زندگی کے حسین افسانے کا رنگیں عنوان بنتی ہے۔ جیون کی جنت گم گشتہ کا نشان بنتی ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے کہنے لگتا ہے، می رقصم، می رقصم، می رقصم۔

☆.....☆

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم
(عثمان ہارونی)

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ چند ہی دنوں بعد کسی کام کے سلسلے میں میرا صدر کی موبائل مارکیٹ میں جانا ہوا۔ وہاں سے فارغ ہوا تو یاد آیا کہ بوہری بازار میں بھی ایک کام ہے سوچا اسے بھی نمٹاتا چلوں۔ سو وہاں سے بوہری بازار کی جانب چل پڑا۔ سگنر چورنگی سے کچھ پہلے جہانگیر پارک دکھائی دیا۔ نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ میں پارک میں گھستا چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دھول، مٹی، جھاڑ جھنکار۔ ویرانی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ ذہن میں ایک فلمی غزل کا شعر گونجنے لگا۔

یہ کیا جگہ ہے دوستو، یہ کون سا دیار ہے
حدِ نگاہ تک جہاں، غبار ہی غبار ہے

جہاں کبھی خوب صورت روش ہوا کرتی تھی، وہاں پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سرسبز گھاس کی جگہ مٹی اور راکھ کے ڈھیر تھے۔ وہ حسین اور نفیس سا حوض جس میں کبھی خوب صورت بطخیں تیرا کرتی تھیں، کیچڑ اور دلدل سے اٹا ہوا تھا، کیا یہ واقعی جہانگیر پارک ہے، وہی پیارا سا پارک کہ جہاں ہم دوست تفریح [illegible] کرتے تھے۔ میرے ذہن [illegible]

[illegible]

شوخ رنگ کے [illegible] ہیں۔

پارک کے بیچوں بیچ ایک خوشنما تالاب ہے۔ سفید سنگِ مرمر سے بنے اس حسین تالاب میں صاف ستھرا پانی بھرا ہے جس میں سفید بطخیں تیر رہی ہیں۔ ایک ننھے منے چوبی پل کے ذریعے اس تالاب کے درمیان بنے ایک چھوٹے سے جزیرے پر جانے کا بھی انتظام ہے۔ اس چھوٹے سے جزیرے پر بطخوں کے رہنے کا انتظام ہے۔ ننھے منے خوش رنگ پھولوں سے پورا جزیرہ مہک رہا ہے۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی پورا پارک برقی قمقموں سے جگمگانے لگتا ہے۔

اچانک پردہ پھر سے ہٹ جاتا ہے اور میرے سامنے وہی تباہ شدہ پارک آجاتا ہے۔ میرے دل میں وحشتیں گھر کرنے لگتی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ پارک میں بگولوں کے اس وحشیانہ رقص کے ساتھ کوئی نوحہ خوانی کر رہا ہو۔ (لیکن اب اس کی قسمت دوبارہ سے کھل اٹھی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ نے خاص توجہ دی اور یہ پارک دوبارہ سے سج گیا ہے) میں اس منظر اور یادوں کے سائے سے گھبرا کر وہاں سے نکل آیا۔ جہانگیر پارک سے متصل مسجد کے میناروں سے اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا بے شک ہر شے کو فنا ہے اور ایک باقی رہنے والی ذات صرف ہمارے رب کی ہے۔

اس روز جہانگیر پارک کیا گیا، یوں لگا کہ سوئے ہوئے جذبات کو جگا دیا ہو۔ ماضی کی یادوں نے ذہن پر ایسی یلغار کی کہ دل اداس اور افسردہ سا ہو گیا۔ پرانے دوست، پرانے لوگ، پرانے دن بے تحاشا یاد آنے لگے۔ وہ [illegible] نسیمیں، وہ رنگین شامیں، وہ خوشگوار ہوائیں، وہ [illegible]

[illegible]

پارٹی [illegible] دوسری پارٹی تک پہنچایا کرتا تھا۔ ایک روز خفیہ پولیس کے دو کارندے اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ صرافہ بازار کی بمبئی ہوٹل کے پاس پہنچا تو اسے اندر نورا بکرا نامی ایک دوست بیٹھا نظر آیا ہے۔ وہ ہوٹل کے اندر چلا گیا اور نورے بکرے کو ایک معقول معاوضے کے عوض اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سونا اپنے گھر لے جائے تاکہ وہ پکڑا بھی جائے تو سونا اس کے پاس سے برآمد نہ ہو۔ اس کے بعد وہ چائے پی کر ہوٹل سے باہر نکلا۔ خفیہ پولیس والے یہی سمجھ رہے تھے کہ سونا اب بھی داؤد دگی ہی کے پاس ہے۔ وہ اسے اس لیے نہیں پکڑ رہے تھے کہ دراصل وہ اس پارٹی پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے جس کے پاس داؤد یہ سونا پہنچانے جارہا تھا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل سے باہر نکلا وہ دونوں اس کے تعاقب میں لگ گئے اور قصہ کچھ یوں آگے بڑھا۔

داؤد دگی بھی کمال کا آدمی تھا۔ ہوٹل سے نکلتے ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ دونوں سادہ لباس والے اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ اب وہ ان دونوں کو خوب گھنی کا ناچ نچائے گا۔ اب وہ بے فکر تھا۔ مال اس نے نورے کے حوالے کر دیا تھا۔ اسے اب ان سادہ لباس

والوں سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ گوگلی سے ہوتا ہوا وہ کاغذی بازار میں نکل آیا۔ بازار تقریباً بند ہو چکا تھا۔ چند ایک دکانیں کھلی تھیں، دکاندار مال سمیٹ رہے تھے۔ وہ گلیوں میں سے ہوتا ہوا بمبئی بازار میں آنکلا۔ یہاں سے وہ کھارادر کی جانب چل دیا پھر پنجاب کلب سے ہوتا ہوا ٹاور تک آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اب بھی اس کے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ اسے ہنسی آ گئی۔ تھکا دوں گا دونوں یاجوج ماجوج کو، اس نے دل میں ٹھان لی۔

ٹاور سے وہ میکلوڈ روڈ پر آ گیا جو اب آئی آئی چندریگر روڈ کہلاتا ہے۔ پہلے تو اس نے ارادہ کیا کہ سٹی اسٹیشن پر جا کر تھوڑا وقت گزارے مگر بعد میں ارادہ بدل کر بولٹن مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ کاروباری لوگ دکانیں بند کر کے اب اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ سائیکل رکشا میں بیٹھ کر اپنی منزلوں کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ ٹرام کے ذریعے سفر کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ داؤد دگی بھی صدر جانے والی ٹرام میں بیٹھ گیا۔

ٹرن...... ٹرن...... ٹرن گھنٹی بجاتی ہوئی ٹرام سڑک پر بچھی لوہے کی پٹری پر دوڑنے لگی۔ لکڑی سے بنی ٹرام میں لکڑی ہی سے بنی ہوئی بڑی بڑی بنچیں تھیں۔ ٹرام میں اچھا خاصا رش تھا۔ ٹرام ڈینسو ہال، سٹی کورٹ اور لائٹ ہاؤس سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ جیسے جیسے اسٹاپ آتا، کچھ لوگ اتر جاتے اور دوسرے لوگ سوار ہو جاتے۔ سعید منزل تک ٹرام کسی حد تک خالی ہو چکی تھی مگر اب بھی چند ایک لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ پلازہ پر پھر کچھ لوگ سوار ہو گئے۔ نشاط والے چوراہے پر جا کر ٹرام گارڈن روڈ پر مڑ گئی پھر وہ جہانگیر پارک سے ہوتی ہوئی ایمپریس مارکیٹ کے قریب جا رکی۔ یہاں سے وہ کینٹ اسٹیشن تک جاتی تھی۔

داؤد دگی ایمپریس مارکیٹ کے قریب اتر گیا۔ دونوں یاجوج ماجوج بھی اس کے ساتھ ہی اترے تھے۔ اب وہ پھر پیدل مارچ کر رہا تھا۔ بوہری بازار کی اندرونی گلیوں سے ہوتا ہوا وہ شاہراہ عراق پر آ گیا۔ اب اس کا رخ وکٹوریہ روڈ کی طرف تھا جو اب عبداللہ ہارون روڈ کہلاتا ہے۔ کونے پر پیراڈائز سینما تھا۔ وہ سینما کے اندر جا گھسا اور نیچے ہال میں فلم کے پوسٹرز دیکھنے لگا۔ ابھی آخری شو شروع ہونے میں کافی وقت تھا۔ پیراڈائز سینما سے نکل کر وہ وکٹوریہ پر آگے بڑھنے لگا۔ پریڈی اسٹریٹ اور وکٹوریہ روڈ کے سنگم پر انڈر گراؤنڈ راستے کے پاس واقع کیفے جارج تک پہنچتے پہنچتے اسے اچانک بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ وہ کیفے جارج میں گھس گیا۔

دونوں یاجوج ماجوج باہر فٹ پاتھ پر بنی لوہے کی ریلنگ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ سامنے چرچ کے ساتھ فٹ پاتھ پر فوٹو گرافروں کے کیبن میں سے کئی بند ہو چکے تھے۔ کیفے جارج میں رش تھا۔ اس نے نرگسی کوفتے اور نان منگوائے اور مزے سے کھانے لگا۔ باہر یاجوج ماجوج بے چارے بھوکے کھڑے تھے۔ کالا چشمہ دونوں نے اب بھی پہن رکھا تھا۔ سالے ڈاکٹر نو کی اولاد، مائی نیم از بانڈ، جیمز بانڈ، ایجنٹ ڈبل زیرو سیون! داؤد دگی نے سوچا۔ حال ہی میں فلم ڈاکٹر نو نے کافی تہلکہ مچایا تھا اور ایجنٹ ڈبل او سیون کو کافی شہرت ملی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کیفے جارج سے باہر نکل آیا۔ کن انکھیوں سے یاجوج ماجوج کو دیکھتا ہوا وہ ایک بار پھر وکٹوریہ روڈ پر گامزن ہو گیا۔ اب اس کا رخ بندر روڈ کی طرف تھا جس کا نام اب ایم اے جناح روڈ ہے۔

وکٹوریہ روڈ کا یہ حصہ بالکل سنسان پڑا تھا۔ راستے میں ڈاکٹر حبیب پٹیل کا اسپتال پڑتا تھا اور اس سے ذرا آگے پارسیوں کا آتش کدہ تھا۔ آخری کونے پر کیفے ریلنس پڑتا تھا۔ سامنے والے فٹ پاتھ پر محمد علی ٹراموے کارپوریشن کا گیراج اور دفتر تھا۔ وہ بندر روڈ سے داہنی طرف مڑ کر پھر گارڈن روڈ والے چوراہے کی جانب چل پڑا۔ روڈ کراس کر کے ناز سینما پر پہنچ گیا۔ ناز میں پرانی انڈین فلم ”دیدار“ چل رہی تھی۔ نرگس، دلیپ کمار اور اشوک کمار کی فلم جو اس نے پہلے بھی کئی بار دیکھ رکھی تھی۔ اب وہ بارہ آنے والے ٹکٹ کی لائنوں میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج وہ یہ فلم ایک بار پھر دیکھے گا۔ یاجوج ماجوج کو بھی مجبوراً ٹکٹ لینا پڑا۔ فلم ختم ہوئی تو تماش بین اداس اور بسورتی ہوئی صورتیں بنائے ہال سے باہر نکلنے لگے۔ فلم تھی بھی بڑی ٹریجڈی۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ صرف آخری شو دیکھ کر واپس جانے والوں کا رش تھا۔ کچھ لوگ بگھیوں میں اور کچھ بسوں میں جا رہے تھے۔ داؤد دگی نے سوچا سارا شہر نیند کے مزے لوٹ رہا ہے اور یہ دونوں مسٹنڈے، بڑی مچھلی کے لالچ میں پیدل چل چل کے تھک گئے ہیں۔ جیسے ہی داؤد اپنے محلے میں پہنچا۔ سادہ والوں کو احساس ہوا کہ ان کے ساتھ ”ہاتھ“ ہو گیا ہے۔ انہوں نے بڑی مچھلی کا خیال ترک کر کے چارے ہی پر قناعت کرنے کا

کراچی کے سینما گھروں میں سے چند نام

☆ اسکالا سینما: بمبینو سے متصل اسکالا سینما جو اب بمبینو کے اندر آچکا ہے۔ امان ٹاور کے بالمقابل 1970ء اور 80ء کی دہائی میں اس کا توتی بولتا تھا۔

☆ کیپری سینما: اسے آگ لگائی گئی لیکن آتشزدگی کے بعد پھر سے تعمیر ہوگیا۔ ایم اے جناح روڈ پر نمائش سے نزدیک قائم یہ سینما اب غیر ملکی فلموں کی نمائش کے بھروسے پر چل رہا ہے۔

☆ ریو سینما: اپنی شہرت کو کھو کر صرف بالغان کے لیے سنسر شدہ فلموں کی نمائش پر سانسیں لے رہا ہے۔ انکل سریا اسپتال کے بالمقابل یہ سینما 1970-80ء کی دہائی میں مقبول سینماؤں میں سے تھا۔

☆ افشاں سینما: 16 ستمبر 1977ء بروز جمعہ بابرا شریف وندیم کی فلم "درد" سے افتتاح ہونے والے یہ سینما جو وحید مراد روڈ (مارٹن روڈ) پر واقع ہے بہت مقبول تھا۔

☆ بمبینو سینما: کبھی یہ اس شہرت کا حامل تھا کہ یہ آصف علی زرداری کے والد کا تھا۔ سی ویو پر واقع یہ سینما پاکستانی و غیر ملکی فلموں کی نمائش سے چل رہا ہے۔

☆ سنگم سینما: یہ سینما چل تو رہا ہے لیکن بہت اچھی حالت میں نہیں ہے اور "بی کلاس" کی اردو پنجابی فلموں پر گزارہ کررہا ہے۔

☆ نشیمن سینما: افشاں کے نزدیک وحید مراد روڈ پر واقع ہے۔ یکم اگست 1975ء میں پرویز ملک کی سپر ہٹ فلم "پہچان" سے افتتاح ہوا تھا۔

☆ زینت سینما: غالب سینما کے نزدیک واقع یہ سینما پاکستانی اور انڈین فلموں کی نمائش کے سہارے چل رہا ہے۔

☆ غالب سینما: یہ علاقے میں قطار کا چوتھا سینما ہے لیکن خستہ حالی کا شکار ہے اور پشتو پنجابی سندھی فلموں کی وجہ سے قائم ہے۔

☆ پیرٹ ہال: اس وقت کراچی کا سب سے مقبول سینما گھر۔ اس ہال میں کل چار سینما گھر ہیں جو مقبولیت کی معراج پر ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے لوگ بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

☆ نوپلکس سینما: یہ بھی جدید تقاضوں پر بنا ڈیفنس ہاؤسنگ میں پسندیدگی کا حامل سینما گھر ہے اور ہاؤس فل رہتا ہے۔

(اور بھی کئی سینما کے نام درج ہونے سے رہ گئے)

کراچی کے وہ سینما گھر جن کا وجود کھو گیا

لیرک، اسٹار، تاز، نشاط، پرنس، جوبلی، سنگیت، شمع، ریگل، ذرائیوان، شہتابی ڈرائیو ان، فلمستان، علی بھائی تھیٹر، امبرہ، بالی ووڈ، نوائش، کراؤن، میجسٹک، ریٹز، محفل، انجمن، کوئین، کیننگ، ریوالی، خیام، ریو، کیسینو، لائٹ ہاؤس، وینس، نیرنگ، انقلاب، تاج محل، سپر، سوسائٹی، شیریں، شاہیمار، شبانہ، صنم، ڈوبلی، ریکس، قیصر، پرنس، پلازہ، پکچر ہاؤس، پیراڈائز، پیلس، پیکاڈلی، پی این ایس شفا، پی این ایس کارساز، پی این ایس ہمالیہ، پی اے ایف سینما، اوڈین، نورمحل، مڈ ڈرائیو ان، میٹرو پول، لیرک، ریکس، اوپرا، نایاب، نگینہ، نفیس، مرزاب، معصور، گزری، لبرٹی، کوہ نور، ارم، امپیریل، گلشن، گلزار، کیپٹل، فردوس، گوڈین، ایروز، ایپارڈ، قسمت، فلیٹ کلب، فانوس، الف لیلہ، عرشی، چاندنی، دلشاد، لالہ زار، گلستان، ٹاکیز، کیمپل، اسٹل ٹاؤن کیمونٹی، نگار، شبستان، زینت، نسرین۔

فیصلہ کرلیا اور پھر اگلے ہی لمحے داؤد دوگی گرفتار ہو چکا تھا۔

گرفتار ہونے کے بعد داؤد دوگی کا کیا حال ہوا؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو بس اس کی ٹراموے کی سیر اور ٹاور سے لے کر ناز سینما تک کی بھاگ دوڑ تھی۔ میرا ذہن ماضی کی ان ہی گزرگاہوں میں اٹکا ہوا تھا۔ میرے ذہن کے کسی خاموش گوشے سے دھیمے سروں میں کسی گیت کی لے ابھرنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز میری سماعتوں میں واضح ہونے لگی اور پھر میرے ذہن میں ایک پرانا گیت گونجنے لگا۔

بندر روڈ سے کیماڑی
میری چلی ہے گھوڑا گاڑی
بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر.....

پچاس کی دہائی میں احمد رشدی کی آواز میں یہ گانا بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس گانے کے بول اور اس کی دھن مہدی ظہیر کی تھی۔ یہ گانا یاد آتے ہی میرے ذہن میں ماضی کا سنہرا دور جگمگ کرنے لگا۔ گیت کی موسیقی کے ساتھ دو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اور پھر گھوڑا گاڑی کی گھنٹی کا سریلا پن۔ مجھے یاد آیا کہ جب صبح سویرے سڑکوں پر ٹرام چلنی شروع ہوا کرتیں تو ان کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دیا کرتیں اور آدھے سوئے آدھے جاگے ذہن میں یہ بات آتی کہ صبح ہو چکی ہے اور اب اٹھ کر اسکول جانا ہے۔

مجھے احمد رشدی کے گانے میں اور داؤد دوگی کی سرگزشت میں جہاں کراچی کی سیر کی یکسانیت نظر آرہی تھی، وہیں مجھے ان دونوں میں ایک شدید تضاد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ احمد رشدی کا گیت رجائیت سے بھرپور تھا جب کہ داؤد دوگی کی آوارہ گردی میں یاسیت تھی۔ اس کی وجہ شاید زمانے کا فرق ہے۔ احمد رشدی کے گانے میں نظر آنے والی عمارتیں اب بھی موجود ہیں جیسے ریڈیو پاکستان، بولٹن مارکیٹ، لکشمی بلڈنگ، قمر ہاؤس وغیرہ لیکن داؤد دوگی کی چہل قدمی والی جگہیں ختم ہو چکی ہیں جیسے پیراڈائز سینما، کیفے جارج، پارسیوں کی عبادت گاہ اور ناز سینما۔ ایسا کیوں؟ میرے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگا۔ آخر ایسا کیوں؟

کافی دنوں تک میں اس بات پر سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں اس کا یہی جواب آیا کہ مہدی ظہیر نے اپنا گیت کراچی کے سنہرے دنوں میں لکھا تھا۔ جب کراچی ایک خوب صورت شہر تھا اور داؤد دوگی کی کہانی کراچی کے پُرآشوب ترین دور میں لکھی گئی۔ جب کراچی دنیا کے بڑے ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ حسین ماضی اور کربناک حال۔ زمانے کا، تہذیب کا تضاد۔ کراچی کا حسین ماضی دھیرے دھیرے بھیانک حال میں غرق ہو رہا ہے۔ وہ عمارتیں... جو کراچی کی پہچان ہیں ان کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ عمارتیں تو اینٹ اور پتھر سے بنی ہوتی ہیں۔ بدل بھی جائیں تو اتنا فرق نہیں پڑتا لیکن اس شہر کا رویہ، یہاں کا ماحول، یہاں کی فضا تک تبدیل ہوگئی ہے۔ وہ شہر جو کبھی محبتوں کا چمن ہوا کرتا تھا اب نفرتوں کا جہنم بن گیا ہے۔ جہاں کبھی مذہبی رواداری ہوا کرتی تھی، وہاں اب فرقہ واریت نظر آنے لگی ہے۔ پرانے دنوں کی یادوں نے کچھ اتنا افسردہ کردیا کہ دل اندر ہی اندر رونے لگا۔

کہتے ہیں کہ یاد ماضی عذاب ہے۔ لوگ گزرے بچپن، بیتی جوانی کو یاد کر کے ملول اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔ پرانے فلمی گانے اس لیے سنتے ہیں کہ وہ ان کے سنہرے دور کی یادگار ہوتے ہیں۔ میں بھی عرصہ دراز تک یہی سمجھتا رہا ہوں مگر پچھلے دنوں ایک پرانا گانا سنا اور اس گانے سے اتنا مسحور ہوا کہ کئی دنوں تک روزانہ رات کو وہی گانا سنتا رہا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ گانا تو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ نہ بچپنا میں نہ جوانی میں، نہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی۔ پھر وہ یاد ماضی والا نظریہ کیا ہوا۔ یقینی بات ہے کہ چونکہ گانا اچھا تھا اس لیے پسند آیا تو پھر کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کراچی کے سنہرے دنوں کو یاد کرنے والے اس لیے ان دنوں کو یاد کرتے ہیں کہ یہ دن واقعتاً اچھے ہوں۔ اس زمانے میں یہ شہر واقعی اس قدر خوب صورت ہوگا کہ آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ امن کا گہوارہ کہ جہاں ہر مذہب اور برادری کے لوگ آپس میں محبت سے رہا کرتے تھے۔ اسی پُرسکون کراچی کے مناظر میرے ذہن کے پردے پر اپنا عکس دکھانے لگے اور میں ماضی کے حسین دلفریب مناظر میں کھو سا گیا۔

رات دھیرے دھیرے بھیگتی جارہی ہے۔ دن تو قدرے گرم رہا لیکن شام سے جو ٹھنڈی پروائیاں چلنی شروع ہوئی ہیں تو کافی راحت سی محسوس ہونے لگی ہے۔ ویسے بھی جاتی ہوئی گرمیاں ہیں اور اب ہلکی سی خنکی کا بھی احساس ہونے لگا ہے۔ مطلع صاف ہے اور چاند بھی پورا ہے۔ ماما پارسی اسکول، ماما پارسی گرلز اسکول کی بھی کیا شاندار تاریخ ہے۔ ذہن کو ٹٹولیں، تاریخ کو چھانیں تو کیسے کیسے واقعات نظر آئیں گے۔ اسے یکم اپریل 1918ء کو جمشید نوسروانجی مہتا نے تین شخصیات کے تعاون سے قائم کیا۔ پہلے اسے ہائی وے بائی اسکول میں شروع کیا پھر جون 1919ء میں ایک بڑی عمارت میں لے آئے جو عبداللہ ہارون روڈ کے کارنر پر ہے۔ یہ عمارت ماما منشن کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ موجودہ عمارت میں 17 جنوری 1920ء میں منتقل ہوئی۔ یہ عمارت 26 جنوری 1925ء

میں مکمل ہوئی۔ پہلا سبق طالبات نے یکم اپریل 1925ء میں شروع کیا گویا یکم اپریل 2018ء میں ایک صدی پورا ہونے کا جشن منایا جائے گا۔ اس کے برابر میں وائی ایم سی کے زیر انتظام خواتین کے ہوسٹل کے احاطے تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ YMCA کی بنیاد 1876ء میں رکھی گئی تھی پھر کراچی میں بھی اس کی شاخ قائم ہوئی۔ قیام پاکستان سے قبل یہ نیشنل کاؤنسل اب وائی ایم سی انڈیا، برما، سیلون کے زیر نگیں تھی۔ 1956ء میں یہ خود مختار بنا دی گئی۔ خواتین کے لیے بنائے گئے ہاسٹل اکیلی عورت کے ٹھہرنے کے لیے بہترین قرار دیا جاتا ہے مگر اس وقت اس کے کمپاؤنڈ میں گھنے درختوں کی شاخوں پر چاندنی سوئی پڑی تھی۔ صرف یہی نہیں، دن بھر کا جاگتا ہوا بندر روڈ بھی سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی سن سے گزر جاتی تو چند لمحوں کے لیے خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔

دور تک سناٹا ہے اور اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بندر روڈ بھی سکوت میں ڈوبا ہوا ہے۔

اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں بندر روڈ کے بیچوں بیچ ٹرام کی پٹریاں دور تک چمکتی نظر آرہی تھیں۔ کبھی کوئی بگھی وہاں سے گزرتی تو گھوڑے کی ٹاپوں سے پورا روڈ گونجنے لگتا تھا۔ بندر روڈ کے اس طرف مارسٹن روڈ پر لیکن اب تک چہل پہل نظر آرہی ہے۔

کوئٹہ لال چمن کباب ہاؤس کے بڑے سے توے پر سے ایک تال کے ساتھ کٹا کٹ کی آواز گونج کر اس بات کا اعلان کررہی تھی کہ ابھی رات کے اس وقت بھی لوگوں کو بھوک لگ سکتی ہے اور وہ کٹا کٹ کھانے آسکتے ہیں۔ ویسے بھی ریوالی کا یہ کباب ہاؤس شہر کے اوّلین کٹا کٹ میں شمار ہوتا تھا۔ کٹا کٹ والے کے برابر میں دودھ والے کی دکان پر بھی رونق تھی۔ بڑے سے کڑاہے میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ ایک طرف لسی پھینٹی جارہی تھی۔ لوگ لسی پی کر دن بھر کی گرمی بھگا رہے تھے کچھ نوجوان لسی پی کر جان بنا رہے تھے۔

ادھر جوبلی کوارٹرز اور پلازہ کوارٹرز کی گلیاں خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ان کے فلیٹس کے مکین گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ بس اسی ٹکڑے میں رونق نظر آرہی تھی۔ ریوالی سینما، ایروز سینما اور پھر ان کے بالکل سامنے قیصر سینما کے برقی قمقمے روشن تھے۔ گو ان میں سے آدھے بجھا دیے گئے تھے، پھر بھی اتنی روشنی ضرور تھی کہ ان سینماؤں میں چلنے والی فلموں کے رنگین پوسٹرز اور بڑی بڑی تصاویر صاف نظر آتیں۔ ان کو دیکھ کر فلم کے متعلق تو اندازہ نہیں لگایا جاسکتا البتہ ہیروئنوں کے چہرے دیکھ کر دل خوش کیا جاسکتا تھا۔ یہ علاقہ اب تک یوں بھی جاگ رہا تھا کہ ابھی ان سینما گھروں میں فلم کے آخری شو چل رہے ہیں جو اب کچھ ہی دیر میں ختم ہونے والے ہیں۔

مارسٹن روڈ کے اگلے سرے پر گوڈین سینما کے پاس بھی کچھ روشنی نظر آرہی ہے۔ گوڈین سینما کافی پرانا سینما گھر ہے۔ تقسیم سے پہلے انگریزوں کے زمانے میں تعمیر ہوا ہے۔ اس میں انگلش فلمیں اور دیسی فلمیں دونوں ہی لگتی رہتی تھیں لیکن یہ ہالی ووڈ کی فلموں کے لیے زیادہ مشہور تھا۔ اس کے عین سامنے محمد علی ٹراموے کا دفتر اور ڈپو تھا۔ دن بھر شہر میں چلنے والی ٹرامیں رات کو اسی ڈپو میں پارک کردی جاتی تھیں۔ گوڈین کے سامنے ہی ذرا ادھر کو جو چھوٹی سڑک پلازہ سینما کی طرف جارہی تھی اس کے کونے پر ایرانی ہوٹل تقریباً بند ہونے کو تھا۔

قیصر سینما کا شمار نارمل سے سینما گھروں میں ہوتا تھا۔ یہ اتنا بڑا اور مقبول نہیں تھا۔ ایروز آزادی کے فوراً بعد تعمیر ہوا ہے۔ اس کا افتتاح محترمہ فاطمہ جناح کے دست مبارک سے ہوا تھا اور اس میں پہلی فلم انڈیا کی "بابل" نمائش پذیر ہوئی تھی۔ بابل میں دلیپ کمار اور نرگس نے کام کیا تھا اور اس کے گانے بے حد مقبول ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد سب سے پہلا سینما جو تعمیر ہوا تھا وہ جوبلی سینما ہے جو بارنس اسٹریٹ پر واقع ہے۔ شاید اسی سینما کی وجہ سے سامنے والے فلیٹس جوبلی کوارٹرز کے نام سے مشہور ہو گئے تھے بلکہ یہ پورا علاقہ اسی نام سے مشہور تھا جوبلی سینما کا بلند و بالا ٹاور کافی دور سے نظر آتا تھا۔

ریوالی سینما نسبتاً نیا تھا۔ اس کی مشینری بھی کافی جدید تھی۔ اس کی وجہ شہرت اس کا پردہ تھا۔ عموماً سینما گھروں میں اسکرین کے اوپر کپڑوں کے جو پردے لٹکے ہوتے ہیں وہ دائیں بائیں کھلتے ہیں لیکن ریوالی کا پردہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کھلتا بند ہوتا تھا۔ یہ لوگوں کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ ویسے بھی مشینری اور عمارت نئی تھی تو یہ بھی لوگوں کی توجہ کا باعث تھا مگر اس کے ساتھ اچھی فلموں کا یہاں نمائش کے لیے پیش ہونا بھی اس کی مقبولیت کا سبب تھا۔

فلم کا آخری شو ختم ہونے ہی والا تھا، اس لیے ان سینما گھروں کے آس پاس بگھیاں، سواریوں کے انتظار میں

برائن جونس کیا زبردست گٹارسٹ تھا۔ اس کی انگلیاں جب گٹار کو چھیڑتیں تو فضا میں نغمگی کا طوفان رقص کرنے لگتا۔ وہ مشہور میوزیکل بینڈ rolling stone کا بانی تھا۔ اس بینڈ نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ برائن 28 فروری 1942ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بیمار رہا کرتا۔ اس کو سانس کا مرض تھا جو آخر تک اس کے ساتھ رہا۔ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کی ماں ایک پیانو ٹیچر تھی جو اسکولوں میں بچوں کو پیانو سکھایا کرتی۔ ماں سے اس نے پیانو بجانا سیکھا تھا۔ جب وہ سترہ برس کا تھا تو اس کے باپ نے برتھ ڈے گفٹ کے طور پر اسے ایک گٹار دیا تھا۔ یہاں سے اسے گٹار میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اسکول میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو اس کی دوست بن گئی اور اس دوستی کے نتیجے میں اس لڑکی نے ایک بچے کو جنم دیا جس کا نام لوئیس رکھا گیا لیکن برائن کی زندگی میں اب تلخیاں شامل ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا اور اپنا گٹار لے کر انجانی منزلوں کی طرف چل پڑا۔ اس نے بہت عرصہ خانہ بدوشوں کی طرح گٹار بجا بجا کر گزارا۔ وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گٹار بجا کر اپنا گزارا کیا کرتا۔ آوارہ گردوں جیسی زندگی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے بینڈ کا نام ''رولنگ اسٹون'' رکھا تھا۔ اسی آوارگی کے دوران لندن میں کچھ اور اسی جیسے میوزک دوست اس سے آملے۔ ان کے پاس اپنے گٹار تھے۔ اب ضرورت ایک ڈرم بجانے والے کی تھی۔ ایک ڈرمر جونی چیپ مین مل گیا جس کے پاس نہ صرف اپنا ڈرم سیٹ تھا بلکہ وہ ہمیشہ اپنی جیب میں سگریٹ کا پیکٹ بھی رکھا کرتا جو ان دوستوں کے کام آتے۔ اس طرح یہ گروپ بن گیا اور انہوں نے مختلف فنکشنز میں بجانا شروع کیا۔ برائن ہی نے اس گروپ کو رولنگ اسٹون کا نام دیا تھا۔ وہی اس بینڈ کے لیے نغمے بھی لکھا کرتا۔ اس کی موت بہت پراسرار انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے مکان کے سوئمنگ پول میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ یہ واقعہ 1979ء کا ہے۔ اس وقت اس ذہین موسیقار کی عمر صرف 27 سال تھی۔

☆☆

کھڑی تھیں۔ دور جانے والے فلم بین خصوصاً فیملی کے ساتھ آئے ہوئے، ترجیحاً انہی بگھیوں میں بیٹھ کر جاتے تھے۔ یہ بگھیاں بھی ایک طرح سے شاہی سواری تھیں۔ بگھی اگر پردے والی ہو یا دھوپ ہو تو اس کے اوپر سائبان سا تان دیا جاتا تھا۔ وگرنہ شام کے بعد یہ سائبان ہٹا دیا جاتا تھا۔ بگھی کے چلنے پر نرم ہوا کے تھپیڑے بہت بھلے لگتے تھے۔ نوجوان لڑکے اکثر کوچوان کے ساتھ اوپر والی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کوچوان بھی کبھار چابک گھما کر گھوڑے کو ٹہوکا مارتا تھا اور زبان سے چخ چخ کی آواز نکال کر گھوڑے کو کسی نامعلوم زبان میں نہ جانے کیا کچھ کہنے کی کوشش کرتا تھا۔ بگھی میں ایک گھنٹی بھی ہوتی تھی جو راستہ صاف کرنے یا اگلی گاڑی کو تنبیہ دینے کے لیے بجائی جاتی تھی۔ بگھی کے دونوں طرف دو لالٹین نما بتیاں بھی رات کے وقت جلائی جاتی تھیں تاکہ اندھیرے میں پتا چل سکے کہ بگھی آرہی ہے۔

اس دن قیصر میں تو فلم اسٹار حبیب کی کوئی پرانی فلم چل رہی تھی۔ اس لیے شو ختم ہونے پر کچھ زیادہ لوگ نہیں نکلے تھے۔ اکثر چھڑے ہی تھے جو موج مستی کرتے پیدل ہی روانہ ہو گئے تھے۔ چند ایک بندر روڈ کی طرف چل دیے تھے جہاں آخری بسیں مسافروں کو لے جانے کے لیے کھڑی تھیں۔ ایروز پر بھی جو فلم چل رہی تھی۔ اس کا آخری ہفتہ تھا اس لیے اس میں بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ اصل مجمع ریوالی سے برآمد ہوا تھا کہ جس میں فلم اسٹار وحید مراد کی فلم زیر نمائش تھی وحید مراد جو چاکلیٹی ہیرو کے نام سے مشہور ہے۔ مقبولیت کے لحاظ سے وہ سب سے اوپر تھا۔ لوگ اس کے دیوانے تھے اس کی پہلی فلم اولاد تھی جس میں وہ نیئر سلطانہ کا بیٹا بنا تھا، اس فلم کا ایک گانا

تم قوم کی ماں ہو سوچو ذرا
عورت سے ہمیں یہ کہنا ہے
اولاد تمہاری دولت ہے
تعلیم تمہارا گہنا ہے

بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس فلم میں وحید مراد کے کام کو بے حد سراہا گیا تھا لیکن اصل شہرت اسے فلم ارمان سے ملی تھی۔ ارمان میں وہ زیبا کے مقابل ہیرو تھا۔ اس فلم کا گانا ''اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم'' بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس فلم نے بھی مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور وحید مراد فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اس کے بالوں کا اسٹائل بھی فیشن بن گیا تھا اور نوجوان اسی قسم کے بال بنانے

لگے تھے۔ خواتین میں بھی یہ اتنا ہی مقبول تھا۔ اس کی فلم دیکھنے کے لیے خواتین کافی تعداد میں آتی تھیں۔ خواتین میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا گانا فلم میں آتا ہے تو خواتین سینما ہال میں پیسے لٹاتی تھیں۔ چھن کر کے ٹیڈی پیسے سینما ہال کے فرش پر گرتے تھے اور بچے وہ سکے لوٹنے لگتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے سینما گھر اس کی فلم لگانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔

ریوالی پر یہ آخری شو بھی ہاؤس فل گیا تھا۔ اب شو ختم ہوا تھا اور لوگ شاداں و فرحاں سینما ہال سے باہر آرہے تھے۔ فلم اچھی تھی اور ان کے پیسے وصول ہوئے تھے۔ مردوں اور عورتوں کی تعداد قریب قریب یکساں تھی۔ لوگ بگھیوں میں بیٹھ کر جا رہے تھا اور کچھ پیدل ہی جا رہے تھے۔ خواتین کے جھنڈ کے جھنڈ سینما ہال سے نکل رہے تھے اور یہ خواتین مختلف ٹولیوں کی شکل میں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو رہی تھیں۔ یہ خواتین باہم مل کر اپنے پروگرام بنا کر فلم دیکھنے آجاتی تھیں۔ عموماً سات آٹھ پڑوسنیں مل کر فلم دیکھنے کا پروگرام بناتی تھیں۔ ان کے ساتھ مردوں کا آنا بھی ضروری نہیں تھا۔ یہ جھنڈ کی شکل میں آتی تھیں۔ فلم دیکھ کر مزے سے باتیں کرتی ہوئی اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتی تھیں۔ یہ خواتین زیادہ تر برقعوں میں ہوتی تھیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہوتی تھیں جو صرف چادر اوڑھنا کافی سمجھتی تھیں۔ رات آدھی بیت چکی تھی تو کیا ہوا۔ سڑکوں پر سناٹا ہے تو کیا ہوا۔ کوئی مرد ساتھ نہیں تو کیا ہوا۔ ان خواتین کو کسی بات کا ڈر، خوف نہیں تھا۔ راستے میں نہ ان کو کوئی چھیڑتا تھا اور نہ کوئی بدمعاش ان کا راستہ روکتا تھا اور نہ کوئی لفنگا ان سے پرس یا زیور لوٹنے کی جسارت کرتا تھا۔ یہ خواتین چہرے پر مسکراہٹ، دل میں اطمینان لیے شہر کی سڑکوں پر ایسے چل رہی تھیں جیسے اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہی ہوں۔ اوپر آسمان پر چمکتا ہوا چاند ان کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی چاندنی کے نور میں اضافہ سا ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خاموشی کی زبان میں اس شہر کے امن و امان کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔

اے شہر کے لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں، میں بھی اس شہر کی جان تھا۔ اس کا مان تھا۔ اس شہر کی روایتوں کا نشان تھا۔ تہذیبی اقدار کی پہچان تھا۔ میں تمہارا اپنا نشاط تھا۔ میرے نام سے آج تک یہ چوک مشہور ہے۔ نصف صدی سے بھی

ترونی سچدیو ایک پیاری بچی جس نے پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی۔ اس نے بے شمار کمرشل میں کام کیا۔ اس کے علاوہ اس نے امیتابھ بچن جیسے اداکار کے ساتھ فلم ''پا'' میں کام کر کے اپنی صلاحیت اور خود اعتمادی ثابت کر دی تھی۔ اس کو پیار سے ''رسنا گرل'' کہا جاتا تھا۔ اس کا انتقال ایک ہوائی حادثے میں نیپال میں ہوا تھا۔ اس وقت وہ صرف 14 برس کی تھی۔ یہ حادثہ 2012ء میں ہوا تھا۔ اسی سے اس کی پیدائش کے سال کا اندازہ لگائیں۔

☆☆

جیسیکا ڈبروف ایک خوب صورت لڑکی جو امریکن پائلٹ تھی۔ 5 مئی 1988ء کو امریکا میں پیدا ہونے والی ایسی لڑکی جس نے سات سال کی عمر میں جہاز اڑا کر ورلڈ ریکارڈ بنایا۔ اس کو بچپن ہی سے پائلٹ بننے کا شوق تھا۔ وہ فضا میں اڑتے ہوئے جہازوں کو بہت شوق سے دیکھا کرتی۔ اس نے ضد کر کے پائلٹ بننے کی کوشش کی اور ایک جہاز اڑاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر چل بسی۔ اندازہ کر لیں۔ پیدائش 1988ء اور موت کا سال 1996ء یعنی اس کی زندگی کل سات سال کی تھی۔ سات سال کی عمر میں اس نے جہاز اڑایا اور اسی کم عمری میں حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسی۔ اس نے چونکہ ابھی زندگی کی ابتداء ہی کی تھی۔ اسی لیے اس کی زندگی کے واقعات بہت کم ہیں۔ جس عمر میں اس کی موت ہوئی ہے وہ عمر کھلونوں سے کھیلنے کی تھی۔

☆☆

جیا خان، ایک خوب صورت، پڑھی لکھی اور شوخ اداکارہ۔ اس کی پیدائش 20 فروری 1988ء کو نیو یارک میں ہوئی تھی۔ اس نے لندن میں پرورش پائی۔ اس کے بعد ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کیا۔ پھر وہ ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ بہرحال اس نے بہت کم فلموں میں کام کیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ آگے چل کر بالی ووڈ میں تہلکہ مچا دے گی لیکن موت نے اس کو مہلت نہیں دی۔ وہ مر گئی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ اس کی موت 2013ء میں ہوئی تھی۔

☆☆

زیادہ عرصے تک میں اس شہر کے لوگوں کو نشاط و سرور کے لمحے بانٹتا رہا۔ ہر روز تھکے ماندے لوگ میری چھت کے تلے، تفریح کی چند گھڑیاں بتانے آیا کرتے تھے۔ شہر کے لوگوں کی من پسند اور سستی تفریح مہیا کرنا میرا کام تھا اور اپنے ہم عصروں میں میرا اپنا ایک مقام تھا۔ میں اس شہر کے امن کے زمانے کا رفیق ہوں، میں اس شہر کی تاریخ کا انمٹ حصہ ہوں۔ میں اس شہر کے ہر پرانے باسی کے ذہن پر نقش ہوں کیونکہ میں ان کے کئی سنہرے خوابوں کا عکس، اس شہر کے ماضی کا دلفریب رقص ہوں۔ ہاں، میں نشاط ہوں۔

شہر کے نفتہ گر لوگو!

اپنے اندر کی آگ بجائے بجھانے کے یہاں تک لے آئے۔ وہ اس طرف کیپری ہے۔ کم بخت ذرا سخت جان نکلا کہ اب تک موجود ہے اور شہر کے لوگوں کا دل بہلانے اب بھی نکی تماشا پیش کیے جا رہا ہے۔ اپنے اسی ڈولبی ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ کہ جس نے کبھی شہر میں دھوم مچا رکھی تھی، یاد ہے، جب انگریزی فلم اٹس میڈ میڈ میڈ ورلڈ کے شروع کے منظر میں وہ بڑے میاں کچھ لوگوں کو خزانے کا پتا بتانے کے بعد آخری ہچکی لیتے ہیں۔ ان کے پاؤں کی ٹھوکر سے قریب پڑا ہوا ٹین کا ڈبہ لڑکھڑاتا ہوا چٹانی پتھروں سے نیچے کی طرف لڑھکنے لگتا ہے۔ تب کیپری کا ساؤنڈ پورے والیوم سے کھول دیا جاتا تھا اور سنیما ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ لوگ بڑے میاں کے مر جانے پر نہیں اپنے ڈر جانے پر کھسیانے ہو کر ہنسا کرتے تھے۔

یہی وہ کیپری تھا کہ جہاں اوّل درجے کی ہالی ووڈ فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔ گریگری پیک اور عمر شریف کی مشہور دی میکناز گولڈ تو یاد ہے ناں۔ اس فلم کا ٹائٹل سونگ اولڈ ٹرکی بزرڈ بھی یاد ہوگا اور پھر اس فلم کے آخری مناظر، وہ لمبی مخروطی چٹانوں کے سایوں کا سرکنا اور پھر پہاڑی درے کا نمایاں ہونا کہ جہاں خزانے کے انبار لگے ہوئے تھے اور پھر زوردار زلزلہ اور ہر شے کا تباہ ہو جانا۔ کتنی زبردست فلم تھی۔ ایسی ہی اور مزیدار فلموں کی ایک پوری فہرست ہے جنہیں دیکھ کر لوگ اپنی ذہنی کلفتوں کو چند گھنٹوں کے لیے سہی بھول جایا کرتے تھے اور پھر ایک فلم دی گڈ دی بیڈ اینڈ دی اگلی، اس فلم کا بیک گراؤنڈ میوزک جو آج بھی فلموں اور ڈراموں کے سسپنس والے مناظر میں بجایا جاتا ہے۔ کیا یہ سب بھلا دیا گیا ہے۔

اچھا ہوا بھول گئے۔ پرنس کو بھی بھول گئے۔ کراچی کے سنیما گھروں کا ایک جدید سنیما، شاید سیٹوں کی گنجائش کے لحاظ سے شہر کا سب سے بڑا سنیما تھا۔ کئی خوب صورت فلمیں یہاں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ رفتہ رفتہ فلموں کا معیار گرتا گیا۔ فلم بینوں کا معیار بھی گرتا گیا۔ یہ پھر بھی سانس لیے جا رہا تھا۔ لوگوں کو ان کے بگڑے ہوئے مزاج کے ساتھ سستی تفریح مہیا کر رہا تھا۔ کھیل ختم، پیسا ہضم، بند ہو گیا بے چارہ۔

میں اپنے سامنے ناز کو دیکھتا ہوں۔ سوچتا ہوں اچھا ہوا اس نے اپنا روپ بدل ڈالا۔ شاپنگ سینٹر بن گیا۔ دھن والوں کی دنیا میں فن والوں کا کیا کام۔ کیا زمانہ تھا اس کا بھی۔ ناز جو کبھی رادھا ٹاکیز ہوا کرتا تھا۔ شاندار فلمیں نمائش کے لیے پیش کرتا تھا پھر مالکان بدلے تو نام بھی بدل گیا۔ ثریا بائی نامی نئی مالکہ نے رادھا ٹاکیز کو ناز ٹاکیز کا نیا نام دیا اور اس شہر نے اسی ناز سنیما کے فٹ پاتھوں پر ولولہ خیز مناظر بھی دیکھے۔ جب فلم ''آن'' اس تھیٹر پر نمائش کے لیے پیش کی گئی تو محض اس فلم کے ٹکٹ لینے کے لیے لوگ رات سے یہاں بستر بچھا کر سویا کرتے تھے کہ دن میں انہیں ٹکٹ کی لائن میں آگے جگہ مل سکے۔ کیا شوق تھا، کیا جنون تھا پھر اسی ناز پر وحید مراد، محمد علی اور ندیم کی فلمیں دھوم مچاتی رہیں۔ فلم انڈسٹری کے زوال نے جہاں فلموں کا ستیاناس کیا وہیں سنیماؤں پر بھی آفت آنی شروع ہوئی اور ماضی کا یہ سنیما، رادھا ٹاکیز سے ناز ٹاکیز کا سفر کرتا ہوا شاپنگ سینٹر بن گیا اور اس کا نام شہر کی تاریخ میں ماضی کا حصہ بن گیا۔

حتیٰ کہ ادھر سر آغا خان روڈ پر انکل سریا اسپتال کے سامنے واقع ریو سنیما نے فحش فلموں کے سلسلے میں بدنامی کمائی۔ پھر بھی میں نے اپنا معیار گرنے نہیں دیا۔ آخر وقت تک فلم بینوں کو اگر فیملی کے ساتھ کوئی فلم دیکھنی ہوتی تو ان کی نگاہِ انتخاب مجھ پر ہی ٹھہرتی تھی لیکن اب میں بھی خاموش پڑا ہوں۔ برباد اور پامال پڑا ہوں۔۔۔ اور اس شہر کی بے وفا شاموں میں اپنے ماضی کو یاد کر کے چپ چاپ روتا ہوں۔

کچھ دیکھتے خواب سجائے ہوئے
کچھ چبھتی یادیں بسائے ہوئے
میں ریزہ ریزہ بکھر گیا
کوئی دیکھنے والا ہے کہ نہیں



زویا اعجاز

وہ جدت کا پرستار تھا، روایت سے بغاوت کو اس نے جزو ایمان سمجھ لیا تھا، اس کی سوچ تھی کہ زندگی کے تقاضوں پر پورا اترنے کے لیے پرانی، فرسودہ روایتوں کا جہل کھرچنا ضروری ہے۔ انبوہ میں ایک ہونا بے وقوفی ہے، انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہو، ہر جگہ الگ سُر گونجے۔ اسی وجہ سے وہ باغی بن گیا تھا۔

وہ معاشرے سے بغاوت کا حامی تھا

وہ ننھا سا لڑکا بہت سہمے ہوئے انداز میں کمرے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں بہت سی الجھنیں اور سوال نظر آ رہے تھے۔

کمرے کے اندر دو افراد کے جھگڑنے اور بحث کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور ہر لفظ اس لڑکے کا دل خنجر کی طرح زخمی کر رہا تھا۔ وہ دونوں افراد اس کی زندگی میں بہت اہم تھے اور وہ ان سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کا اس طرح بحث و مباحثہ اس کے لیے کوئی نیا منظر نہیں تھا لیکن ہر بار وہ پہلے سے



زیادہ دکھ محسوس کرتا۔

''مجھے اس وقت تمہارے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔'' مرد کی آواز مزید بلند ہوئی۔

''میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا؟'' عورت چلّائی۔

''مجھے کچھ پیسے درکار ہیں ورنہ مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔'' مرد نے التجا کی۔

''میں اپنا سب کچھ تو تم پر برباد کر چکی ہوں۔ اب مزید کیا چاہیے تمہیں؟'' عورت پر اس التجا کا کوئی اثر نہ ہوا۔

''اس مرتبہ آخری بار میری مدد کر دو۔''

''میں بالکل قلاش ہو چکی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔''

''جھوٹ بولتی ہو تم! تمہارے پاس اب بھی بہت دولت ہے۔'' مرد غرایا۔

''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یونہی سہی ورنہ حقیقت تم خود بھی جانتے ہو۔ انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' عورت نے بے نیازی مگر سختی سے کہا۔

مرد کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور لب و لہجے میں مٹھاس بھر لی۔ ''دیکھو کیتھی! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم معاملہ کی سنگینی نظر انداز کر رہی ہو۔''

''مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''احمق عورت! تم نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔''

''پہلے بھی تو سب کچھ برباد ہی ہے۔''

''میرا نہیں تو جارج ہی کا خیال کر لو!'' اس نے دھمکایا۔

''اب تک صرف اسی کا تو سوچا ہے لیکن اب میں تمہارے مطالبات پورے نہیں کر سکتی۔''

''ٹھیک ہے! اس صورت میں مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔''

''تم پہلے بھی میرے ساتھ کب ہو جان!! تمہاری موجودگی بھی میرے لیے کسی سزا سے کم تو نہیں رہی۔'' عورت نے دکھ سے کہا۔

اگلے روز جان اس ننھے لڑکے کے پاس آیا اور کافی دیر تک اسے گلے لگائے سر سہلاتا رہا۔

''میں چاہ کر بھی یہاں نہیں رہ سکتا میرے بچے! کیتھی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں تمہیں بہت یاد کروں گا۔'' وہ اسے محبت سے کہہ کر چلا گیا۔

اس روز کے بعد جارج کو وہ کبھی نظر نہ آیا۔ جارج بہت افسردہ رہنے لگا۔ ہر روز صبح اٹھ کر وہ جان کا چہرہ تلاش کرتا اور ہر رات سونے سے قبل بھی اس کی آنکھیں باپ کی دید کی منتظر رہتیں لیکن وہ کبھی بھی واپس نہ آیا۔

جارج کے ننھے سے ذہن میں ایک ہی بات نقش ہو گئی کہ اس کی ماں ضدی، احمق اور ظالم ہے۔ کیتھرائن کی وجہ سے اس کا باپ کبھی واپس نہیں آ سکا اور اسی لمحہ سے جارج اور کیتھرائن میں نفرت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ ایسی نفرت جس کی لپیٹ میں آ کر بہت سی زندگیاں برباد ہوئیں اور بہت سے وجود بے مول ہو گئے۔

☆.....☆

جارج اپنی کم عمری کی وجہ سے ماں کے لیے خود ساختہ اندازے لگا کر زندگی جی رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو بہت مثالی سمجھتا تھا۔ اس کی یادداشت میں ایک بانکا سجیلا، زندگی سے بھرپور شخص رہتا تھا جو اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کو اپنے آبا و اجداد کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اصل قصوں سے وہ ہمیشہ بے خبر ہی رہا۔

کیپٹن جان بائرن برطانوی بحریہ میں افسر تھا۔ وہ ایک مصنف بھی تھا۔ اسے 'میڈ جیک' کے نام سے بھی پکارا جاتا۔ جان خاندانی طور پر بحریہ سے وابستہ تھا۔ اس کے والد بھی نائب امیر البحر تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب بھی کسی سمندری سفر پر روانہ ہوتا، موسم کروٹ بدلتا اور بہت طوفانی روپ اختیار کر لیتا۔ اسی وجہ سے وہ Foul Weather کے نام سے بھی مشہور تھے۔

کیپٹن جان بائرن ایک عیاش طبع شخص تھا جس نے زندگی میں محنت کے سوا سب کچھ کیا۔ اس کی پہلی شادی ایک دھواں دھار معاشقے کا نتیجہ تھی۔ امیر رابرٹ ڈارسی کی بیٹی ایمیلیا کو اپنے دام میں پھنسانا اس کے لیے بالکل مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ رابرٹ ڈارسی برطانوی امراء کے طبقہ میں 'ارل' (تیسرے درجے کا امیر) تھا۔ ایمیلیا شادی شدہ تھی۔ اس کا شوہر 'کارمارتھن' کا نواب تھا۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی اور اسی دولت کی وجہ سے ہی جان اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ایمیلیا نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر جون 1779 میں جان سے شادی کر لی۔ اسے گمان تھا کہ جان ہمیشہ اسے اپنے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھے گا اور ان کی محبت بھی سدا قائم رہے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ جان کا رویہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اجڈ ہوتا گیا۔ وہ اسے ذہنی اذیت دیتا۔ کیونکہ جان ایک وحشی اور جنگلی انسان تھا۔ ایمیلیا نے اس دوران دو لڑکیوں کو جنم دیا۔ ایک بیٹی زیادہ

عرصہ زندہ نہ رہ سکی۔ دوسری بیٹی آگسٹا بھی عجیب و غریب حالات اور گھٹے ہوئے ماحول میں پرورش پانے لگی۔

ایمیلیا نے زندگی بہت ناز و نعم میں گزاری تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ محبت کے نام پر کھایا گیا دھوکا اور جان کا رویہ اسے ایک گہرے روگ میں مبتلا کر گیا۔ وہ نرم و نازک سی عورت یہ سب برداشت نہ کر پائی اور پانچ سال میں ہی موت کو گلے لگا بیٹھی۔

☆.....☆

جارج اپنے کھیل میں مصروف تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا جس نے اس کی زندگی کو بہت سی مشکلات میں ڈال رکھا تھا۔ اسے ClubFoot کا عارضہ تھا۔ اس مرض میں پاؤں کی ہڈیاں صحیح پروان نہیں چڑھتیں۔ ایڑھی تلوے سے بہت بڑی ہو جاتی ہے اور پنجہ مڑتے ہوئے ایڑھی کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ اس جسمانی نقص کا علاج تو ممکن تھا لیکن جارج کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے اچھی طبی سہولیات نہ ملیں اور یہ مرض بگڑ گیا۔

وہ اپنے اس نقص کی وجہ سے خاصا بیزار اور چڑچڑا بھی رہتا۔ ساتھی لڑکوں کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھتا تو دل میں نفرت اور حسد کی ایک آگ پیدا ہو جاتی۔ چھوٹی سی عمر ہی سے اس کے ذہن میں بہت سی الجھنیں تھیں۔ وہ اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا رہتا۔

''میں دوسرے لڑکوں کی طرح کھیل کود میں حصہ کیوں نہیں لے سکتا؟''

''میری ماں دوسری عورتوں کی طرح چست، چالاک اور نرم خو کیوں نہیں ہے؟''

''میرا باپ واپس کیوں نہیں آیا؟ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔''

اس طرح کے کئی سوال اس کے ذہن میں کھلبلی مچاتے اور وہ خود ہی ان کے جواب تلاش کرنے کی کوششیں کرتا رہتا۔ اس دن وہ اپنا کھیل چھوڑ کر کیتھرائن سے کچھ سوال پوچھنے کے لیے اسے ڈھونڈنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح سیڑھیوں میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر غصہ، نفرت اور بیزاری تھی۔ جارج کے لیے یہ رنگ نئے نہیں تھے۔ اس نے ماں کو ہمیشہ اسی روپ میں دیکھا تھا۔ وہ خلا میں تک رہی تھی۔ جارج نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا لیکن جب کچھ نظر نہ آیا تو غصے سے پاؤں پٹخ کر ایک جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کیتھرائن کو غور سے دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ خلا میں اسے کیا نظر آ رہا ہے؟

کیتھرائن اپنے پاس کھڑے جارج کی حرکات سے لاعلم نہیں تھی لیکن وہ اس کے تلخ سوالوں کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے نظر انداز کیے ہوئے اپنے ماضی اور جان کے متعلق سوچ سوچ کر کڑھتی رہی۔

کیتھرائن کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ ولیم بائرن کی بیٹی تھی۔ ولیم ایک معزز سیاستدان اور نواب تھا اور ردچڈیل میں لنکاسٹر کاؤنٹی کی نواب نسل میں چوتھا جانشین تھا۔ کیتھرائن نے زندگی میں بے شمار دولت دیکھی تھی۔ اس کی بدقسمتی کا آغاز اس وقت ہوا جب جان سے شادی کی حامی بھر لی۔ ابتدا میں وہ اس کی فطرت بالکل نہ سمجھ سکی اور اس کی محبت کو ہی سچ مان کر خود فریبی کا شکار رہی۔

شادی کے بعد جان نے اسے بہت محبت دی اور اپنا خاندانی نام تک تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیتھرائن اس فیصلے سے بہت خوش تھی۔ اس کی ایک عزیزہ نے اپنے خدشات بیان کیے۔ ''کیتھی! کیا تمہیں یقین ہے کہ جان تم سے مخلص ہے؟''

''ہاں وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''وہ تو ہمیں بھی نظر آ رہا ہے کہ اس نے اپنا خاندانی نام تک تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس نے طنز کیا۔

''اس میں اتنا چیں بہ جبیں کیوں ہو رہی ہو۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے بہت مخلص ہے۔'' کیتھرائن نے اتراتے ہوئے کہا۔

''نہیں میری بہنا! یہی تو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص ابن الوقت اور موقع پرست ہے۔ خاندان اور نام تو انسان کی پہچان ہوتے ہیں۔ جو شخص اسے تبدیل کر لے گا، وہ بہت خطرناک ہو گا۔ اس لیے اب بھی وقت ہے اعتبار کی پٹی آنکھوں سے اتار دو۔''

''تم مجھے میرے شوہر سے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ شاید تم حسد میں مبتلا ہو رہی ہو۔ تمہاری یہ باتیں مجھے اس سے بدگمان نہیں کر سکتیں۔'' کیتھرائن کو اپنے شوہر پر بہت اعتماد تھا۔

کچھ عرصہ گزرا تو جان نے اپنے سسر کا خاندانی نام اپنا لیا اور جان گورڈن بائرن بن گیا۔ کیتھرائن بہت خوش تھی۔ یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ جلد ہی جان نے اپنے اصل رنگ دکھانے شروع کر دیے۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور پیسا ہی اس کا مذہب تھا۔ عیاشی اس کی رگ رگ میں بھری تھی۔ آنے

والے وقت نے یہ بات ثابت کردیا کہ اس نے بیوی کے اثاثہ جات پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہی اپنا نام تبدیل کیا تھا۔

وہ بہت شاطر انسان تھا۔ حیلے بہانوں سے پیسے اینٹھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اللے تللوں میں زندگی گزارنے کی وجہ سے بال بال مقروض تھا۔ قرض خواہوں کے مطالبات جب حد سے بڑھ جاتے تو کیتھرائن سے پیسے وصول کرکے انہیں ادائیگی کردیتا۔ دو سال ہی کے عرصہ میں اسے اپنی جائداد فروخت کرنی پڑی۔ شادی سے قبل اس کے اثاثہ جات 23,500 پاؤنڈز تھے لیکن شوہر کے قرضوں کی ادائیگی کے بعد نوبت یہاں تک آپہنچی کہ اس جائداد کے ٹرسٹ سے اسے صرف ڈیڑھ سو پاؤنڈز سالانہ کا منافع باقی رہ گیا۔ کیتھرائن کی آنکھوں سے محبت کی پٹی اتری تو یہ بھیانک حقیقت نظر آئی کہ جان کو اس سے کبھی بھی محبت نہ تھی۔ وہ ایک جونک نما انسان تھا جو اس کی ساری دولت چوس گیا تھا لیکن اپنے اطوار اب بھی نہ سدھارے اور قرض لینے کا سلسلہ بھی شیطان کی آنت کی طرح پھیلتا چلا گیا۔

کیتھرائن اس آگاہی سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔ اس کا پندار زخمی ہوگیا اور ردعمل کے طور پر وہ سرد مہر اور بے حس ہوگئی۔ قرض خواہوں کے مطالبات جب حد سے بڑھے تو وہ شوہر کے ساتھ 1786 میں فرانس جاکر روپوش ہوگئی۔ فرانسیسی سرزمین ان کے رشتے میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ کرسکی ماسوائے اس بات کے کہ جارج کی پیدائش کی خبر نے اس کی طبیعت میں ہلکی پھلکی تبدیلی پیدا کردی اور وہ شوہر کے بد اطوار کو بھول کر آنے والے مہمان کے خیالات میں گم رہنے لگی۔

تھوڑا وقت اور گزرا تو اس کے دل میں پھر سے اپنی آبائی سرزمین کی ہڑک پیدا ہونے لگی۔ وہ اپنی اولاد کو انگلستان میں جنم دینا چاہتی تھی اس لیے اس نے شوہر کو مجبور کرکے واپسی پر آمادہ کیا۔ جان نے بھی وقتی مصالحت کے تحت اس کی بات مان لی اور 1787 میں وہ وطن واپس آگئے۔

اگلے سال 24 Holles Street میں 22 جنوری 1788 کو ان کے گھر ایک بہت معصوم نقوش اور من موہنی سی صورت والے بچے نے جنم لیا۔ بچہ بہت خوبصورت تھا۔ کیتھرائن اسے دیکھ کر نہال ہونے لگی۔ اسے 'سینٹ میری لیبون پیرش' چرچ میں بپتسمہ دے کر 'جارج گورڈن بائرن' کا نام دیا گیا۔

جارج کی پیدائش کے بعد بھی حالات میں کوئی سدھار نہ آیا۔ دو سال بعد وہ بیٹے کے ساتھ Aberdeenshire منتقل ہوگئی۔ زندگی بہت کسمپرسی کا شکار تھی۔ کچھ عرصہ بعد جان بھی انہی کے پاس آگیا اور ایک بار پھر لڑائی جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔ ان دنوں وہ کوئینز اسٹریٹ میں رہ رہے تھے۔ جان اپنے قرض خواہوں سے بہت پریشان تھا اور ایک جھگڑے کے بعد اس نے دوبارہ فرانس منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

فرانس میں ایک سال گزارنے کے بعد وہ تپ دق میں مبتلا ہوگیا۔ اٹھارہویں صدی میں یہ ایک مہلک مرض تھا۔ اپنی عیاشی اور قرض میں ڈوبی زندگی سے اسے 1791 میں نجات مل گئی۔ موت کے وقت اس کی عمر صرف پینتیس برس تھی۔

سیڑھیوں میں بیٹھی کیتھرائن کو شوہر کے فریب' اس سے ملی اذیت اور اس کی موت یاد آئی تو وہ ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا ہوگئی۔ ''تم پر خدا کی لعنت ہو جان! تم مرنے کے بعد بھی جہنم میں جلو گے۔ تم نے میری زندگی برباد کردی۔ تم مرنے کے بعد بھی کبھی سکون میں نہیں رہو گے۔''

بلند آواز سے چیختی ہوئی کیتھرائن بھول گئی کہ جارج بھی یہ سب سن رہا تھا۔ جارج کو اس وقت اپنی ماں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس کی ضد' احمقانہ پن اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہی جان ان سے دور چلا گیا تھا اور اب بھی وہ اسے گالیاں دے رہی تھی بددعاؤں سے نواز رہی تھی۔

جارج گارڈن بائرن نے سوچ لیا کہ اس کی ماں ایک 'اچھی عورت' بالکل نہیں تھی۔ وہ ماں سے مزید نفرت کرنے لگا۔

☆......☆

جارج اور کیتھرائن ایک ہی گھر میں رہتے تھے لیکن ذہنی اور قلبی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ کیتھرائن کو بیٹے کے طور طریقوں اور خوبصورتی میں جان کی جھلک دکھائی دیتی۔ وہ اس کی ہٹ دھرم طبیعت سے بھی عاجز تھی۔ جارج ایک مشکل بچہ تھا۔ اسے سنبھالنا آسان نہیں تھا۔ اپنے جسمانی نقص کی وجہ سے وہ چڑچڑے پن میں مبتلا رہتا۔ کیتھرائن نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں سدھار آجائے گا۔

دوسری جانب جارج کو اپنی ماں کے عجیب و غریب اطوار دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ وہ اپنے ہی مزاج کی عورت تھی۔ کبھی بہت خوش ہوتی' ہنستی کھلکھلاتی دکھائی دیتی اور کبھی اس پر عجیب اداسی' بیزاری اور ہسٹریائی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس حالت میں وہ خود کلامی کرنے لگتی' خلا میں تکتی ہوئی جانے کیا بڑبڑاتی رہتی اور پھر چیخ و پکار کرنے لگتی۔ جب وہ خوشگوار موڈ میں ہوتی تو جارج اس کے پاس چلا جاتا اور مختلف

حیلے بہانوں سے اپنے باپ کے بارے میں جاننے کی کوششیں کرنے لگتا۔

''وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' کیتھرائن نے ایک روز اسے حقیقت سے آشنا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''کیوں؟ وہ اگر نہیں آئیں گے تو مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔''

''تم بھی اس کے پاس نہیں جاسکتے۔ وہ مرچکا ہے۔''

''لیکن وہ بوڑھے تھے نہ ہی بیمار۔ ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''وہ بیمار ہی تو تھا۔ اس نے اپنی بیماری مجھے بھی منتقل کردی۔ اس نے خود ہی اپنا گلا کاٹ لیا۔'' کیتھرائن نے اس کے ماضی کی عادات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

جارج اس کی یہ بات مکمل طور پر سمجھ نہ سکا اور اس کے ذہن میں ایک اور غلط فہمی نے جگہ بنالی کہ اس کے باپ نے اپنا گلا کاٹ لیا تھا اور اس کی ذمہ دار بھی صرف اس کی ماں ہی تھی جس کے دھوپ چھاؤں جیسے مزاج نے نوبت یہاں تک پہنچا دی۔

کیتھرائن کے لیے اب جارج کو سنبھالنا اور اس کی پرورش کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک اسکاچ لڑکی 'مے گرے' کو بطور آیا رکھ لیا۔ یہ فیصلہ بھی درست ثابت نہ ہوا۔ مے گرے اخلاقی طور پر اچھی خاتون نہ تھی۔ وہ جارج کی طرف مائل ہوگئی اور اسے بھی اپنی طرح اخلاقی پستیوں کا عادی بنانے لگی۔ جارج کبھی بھی ماں سے اتنا نزدیک نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں آنے والے مسائل اور ایسے حادثات بتا کر رہنمائی طلب کرتا۔ وہ بخوشی اس اخلاقی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ کیتھرائن کو ذہنی اذیت دینے کا کوئی بھی موقع وہ ہاتھ سے جانے ہی نہ دینا چاہتا تھا۔

جارج بائرن کی زندگی کو گمراہیوں کے حوالے کرنے والا دوسرا شخص اس کے اپنے ہی خاندان سے تھا۔ لارڈ گرے ڈی روتھین' کیتھرائن کا رشتہ دار تھا اور سائل بھی۔ وہ اخلاقی پستی کا شکار تھا۔ نو سال کی عمر میں اس نے جارج بائرن کا بچپن اور معصومیت اس سے چھین لی' اسے بے شمار نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کردیا۔

جارج کو اپنے گھر میں گرے کی آمد و رفت بالکل پسند نہ تھی لیکن کیتھرائن اس کا استقبال خوشدلی سے کرتی۔ شوہر کے دیے گئے فریب اور اس کی وفات سے وہ احساس محرومی کا شکار تھی اس لیے لارڈ گرے کے فلرٹ کا خندہ پیشانی سے سامنا کرلی۔ اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ اس کی یہ حرکات بیٹے کو مزید نفرت میں مبتلا کررہی ہیں۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ جارج اور لارڈ ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کا بھرم جارج ہی نے ایک روز چکنا چور کردیا۔ لارڈ گرے ان کے گھر میں موجود تھا۔ اس نے جارج کو بہت محبت سے اپنے پاس بلایا۔ ''جارج! میرے پیارے بچے! کیسے ہو تم؟ میں تمہیں اور کیتھرائن کو اپنے گھر مدعو کرنے آیا تھا۔'' وہ بیٹھک کے کمرے میں اس کی اچانک آمد پر کھسیا گیا تھا۔

''آئندہ اس شخص کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا کرو۔'' جارج کی نیلگوں آنکھوں میں نفرت کی تپش تھی۔

''کیا تمہیں میری یہاں آمد پسند نہیں بیٹا؟'' لارڈ نے ایک بار پھر محبت جتائی۔

جارج نے غصے سے فرش پر تھوکا اور حقارت سے اسے گھورتا وہاں سے چلا گیا۔

''اس کی بدتمیزی پر میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ وہ بہت بے ہودہ ہو چکا ہے۔ ہر وقت ناک میں دم کیے رکھتا ہے۔'' کیتھرائن نے بات سنبھالی۔

لارڈ گرے کے جانے کے بعد اس نے جارج کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تمہیں مہمانوں سے برتاؤ کی تمیز نہیں رہی؟''

''مجھے وہ شخص سخت ناپسند ہے۔''

''لیکن کیوں؟ وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔''

''مجھے اس شخص سے گھن آتی ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو میں اسے قتل کردوں گا۔'' جارج کے چلانے پر کیتھرائن بھی غصے میں آگئی۔ کچھ دیر قبل کی گئی شراب نوشی بھی اپنا رنگ جمانے لگی تھی۔

''تم لنگڑے چھوکرے! اپنے باپ ہی کی طرح خود غرض ہو۔ تمہیں بھی رشتوں کی قدر نہیں۔''

''میں لنگڑا چھوکرا نہیں ہوں۔ میں لنگڑا شیطان ہوں۔ تمہارے جسم کی طرح دماغ پر بھی چربی چڑھ چکی ہے۔ میرے ساتھ آئندہ مت الجھنا۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

ممکن ہے ان ماں بیٹے کا یہ رشتہ' گفتگو اور انداز غیر فطری محسوس ہو۔ لیکن حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک غیر فطری زندگی جی رہے تھے۔ اپنی اپنی ذات میں نفرت کے بلند قلعہ تعمیر کیے وہ انہی قلعوں میں قید ہوچکے تھے اور اب باہر آنے کا رستہ بھی بھول گئے تھے۔

جارج بائرن خیر و شر کا الجھا ہوا ملاپ تھا۔ اس کی فطرت میں یہ دونوں رنگ اس قدر الجھ چکے تھے کہ ان کی الگ الگ تمیز کرنا ناممکن تھا۔ ایک وقت میں وہ خوش مزاج' شوخی و شرارت کا عکس نظر آتا تو دوسرے ہی لمحہ نفرت' خودسری اور سرکشی جھلکنے

تھی۔
یہی حال کیتھرائن کا بھی تھا۔ وہ بیٹے سے بہت محبت کرتی تھی۔ اپنے پیچیدہ حالات کے باوجود اسے انگلستان کے بہترین تعلیمی ادارے Harrow میں داخل کروانے کے لیے جوڑ توڑ کررہی... تھی لیکن دوسری جانب اس کی سرکشی کبھی کبھی کی روح میں لگے زخموں سے ٹکراتی تو وہ مزید بکھر جاتی۔ اسی اذیت اور دکھ میں وہ اس پر چیخنے چلانے لگتی۔ کیتھرائن کی یہ نفسیات بیٹے کو اس سے بہت دور کرتی گئی۔ اپنے دکھوں پر ماتم کرتی اس عورت کو یہ احساس ہی نہ ہوسکا کہ وہ اکلوتے بیٹے کو خودرو جنگلی پودے کی طرح پروان چڑھا رہی ہے۔ وہ اس کی پرورش تو کررہی تھی لیکن تربیت میں مکمل ناکام تھی۔ جارج کی تربیت کا ذمہ سے گریبے جیسی عورت کے سپرد کر کے وہ پرسکون ہو چکی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ جن ہاتھوں میں بیٹے کو سونپا ہے وہی اسے گمراہی کے رستوں پر انگلی تھام کر چلنا سکھا چکے ہیں۔

☆......☆

کیتھرائن اور جارج بائرن کی زندگی یونہی گمنامی میں گزر جاتی لیکن پھر ایک ایسا حادثہ ہوا کہ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔

1798 میں رچڈیل کا پانچواں نواب موت سے ہمکنار ہوگیا۔ وہ بھی طبعاً بدفطرت تھا۔ اس کی وفات کے بعد یہ تاج جارج گورڈن کے سر پر سجا قرار پایا۔ جارج کی عمر اس وقت دس سال تھی۔ دور ونزدیک میں صرف وہی وراثت کا حقدار تھا لہٰذا انیس مئی 1798 کو اسے رچڈیل کا چھٹا نواب قرار دے دیا گیا اور اس روز سے دنیا اسے 'لارڈ بائرن' کے نام سے جاننے لگی۔

تمام اثاثے اور جائیداد اس کے حصہ میں آگئیں۔ نوٹنگھم شائر میں واقع آبائی گھر Newstead Abbey بھی اسی کے قبضہ میں آگیا۔ کیتھرائن بائرن اس روز بے حد خوش تھی۔ فخر اور طمطراق سے وہ ولیم بائرن کی بیٹی کی سی شان لیے جارج کے ہمراہ دوبارہ اس گھر میں منتقل ہوگئی۔

معاشی رتبہ میں تبدیلی آتے ہی لارڈ بائرن کی بچپن کی محرومیوں 'زیادتیوں اور استحصال نے اپنے پھن پھیلا لیے۔ ماضی نے اسے اس قدر زہریلا بنا دیا تھا کہ اب وہ اپنا زہر دوسروں میں بھی منتقل کرنا چاہتا تھا اور اس فیصلے کو اس نے زندگی کی آخری سانس تک نبھایا۔

کیتھرائن اسے بہترین تعلیم دینا چاہتی تھی۔ اس کی رسمی تعلیم کا آغاز Aberdeen Grammar School سے ہوا تھا۔ اگست 1799 میں وہ 'ڈلِ وچ' میں 'ڈاکٹر ولیم گلینی' کے اسکول میں داخل ہوگیا۔ اس ادارے میں ڈاکٹر گلینی نے اسے بہت توجہ' شفقت اور محبت سے پڑھایا۔ وہ اس کے مزاج کی انتہا پسندی اور ذہنی کجی بھانپ گیا تھا اور اسے اعتدال پسندی کی راہ پر چلانا چاہتا تھا۔ بائرن کی فطرت میں بچپن کے رنگ اس قدر گڈمڈ ہو چکے تھے کہ وہ اساتذہ کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود اپنی اس شدت پسندی سے چھٹکارا حاصل نہ کرسکا۔

اس ناکامی میں ایک بڑا حصہ کیتھرائن کا بھی تھا۔ وہ قوت فیصلہ اور قوت ارادی سے محروم عورت تھی۔ اس نے ہمیشہ عجلت میں فیصلے کیے اور بغیر سوچے سمجھے ان پر عمل بھی کر دیا۔ اس کی یہی جلد بازی بائرن کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اپنے مزاج کے تحت وہ اسے مختلف تعلیمی اداروں میں داخل کرواتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کبھی بھی نظم وضبط اور ٹھہراؤ سیکھ ہی نہ سکا۔

1801 میں اسے لندن کے مشہور بورڈنگ اسکول Harrow میں داخل کروا دیا گیا۔ اس ادارے کا تعلیمی ماحول بے مثال تھا۔ وہ ایک غیر نمایاں طالب علم تھا جس کی زندگی میں نظم وضبط کا فقدان تھا۔ اسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ زندگی کے ہر لمحہ سے خوشی کشید کرنا اسے خوب آتا تھا اور اس کم عمری میں ہی اس کی زندگی میں صنف نازک کی آمد ورفت کا آغاز بھی ہوگیا تھا۔

Mary Chaworth سے اس کی ملاقات اسکول ہی میں ہوئی تھی۔ کیوپڈ نے اپنا اثر دکھایا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہو گئے۔ میری سے قبل بھی بائرن کی زندگی میں دو لڑکیاں آچکی تھیں۔ مارگریٹ پارکر اور میری ڈیوف اس کی کزن تھیں۔ اس نے ان سے بھی اسی سچائی و ایمانداری سے 'محبت' کی تھی جس طرح وہ میری سے کررہا تھا۔ اس نے اپنے مبینہ معاشقے کبھی کسی سے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی اور کیتھرائن کو بھی میری کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

کیتھی کا جوابی ردعمل بہت شدید تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں بیٹے کو تنبیہ کی۔ "تمہیں ایک خطرناک مرض لاحق ہوچکا ہے۔ بے لگام محبت ایک مرض ہی ہے جو بدترین قرض میں جکڑ دیتی ہے۔"

بائرن کی زندگی میں انتشار پھیل چکا تھا۔ اسکول میں اس کی دوستی اور تعلقات صرف میری تک ہی محدود نہ تھے۔ لارڈ گرے سے کے دیئے گئے زخم اس قدر زہریلے ہو چکے تھے کہ وہ

اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ ہوگیا تھا۔ جان فٹز گِن' تھامس کلیرج' جان ایڈیلسٹن جیسے ہم مزاج دوست معمولی گھرانوں کے افراد نہیں تھے۔ وہ بااثر اور نامور خاندانوں کے چشم وچراغ تھے۔ انیسویں صدی کا برطانیہ بہت سی گمراہیوں میں مبتلا تھا۔ برطانوی امراء اور اشرافیہ میں یہ اخلاقی کجی مکمل سرایت کرچکی تھی اور کسی متعدی بیماری کی طرح پھیلتی ہی چلی جارہی تھی۔ ایسی صورت میں تربیت سے محروم جارج گورڈن بائرن اس گمراہی سے بچتا بھی تو کیسے؟

☆......☆

اسکول کی پڑھائی جاری رکھے تین سال گزر چکے تھے۔ اس کی سوچ اور معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جن دنوں وہ نوٹنگھم شائر میں واقع اپنے گھر میں ہوتا تھا' کیتھرائن کو ہر وقت زچ کیے رکھتا۔ ایک روز وہ اپنے اسی پسندیدہ مشغلے میں مصروف تھا کہ عقب سے مترنم آواز میں ملامتی فقرے سن کر خاموش ہونا پڑا۔ "میں سمجھتی تھی کہ میرے والد مرحوم جان بائرن کا بیٹا جارج بہت مہذب اور شائستہ طور طریقوں کا مالک ہوگا لیکن آج میرا بھرم ٹوٹ گیا۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں آگسٹا کھڑی تھی۔ وہ اس کی صورت آشنا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ جان بائرن کی پہلی بیوی کی وفات کے بعد آگسٹا نے بہت سخت زندگی گزاری تھی۔ پہلے پہل اس کی نانی لیڈی ہولڈرنیس نے اس کی پرورش کی لیکن وہ بھی بجھتا ہوا چراغ تھی۔ آخر کب تک اس کا ساتھ دے پاتی۔ اس کی وفات کے بعد مختلف رشتہ داروں اور دوست احباب کے گھروں میں شب وروز گزار کر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کررہی تھی اور کبھی کبھار کیتھرائن سے ملنے بھی چلی آیا کرتی۔

بائرن کو اس کے الفاظ سن کر ذرا شرمندگی ہوئی اور وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔ اس روز کے بعد ان دونوں میں ایک بے نام سا تعلق استوار ہوگیا۔ وہ جب بھی گھر آتا' آگسٹا اسے ماں کی موافقت میں سمجھانے کی ہرممکن کوشش کیا کرتی۔ وہ دوستی اور اعتماد کے تعلق میں بندھ گئے۔

"تم بہت اچھے لڑکے ہو جارج! رچڈیل کے نواب ہو اس لیے ایسی بدتہذیبی تم پر نہیں جچتی۔"

"میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔ بس خود بخود ہو جاتا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ تمہاری ماں تم سے بہت پیار کرتی ہے اور اسے ایسا رویہ بہت تکلیف دیتا ہے۔"

"مجھے تو کبھی اس کا پیار نظر نہیں آیا۔" وہ ہنسا۔

"تم انہیں اذیت دینے کے لیے اپنا نقصان بھی کررہے ہو۔"

"یہ بات کس بنا پر کہہ رہی ہو؟"

"تمہارے پاؤں کا عیب ٹھیک ہوسکتا تھا لیکن آنٹی نے بتایا کہ تم نے تسمہ والے خصوصی جوتے پہننے سے ہمیشہ انکار کیا۔ کیا یہ تمہارا ذاتی نقصان نہیں؟" اس نے سبھاؤ سے کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بائرن کبھی اس پہلو یا اپنی ذات کی کسی بھی کمزوری کا تذکرہ پسند ہی نہیں کرتا۔

"مجھے لوگوں کی ترحم اور تاسف آمیز نظروں سے سخت نفرت ہے۔ اس لیے میں ایسے جوتے پہن کر اپنے جسمانی نقص کا اشتہار نہیں لگوانا چاہتا تھا۔"

"لیکن خصوصی جوتے تو تم اب بھی پہنتے ہو۔ کیا اس سے تمہیں اذیت یا پریشانی نہیں ہوتی؟" آگسٹا نے اس کے لیے خاص طور پر بنوائے گئے جوتوں کی طرف دیکھا جنہیں پہن کر پاؤں کا عیب زیادہ نمایاں نہیں ہوتا تھا۔

"اس سے ملنے والی اذیت صرف مجھ تک محدود ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میں کیا محسوس کرتا ہوں لیکن تسمے پہن کر ہر ایک مجھ سے اظہار ہمدردی کرے گا' ترس کھائے گا۔ یہ مجھے منظور نہیں۔"

آگسٹا کو اس کی قوت ارادی اور سوچ نے بہت متاثر کیا۔ وہ دونوں اپنی زندگی کے چھوٹے موٹے مسائل پر بات کرلیا کرتے تھے۔ آگسٹا اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اسکول جانے کے بعد بائرن نے اس سے خط وکتابت جاری رکھی۔ وہ خطوط میں بھی اسے کیتھرائن سے مثبت رویہ اپنانے پر زور دیتی رہی۔ ان کی دوستی کافی گہری ہوگئی تھی۔

☆......☆

بائرن سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ بلوغت نے اس کی سرکشی ہٹ دھرمی اور اخلاقی بے راہ روی میں مزید اضافہ کیا تھا لیکن اس سال اس کی زندگی میں دو تبدیلیاں آئیں۔ اس نے 'لارڈز' کے تاریخی کرکٹ گراؤنڈ پر ہونے والے Eton Vs Harrow کرکٹ میچ میں حصہ لیا۔ اپنی تکلیف دہ بیماری کے باعث اس میچ میں شرکت آسان نہیں تھی لیکن اس نے قوت ارادی کی بدولت یہ کام بھی ممکن کردکھایا۔

بائرن تکنیکی اعتبار سے ایک ناکام کرکٹر تھا اور اس بات سے آگاہی کے باوجود وہ صرف قریبی احباب اور رشتہ داروں کو متاثر کرنے کے لیے اس مشکل مرحلہ سے بھی گزر گیا۔ اس کی

مشکل پسندی سے سب متاثر ہوئے لیکن کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ اکھڑ، مغرور، تند خو اور بظاہر سطحی دکھائی دینے والے لارڈ بائرن کے اندر ایک حساس، گہری سوچ اور کڑھنے والا شخص بھی چھپا ہے جسے پھولوں اور رنگوں سے پیار ہے اور وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا روپ دینا چاہتا ہے۔

لارڈ بائرن نے سترہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کر دیا۔ اسی سال خزاں میں اس کا داخلہ Trinity College Cambridge میں ہوگیا۔ پڑھائی لکھائی کا اسے کوئی خاص شوق تو تھا نہیں اس لیے کالج میں بھی اپنے سابقہ معمول جاری رکھے۔ کالج میں بائرن کو اپنا کمرا بالکل پسند نہ آیا اور وہ انتظامی افسر کے پاس جا پہنچا۔ ”مجھے کمرے میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔“

”کیسی تبدیلیاں؟“ ایڈمن نے حیرانی سے اس معصوم صورت لڑکے کی طرف دیکھا۔

”کمرے میں شیشے کی صراحی، بلوریں گلاس، چار بوتلیں وائن، چار بوتلیں پورٹ، چار عدد شیری اور چار ہی بوتلیں ارغوانی شراب ہونی چاہیے۔ مجھے یہ سب مہیا کیا جائے یا انہیں رکھنے سے منع نہ کیا جائے۔“ اس کا مطالبہ سن کر ایڈمن نے سر پیٹ لیا۔

بائرن کی ضد صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ وہ اپنے پالتو جانوروں سے بہت محبت کرتا تھا۔ Boatswain نامی بلڈاگ میں تو اس کی جان تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ اس کے کاٹنے یا کسی بھی انفیکشن کی پروا کیے بغیر اس کی آیا گیری تک کر لیا کرتا۔ وہ اسے کالج میں بھی ہمراہ رکھنا چاہتا تھا لیکن ادارے نے اپنے تحریری قوانین کا حوالہ دیتے ہوئے اسے منع کر دیا۔ اس وقت تو وہ خاموش ہوگیا۔ انتظامیہ نے بھی سکون کا سانس لیا لیکن یہ سکون اس وقت ہوا ہوگیا جب کچھ عرصہ بعد بائرن ایک ریچھ لیے چلا آیا۔

”یہ کیا اٹھا لائے ہو ساتھ؟“ ایڈمن حیرت سے چلایا۔

”یہ میرا پالتو ریچھ ہے اور آج سے یہیں میرے ساتھ رہے گا۔“

”ایسا ممکن نہیں بائرن! یہ خلاف قانون ہے۔“

”ایسا بالکل ممکن ہے ڈیئر سر!! اور قانون ذرا مجھے بھی تو دکھایئے؟ آپ کے تحریری قوانین میں جن پالتو جانوروں کو یہاں لانے سے منع کیا گیا ہے ان میں ریچھ کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس لیے آپ اس معصوم کو یہاں رہنے سے روک نہیں سکتے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ اسے کیسے اپنے ساتھ رکھو گے؟“

”یہ نہ صرف میرے ساتھ رہے گا بلکہ میں اس کا داخلہ بھی کرواؤں گا۔ یہ کالج کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور میری کلاس میں بیٹھ کر پڑھائی بھی کرے گا۔“ بائرن کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ اپنے خلاف ہونے والے کسی بھی کام کا بہترین انتقام لیا کرتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک انتقامی زندگی ہی جی رہا تھا۔

☆......☆

1805 میں بائرن نے اپنے جذبات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ سترہ سال کا تھا۔ آغاز میں اس نے چند نظمیں لکھیں۔ اس دوران اس کی شناسائی الزابتھ پگوٹ اور اس کے بھائی جان سے ہوئی۔ یہ شناسائی جلد ہی قریبی تعلقات میں ڈھل گئی۔ اس نے جان کے ساتھ تفریحی عناصر پر مشتمل دو اسٹیج ڈرامے تیار کیے۔ الزابتھ کی دلچسپی بائرن کی شاعری میں تھی۔ وہ اس کے مسودے اکٹھے کرتی اور انہیں قدرے بہتر لکھائی و انداز میں ڈھالنے لگی۔

بائرن کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد کامیاب اور نامور شاعر بن جائے گا۔ اس نے اپنی ابتدائی شاعری کے سبھی مسودے جمع کیے اور ایک قریبی دوست 'جے۔ ٹی۔ بیچر' کو دکھائے۔ ”اسے پڑھ کر اپنی رائے دو بیچر!“

”یہ کیا ہے بھئی؟“

”میری شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ میں اسے کتابی شکل میں شائع کروانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ شاعری انگلستان میں دھوم مچا دے گی۔“

بیچر نے مسودے پر ایک نظر دوڑائی اور فوری نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اس نے کاغذات کو تہ کیا اور قریبی آتشدان میں پھینک دیا۔

”یہ کیا حرکت کی تم نے؟“ بائرن کو غصہ آیا۔

”یہ مسودے اسی قابل ہیں۔“ بیچر نے نرمی سے سمجھایا۔ ”میں تمہاری لکھنے کی صلاحیتوں سے انکاری نہیں لیکن یہ شاعری منفی تنقید حاصل کرے گی۔ جذبات و احساسات کا بیان بہت بے باک ہے۔ میری کے لیے لکھی گئی نظم تو ضرورت سے زیادہ ہی بے باک ہے۔ عوام کو وہ ادب پڑھاؤ جو ان کے لیے قابل ہضم ہو۔ تمہاری شاعری میں عشقیہ جذبات کی بھرمار ہے۔ ہم سب اپنی زندگی میں ایک بار اس دور سے گزرتے ہیں لیکن جب کسی شاعر یا ادیب کے قلم سے یہ جذبات پڑھتے ہیں تو

تنقید کرنے لگتے ہیں۔ کیا تم اپنی تخلیقات پر ایسی بے رحم تنقید برداشت کر لو گے؟“

بائرن کا جواب نفی تھا۔ وہ بیچر کی بات سمجھ گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بہت جلد اپنی شاعری میں مثبت تبدیلی لے آئے گا۔

شاعری میں جدوجہد کے علاوہ اس کے معمولات زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ذہنی و اخلاقی بے راہ روی میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اپنی وجاہت اور کشش سے آگاہ تھا۔ اس کا قد لگ بھگ پانچ فٹ 9 انچ تھا اور وزن 89 کلو۔ اپنی شخصیت کو مزید پرکشش بنانے کے لیے وہ مصنوعی آرائشی چیزوں کا سہارا بھی لیا کرتا۔ اس کا جسم ورزشی تھا لیکن اپنی جسامت سے غیر مطمئن رہتا۔ وہ ایک قابل نکمہ باز، گھڑسوار اور شاندار تیراک بھی تھا۔ کالج میں وہ اپنی غذا کے معاملہ میں بہت محتاط رہتا۔ وزن قابو میں رکھنے کے لیے ڈائٹنگ کیا کرتا تھا۔ اس کے جسمانی نقص کی وجہ سے مطلوبہ معیار کی ورزش ممکن نہ ہوتی تو ڈھیروں کپڑے پہن لیا کرتا تا کہ اسے زیادہ پسینا آئے اور جسم سے فاضل مادے خارج ہو سکیں۔

بائرن سبزی خور تھا۔ وہ کئی کئی روز خشک بسکٹ اور سفید وائن پر آسانی سے گزارا کر لیتا۔ کبھی کبھار گوشت اور میٹھی چیز بھی کھا لیتا تھا لیکن بعد میں ورزش بھی لازم تھی۔ اس کے پاؤں کی وجہ سے ورزش ایک دردناک مرحلہ ہوتی تھی جس کی بدولت وہ خواہش کے باوجود وزن کم نہ کر پایا۔

کالج میں پڑھائی کے دوران اسے قمار بازی کی لت بھی لگ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قرض کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ وہ انتہائی شاہ خرچ تھا۔ کیتھرائن نے اسے ایسی روش پر چلنے سے بہت منع کیا لیکن بے سود۔ قرض بڑھنے لگا۔ کیتھرائن کو اس کی صورت میں ایک اور جان بائرن نظر آنے لگا۔

دو سال مزید گزر گئے۔ اس کے معمولات جوں کے توں برقرار رہے۔ 1807 میں اس کی ملاقات جان کیم ہوب ہاؤس سے ہوئی جو بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اسی سال بائرن کی شاعری کا پہلا مجموعہ Hours of Idleness شائع ہوا۔ یہ کتاب سابقہ اور کچھ نئی مختصر نظموں پر مشتمل تھی جس میں اس کا انداز بیان قدیم روم کے شاعروں سے ملتا جلتا تھا۔ بائرن کی عمر اس وقت انیس برس تھی۔ فنی پختگی کی کمی کے باعث اس کتاب پر بے رحم تنقید ہوئی۔ بعض حلقوں میں تو یہ تنقید تذلیل کا روپ دھار گئی تھی۔ بائرن کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے ردعمل دینے کے لیے وقت اور طریقہ کار منتخب کر لیا اور روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔

1808 کے آغاز میں اس نے اپنے ایک کزن جارج بیٹس ورتھ کے ساتھ بحری سفر کا منصوبہ بنایا۔ وہ مختلف ممالک کا دورہ کر کے اپنا تخیل اور مشاہدہ وسیع کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت پُرجوش تھا لیکن مئی میں ہونے والی Alvoen کی جنگ سے یہ سفر موخر ہوگیا۔ یہ ڈنمارک، ناروے اور برطانوی بحری جنگ تھی۔ بیٹس ورتھ 32gun frigate HMS Tartar کا کپتان تھا جسے اس مہم میں عملی حصہ لینا تھا۔ اس کی موجودگی کے بغیر بائرن کا سفر ناممکن تھا۔ وہ کچھ مایوس سا ہوگیا۔

☆......☆

لارڈ بائرن کی زندگی کا اکیسواں سال اس کے لیے بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ مارچ میں ’ایڈن برگ ریویو‘ ادبی جریدہ میں اس کی نئی تخلیق English Bards and Scotch Reviewers شائع ہوئی۔ بائرن نے اسے بطور گمنام شخص شائع کروایا۔ یہ ایک طنزیہ نظم (ہجو) تھی جس میں ناقدین کی جانب سے اس کی گزشتہ تخلیقات پر تنقید برائے تذلیل کو نشانہ بنایا گیا۔

13 مارچ 1809 اس کے لیے ایک یادگار دن تھا۔ برطانوی ایوان بالا ’ہاؤس آف لارڈز‘ میں اسے ایک نشست ملی۔ سیاست میں آمد ایک بہت اہم کامیابی تھی لیکن اس کی زندگی سے وابستہ مختلف آزار اس کامیابی سے لطف اندوز ہونے میں رکاوٹ ثابت ہونے لگے۔ اس نے ہوب ہاؤس سے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔ ”میں ایک طویل سفر کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت منظر عام سے ہٹنا ہی میرے لیے بہتر ہے۔“

”یہ تمہارے سیاسی اور ادبی زندگی کا بہت اہم موڑ ہے۔ ایسے موقع پر منظر عام سے ہٹنا کیا بہتر ہوگا؟“

”لوسی (ملازمہ) کا بیٹا میرے نام سے منسوب کیا جانے لگا ہے۔ (اور حقیقت بھی یہی تھی)۔ میری گلے کا ہار بن چکی ہے جبکہ اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ قرض خواہ بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ادبی سفر کو ایک نیا جذبہ و قوت ملے گی۔“

”ٹھیک ہے دوست! میں تو ہر حال اور فیصلہ میں تمہارے ساتھ تھا، اب بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔“

بائرن اس کی مخلصانہ یقین دہانی پر پُرسکون ہوگیا۔ اسے ہوب ہاؤس کی دوستی پر ہمیشہ فخر رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس فیصلہ کی ایک اہم وجہ اسے بتا نہ پایا۔ ان دنوں

انگلستان میں کچھ عرصہ سے شدید عوامی ردِعمل کی وجہ سے نئی اصلاحات نافذ ہوئی تھیں جن کے تحت غیر اخلاقی حرکات کے محرک افراد کے گرد گھیرا بہت تنگ کر دیا گیا۔ اس سزا سے کسی کو بھی استثنا حاصل نہیں تھا۔ شک کی بنیاد پر بھی مطلوبہ فرد کو گرفتار کر کے سرِعام پھانسی دے دی جاتی۔ ایسی صورتِ حال میں بائرن کا خوفزدہ ہونا کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔

11 جون 1809 کو وہ لندن سے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں کئی ملازمین بھی ہمراہ تھے۔ ولیم فلیچر اس کا خاص خدمت گار اور خانساماں تھا۔ ان دنوں فرانس اور اس کے اتحادیوں سے برطانوی جنگ بھی زوروں پر تھی۔ انہوں نے یورپی ممالک کی طرف رخ کرنے سے گریز کیا اور بحیرہ روم کا سفر شروع کر دیا۔

بحیرہ روم اور مشرقی ممالک کی جانب بائرن کا رجحان نیا نہیں تھا۔ بچپن میں فارس اور ترک سرزمین کے متعلق پڑھے جانے والے قصے اسے بہت بھاتے تھے۔ وہ اسلام کے بارے میں جاننے کے لیے بھی متجسس تھا۔ صوفیانہ تصوف اس کے لیے ایک بہت انوکھی شے تھی۔ انگلستان سے شروع ہونے والا یہ سفر پرتگال، اسپین اور بحیرہ روم سے البانیہ تک جا پہنچا۔ پرتگال میں گزارا جانے والا وقت یادگار تھا۔ اس نے وہاں قیام کے دوران پرتگالی زبان میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی۔ نت نئے لوگوں سے ملنے اور انسانی فطرت کی گہرائی سیکھنے کے مواقع ملے۔ وہ اس سفر میں بہت خوش تھا لیکن پھر آگسٹا کی جانب سے ملنے والے ایک خط سے علم ہوا کہ کیتھرائن اپنی مختلف بیماریوں، نفسیاتی الجھنوں اور ایک غیر فطری زندگی جیتے رہنے کی جنگ ہار گئی ہے۔ یہ خبر پڑھ کر اسے وقتی طور پر دکھ ہوا کیونکہ زندگی میں کبھی بھی کسی بھی موڑ پر وہ اپنی ماں کے قریب نہیں رہا تھا۔ البتہ آگسٹا کی جانب سے ایک طویل عرصہ بعد ملنے والے اس خط نے اسے خوشی ضرور دی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس تعلق میں اب کوئی بھی خلا پیدا نہیں ہونے دے گا۔

بائرن کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ سفر اس کی ادبی زندگی کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ انگلستان واپسی کے بعد اس نے Childe Harold's Pilgrimage کے دو باب رقم کیے اور ان کی اشاعت کے بعد راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس نظم میں ایک ایسے نوجوان کے جذبات بیان کیے گئے تھے جو مادی دنیا اور اس کی چمک دمک سے گمراہی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنی زندگی گمراہی میں گزارنے کے بعد وہ اوب گیا اور پھر اسے اجنبی دیس اور سرزمین اپنی جانب صدائیں دینے لگیں۔ وہ ایسے جزائر کی تلاش کرنا چاہتا تھا جہاں خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ اسے ایک علامتی نظم بھی قرار دیا گیا جس میں نئی نسل کی جنگ اور اخلاقی برائیوں سے بیزاری 'خودکشی' کے انداز میں بیان کی گئی۔ ادبی حلقوں میں اسے بہت سراہا گیا اور لارڈ بائرن کی پیشہ وارانہ زندگی نے ایک نئے عروج کی طرف سفر شروع کر دیا۔

☆......☆

شہرت کا نشہ لارڈ بائرن کے حواس پر چھا چکا تھا۔ وہ ہر جگہ موضوعِ گفتگو تھا۔ نجی اور سرکاری محفلیں، کلبز، پارٹیز اور ڈرائنگ روم میں بھی صرف اسی کا تذکرہ ہوتا۔ خواتین کے لیے اس کی ذات میں کشش بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجاہت کے ساتھ شاعری کا اضافہ انہیں بہت سے خواب دیکھنے پر اکسانے لگا۔ بائرن بھی اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ ایسی ہی کسی محفل میں اس کی نظر ایک حسین خاتون پر جا ٹھہری۔ یہ خاتون چھبیس سالہ لیڈی کیرولین تھی۔ اس کی شادی ولیم لیمب سے ہو چکی تھی جس کا تعلق اشرافیہ سے تھا۔

بائرن نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے سبھی داؤ آزما لیے لیکن وہ اپنی بے نیازی میں مگن تھی۔ اپنی شاعری اور تخلیقات کا حوالہ دینے پر بھی اس نے کوئی خاص ردِعمل نہ دیا اور دل جلانے والی مسکراہٹ سے بولی۔ ”میں بھی ایک مصنفہ ہوں اس لیے عام خواتین کی طرح شاعروں اور مصنفین کو اپنے حواس پر سوار نہیں کرتی۔“

بائرن اس کی اس ادا سے مزید متاثر ہوا اور اپنی چرب زبانی جاری رکھی۔

”تم ایک دیوانے اور شیطانی ذہن کے مالک ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم سے آشنائی بڑھانا بہت خطرناک ہے۔“ کیرولین نے اس کے بھی داؤ ناکام بنا دیے۔

بائرن نے ہمت نہ ہاری اور اسے اپنی جانب راغب کرنے کی کوششیں کرتا رہا اور آخرکار لیڈی کیرولین لیمب اپنی تمام تر سمجھداری، متانت اور ذہانت کے باوجود اس کی ذات کی اسیر ہو گئی۔ ان کا رشتہ دھواں دھار تھا۔ بائرن اسے کیرولین کی بجائے سرِعام 'کیرو' پکارتا اور جواب میں دوسرے فریق نے بھی اس عرفیت کو اپنا عوامی نک نیم بنا لیا۔ وہ عوامی مقامات پر ساتھ دیکھے جانے لگے تو افواہوں کا ایک نیا بازار گرم ہو گیا لیکن انہیں کوئی پروا نہ تھی۔

اس ساری صورتِ حال میں ولیم لیمب کی حالت سب سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اس نے کسی طریقے سے کیرولین کو آئرلینڈ بھیج دیا۔ یہ طویل فاصلہ اور جدائی بھی اس کے جذبات

میں کوئی کمی نہ لا سکی اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیرولین اس کے لیے بہت سنجیدہ ہو چکی تھی اور ہر عورت کی طرح اسے بھی یہی لگتا تھا کہ بائرن اسے کبھی دھوکا نہیں دے گا اور اس کی واپسی کا شدت سے منتظر ہو گا۔

انگلستان میں لارڈ بائرن کی زندگی ایک نئے بھونچال میں گھر چکی تھی۔ لیڈی کیرولین کے جانے کے بعد اس کا رشتہ 'آگسٹا ماریہ لی' سے قائم ہو گیا۔ وہی آگسٹا جو اس کی سوتیلی بہن تھی اور اپنے کزن لیفٹیننٹ کرنل جارج لی سے شادی کے بعد دو بچوں کی والدہ بھی تھی۔

آگسٹا سے اس کے تعلقات نے یہ نیا اور شرمناک موڑ کب لیا اس بارے میں مؤرخین نے دانستہ طور پر خاموشی اختیار رکھی ہے۔ قیاس یہی کیا جاتا ہے کہ وہ دونوں اخلاقی طور پر دیوالیہ تھے۔ بچپن میں جب انسانی کردار اور شخصیت کی نیو رکھی جاتی ہے اور اپنی ذات سے جڑے غیر فطری مسائل سے جنگ میں مصروف تھے۔ تربیت ان دونوں کو ہی کبھی نہ مل سکی اور نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ رشتوں کی نزاکت سمجھنا اور ان کا احترام کرنا کبھی بھی نہ سیکھ سکے۔

1813 میں کیرولین بھی لندن لوٹ آئی۔ اسے گمان تھا کہ بائرن کا ردِعمل بہت پُرجوش ہو گا لیکن یہ جان کر اس کی مایوسی اور صدمہ کی کوئی انتہا نہ تھی جب بائرن نے واضح انداز میں اس رشتے کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟“ کیرولین اپنی ذلت برداشت نہ کر سکی۔

”ایسا کرنا میرے لیے کبھی بھی مشکل نہیں رہا۔ مجھے اب تمہاری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

کیرولین کی حالت قابلِ رحم تھی۔ آنے والے وقت میں وہ بھکاریوں کی طرح اسے اپنی محبت اور گزشتہ تعلق کے واسطے دیتی رہی لیکن بائرن کی سرد مہری ختم نہ ہوئی۔ ایک محفل میں ان کا جھگڑا اس قدر بڑھا کہ اس نے سرِعام کیرولین کی تذلیل کر دی۔ کیرولین اپنے حواس کھو بیٹھی اور وہاں موجود ایک گلاس توڑنے کے بعد اپنی کلائی کی نسیں کاٹنے کی کوشش تک کر ڈالی۔ بائرن کو یہ منظر بھی موم نہ کر سکا۔ اس کے فیصلے ہمیشہ حرفِ آخر ہوتے تھے۔

لیڈی کیرولین کے لیے بائرن کی بے رخی اور بے وفائی بہت بڑا سانحہ تھی۔ محبت اس کے لیے ایک روگ بن گئی۔ اس کی صحت پر بہت منفی اثر پڑنے لگا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کا وزن

لارڈ بائرن کے چند دانشمندانہ اقوال

1۔ مسکراہٹ کبھی ترک نہ کرو۔ یہ دنیا کی ارزاں ترین دوا ہے۔

2۔ جو دلیل سے بات نہ کرے، متعصب ہے۔ جو کر نہ سکے، بے وقوف ہے۔ اور جو جرأت سے کام نہ لے وہ غلام ہے۔

3۔ آفت و مصیبت سچائی کی طرف چلنا سکھا دیتی ہے۔

4۔ محبت ایسے خطرناک رستوں پر بھی چلنا سکھا دیتی ہے جہاں بھیڑیئے بھی شکار کے لیے قدم نہ رکھ سکیں۔

5۔ دوستی ایک زینہ چڑھ کر ہمیشہ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن محبت کبھی ایک زینہ اتر کر دوستی میں تبدیل ہونا نہ سیکھ سکی۔

6۔ میری شاعری کا موضوع انسانی بے وقوفیاں ہیں۔

7۔ زندگی چار سوالات کی تلاش کا نام ہے۔ روح کس مادے سے بنی ہے؟ تقدیس کیا ہے؟ زندگی گزارنے کی بہترین راہ کون سی ہے؟ بہترین موت کیا ہے؟ اور ان سب کا جواب ایک ہی ہے...... محبت...... صرف محبت۔

☆☆☆

☆۔ ہمدردی کی شبنم کا نام ہی آنسو ہیں۔

☆۔ غم زندگی سے آگاہی کا دوسرا نام ہے۔ جو جتنا زیادہ آگاہ ہو گا اتنا ہی غمگین ہو گا۔ غمِ حیات ہی شجرِ حیات ہے۔

☆۔ سچائی افسانوں سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔

☆۔ خلوص عاجز ہو سکتا ہے لیکن خادم نہیں۔

☆۔ زندگی خواہشات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔

☆۔ کتب بینی کسی دوست کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دیتی۔

☆۔ شہرت کیا ہے؟ ایسے لوگوں کا آپ کو جاننا جنہیں آپ جانتے ہیں اور نہ ہی پروا کرتے ہیں۔

☆۔ بامقصد زندگی میں آنسوؤں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

☆☆☆

اس حد تک کم ہو گیا کہ بائرن نجی محافل میں آخر یہ کہنے لگا۔ ”میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ مجھے ایک ڈھانچے سے کیونکر محبت ہو گئی تھی؟“

کیرولین اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے بے شمار طریقے اپنا کر بھی ناکام رہی تو انتقام کی آگ میں جلنے لگی۔ اس نے ایک ناول Glenarvon تخلیق کیا اور اس کے مرکزی کردار ’لارڈ روتھوین‘ کے روپ میں بائرن کا کردار مسخ کر کے بیان کر دیا لیکن بائرن کبھی بھی سابقہ جنتشن کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ وہ ان دنوں نئے آسمان کی تسخیر میں مگن تھا۔

آگستا سے تعلقات اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھے۔ عوامی حلقوں میں انہیں طنز و مزاح کا نشانہ بھی بنایا جاتا رہا۔ 1814 میں آگستا نے ایک لڑکی ’میڈورا‘ کو جنم دیا اور زبان خلق کا دعویٰ تھا کہ وہ بائرن کی بیٹی ہے۔ اس موقع پر بائرن کا اپنا الجھا بکھرا سراسیمہ رویہ بھی اس دعوے کو سچ ثابت کرتا رہا۔ عوامی لعن طعن اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی کو ایسے تنازعات سے بچانے کے لیے اس نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔

☆......☆

لارڈ بائرن کی زندگی اب ایسے مقام پر آ گئی تھی جہاں اس کی ہر جنبش عوام کی نظروں میں ہوا کرتی۔ وہ ایک مقبول اور ہردلعزیز شاعر بن چکا تھا۔ لوگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اس نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور قرعہ فال ’این ایزابیلا‘ کے نام نکلا۔

بیلا لیڈی کیرولین کے شوہر ولیم لیمب کی کزن تھی۔ وہ نہایت مہذب‘ شائستہ اطوار‘ مذہبی خیالات کی مالک‘ بہترین ریاضی دان‘ نرم خو اور باکردار تھی۔ بائرن سے کئی بار مختلف سماجی تقریبات میں ملاقات بھی کر چکی تھی۔ وہ ان تمام عورتوں سے بہت مختلف تھی جو اب تک بائرن کی زندگی میں آئی تھیں۔ اس نے دو سال قبل بیلا کی ایک رشتہ دار بزرگ خاتون کے توسط سے اسے شادی کی پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اس انکار کے باوجود وہ بائرن کے سحر سے بچ نہ سکی۔ اس کی شخصیت میں گندھے خیر و شر کے رنگوں سے باعلم ہونے کے باوجود وہ دوسری بار شادی کی پیشکش ٹھکرا نہ سکی۔ وہ ایک مختلف عورت تھی لیکن پھر بھی ہر عورت کی طرح یہی سوچتی تھی کہ اس کی محبت‘ توجہ اور اعتماد بائرن کی زندگی بدل دے گا۔ اگر وہ کچھ وجوہات کی بناء پر الجھی بکھری زندگی جینے لگا ہے تو یہ بیلا کا مذہبی فریضہ ہے کہ اسے سیدھے رستے پر لانے میں مددگار ثابت ہو۔ انہی خیالات کی بناء پر اس نے بائرن کا رشتہ قبول کر لیا اور دو جنوری 1815 میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی۔

آغاز میں سب اچھا تھا۔ بائرن ان دنوں معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ وہ قرضوں سے نجات کے لیے اپنی جائیداد بیچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن کامیابی تھی کہ ہی نہ دیتی۔ اس کی پیشہ وارانہ زندگی کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس کی بھی نظمیں اشاعت اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ بنا رہی تھیں لیکن ذاتی زندگی بہت منتشر تھی۔ وہ شراب کے نشے میں غرق رہنے لگا۔ یہاں تک تو بیلا سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن دوسری عورتوں سے تعلقات اس کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھے۔ بائرن کی الماریوں اور بہت سی ذاتی اشیاء کی تلاشی نے اسے کئی حقائق سے آشنا کیا۔ وہ شوہر سے الجھنے لگی۔ ”یہ طریقہ کار ہرگز مناسب نہیں ہے۔ آجکل تمہارا نام سوزن بوائس نامی اداکارہ کے ساتھ کیوں لیا جانے لگا ہے؟“

”ہم دونوں کے اچھے تعلقات ہیں بیلا! اس میں اتنا چیخنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مجھے تمہارے مختلف عورتوں سے معاشقے اور عوام میں ان کا چرچا بالکل قبول نہیں۔ اور آگستا سے ملاقات تو بالکل برداشت نہیں۔“

”میں تو شروع ہی سے ایسا تھا بیلا! اب اتنی چیخ و پکار کیوں؟ وہ سب وقت گذاری کا ذریعہ ہے اور تم میری بیوی ہو۔ اس حقیقت کو جتنی جلد سمجھ لوگی‘ برداشت کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔“

”بالکل نہیں۔ میں اپنے شوہر میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔“

”تو پھر مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟“ بائرن کا طنزیہ لہجہ اسے اپنی غلطی کا احساس دلانے لگا۔ اسے تبدیل کرنے کی سوچ کے ساتھ اس نے شادی کی تھی جبکہ وہ تبدیل ہونے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ ان کے رشتے میں دراڑیں پیدا ہونے لگیں۔

بائرن کا مزاج دن بدن تلخ ہوتا چلا گیا۔ بیلا کو یقین ہونے لگا کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں رہا۔ وہ اس سے بدترین سلوک کرتا‘ مغلظات بکتا اور مختلف مرد و خواتین سے تعلقات بنانے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کرتا۔ اسی سال دسمبر میں بیٹی کی پیدائش کے بعد بیلا نے قانونی طور پر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ بائرن اس معاملہ کو طول دینا چاہتا تھا۔ بیلا ایک وسیع و عریض جائیداد کی وارث تھی۔ اس سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے جانے دینا بھی دانشمندی نہیں تھی۔ وہ اسے جائیداد ملنے کے بعد اپنے قرضے چکا سکتا تھا لیکن بیلا مزید دیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے قانون کا سہارا لیا اور مارچ 1816 میں بائرن کے نام اور شادی کے بندھن سے آزاد ہو کر بیٹی ’ایڈا‘ کو ساتھ لیے والدین کے پاس لیسسٹر شائر منتقل ہو گئی۔ اس علیحدگی کے بعد اس نے کبھی بائرن سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کی نہ ہی اسے ایسا موقع دیا۔

☆......☆

ذاتی زندگی میں ناکام لارڈ بائرن سیاسی میدان میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑ چکا تھا۔ ہاؤس آف لارڈز میں اس کی تقاریر بہت دبنگ ہوتیں۔ انہیں اخبارات میں نمایاں جگہ دی جاتی۔ وہ صنعتی میدان میں مشینوں کی اجارہ داری اور انسانی بے وقعتی کے خلاف تھا۔ انہیں اصل مقام دلوانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں مذہبی رواداری کی کمی بھی اس کے لیے لمحہ فکریہ تھی۔ وہ اپنے ساتھی لارڈز کو اس بات سے آگاہی دینا چاہتا تھا کہ دوسرے مذاہب اور مختلف عقائد کے لوگوں کو بھی مذہبی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ تقاریر میں اس کے الفاظ سخت اور تلخ ہوتے تھے لیکن لہجے کی چاشنی ان کی تلخی کم کر دیتی۔

انگلستان میں اس کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ 'The Giaour','The Bride of Abydos' نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور 'The Corsair' کی اشاعت کے بعد تو مقبولیت کے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ پہلے ہی روز دس ہزار کاپیوں کی فروخت ہوئی۔ 'Lara,A tale' 'The Seigh of Cornith','Parisina','She Walks in Beauty','And thou art dead' عوام میں مقبول بھی تھیں اور اعلیٰ فنی معیار کے مطابق بھی۔

بائرن کی شاعری ہردلعزیز ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انسانی فطرت کی مکمل عکاسی کرتا۔ شاعری کا موضوع انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں ہوتا تو کبھی سیاسی شکنجہ اور جبر میں جکڑے مزدور طبقہ کے مسائل۔ سلطنت عثمانیہ کا اتلاا اس کے قلم کی نوک پر مچلتا تو کبھی سوتیلے رشتوں میں پیدا ہو جانے والی ایسی محبت دکھائی دیتی جو سماج اور مذہب کی رو سے شرمناک ہوا کرتی۔ وہ جو بھی لکھتا‘ دلوں میں گھر کر لیتا لیکن دلوں پر راج کرنے والے لارڈ بائرن نے اپنی ذاتی زندگی کی ڈور اس قدر الجھالی تھی کہ اب انگلستان میں اسے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ ناقدین اس کے فن پر تنقید کی بجائے ذاتیات پر حملے کرنے لگے۔ بیوی اور بچی سے علیحدگی نے ایک نیا محاذ کھول دیا تھا۔ ایسے ماحول میں اس کا فنی سفر بھی کامیابی سے جاری نہ رہ پاتا۔ اپنے قلم اور تخیل کو بے موت مرنے سے بچانے کے لیے اس نے انگلستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک طویل سفر پر روانہ ہو گیا۔

وہ اس سرزمین پر کبھی بھی واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔

☆......☆

1816 میں لارڈ بائرن نے ایک بار پھر سمندری سفر اختیار کیا۔ اسی سال گرما میں وہ اپنے ذاتی معالج جان ولیم کے ساتھ سوئزرلینڈ میں لیک جنیوا منتقل ہو گیا۔ سفر اس کے لیے ہمیشہ بہت فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک اور شاعر ’شیلے‘ اور اس کی منگیتر ’میری گوڈون‘ سے ہوئی۔ ان کے ہمراہ کلارکلیئر مونٹ نامی خاتون بھی تھی جو لندن میں اس کی خاصی قریبی ساتھی رہ چکی تھی (مورخین کے مطابق ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔)

شیلے سے ملاقات بائرن کے فنی سفر کا ایندھن ثابت ہوئی۔ اس نے Childe Harold's Pilgrimage کے مزید باب تخلیق کیے جن کی اشاعت کے بعد ناقدین نے یہ بات برملا تسلیم کی کہ بائرن کا قلم اور تخیل بہت نکھر گیا ہے۔ یہ سال اس کے لیے بہت کامیاب ثابت ہوا۔ 'The Prisoner of Chillon' ,'The Dream' ,'Prometheus' ,'Darkness' ,'My Soul is Dark' کی اشاعت نے اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ راک اسٹار بن چکا تھا۔

موسم سرما وینس میں گزرا۔ یہاں اس کی ملاقات ماریانا سے ہوئی اور حسب سابق محبت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ ماریانا ہی کے گھر رہائش پذیر تھا۔ کچھ عرصہ بعد محبت کے یہ جذبات باسیس سالہ مارگریٹا کاگنی کی طرف منتقل ہو گئے۔ دونوں خواتین شادی شدہ تھیں اور بائرن پر بری طرح فریفتہ بھی۔ مارگریٹا ناخواندہ تھی۔ وہ اپنے جذبات سے اس قدر مغلوب ہوئی کہ شوہر اور گھر چھوڑ کر بائرن کے ساتھ رہنے چلی آئی۔ ایک نیام میں دو تلواریں کس طرح رہ سکتی تھیں بھلا؟ دونوں خواتین میں لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے نفرت اور بائرن سے جنونی محبت کرتی تھیں۔

بائرن نے پہلے پہل تو ذہنی سکون کی خاطر ایک بجرے میں وقت گذارنا شروع کیا لیکن جب معاملہ مزید بگڑا تو اس نے مارگریٹا کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ شوہر اور گھر کو ٹھکرانے والی مارگریٹا کے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے خود کو نہر کی لہروں کے حوالے کر دیا تاہم بعد میں

اسے بچالیا گیا۔

☆......☆

آرمینیا میں قیام بھی لارڈ بائرن کے لیے بہت شاندار تھا۔ وہ آرمینیائی ثقافت سے بہت متاثر تھا۔ فادر ایچ آوگیرین سے آرمینیائی زبان وبیان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس نے زبان اور تاریخ پر مشتمل کئی سیمینارز میں شرکت کی۔ یہ دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے انگریزی اور آرمینیائی گرامر پر مشتمل لغت بنانے کی تیاریاں بھی شروع کردیں۔

1817 بھی ایک معروف سال تھا۔ روم کا سفر، وینس میں رہائش Childe Harold's Pilgrimage کے باب نو کم شائع Newstead کی فروخت کے قانونی مراحل نے اسے بہت الجھائے رکھا۔ زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آیا تو تخلیقی صلاحیتیں بھی نکھر کر سامنے آئیں۔ اگلے برس Don Juan پر کام شروع کیا جس نے اسے شہرت کی نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ تصنیف بائرن کا شاہکار اور انگریزی ادب کی طویل نظموں میں 'جان ملٹن' کی شہرہ آفاق کتاب 'پیراڈائز لوسٹ' کے مساوی معیار کی سمجھی جاتی ہے۔

ڈان وان ایک لیجنڈ افسانوی کردار ہے۔ ابتداء میں اس کردار کو اسپین کے ڈراما نگار نے الفاظ کے روپ میں ڈھالا تھا جو اس قدر مقبول ہوا کہ جنس مخالف میں بے انتہا دلچسپی رکھنے والے افراد کی جیتی جاگتی علامت بن گیا۔

بائرن نے اس کردار کے ساتھ ایک نیا تجربہ کیا۔ اب تک تو اسے خواتین پر فریفتہ ہو جانے والوں کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن بائرن کا یہ کردار بہت معصوم فطرت تھا۔ خواتین خود اس کی طرف مائل ہوتیں اور نت نئے ہتھکنڈے آزما کر اسے اپنے دام فریب میں جکڑ لیتیں۔ ڈان وان کا یہ نیا روپ قارئین کے دلوں میں گھر کر گیا اور اپنے ساتھ بائرن کو بھی دائمی لازوال شہرت عطا کرکے امر بنا گیا۔

وقت پر لگا کر گزر رہا تھا۔ بائرن کا قلمی سفر کامیابی اور شہرت کے زینے طے کرتا رہا۔ اس کے رومانوی معاملات بھی زوروں پر تھے۔ اس کے سحر اور کشش سے کوئی بھی بچ نہ پاتا۔ Don Juan کے مزید باب تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ The Rovenna Diary اور My Dictionary and Recollections مکمل کیں۔ اسی دوران بائرن کا ناشر تھامس مور بھی کئی بار اس سے ملنے کے لیے آیا۔

''میں تمہارے کام اور طریقہ کار سے بہت خوش ہوں تھامس!'' بائرن نے فراخدلی سے کہا۔

''تمہاری ذرہ نوازی ہے میرے دوست! ورنہ تمہاری تخلیقات کی اشاعت میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ قارئین تمہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ تمہاری نظمیں ان کے دلوں کی دھڑکن بن جاتی ہیں۔''

بائرن فخر سے مسکرانے لگا۔ ''اب میں تمہارے ذمے ایک اور کام لگانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے خوشی ہوگی۔''

''میں اپنی خودنوشت رقم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا عنوان Life and Adventures ہوگا۔ اس کتاب کو ایک شاہکار بنانا ہے۔ میں اپنی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اوجھل نہیں رکھنا چاہتا۔''

''بہت زبردست خیال ہے۔ یہ ایک بیسٹ سیلر ثابت ہوگی۔''

''اس پر کام شروع کرو اور میرا مکمل تعاون تمہیں حاصل ہوگا۔''

تھامس مور بخوشی رضامند ہوگیا۔ اس کتاب کی اشاعت کاروباری نقطہ نظر سے بھی اس کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتی۔ وہ مستقبل میں اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں محسوس کرکے بہت پُرجوش ہونے لگا۔

☆......☆

لارڈ بائرن کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ شیلے اور میری کے ساتھ قیام نے اس کے مزاج پر بھی بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ دوپہر گئے نیند سے بیدار ہوتے، شام چھ بجے تک بیٹھے گپیں ہانکتے، قریبی جنگلات کی سیر کرتے۔ ڈنر کے بعد صبح چھ بجے تک پھر محفل جمتی اور ادبی خیالات پر بحث ومباحثے ہوتے۔ اپنی نئی تخلیقات ایک دوسرے کو دکھا کر اس میں مزید نکھار بھی پیدا کیا جاتا۔

اس رہائش گاہ میں حسب معمول بائرن کے ساتھ ڈھیروں ملازمین کے علاوہ دس عدد گھوڑے، آٹھ جسیم کتے، تین بندر، پانچ بلیاں، ایک چیل، ایک کوا اور عقاب بھی اہل خانہ ہی کی طرح رہتے۔ گھوڑوں کے سوا سبھی چرند پرند گھر میں آزادانہ گھومتے پھرتے دکھائی دیتے۔ جانوروں سے اس کی محبت ویسے بھی مثالی تھی۔ دس سال قبل Boatswain کی وفات پر اس نے مقبرہ بنوانے کے بعد اپنی تدفین بھی اسی مقام پر کرنے کی وصیت تک لکھ دی تھی۔

لی ہنٹ اور شیلے کی دوستی اس کے لیے بہت توانا جذبوں کا سرچشمہ تھی۔ اس تکڑم نے The Liberal نامی اخبار کے اجراء کے لیے منصوبہ بندی کر لی۔ 1822 میں اٹلی آمد کے بعد اس کا مزاج بہت مثبت ہو گیا۔ وہ ڈنر پارٹیز منعقد کرنے لگا۔ ان دنوں اس پر زندہ دلی، خوش اخلاقی اور عیش ونشاط کا غلبہ تھا۔ انہوں نے مشترکہ طور پر ساحل پر ایک گھر کرائے پر لیا اور دو مستول کا جہاز تعمیر کروانے لگے۔ بائرن اپنی ذاتی کشتی خریدنا چاہتا تھا۔ ایک مشترکہ دوست کیپٹن ڈینیل روبرٹس نے اس کے لیے کشتی ڈیزائن کی اور تعمیر شروع کردی۔ اس کا نام The Bolivar رکھا گیا۔ ان کے ارادے بہت بلند اور منصوبے بے شمار تھے لیکن شیلے کی حادثاتی موت سے سب کچھ بکھر گیا۔

☆......☆

ان سبھی دوستوں کو سمندر سے عشق تھا۔ تیراکی اور کشتی رانی بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ آٹھ جولائی 1822 کو مقامی طور پر موسم میں تبدیلی اور سمندری طوفان کی پیش گوئی بھی کردی گئی تھی۔ اس روز سفر کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی لیکن یہ موت کی ندا ہی تھی جو شیلے اور ایڈورڈ ولیمز کو سفر پر اکسا رہی تھی۔ وہ کسی کے روکنے سے نہ رکے۔

سمندر میں انہیں طوفان نے آلیا۔ شیلے کی نعش دریافت ہوئی تو اس کی شناخت صرف کپڑوں اور جیب میں موجود جان کیٹس کی شاعری کی چھوٹی سی کتاب سے ہو سکی۔ اس کے جسم کے کئی حصے سمندری مخلوق چبا کر غائب کرچکی تھیں۔

بائرن پر اس حادثہ کا گہرا اثر ہوا۔ اس کا دل یکدم ہر شے سے اچاٹ ہوگیا۔ شیلے کی موت سے قبل وہ درجنوں طویل نظمیں تخلیق کرکے پسندیدگی کی سند حاصل کرچکا تھا لیکن اس سانحہ کے بعد وہ بجھ سا گیا۔ اب پہلے جیسی محفلیں جمتی تھیں اور نہ ہی ادبی بحث ومباحثے ہوتے۔ ہر شخص پر جمود طاری ہو گیا۔ بائرن اس گھٹن زدہ ماحول میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ 1823 میں اس نے ضروری تیاریوں کے بعد اپنی کشتی ایک مقامی نواب کے ہاتھوں فروخت کی اور جینوا چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس کی اگلی منزل یونان تھی۔ اس کے سر میں ایک نیا سودا سما گیا۔ ان دنوں یونان اور ترک حکومت حالت جنگ میں تھے اور بائرن اپنی زندگی میں چھائے جمود کو ختم کرنے کے لیے اس جنگ میں عملی حصہ لینا چاہتا تھا۔ اس فیصلہ پر عمل کرنے میں واحد رکاوٹ مقامی نواب کی بیٹی ثریا تھی جس نے بائرن کی محبت کے لیے اپنا گھربار اور شوہر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی جینوا سے روانگی ثریا کے لیے ناقابل برداشت سانحہ تھی۔ وہ روتی دھوتی ہوئی بندرگاہ تک پہنچ گئی جہاں ہرکولیس پر سوار بائرن نے یونان کے لیے روانہ ہونا تھا۔

ثریا کی خستہ حالت دیکھ کر بائرن کا دل پہلی بار کسی کے لیے پسیج گیا۔اس نے جہاز کے کپتان سے خصوصی درخواست کے بعد چند لمحات کے لیے واپس بندرگاہ کی طرف مڑنے کے لیے کہا۔وہ ثریا کو ہمسفر بنانا چاہتا تھا لیکن بندرگاہ پہنچنے پر علم ہوا کہ وہ مایوس ہو کر واپس جا چکی ہے۔اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لیے خاموشی سے ایک بار پھر سفر کا آغاز ہو گیا۔

یونان پہنچ کر ایک ہنگامہ خیزی شروع ہو گئی۔بائرن نے یونانی بحری بیڑوں کی مرمت کے لیے چار ہزار پاؤنڈز فراہم کر کے مقامی لوگوں اور فوج کا دل جیت لیا۔28دسمبر 1823 کی رات یونانی سرزمین کی جانب سفر کے دوران ان کے جہاز کو عثمانی سلطنت کے جنگی جہاز نے گھیر لیا تاہم کوئی خطرناک صورتِ حال پیش نہ آئی۔بائرن نے مزید سفر کے لیے راستہ تبدیل کر لیا اور پانچ جنوری 1824 کو مغربی یونانی علاقے 'میسولونگی' پہنچ گیا۔

بائرن ہر ممکن طریقہ سے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ تو پہلے ہی کر چکا تھا اس لیے رچڈیل میں اپنی جائیداد فروخت کروائی اور 11,250 پاؤنڈز کی رقم فراہم کر دی۔اس سخاوت کے بعد اس کے پاس بیس ہزار پاؤنڈز بچے تھے۔اس رقم کو اگر جدید تناظر میں دیکھا جائے تو وہ کروڑ پتی تھا لیکن باقی ماندہ رقم بھی بائرن نے مناسب وقت آنے پر اسی مقصد کے لیے خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

اس مبینہ سخاوت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔یونان جیسے غریب اور جنگ زدہ ملک میں ایک برطانوی نواب کی بحیثیت فوجی آمد اور عملی معاشی مدد کوئی معمولی بات ہرگز نہیں تھی۔مقامی لوگوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح اسے اپنے گھیرے میں لے لیا اور اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل کے حل کے لیے بھی اسی سے رقم طلب کرنے لگے۔

کچھ عرصہ مزید گذرا تو بائرن پر بہت سی حقیقتیں کھل گئیں۔یونانی ترک حکومت کے خلاف جنگ سے زیادہ اپنے اندرونی معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ملک میں خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی۔مذہبی رواداری کا کہیں بھی نام و نشان نہیں تھا۔وہ مایوس ہونے لگا۔

انہی دنوں اس کی ملاقات ایک نو سالہ ترک لڑکی 'ہیتو' سے ہوئی۔اس کے والدین یونانیوں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔مذہبی منافرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ یونانی عیسائی کسی بھی ترک مسلمان کا وجود برداشت کرنے کے روادار ہی نہ تھے۔بچے'بوڑھے'جوان'مرد'عورتیں بلا تخصیص اور بے دھڑک قتل کر دیے جاتے تھے۔وجہ قتل کے لیے صرف ان کا مسلمان ہونا ہی بہت تھا۔بائرن نے بچی کو گود لینے کا فیصلہ کر لیا اور حفاظتی نقطۂ نظر کے تحت اسے ایک دوسرے علاقہ میں منتقل کر دیا۔

کسی بھی جنگ میں حصہ لینے کا عمل بظاہر بہت پُرکشش اور توانا محسوس ہوتا ہے۔دل میں امنگیں جاگنے لگتی ہیں۔اپنے متعین کردہ مقصد کے لیے کٹ مرنے کا جذبہ اور آزادی کے سہانے خواب بھی دل لبھاتے ہیں لیکن جب عملی طور پر اس عمل سے گذرا جائے تو اعصاب کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔جنگ میں سب سے پہلے اخلاقیات اور اقدار کا خاتمہ ہوتا ہے۔انسان حیوانیت کے درجے تک جا پہنچتا ہے۔لہو کی چاٹ اسے اپنے ہی جیسے انسانوں کی بے حرمتی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔جنگ کی تباہیاں جھیلنا ہرگز آسان نہیں ہوتا۔بائرن کے لیے بھی ایسی ہی صورتِ حال تھی۔اس دوران اس کے قلم نے بہت سی نظمیں رقم کیں جو اشاعت کے بعد پسندیدگی بھی پاتی رہیں۔

بائرن کی اخلاقی بے راہ روی بھی جوں کی توں برقرار تھی۔یونان پہنچ کر تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔اعصابی سکون اور وقتی خود فراموشی حاصل کرنے کے لیے اس نے نابالغ لڑکوں کا استحصال شروع کر دیا۔ستم ظریفی تو یہ تھی کہ کئی لڑکے خود ہی اس کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ایسے ہی ایک مقامی لڑکے پر وہ اس بری طرح فریفتہ ہوا کہ اس کی خوراک'لباس سمیت ہر قسم کی ضروریات اپنے ذمہ لے لیں۔مختصر عرصہ میں ہی بائرن نے اس پر چھ سو پاؤنڈز نثار دیے جو موجودہ وقت میں 24,600 برطانوی رقم کے مساوی ہیں۔

نکولو جیراڈ نامی چودہ سالہ لڑکے کے لیے وہ اس قدر سنجیدہ ہوا کہ اس سے اطالوی زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے تعلیم و تربیت کے لیے عیسائی خانقاہ میں داخل کروا دیا اور اپنی وصیت میں اس کے لیے سات ہزار برطانوی سکے مقرر کر دیے۔

رومانوی معاملات کے ساتھ اس نے مایوسی کے باوجود یونان آمد کا مقصد فراموش نہیں کیا تھا۔ایک مقامی حریت پسند کے ساتھ مل کر ترک قبضہ میں موجود ایک قلعہ پر حملہ کرنے کا

منصوبہ بنایا گیا۔بائرن نے اپنی صوابدید پر ایک شخص کو توپ خانہ کے معاملات چلانے کے لیے ملازم رکھا۔اسے فوجی مہمات کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن یونانی باغیوں کی فوج کی کمان سنبھال کر اس نے جنگ میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔

فروری اپنا نصف سفر طے کر چکا تھا۔قلعہ پر قبضہ کی مہم کی تیاریاں آخری مراحل میں پہنچ گئیں لیکن بائرن کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی۔ان دنوں علاج کے لیے ایک خصوصی طریقہ بہت مقبول تھا۔مریض کے جسم سے خصوصی اوزاروں کی مدد سے خون نکالا جاتا۔فاسد خون کے اخراج کے بعد جسمانی نظام بھلا چنگا ہو جاتا تھا۔بائرن کے ساتھ بھی یہی طریقہ آزمایا گیا۔ممکن ہے کہ یہ طریقہ علاج دیگر افراد کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا لیکن بائرن کی عیش و طرب پر مشتمل زندگی نے اسے جسمانی طور پر پہلے ہی بہت کھوکھلا کر رکھا تھا۔اس اجراء کے بعد وہ مزید نقاہت میں مبتلا ہو گیا۔

کچھ وقت گذرا تو وہ جزوی طور پر صحت یاب ہو گیا لیکن اپریل کا آغاز ہوتے ہی اسے سردی نے دبوچ لیا اور شدید بخار کے باعث وہ ایک بار پھر عضو معطل بن کر بستر سے لگ گیا۔اس کا معالج 'جولیس وان میلنگن' اس صورتِ حال پر بہت پریشان تھا۔جولیس نے ایک بار پھر سابقہ طریقہ علاج پر عمل کیا۔اب یہ بائرن کی بدقسمتی کہیے یا معالج کی پیشہ وارانہ کوتاہی۔اس علاج میں استعمال ہونے والے طبی اوزار جراثیم سے پاک نہ تھے۔بائرن کے زخم بگڑ گئے۔ان میں تعفن اور پیپ پیدا ہوئی تو اس کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

لاکھوں دلوں کو اپنی شاعری سے گرما دینے اور ہر ایک کو اپنی شخصیت کے سحر سے دیوانہ کر دینے والا رچڈیل کا چھٹا نواب جارج گورڈن بائرن یونان کے اس جنگ زدہ علاقے میں نقاہت'درد اور بدبودار زخموں کی اذیت جھیلتا بسترِ مرگ پر موجود تھا۔اس کٹھن وقت میں اس کی شہرت افاقہ دے رہی تھی نہ ہی اب تک کی جانے والی سینکڑوں محبتیں۔وہ اپنی موت کی آہٹیں سننے لگا تھا۔آسمان پر اس کی آمد کا نقارہ بج چکا تھا۔انیس اپریل 1824 کو شہرت'عزت'محبت'شاعری'عیش و نشاط وہیں دھرے رہے اور صرف چھتیس سال کی عمر میں فرشتہ اجل خاموشی سے اس کی روح قبض کر کے اسے اصل مقام تک لے گیا۔

☆.....☆

مورخین لکھتے ہیں کہ اگر بائرن کی زندگی میں یونان کو آزادی مل جاتی تو اس کی خدمات مدنظر رکھتے ہوئے اسے بادشاہت عطا کر دی جاتی تاہم اگر غیر جانبداری اور منطقی بنیادوں تک بائرن کی یونان آمد کے بعد حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایک نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ذات سے جنگ میں کوئی عسکری فائدہ نہیں ہوا تھا۔

بائرن نے اپنی زندگی میں سبھی خواہشات کی تکمیل کی۔یونان میں اس کی موجودگی کا مقصد حریت پسندوں کو فائدہ پہنچانا تھا اور وہ اس مقصد میں جزوی طور پر کامیاب ضرور ہوا۔عملی طور پر وہ کسی یونانی علاقے کو فتح دلا سکا نہ ہی ان کی خانہ جنگی ختم کر کے اتحاد پیدا کر سکا۔اسے صرف اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر ہی کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔اس نے اپنی دولت ان لوگوں کی مدد اور فلاح کے لیے جھونک دی۔ایسے حالات میں اس کی موت نے عالمی برادری کی توجہ بھی اپنی جانب کھینچ لی۔رچڈیل کے نواب اور انگریزی زبان کے صف اوّل کا شاعر کسمپرسی کی حالت میں زندگی کی بازی ہارا تو کئی دیگر اقوام کی ہمدردیاں بھی یونان کے ساتھ ہو گئیں۔

یونانی اس کی جرأت'ہمت اور فیاضی کو یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو رونے لگے۔اس کی لاش حنوط کر دی گئی۔اخلاقی تقاضا یہی تھا کہ میت اس کی آبائی سرزمین انگلستان بھیج دی جائے۔وہی انگلستان جہاں سے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر کے وہ نگر نگر گھومتا رہا۔یونانی اس سے بے حد محبت کرنے لگے تھے اور اپنے اس ہیرو کی کوئی نہ کوئی نشانی بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔لاش حنوط کرتے وقت اس کا دل الگ محفوظ کر لیا گیا۔یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ بہت خوبصورت اور لازوال دل کا مالک ہے'وہ اسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک پرائی جنگ لڑنے چلا آیا۔یونان کے قومی شاعر نے اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک نظم To The Death of Lord Byron لکھ کر خراجِ تحسین پیش کیا۔

بائرن کی حنوط شدہ لاش اس کے ایک خصوصی ملازم Tita کے ہمراہ انگلستان پہنچی تو ایک کہرام برپا ہو گیا۔تابوت میں اس کے آخری دیدار کے لیے ایک خلقت امڈ آئی۔برطانوی حلقوں میں اسے ہیرو کا درجہ مل گیا۔دو روز تک عوامی دیدار کے بعد آخری رسومات ادا کر دی گئیں اور سینٹ میری میگڈالون چرچ نوٹنگھم شائر میں دفن دیا گیا۔قبر پر سنگ مرمر کی صلیب یونانی بادشاہ نے بطور خاص بھیجی۔انگریزی شاعری اور ڈراما نویسی کا ایک عہد خاک نشین ہو گیا۔

☆......☆

تھامس مور کو اپنی ذمہ داری اب بھی یاد تھی۔ لارڈ بائرن کی خودنوشت منظرِ عام پر لانے کا بہترین وقت آ گیا تھا۔ اس نے کچھ اہم پہلوؤں پر بات چیت کے لیے بائرن کے قریبی دوست ہوب ہاؤس سے رابطہ کیا۔

''بائرن کی آخری خواہش کی تکمیل کے لیے یہی بہترین موقع ہے۔'' اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''اس کی آخری خواہش کیا تھی بھلا؟''

''وہ اپنی خود نوشت Life and Adventures منظرِ عام پر لانا چاہتا تھا۔ میں نے کتاب کے کچھ ڈرافٹ تیار کر لیے ہیں اور کچھ کی تیاری میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھ سے جلد از جلد ملاقات کرو۔ مسودات ساتھ لے آنا اور اس کتاب کا کسی سے بھی تذکرہ نہ کرنا۔''

تھامس مور پُرجوش ہو گیا۔ یہ کتاب کاروباری نقطۂ نظر سے بلاک بسٹر ثابت ہوتی۔ وہ اپنے تمام مسودات لیے ہوب ہاؤس کے پاس پہنچ گیا جس کے چہرے پر بہت سنجیدگی اور سختی طاری تھی۔ اس نے مسودات لے کر آتش دان میں پھینک دیے۔

''یہ کیا کر دیا احمق انسان! میری سالہا سال کی محنت برباد کر ڈالی۔''

''احمق میں نہیں تم ہو۔'' ہوب ہاؤس نے تحمل سے کہا۔ ''تم بھی میری طرح بائرن کے دوست رہے ہو۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی زندگی کے حساس اور متنازعہ پہلو دنیا بھر میں عام کر دیے جائیں۔ وہ جو بھی تھا' جیسا بھی تھا' اب اس دنیا میں نہیں رہا اور میری دوستی کو یہ گوارا نہیں کہ عوام اس کے نجی معاملات کو چٹخارے لے کر بیان کرے۔ جب تک میں زندہ ہوں' ایسا کبھی بھی نہیں ہونے دوں گا۔ کاروباری مفادمت دیکھو۔ ایک دوست کی حیثیت سے سوچو۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ایسا کب تک ہوگا؟ کبھی نہ کبھی تو اس پر لکھا جائے گا اور اس وقت ہم کیسے روک پائیں گے؟''

''تب تک بہت وقت گذر چکا ہو گا۔ تنازعات کی شدت اور واقعات پر گرد بیٹھ گئی ہو گی۔ اس وقت بائرن کی ذات پر منفی اثر نہیں پڑے گا۔ اب تم خود دیکھ لو اتنا عرصہ گذر چکا ہے' ہم سبھی دوستوں نے ہزاروں پاؤنڈز اکٹھے کر کے مجسمہ تعمیر کروایا لیکن حکومتی سطح پر اسے اب بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے کوئی یادگار تعمیر نہیں کی گئی۔ مجسمہ ٹرینیٹی کالج کی لائبریری میں نصب کر دیا گیا ہے۔'' ہوب ہاؤس ایک عظیم شاعر کی ایسی بے قدری پر بہت افسردہ تھا۔

انگلستان میں یہ نظر اندازی ایک طرف لیکن یونان میں نیشنل گارڈن کے باہر ایک مجسمہ نصب کروایا گیا جس میں ایک عورت بائرن کو تاج پہناتے دکھائی گئی۔ فرانسیسی مجسمہ سازوں کی محنت اور مہارت نے اسے لازوال حیثیت عطا کر دی۔ مقامی طور پر اسے megalos kai kalos (عظیم اور اچھا انسان) کا خطاب دیا گیا۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو انگلستان کے ادبی حلقوں نے بائرن کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنی شروع کر دی۔ اخبارات میں کالم شائع کیے گئے جس میں ایک نہایت تلخ حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی کہ بائرن کے پالتو کتے بوٹسوین کے لیے ایک مقبرہ موجود ہے لیکن خود بائرن جیسے شہرۂ آفاق شاعر کے لیے کوئی یادگار تک موجود نہیں۔ انگلش حکومت کو اس شرمناک حقیقت کا احساس ہوا تو Westminister Abbey میں اس کے لیے ایک یادگار تعمیر کرنے کی منظوری دے دی۔ اسکول کے بچوں نے اس موقع پر بہت تعاون کیا اور اپنے محبوب شاعر کے لیے چندہ بھی اکٹھا کیا۔

لارڈ بائرن کی ذاتی زندگی کے تضادات سے قطع نظر اسے ہمیشہ ذہین شاعر تسلیم کیا جاتا رہا۔ انگریزی ادب پر اس کا اثر اس قدر طاقتور ہے کہ ایک ایسے نئے ہیرو کو الفاظ اور کردار میں ڈھالا گیا جس کی ذاتی زندگی عام لوگوں کی طرح تھی۔ اس کے کردار میں بشری کمزوریاں بھی تھیں لیکن وہ ذہین و فطین تھا۔ سماج کی تبدیلی کا خواہشمند بھی تھا لیکن اس کا ماضی داغدار ہوتا۔ فطرت باغیانہ ہوتی تو تکبر' ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی' جلاوطنی' دور اندیشی کی کمی بھی اس کی خصوصیات ہوتیں۔ یہی تشریح لارڈ بائرن کی ہے اور انہی خصوصیات پر مبنی کردار ادب اور سیاست کا ایک ان مٹ حصہ بن گیا۔

جارج گورڈن بائرن عہدِ شباب میں چھتیس بہاریں دیکھنے کے بعد عدم سدھار گیا لیکن قارئین کے دلوں میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ ایک غیر فطری اور باغی زندگی جینے والا بائرن اگر مزید زندہ رہتا تو ادب اور شاعری میں مزید تہلکہ خیز تخلیقات کا اضافہ کرتا یا رومانوی معاملات میں نئی داستانیں رقم کرتا؟ کون جانے؟

فلم نگری

سپر رائٹر

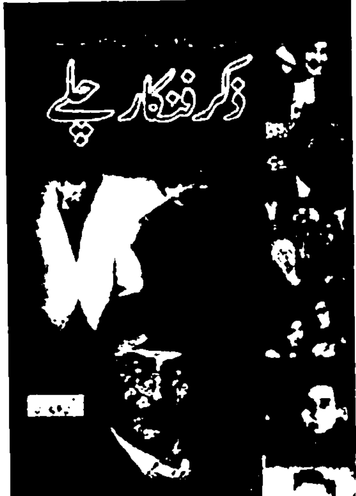
انور فرہاد

جب بھی پاکستان کی فلمی صنعت کا ذکر چھڑے گا تو ایک نام تواتر سے سامنے آئے گا جس نے فلمی شاعری کا ایک سنہرا باب، جداگانہ انداز کے گیتوں سے رقم کیا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسل ان ناموں سے واقف ہی نہیں جنہوں نے کم وسائل کے باوجود پاکستانی فلمی صنعت کو اوج پر پہنچایا۔ ایسا ہی ایک نام زخمی کانپوری کا ہے۔ اس نامور گیت کار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک مختصر سی تحریر۔

قلم کے جادو سے کانوں میں رس گھولنے والے گیت کار کا تذکرہ

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

ایک دور تھا جب لوگ ایسے مشورے دیتے تھے اور لوگ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ پڑھنے والوں کی مختلف کیٹیگری ہوتی تھی۔ کچھ علمی نوعیت کی کتابیں پڑھتے تھے، کچھ ادبی کتابیں، کچھ مذہبی کتب کا مطالعہ کرتے تھے اور ایک بڑا طبقہ تھا جو تفریحی ادب یا پاپولر لٹریچر پڑھا کرتا تھا۔ پڑھنے والوں میں مرد و خواتین بھی ہوتے تھے اور کمسن و نوعمر طالب علم بھی۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنی ایک چچی کو



مطالعے کا شیدائی دیکھا۔ وہ گھر کے کام کاج کے ساتھ ناولیں بھی پڑھتی رہتی تھیں۔ اکثر باورچی خانے میں چولہے پر ہانڈی چڑھا کر پڑھنا شروع کرتیں تو کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ سالن جل بھن جاتا اور انہیں اس وقت ہوش آتا جب جلنے کی مہک سے باورچی خانے کی فضا مسموم ہو جاتی۔ تب بچی صادق سردھنوی یا ایم اسلم کو فرش پر پٹخ کر ہانڈی کی طرف متوجہ ہوتیں۔ میرا مطلب ہے ان کے ناول کو رکھ کر۔

ان دنوں ہر محلے میں ایک دو آنہ لائبریری ہوا کرتی تھیں۔ ذرا ٹھہریے میں پہلے آنہ لائبریری کی وضاحت کر دوں۔ آج کے قارئین کے لیے یہ بہت ضروری ہے جس طرح آج کل سو پیسوں کا ایک روپیا ہوتا ہے، اسی طرح ان دنوں سولہ آنے کا ایک روپیا ہوتا تھا۔ ایک آنے میں پڑھنے والے ان لائبریریوں سے کتاب ایشو کرا کے گھر لے جاتے تھے۔ اس دور میں مردوں کا بھی یہ حال تھا کہ انہیں رات کو نیند نہیں آتی تھی جب تک وہ کچھ دیر تک مطالعہ نہیں کرتے تھے۔

اور جب ابن صفی کے ناول ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کا دور شروع ہوا تو سارے پڑھنے والے ان کے دیوانے ہو گئے۔ میں بھی ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا اور مجھے بھی ہر مہینے ان ناولوں کا انتظار شدت سے ہوتا تھا۔ ہم کئی دوست آپس میں چندہ کر کے دونوں ناول خریدا کرتے تھے اور گھر کے لوگوں سے چھپ کر انہیں پڑھا کرتے تھے۔

لیکن اب..... اب پڑھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔ اب تفریح طبع کے لیے متعدد ذرائع ہیں۔ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے سارے لوگوں کو اپنے جادوئی حصار میں جکڑ لیا ہے۔ اس صورت حال پر میرا ہی ایک شعر ہے۔

ایک ٹی وی بولتا رہتا ہے بس
سب کتابیں شیلف پر خاموش ہیں

اب لوگ ہاگ آدھی رات تک ٹی وی دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اگر کچھ پڑھنا بھی چاہتے ہیں تو فیس بک پر پڑھ لیتے ہیں۔ بے چاری کتابیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ کتابوں کی ایسی بے توقیری سے کتابوں کی اشاعتیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ اب پبلشرز وہی کتابیں شائع کرتے ہیں جن سے انہیں فائدے کی اُمید ہوتی ہے۔ ایسی کتابوں میں تفریحی کتابیں زیادہ تر ہوتی ہیں۔ افسانوں کے مجموعے، ناول یا شوبز کی شخصیات اور واقعات پر مبنی کتابیں۔

دوسری نوعیت کی کتابیں اب بھی چھپتی ہیں، جو خالص ادبی نوعیت کی ہوتی ہیں یا شاعری کے مجموعے۔ مگر اب یہ منافع خور پبلشر نہیں شائع کرتے۔ صاحب کتاب اپنی کتابیں خود طبع کرواتے ہیں جن کی تعداد بہت محدود ہوتی ہے۔

شوبز کی شخصیات، حالات و واقعات پر مبنی کتابیں، کتابوں کا کاروبار کرنے والے ادارے گاہے بگاہے شائع کرتے ہیں۔ ایسی کتابیں زیادہ تر لاہور میں شائع ہوتی ہیں جو معروف فلم جرنلسٹوں کی ہوتی ہیں۔ یاسین گوریجہ، طفیل اختر اور اقبال راہی ایسے ہی چند گنے چنے رائٹروں کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ اب کراچی میں بھی کچھ برسوں کے دوران کئی فلمی کتابیں شائع کی گئی ہیں جن میں سب سے اہم نام زخمی کانپوری کا ہے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ ان کی آٹھ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں جب کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی تین کتابیں ان کے پبلشر نے چھاپیں اور ان سے اپنی تجوری کا پیٹ بھرا۔

جس ادارے نے ان کی ساری کتابیں چھاپی ہیں اس نے ان کتابوں سے پہلے میری لکھی ہوئی ایک کتاب شائع کی تھی جو اداکار، ہدایت کار، فلم ساز، گلوکار اور نامور کامیڈین رنگیلا پر تھی۔

اس کتاب کے لکھنے اور چھپنے کی بھی ایک کہانی ہے۔ ایک بک سیلر، پبلشر اور ایڈیٹر خالد علی صاحب ہوا کرتے ہیں جنہوں نے ایک دو ادبی ڈائجسٹ بھی نکالے اور ایک ہورر ڈائجسٹ، طویل عرصے سے نکال رہے ہیں۔ ''اس ڈائجسٹ'' میں، میں نے بھی طویل مدت تک ہر مہینے ایک کہانی لکھی۔

ایک دن خالد علی صاحب کہنے لگے۔ ''رنگیلا میرا فیورٹ فنکار ہے۔ میں اس پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقصد سے میں نے کئی فلمی صحافیوں سے کہا کہ رنگیلا پر ایک کتاب لکھ دو۔ سب نے ایک ہی جواب دیا۔''

''کیا جواب دیا؟'' یہ میرا سوال تھا۔

''رنگیلا پر تو ایک آدھ مضمون ہی لکھا جا سکتا ہے۔ کتاب نہیں۔''

''اچھا۔'' کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''آپ بھی تو فلم جرنلسٹ ہیں۔'' خالد بھائی بولے۔ ''کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ رنگیلا پر زیادہ سے زیادہ

ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے؟''

''نہیں۔ خالد بھائی میرا یہ خیال نہیں۔''

خالد بھی ایک دم خوش ہو گئے۔ پھر بولے۔ ''تو کیا آپ رنگیلا پر ایک مکمل کتاب لکھ دیں گے؟''

''لکھ دوں گا..... مگر.....''

''مگر کیا؟''

''آپ جانتے ہیں۔ میں قلم کا مزدور ہوں۔ لکھنا پڑھنا ہی میری روزی روٹی کا سہارا ہے۔ میں بلا معاوضہ یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''میں جس طرح ''ڈر'' کی کہانیوں کا اعزازیہ آپ کو اور دوسروں کو دیتا ہوں اسی طرح اس مخصوص کتاب کا بھی آپ کو معقول معاوضہ دوں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آج ہی سے اس کتاب پر کام شروع کر دیتا ہوں مگر تھوڑا وقت لگے گا۔''

''ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ ایسی کسی کتاب کے لیے فیکٹس اور فیگرز کی تلاش اصل مرحلہ ہوتا ہے اس کے لیے آپ کو وقت تو درکار ہوگا۔''

یہ وہ وقت تھا جب رنگیلا کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اپنے عروج اور پھر زوال کا زمانہ دیکھ کر وہ اس عالم فانی سے عالم جاودانی کوچ کر چکے تھے۔ جیسے جیسے ان کے بارے میں مجھے مواد ملتا گیا میں نے اپنے خاص انداز اور اسلوب میں ان پر لکھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دن کتاب مکمل ہو گئی اور میں نے مسودہ خالد علی بھائی کو تھما دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چائے تو وہ ہر ملاقات میں پلاتے ہی تھے آج اپنے محبوب فنکار پر کتاب کا مسودہ وصول کر کے مارے خوشی کے وہاں موجود ہم تمام لوگوں کا منہ بھی میٹھا کرایا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ''رنگیلا'' کی اشاعت کس مرحلے میں ہے؟

''یہ تو آپ کو آصف حسن ہی بتائیں گے۔''

''کیوں؟ وہ کیوں بتائیں گے؟''

مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہ میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔ ان دنوں میرے پاس کتابوں کی طباعت کا بہت کام جمع ہو گیا ہے۔ اس لیے ''رنگیلا'' کو میں نے آصف حسن کے سپرد کر دیا ہے۔ وہی اب اس کتاب کو پرنٹ کریں گے۔''

آصف حسن، خالد بھائی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کا دھندا بھی کتابوں کی طباعت و اشاعت ہے اور ان کی کتابوں کی دکان بھی ہے اردو بازار میں۔ جو خالد بھائی کے

زندگی نامہ

نام: جمیل احمد
قلمی نام: زخمی کانپوری
پیدائش: کانپور (بھارت)
سن پیدائش: 18 اگست 1938ء
والد: ظہور احمد مرحوم
تعلیم: ایم اے، ایل ایل بی 1978ء
ملازمت: پہلی ملازمت بطور کلرک پاک بحریہ میں کی جو 1962ء میں شروع ہوئی اور 18 برس تک جاری رہی اور وکالت شروع کرنے کے بعد ختم ہوئی۔
شادی: 1956ء میں ہوئی۔
اہلیہ: بانو بیگم
اولاد: تین صاحبزادیاں، ماشاءاللہ سب شادی شدہ ہیں۔
کتابیں: گیارہ۔ آٹھ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ تین انتقال کے بعد۔
رشتے دار: دو بھائی اور دو بہنیں۔ جن میں ایک بھائی اور ایک بہن کا انتقال ہو چکا ہے۔
انتقال پُر ملال: 8 مئی 2011ء کو کراچی میں ہوا۔

دفتر کے قریب ہی ہے۔ آصف حسن صرف ادبی کتابیں چھاپتے تھے۔

میں ان سے ملا اور ''رنگیلا'' کے بارے میں پوچھا تو بولے۔

''انور بھائی! میں فلمی کتابیں نہیں چھاپتا مگر بھائی جان (خالد بھائی) کے حکم پر اسے چھاپ رہا ہوں جو میری ہی دکان سے ڈسٹری بیوٹ ہوگی۔ یہ کتاب اس وقت پریس میں ہے۔''

اب جب میں خالد بھائی کے دفتر جاتا تو آصف حسن سے بھی دو چار گھڑی گپ شپ لگا لیتا۔ بہر حال ''رنگیلا'' چھپ کر منظر عام پر آ گئی۔ اس کی سن اشاعت 2010ء ہے۔ جو اس کتاب میں کچھ اس طرح تحریر ہے۔ ایڈیشن 2010ء۔ یعنی اس کے بعد بھی ایڈیشنز چھاپی جائیں گی۔ اس کتاب کی اشاعت سے اس کے پبلشر کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

''رنگیلا'' کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ایک دن آصف حسن نے مجھے بتایا۔ ''زخمی کانپوری میرے پاس اپنی

چار کتابوں کے مسودے لے کر آئے تھے اور کہا تھا۔ ”میری یہ کتابیں بھی آپ چھاپیے۔“

میں نے ان سے کہا۔ ”میں صرف ادبی کتابیں چھاپتا ہوں۔ فلمی کتابیں نہیں شائع کرتا۔“

”مگر آپ نے انور فرہاد کی لکھی کتاب تو چھاپی ہے، وہ تو کوئی ادبی کتاب نہیں خالص فلمی کتاب ہے۔“

”آپ نے اس میں لکھا انور فرہاد کا دیباچہ نہیں پڑھا۔ یہ کتاب دراصل میرے بڑے بھائی خالد علی نے ان سے لکھوائی تھی، وہی اس کتاب کو شائع کرنے والے تھے مگر بوجوہ خود نہیں چھاپ سکے اس لیے اس کی ذمہ داری مجھے سونپ دی جو بطور مجبوری میں نے نبھائی۔“

اس کے بعد آصف حسن نے مجھے جو کچھ بتایا وہ بڑی اہم بات ہے۔

”انور بھائی! میرے انکار پر یوں لگا جیسے وہ اندر سے مزید زخمی ہوگئے ہیں۔ ان کے چہرے پر ان کی اندرونی کیفیت بڑی تیزی سے ظاہر ہونے لگی تھی پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ مارے صدمے کے بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ میں نے گھبرا کر ان سے کہہ دیا۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔ آپ اپنے مسودے چھوڑ جائیں۔ میں انہیں پڑھ کر آپ کو بتاؤں گا۔“

اس کے بعد ان کی طبیعت نارمل ہوئی۔ متوقع دل کا دورہ ٹل گیا۔

”آصف صاحب!“ میں نے ان سے کہا۔ ”زخمی کانپوری سینئر فلم جرنلسٹ ہیں۔ ان کے پڑھنے والوں اور انہیں پسند کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ آپ بلاخوف ان کی کتابیں شائع کریں۔ انشاءاللہ ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی، آپ کو کاروباری طور پر نقصان نہیں ہوگا۔ ٹھیک ٹھاک فائدہ ہوگا۔“

”میرے دوست مراد لاکھانی نے بھی اس بات کی یقین دہانی کی ہے کہ زخمی کانپوری معروف فلم رائٹر ہیں۔ ان کی کتابوں کی اشاعت ہونی چاہیے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے بے تحاشا لکھا ہے اور بہت اچھے معلوماتی اور دلچسپ مضامین لکھے ہیں جو کتابی صورت میں سامنے آنا چاہیے۔“

”دراصل بات یہ ہے کہ مجھے فلموں اور فلم والوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“

”جن لوگوں کو معلوم ہے۔ ان کا تعاون حاصل کریں۔“

میں نے ان سے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ فلمی معلومات پر کتابوں کی اشاعت وقت کی ایک ضرورت ہے۔ اخبارات اور میگزینز میں ان کی مقبولیت کا یہ مطلب ہے کہ فلموں اور فلم والوں کے بارے میں لوگ جاننا چاہتے ہیں مگر اخبارات اور جریدوں کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح ہمارے ہاں بھی ایسی تحریروں کو کتابی صورت میں شائع ہو کر محفوظ ہونا چاہیے۔

قصہ مختصر یہ کہ آصف حسن نے ڈرتے ڈرتے زخمی کانپوری کی ایک کتاب شائع کردی جس کے بعد ان کا ڈر اور خوف دور ہونے لگا۔ ادبی کتابوں کی ترسیل جس سلوموشن میں ہوتی ہے اس کے برعکس زخمی کانپوری کی کتاب ”رنگیلا“ کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے بک گئی۔

کاروباری لوگ اپنے فائدے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ فلمی کتاب کی کوئیک سیل نے انہیں (آصف حسن کو) متاثر کیا اور انہوں نے یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے باقی تینوں کتابیں بھی چھاپ دیں۔ یہی نہیں ان سے کہا۔ ”اپنی دیگر کتابوں کے مسودے بھی لا کر دیں۔“

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زخمی کانپوری کی کتابیں چھاپنے والے پبلشر نے پیٹ بھر کر منافع کمایا مگر مصنف کو ایک پیسا بھی نہیں دیا۔ ان کے خیال میں ان کی کتابیں شائع کر کے ہی انہوں نے ان پر احسان عظیم کیا ہے۔

برسبیل تذکرہ اس موقع پر ایک واقعے کا ذکر غیرضروری نہیں ہوگا۔ کراچی کے ایک پبلشر نے میرے شائع شدہ فلمی مضامین کو بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے انہیں کوئی دس کتابوں کا مواد فراہم کردیا اور جب پوچھا۔

”اس کے عوض آپ مجھے کیا دیں گے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ بس آپ کے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کردیں گے۔“

”مجھے ایسی کتابوں کی اشاعت منظور نہیں جن سے بس پبلشر فائدہ اٹھائے ان کے لکھنے والے کو کوئی فائدہ نہ ہو۔“

یوں میں نے ان سے اپنے مضامین واپس لے لیے۔ میں زخمی کانپوری کے نقش قدم پر نہیں چلا کیونکہ زخمی کانپوری کا ذریعہ معاش لکھنا نہیں تھا۔ ان کا پیشہ وکالت تھا۔ ان کے لیے لکھنا پڑھنا شوقیہ مشغلہ تھا۔ اس لیے وہ بلا کسی معاوضے کے اپنی کتابیں تو چھپوا سکتے تھے جس کا متحمل میں

نہیں ہو سکتا۔ میرا مؤقف یہ ہے کہ جب آپ میری تحریریں بیچ کر کمائیں گے تو اس میں میرا بھی ایک معقول حصہ ہونا لازمی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں پبلشرز اس حق سے مصنفین کو محروم نہیں رکھتے۔

یورپ امریکا اور بہت سے ممالک کے پبلشرز مصنفین کو ان کا جائز حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک کا ہی وتیرہ ہے کہ جہاں دیگر شعبوں میں لوٹ مار کا بازار گرم ہے وہاں کتابیں شائع کرنے والے پبلشنگ ادارے بھی لکھنے والوں کو اپنے استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔

سانحہ کی دہائی کی بات ہے۔ ڈھاکے کے نیو مارکیٹ میں میری کتابوں کی ایک دکان تھی جہاں اکثر شام کے وقت شہر کے ادیب و شاعر آجاتے تھے۔ ایک دن محترم عندلیب شادانی تشریف لائے تو ایک کتاب پر نظر پڑتے ہی بولے۔ ”میاں! ذرا یہ کتاب تو دکھانا۔“

میں نے ریک سے اتار کر وہ کتاب تھما دی۔ یہ ”پریم پجاری کی کہانیاں“ تھیں۔ شادانی صاحب نے اپنی جوانی کے دور میں پریم پجاری کے فرضی نام سے کچھ کہانیاں لکھی تھیں جو بہت مقبول ہوئیں پھر جب یہ راز منکشف ہوگیا کہ یہ پریم پجاری کون ہے تو شادانی صاحب نے ان کہانیوں کا سلسلہ بند کردیا۔ بعد میں لاہور کے ایک پبلشر نے انہیں کتابی صورت میں چھاپا۔ شادانی صاحب کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد مسکرانے لگے۔

”دیکھو۔“ انہوں نے کتاب کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”35 سال سے یہ لوگ اس کا پہلا ایڈیشن ہی چھاپ رہے ہیں۔“

واقعی کتاب میں پہلا ایڈیشن ہی لکھا ہوا تھا۔

”35 برس پہلے چھپنے والی کتاب کیا اتنی ہی تر و تازہ ہو سکتی ہے؟“

یہ باتیں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں لکھنے والوں کی حق تلفی کا سلسلہ نیا نہیں جب کہ یورپ اور امریکا میں پبلشرز کا مثبت رویہ بھی بہت پرانا ہے۔

زخمی کانپوری اچھے رائٹر ہی نہیں، بہت وسیع القلب انسان بھی تھے۔ اپنے مالی فائدے کو پس پشت ڈال کر اپنے پبلشر کو اپنی زندگی میں بھی اور اپنی موت کے بعد بھی فائدہ پہنچاتے رہے۔ ہر کتاب پر یہ جملہ خاص طور پر لکھا ہوتا ہے۔ ”جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ۔“ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ پبلشر کی جاگیر ہے۔ وہ زندگی بھر اسے چھاپ کر اپنی تجوری بھرتے رہیں گے۔ ان کے بعد ان کے بچوں کو وراثت میں ان کے حقوق منتقل ہو جائیں گے مگر مصنف یا اس کا کوئی عزیز کبھی بھی انہیں چھاپنے کا مجاز نہیں ہوگا۔

زخمی کانپوری سے میری بہت پرانی شناسائی تھی۔ پہلے پہل ان کی تحریروں سے ملنے کا اتفاق تب ہوا۔ جب میں جناب منیر حسین کے فلمی جریدے ماہنامہ ”فلم ایشیا“ سے وابستہ تھا۔ منیر حسین پرانے صحافی تھے۔ متعدد رسالے انہوں نے نکالے۔ اردو کے بھی اور انگریزی کے بھی مگر زیادہ مقبولیت انہیں ”فلم ایشیا“ سے اور بہت زیادہ مقبولیت ”اخبار وطن“ سے حاصل ہوئی۔ ”اخبار وطن“ خالص کرکٹ کا میگزین تھا۔ منیر حسین کی شناخت اردو کمنٹری کے بانی کی

زخمی۔ بہزاد کے آستانے پر

زخمی کانپوری عین عالم شباب میں پہلے ہی عشق کی ناکامی میں اس قدر بے قرار ہوئے کہ انہیں سکون دل کے لیے عاشق رسولؐ بہزاد لکھنوی کے آستانے پر جانا پڑا۔ بہزاد صاحب کے قدموں پر جا گرے تو بہزاد صاحب نے بڑی شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اٹھا کر گلے سے لگایا۔ زخمی کے بے قرار دل کو قرار آیا اور ان کی دنیا بدل گئی۔ اب ان کا سب کچھ بہزاد صاحب کی ذات اور ان کا آستانہ تھا۔ ابھی وہ کہیں ملازم نہیں تھے اس لیے ان کا زیادہ تر وقت بہزاد صاحب کی خدمت میں گزرتا۔ وہ ہر طرح بہزاد صاحب کی خدمت کرتے حالانکہ ان کا ایک ذاتی خدمت گار تھا مگر جب زخمی کانپوری ہوتے تو صرف وہی ان کی خدمت کرتے۔ بہزاد صاحب بھی زخمی پر بہت مہربان تھے۔ بہزاد صاحب نے زخمی کو شاعری کے رموز سکھائے، شعر کہنے کے گر بتائے۔ وہ اپنے پیر و مرشد کو اپنا کلام دکھاتے۔ وہ ان کی اصلاح کرتے۔ زخمی کانپوری کو شعر و شاعری سے رغبت ابتداء ہی سے تھی۔ بہزاد صاحب کے آستانے جا کر ان کی طبیعت شاعری کی طرف اور بھی راغب ہوگئی اور وہ استاد کی خدمت کے ساتھ مشق سخن بھی کرتے رہے۔ دونوں کا ساتھ اس وقت چھوٹا جب بہزاد صاحب پاکستان کوارٹر سے کوکن مسلم سوسائٹی منتقل ہوگئے۔ ادھر زخمی کانپوری بھی گارڈن ویسٹ سے ناظم آباد جا بسے۔

حیثیت سے بھی ہوتی ہے۔
ایک دن انہوں نے مجھے ایک مضمون دیا اور کہا۔ ”اسے پڑھ کر بتایئے کیسا ہے؟“
میں نے پڑھا۔ بہت اچھا تھا۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے بھی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی۔ میں نے منیر بھائی سے کہا۔ ”بہت اچھا ہے۔“
”فلم ایشیا کے آنے والے شمارہ میں شائع کردیجیے۔“
یہ زخمی کانپوری کی پہلی تحریر تھی جس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہر ماہ ایک نئی تحریر مجھے منیر بھائی کے توسط سے ملتی جو زخمی کانپوری صاحب کی ہوتی تھی۔ وہ کون ہیں؟ کب آکر اپنی تحریر منیر بھائی کو دے جاتے ہیں؟ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ زخمی صاحب کی تر و تازہ اور توانا تحریریں ایم اے مغنی صاحب کے توسط سے آتی تھیں۔ پھر وہ خود آکر دے جاتے تھے۔
آج کے قارئین کے لیے ایم اے مغنی صاحب کا تعارف کرانا بھی ضروری ہے۔ ان کی وجہ شہرت فلم پبلسٹی کے ماہر کی حیثیت سے تھی۔ وہ بمبئی کی فلم انڈسٹری سے وابستہ رہ چکے تھے۔ وہاں کی بیشتر فلموں کے علاوہ شہرۂ آفاق فلم ”پکار“ کی بھی انہوں نے زبردست تشہیر کی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح نہ ٹی وی چینلز تھے، نہ پرنٹ میڈیا اتنا پاورفل تھا اس لیے فلموں کی پبلسٹی کا کام بہت مشکل تھا جو ایم اے مغنی صاحب بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ برصغیر کے بٹوارے کے بعد وہ پاکستان آگئے اور انہوں نے کچھ پاکستانی فلموں کی بھی پبلسٹی کی پھر ریٹائرڈ زندگی گزارنے لگے۔ وہ فلم ایشیا میں اکثر اپنی یادداشتیں لکھا کرتے تھے۔ منیر حسین کی طرح دیگر صحافیوں سے ان کے اچھے اور دوستانہ مراسم تھے۔ مغنی صاحب ناظم آباد کراچی میں رہتے تھے۔ اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ زخمی کانپوری ان کے پڑوسی تھے۔ زخمی کانپوری اکتوبر 1947ء میں پاکستان آگئے تھے اور مختلف محلوں اور علاقوں سے ہوتے ہوئے آخر کار ناظم آباد میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ پڑوسی جب ایک دوسرے سے ملتے ملاتے ہیں تو ان کو ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔
زخمی صاحب سے مغنی صاحب ملے تو ان سے پوچھا۔
”آپ کا کیا مشغلہ ہے؟“
زخمی صاحب نے کہا۔ ”تعلیم سے فارغ ہوکر وکالت کررہا ہوں اور کچھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی ہے۔“
”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟“
پہلے تو وہ ذرا شرمائے، پھر ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ”فلمی مضامین لکھتا ہوں۔“
”تو اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے؟ کہیں چھپتی بھی ہیں تمہاری تحریریں؟“
”جی نہیں۔“ زخمی بولے۔ ”میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ نہ ہی مجھے کوئی جانتا ہے پھر چھپنے چھپانے کی بات کیسے ہوگی۔“
”چھپنے کے لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔“ مغنی صاحب بولے۔ ”تحریر کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ اچھی تحریر خود اپنا تعارف ہوتی ہے۔“
بہرحال اس مفید مشورے کے بعد مغنی صاحب بولے۔ ”اپنی کوئی تحریر مجھے دیں۔ میں اسے اشاعت کے لیے کسی کو دے دوں گا۔ اچھی ہوگی تو چھپ جائے گی اچھی نہیں ہوگی تو ردی کی ٹوکری کی خوراک بن جائے گی۔“
اس طرح زخمی کانپوری کا پہلا مضمون 1987ء میں ماہنامہ ”فلم ایشیا“ میں شائع ہوا جو آنجہانی راجندر کرشن پر لکھا گیا تھا۔
یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت زخمی کانپوری اپنی عمر کی گولڈن جوبلی مکمل کرچکے تھے۔ حالانکہ اکثر لکھنے والے اس عمر میں لکھنا ترک کردیتے ہیں مگر زخمی کانپوری نے اس وقت لکھنا شروع کیا اس کے بعد روزنامہ جنگ کراچی ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی میں بھی زخمی کانپوری کے مضامین مغنی صاحب ہی کے توسط سے پہنچے۔ ان تحریروں میں اتنی جان تھی کہ اگر وہ مغنی صاحب کے ذریعے نہ بھی پہنچتیں تب بھی شائع ہوتیں۔
ان مضامین کی اشاعت کے بعد زخمی صاحب کے مضامین کی اشاعت کا باضابطہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ مختلف اخبارات و رسائل میں پابندی کے ساتھ چھپنے لگے۔ جن میں روزنامہ جنگ، اخبار جہاں اور فلم ایشیا کے علاوہ ہفت روزہ نگار کراچی، پندرہ روزہ فاصلہ، ماہنامہ ٹی وی ٹائمز، ماہنامہ رومان کراچی، ماہنامہ صبح نو کراچی، ماہنامہ روپ کراچی، ماہنامہ نوائے ٹوکیو، اسٹار ڈسٹ کراچی، آواز وطن، ادبی جریدہ دنیائے ادب کراچی کے نام قابل ذکر ہیں

سب کہ صبا لکھنوی کے جریدہ افکار کے جوش نمبر میں بھی زخمی کانپوری کا جوش کی فلمی نغمہ نگاری پر مضمون شامل ہے۔
ایک وقت آیا جب زخمی کانپوری سے روبرو ملاقاتیں ہونے لگیں۔ یہ وہ دور تھا جب بھائی الیاس رشیدی کے انتقال پُرملال کے بعد مجھے ہر ہفتہ ایک دن نگار کے دفتر جاکر اداریہ لکھنا پڑتا تھا۔ اداریہ کے علاوہ میرا ایک مضمون یا کالم بھی ہر ہفتے شائع ہوتا تھا جو میں گھر سے لکھ کر لے جاتا تھا۔ اس دوران بھائی زخمی کانپوری بھی کبھی کبھار اپنے مضامین لے کر آجاتے تھے اور ہماری ملاقات ہوجاتی تھی۔
عام لوگوں کے مقابلے میں قلم قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ مجھے اپنی طرف راغب کرنے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا مزاج میری طبیعت سے زیادہ مختلف نہ ہو۔ میں جس طرح زخمی کانپوری کی تحریروں سے متاثر تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ان سے مل کر مجھے اچھا لگا۔ پتا نہیں یہ میری اچھائی ہے یا برائی کہ میں اصل شخصیتوں سے نہیں، ان کی تحریروں سے متاثر ہوتا ہوں۔ زخمی کانپوری کی تحریروں میں مجھے جامعیت اور اپنے موضوع سے بھرپور انصاف کا احساس ہوا۔ ان کے زیادہ تر مضامین چونکہ فلمی شخصیتوں سے متعلق ہوتے تھے جن کے بارے میں لکھنے سے پہلے وہ تحقیق و تصدیق میں بڑی دیانتداری سے محنت کرتے تھے اس لیے ان کی تحریروں نے مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو بہت جلد اپنا گرویدہ بنالیا۔ میں برملا اس بات کا اعتراف کروں گا کہ اکثر مواقع پر میں نے حوالے کے لیے ان کی تحریروں سے اکتساب کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ان کی تحریروں کو معتبر سمجھتا ہوں۔
اردو کی فلم جرنلزم کے حوالے سے جب بات ہوتی ہے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس شعبے کو اہمیت ہی نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم اچھے لکھنے والے سامنے آئے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا شوبز کی صحافت کا معیار پست سے پست تر ہوتا گیا۔ اچھے اخبارات و جرائد کے ساتھ ساتھ اچھے صحافی بھی خال خال ہی رہ گئے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ فلم جرنلزم سے وابستہ صحافیوں کی اکثریت صحیح جملے بھی نہیں لکھ سکتی جب کہ کسی موضوع پر لکھنے کے لیے ان کے پاس مواد بھی موجود نہیں ہوتا وہ اس کی تلاش کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے۔ لکھنے کے لیے پڑھنا ضروری ہوتا ہے جو آج کے لکھاری ضروری نہیں سمجھتے۔ زخمی کانپوری کے پاس نہ صرف کتابوں اور جرائد کا ذخیرہ تھا بلکہ وہ کتب

زخمی کانپوری کا مشن جاری ہے

زخمی کانپوری کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے وہ اپنے چھوٹے بھائی کے صاحبزادے فیصل کانپوری کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے اسی لیے اس کی تعلیم و تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ انہی کی زیر نگرانی فیصل کانپوری نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔ ان کا یہ بھتیجا بھی ان سے بہت محبت کرتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے بھی جون 2011ء سے لکھنا شروع کیا۔ اب تک اس کے 50 مضامین اخبارات و میگزین کی زینت بن چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے زخمی کانپوری کے مشن کو جاری رکھنے کی نیت سے قلم کاری شروع کی ہے۔ وہ فلمی مضامین کے علاوہ نعت خوانوں پر لکھتے ہیں اور کہتے ہیں نعت نگاروں اور نعت خوانوں کے متعلق میرا یہ قلمی سفر جاری رہے گا۔ فیصل کانپوری شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ ہیں۔

حضرت بہزاد لکھنوی کی فلمی نغمہ نگاری

عام لوگ حضرت بہزاد لکھنوی کو ایک صوفی منش اور عاشق رسولؐ کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر زخمی کانپوری بتاتے ہیں کہ حضرت بہزاد لکھنوی نے بمبئی کی 45 فلموں کے فلمی گیت بھی لکھے تھے۔ ان کی ایک غزل

جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

آج بھی بہت شوق سے سنی جاتی ہے۔ یہ راج کپور کی پہلی فلم بطور ہدایت کار ”آگ“ میں شامل ہے۔ زخمی کانپوری کو خود بہزاد صاحب نے بتایا تھا کہ ایک دن راج کپور مجھ سے اسٹوڈیو میں ملا اور کہنے لگا۔ میں ایک فلم بنا رہا ہوں جس کا نام میں نے ”آگ“ رکھا ہے۔ آپ اس کے گیت لکھیے۔ فی الحال مجھے ایک المیہ غزل چاہیے جسے میں مکیش کی آواز میں ریکارڈ کراؤں گا جس کی موسیقی رام گنگولی ترتیب دیں گے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور مجھے ساری سچویشن سمجھائی۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے یہ غزل لکھ دی۔ راج کپور بہت خوش ہوا۔ یوں تو فلم ”آگ“ کے تمام گیت بہت پسند کیے گئے مگر یہ غزل بے حد مقبول ہوئی۔ شاید اس غزل کا اثر ہی تھا کہ راج کپور اور مکیش دونوں ہی کلک ہوگئے۔ نامور ادیب اور نقاد مشفق خواجہ کا کہنا ہے کہ یہ ایک کلاسیکل غزل ہے۔ ان کا یہ کہنا ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

خانوں اور لائبریریوں سے بھی اپنے لیے تحقیقی مواد حاصل کرتے تھے۔ جب کہ موجودہ شخصیتوں سے بالمشافہ ملاقاتیں کر کے بھی ان کے بارے میں معلومات جمع کرتے تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے جن شخصیتوں کے بارے میں تحقیقی مضامین لکھے ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو گوشہ گمنامی میں تھے۔ انہیں ڈھونڈ نکالنا اور ان کے بارے میں ان کی گفتگو کی روشنی میں لکھنا حقیقتاً بڑے جان جوکھوں کا کام تھا جو زخمی کانپوری نے کیا۔

زخمی کانپوری نے برصغیر ہند و پاک کے نغمہ نگاروں سے متعلق ہی مضامین قلم بند نہیں کیے۔ موسیقاروں، گلوکاروں، گلوکاراؤں، اداکاراؤں، فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے بارے میں بھی متعدد شخصیتوں پر لکھنے کے ساتھ ساتھ سیکڑوں متفرق موضوعات پر مضامین لکھے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا۔ ”آپ اپنے مضامین کتابی صورت میں شائع کیوں نہیں کرتے ؟“

”اس سے کیا ہوگا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اس سے یہ ہوگا کہ وہ دستاویزی صورت میں محفوظ ہوجائیں گے۔ ضائع ہونے سے بچ جائیں گے۔“

1987ء سے تادم مرگ وہ لکھتے رہے، لکھتے رہے، بقول شاعر

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

وہ لکھتے رہے اور اخبارات و جرائد میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نیت سے انہیں ترتیب دیتے رہے۔ انہی دنوں کی بات ہے۔ انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔

”میری تحریروں کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ دیں۔“

اور ان سے جب اگلی ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی تحریروں کے علاوہ ان کی شخصیت کے بارے میں بھی اپنے محسوسات ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر انہیں پیش کردیا۔

”اگر اللہ نے چاہا اور میری کتابیں کبھی شائع ہوئیں تو ان میں سے کسی ایک کتاب میں، میں آپ کی یہ تحریر شامل کروں گا۔“

اور حسب وعدہ جب ان کی کتابوں کی اشاعت شروع ہوئی تو میری یہ تاثراتی تحریر انہوں نے اپنی ایک کتاب میں شامل کی۔ ان کی اس کتاب کا نام ہے ”ذکر جب چھڑ گیا“ اس کتاب کی سنِ اشاعت 2008ء ہے۔ یہ زخمی کانپوری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے شائع ہونے والی کتابیں یہ ہیں۔

1۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا

2۔ پری چہرے

اور ان کے بعد شائع ہونے والی کتابیں یہ ہیں۔

3۔ داستان کہتے کہتے

4۔ ذکر فنکار چلے

5۔ دور کوئی گائے

6۔ یہ باتیں تری یہ فسانے ترے

ایک وقت تھا جب ان کی کتابوں کی اشاعت کا رسک کوئی لینے کو تیار نہیں تھا پھر وہ وقت آیا جب ان کی کتابیں چھپنا شروع ہوئیں تو ایک کے بعد ایک چھپتی ہی چلی گئیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے انہیں ان کے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا جو مشورہ بھی دیا تھا اس پر وہ عمل پیرا ہوئے اور ان کے وہ مضامین جو بڑی عرق ریزی کے بعد لکھے گئے تھے وہ تلف ہونے سے بچ گئے۔ فلم کے حوالے سے اردو زبان میں ایسی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے جو فلمی صحافت کے طالب علموں کی درست رہنمائی کرسکیں۔

زخمی کانپوری کی شخصیت کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ان کی ابتدائی زندگی اور جدو جہد کے زمانے کی ایک تصویر آپ کو دکھا دوں۔

پاکستان 14 اگست 1947ء کو عالم وجود میں آیا تھا جس کے دو مہینے بعد ہی زخمی کانپوری بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے تھے اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی تھی اور اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ 1959ء میں کراچی بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے کیونکہ اس وقت ان کے حالات بہتر نہیں تھے۔ انہیں ملازمت کر کے اپنے آپ کو سہارا دینا پڑا۔ پاک بحریہ میں انہیں بطور کلرک ملازمت ملی۔ یہ سال 1962ء کا تھا۔ اس نوکری کے بعد ان کی مشکلیں آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ ان کے دل میں آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کا جوش و جذبہ تھا اس لیے دس سال بعد یعنی 1969ء میں جب ان کے حالات کسی قدر بہتر ہوئے تو

انہوں نے اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے کر دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کردیا۔ 1973ء میں اس کالج کے طالب علم کی حیثیت سے گریجویشن کیا پھر 1976ء میں کراچی کے ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور 1978ء میں جامعہ کراچی سے بطور پرائیویٹ طالب علم اردو میں ایم اے کیا اور جب وہ ایم اے ایل ایل بی ہوگئے تو انہوں نے 1980ء میں پاک بحریہ کی 18 سالہ ملازمت سے مستعفی ہوکر وکالت شروع کردی۔

وہ جو حسرت موہانی نے کبھی کہا تھا۔

”ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی“

تو کچھ ایسی ہی حالت زخمی صاحب کی بھی تھی۔ ملازمت بھی، تعلیمی مصروفیات بھی اور ساتھ ساتھ لکھنے اور چھپنے چھپانے کا سلسلہ بھی جاری رہا، کسی بھی شعبے میں اگر محنت کی جائے تو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ زخمی کانپوری نے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود دلجمعی اور دیانت داری کے ساتھ جو جدو جہد کی اس کے نتیجے میں انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وکالت کا پیشہ اختیار کر کے باعزت زندگی بسر کی اور متعدد کتابوں کے مصنف بن کر اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ بقول مسرور انور

جو زمانے میں ہمت نہ ہارے
اپنی تقدیر جو خود سنوارے
اس جہاں میں اسی کے ہمیشہ
کامیابی قدم چومتی ہے

انہوں نے اپنے آپ کو نقصان اور اپنے پبلشر کو اس لیے فائدہ پہنچایا کہ صحافت ان کا پیشہ نہیں شوق تھا جو مجھ جیسے قلم کے مزدور کے لیے ممکن نہیں۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام جمیل احمد ہے تو میں سوچنے لگا۔ وہ زخمی کیسے ہوگئے۔ میں نے ان سے تو اس بارے میں نہیں پوچھا مگر صحافی ہونے کے ناتے اس کھوج میں لگ گیا اور آخرکار اپنے سوال کا جواب مجھے مل گیا۔

جب آتش جوان تھا تو ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو عام طور پر جوانی کے ایام میں جوانوں کا ہوتا ہے۔ کسی پری چہرہ پر ان کی نظر پڑی اور ان کے دل نے کہا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس موقع محل کے تناظر میں میرا ایک تازہ ترین شعر

عظیم موسیقار۔ عظیم تر انسان

نوشاد صاحب کو عظیم موسیقار کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے میوزک ڈائریکٹر ہی نہیں تھے بہت بڑے انسان بھی تھے۔ زخمی کانپوری نے ان کی عظمت کی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ گلوکار محمد رفیع نے جب اپنی بیٹی کی شادی کی تو اس کے لیے ایک بڑا شادی ہال بک کرایا۔ نوشاد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے رفیع سے کہا۔ بیٹی کو اپنے گھر سے رخصت کرو جہاں اس نے اپنی زندگی کے دن گزارے ہیں۔ محمد رفیع نے اس مشورے پر عمل کیا۔ ہال کی بکنگ منسوخ کرائی اور سارا انتظام گھر پر کیا اور وہیں سے بیٹی کو رخصت کیا۔ بات جس نے بھی سنی نوشاد صاحب کی تعریف کی۔ زخمی صاحب بتاتے ہیں محمد رفیع کی شادی بھی نوشاد صاحب کے انتخاب پر ہوئی تھی۔ محمد رفیع کا سارا گھرانا لاہور میں رہتا تھا اس لیے تنہائی محمد رفیع کو کھائے جاتی تھی اس لیے نوشاد صاحب نے ہی محمد رفیع کی شادی کروائی تھی۔ اسی طرح نوشاد صاحب نے نغمہ نگار شکیل بدایونی کا بھی ساتھ دیا تھا۔ شکیل بدایونی اپنے آخری ایام میں بیمار ہوئے تو نوشاد صاحب نے انہیں اسپتال میں داخل کرایا اور ان کی بڑی اچھی طرح تیمارداری کی مگر وہ جانبر نہ ہوسکے۔ شکیل بدایونی اور محمد رفیع کی موت کے بعد دونوں گھرانوں کی دیکھ بھال نوشاد صاحب ہی نے کی۔

☆☆☆

فلم آگ کی غزل

زندہ ہوں اس طرح کہ غمِ زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں
یہ چاند یہ ہوا یہ فضا سب ہیں ماند ماند
جب تو نہیں تو ان میں کوئی دلکشی نہیں
گو مدتیں ہوئی ہیں کسی سے جدا ہوئے
لیکن یہ دل کی آگ ابھی تک بجھی نہیں
ہونٹوں کے پاس آئے ہنسی کیا مجال ہے
دل کا یہ معاملہ ہے کوئی دل لگی نہیں
آنے کو آچکا تھا کنارہ بھی سامنے
پر اس کے پاس ہی میری نیا گئی نہیں

بنیے۔

ان پہ پڑتے ہی نظر زور سے دھڑکا میرا دل
کیا ہوا پوچھا تو کہنے لگا قاتل قاتل

کچھ ایسی ہی کیفیت جواں سال جمیل احمد کی تھی۔ انہوں نے اس قتالہ سے راہ و رسم محبت بڑھانے کی کوشش کی مگر افسوس صد افسوس کہ کامیاب نہ ہو سکے۔ نئے دور کی نئی لیلیٰ بڑی ہوشیار ہوئی ہے۔ ہر مجنوں کو لفٹ نہیں کراتی۔ دیکھتی ہے کہ کس میں کتنا دم خم ہے۔ کون اس کے ناز نخروں کا بوجھ سنبھال سکے گا۔ کس کی جیب کتنی بھاری ہے۔ کس کے بینک اکاؤنٹ میں کتنا مال ہے؟

ہمارے مجنوں نے جب یہ کہا ہوگا ''نہ سونا نہ چاندی نہ کوئی محل تجھ کو میں دے سکوں گا۔'' تو ظاہر ہے اس امتحان میں وہ فیل ہو گئے ہوں گے۔ لیلیٰ نے انہیں ریجیکٹ کر دیا ہو گا۔ ایسے میں وہی ہوا جو اس طرح کے حالات میں ہوتا ہے۔ ان کے احساسات زخمی ہو گئے۔ جذبات زخمی ہو گئے۔ ان کا دل زخمی ہو گیا اور وہ خود بھی زخمی ہو گئے۔ یہ ہے، جمیل احمد کا زخمی کانپوری بننے کی اسٹوری۔

ہمارے ہاں لو اسٹوری کی ناکامی پر یا تو ناکام عاشق اپنا گریبان چاک (پھاڑ) کر کے جنگل میں نکل جاتا ہے یا شاعری شروع کر دیتا ہے۔ جمیل احمد نے بھی یہ آسان راستہ اختیار کیا اور اپنی ناکام محبت کی نوحہ خوانی شروع کر دی اور پھر اپنی اور اپنی شاعری کی اصلاح کے لیے بہزاد لکھنوری جیسی شخصیت کا انتخاب کیا۔ بہزاد صاحب بھی عاشق تھے۔ عاشقِ رسولؐ تھے۔ عاشق نے عاشق کا ہی سہارا لیا۔ کچھ عرصے تک استاد کی بارگاہ میں رہے۔ ان کی خدمت کرتے رہے اور اپنے ٹوٹے ہوئے دل، زخمی دل کی پکار۔ اپنے اشعار کی اصلاح بھی لیتے رہے پھر اس نتیجے پر پہنچے

تجھ سے دل کش ہیں کئی اور بھی غم اے غمِ دل!
مرحلے اور بھی ہیں زیست کے مشکل مشکل

زخمی کانپوری کو عشق نے مکمل طور پر نکما نہیں کیا تھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد وہ اپنے پر پرزے جھاڑ کر کارزارِ حیات میں دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ ان میں یہ خوبی ابتداء ہی سے تھی کہ وہ مشکلات سے گھبراتے نہیں تھے نہ جدوجہد سے جان چراتے تھے۔ ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ حالات سے لڑنے اور مخالف ہواؤں سے مقابلہ کرنے میں گزرا۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو دیانت داری سے تحقیق و تصدیق کے ساتھ صحافتی اصولوں کی پاسداری کی۔ دیانت داری اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اپنی ذات میں مست اور اپنی لگن میں مستغرق رہے۔ انہیں نہ تشہیر کی خواہش تھی نہ ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت تھی۔ نہ وہ داد کے طالب تھے نہ کسی تعریف کے بھوکے۔ وہ تو زیادہ تر ان لوگوں پر کام کرتے تھے جنہیں دنیا والوں نے بھلا دیا تھا جن کے اپنے انہیں فراموش کر بیٹھے تھے اور جن کا ذکر کرنے سے پہلے لوگ سوچتے تھے کہ اب اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟

ان کی طبیعت کی طرح ان کا پیکر بھی تھا۔ سانولا سلونا رنگ، پُرسکون چہرہ، مطمئن آنکھیں۔ لہجے میں انکسار، کوئی دعویٰ نہیں، کوئی ڈینگ نہیں، نہ کسی کے سامنے اپنے کارنامے گنواتے تھے، نہ کسی کو متاثر کرنے کے لیے شیخی بگھارنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑے کم گو تھے، اپنے آپ میں مست رہنے والے۔ صوفی منش شخصیت کے مالک تھے۔ بے تحاشا لکھنے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود نہ کسی ستائش کی تمنا کی نہ ان پر غرور و فخر کیا۔ وہ ہر وہ چیز جسے درست سمجھتے تھے اس کا انتخاب کرتے اور جیسا دیکھتے، جیسا اس کے بارے میں محسوس کرتے من و عن لکھ دیتے تھے۔ نہ کسی کو کبھی ڈرایا نہ کسی سے ڈرے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

لکھنے والے کے لیے پڑھنے والا بھی ہونا ضروری ہے۔ زخمی کانپوری خاصے پڑھے لکھے انسان تھے۔ اردو لسانیات میں ماسٹر کی ڈگری لی تھی اس لیے بہت اچھی صاف ستھری معیاری اور دل میں اتر جانے والی زبان لکھتے تھے۔ ان کے طرز تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اتنی آسان ہوتی ہے کہ آٹھ سال کے بچے سے لے کر ساٹھ سال کا بوڑھا بھی آسانی سے پڑھ لے اور سمجھ لے۔ ان کا حافظہ بہت تیز تھا جہاں علم و فن کا کبھی ختم نہ ہونے والا ایک عظیم خزانہ مدفون تھا۔ ان کے لکھے ہوئے بعض مضامین نصف صدی یا اس سے زیادہ پر محیط ہیں۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ زخمی صاحب جیسے صاحبِ علم نے فلم کا موضوع انتخاب کر کے اس کو عزت و تکریم کی منزل تک پہنچایا ورنہ اس سے پہلے یہ موضوع عام طور پر سوقیانہ اور کمتر سمجھا جاتا تھا۔ ایک بڑا رائٹر ان موضوعات پر لکھنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔ زخمی صاحب نے اس صنف کی طرف توجہ دے کر فلم کے شائقین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کسی لکھنے والے کی یہ خوبی اسے پسندیدگی کی صف میں لا کھڑا کرتی

ہے۔

اس موضوع پر لکھنے کے لیے دو باتوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ پہلا واقعات کو جمع کرنا، دوسرا تحریر کی روانی۔ یہی دونوں باتیں تحریر میں دلکشی پیدا کرتی ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ دونوں باتیں زخمی کانپوری کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

آپ کو کتابیں ہر موضوع پر پڑھنے کو مل سکتی ہیں مگر فلم کے موضوع پر کتابیں لکھنا امرِ محال ہے بلکہ ناممکن ہے کیونکہ فلمی جرائد اور رسائل میں چھپنے والے اکثر مضامین اس پائے کے نہیں ہوتے کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کرایا جائے اس لیے وہ مضامین بہت جلد لوگوں کے ذہنوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ زخمی کانپوری کے مضامین کی یہ خوبی ہے کہ یہ معیاری اور خوب صورت تحریر کے ساتھ وسیع معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ کام انہوں نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ ساتھ شوق اور دلچسپی سے کیا ہے۔

زخمی کانپوری ایسے لکھنے والے تھے جن کے اخبار و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کو اکثر لوگ سنبھال کر رکھتے تھے تاکہ بوقت ضرورت بطور سند کام آسکیں۔

زخمی صاحب یہ بات خود بتاتے تھے کہ اکثر لوگ مجھ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ''زخمی صاحب! آپ کے بہت سے مضامین ہم نے بطور خاص جمع کر رکھے ہیں۔''

''کیوں؟ آخر کس بنا پر جمع کرتے ہیں آپ؟''

''اس لیے کہ یہ ہمارے لیے معلومات کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہم فلمیں دیکھتے ہیں مگر اپنے محبوب فنکاروں کے بارے میں ہمیں بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوتا۔ آپ ان کی پس پردہ باتیں ہمیں بتاتے ہیں اس لیے ہمارے لیے ایسی تحریریں اہم اور قیمتی ہوتی ہیں۔''

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس دن زخمی کانپوری کا کوئی مضمون کسی نغمہ نگار، گلوکار یا موسیقار پر شائع ہوتا تھا تو لوگ صدر کی کیسٹ کی دکانوں پر جا کر اپنی اپنی پسند کے گیت کیسٹ پر بھروانے جاتے تھے۔

ایک بار ایک دکاندار نے یہ بات مجھے بتائی۔ ''جس دن زخمی کانپوری صاحب کا کوئی مضمون گانے کے کسی شعبے سے متعلق کسی اخبار یا رسالے میں چھپتا ہے۔ اس دن ہماری دکان پر اسی گلوکار یا موسیقار یا نغمہ نگار کے گیت بھروانے والوں کا رش لگ جاتا ہے اور اس کے کیسٹ کی خریداری بھی زیادہ ہوتی ہے۔''

مقبول گیت کا نامقبول گیت نگار

بڑے ارمانوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم
پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم

یہ انڈین گیت آج بھی پرانے گیتوں کے شائقین بڑے شوق سے سنتے ہیں مگر اس سدا بہار گیت کے بارے میں نہیں جانتے کہ اس گیت کا لکھنے والا کون ہے۔ زخمی کانپوری بتاتے ہیں کہ فلم ''ملہار'' کے اس گیت کے شاعر کا نام کیف عرفانی تھا۔ ''ملہار'' گلوکار مکیش کی پہلی ذاتی فلم تھی۔ اس کے موسیقار روشن تھے۔ ''ملہار'' اگرچہ کاروباری لحاظ سے زم گئی مگر اس کے تمام گیت زبردست ہٹ ہوئے جو سب کے سب نغمہ نگار کیف عرفانی کے لکھے ہوئے تھے۔ ایسا عشق و محبت میں ڈوبا ہوا نغمہ جس نے تحریر کیا وہ ایک فقیر منش شاعر تھا۔ مجذوب کی طرح زندگی گزارتا تھا۔ اس کے کاندھے پر ہر وقت ایک کمبل پڑا رہتا تھا۔ دراز زلفیں اس کی پہچان تھیں۔ اس شاعر نے ''ملہار'' میں ایسے زبردست گیت تحریر کیے جنہوں نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے لکھے ہوئے گیتوں سے تو ایک زمانہ واقف ہے مگر لکھنے والے کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔

جگنو جس نے دلیپ کمار کو سورج بنا دیا

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ دلیپ کمار اپنی ابتدائی فلموں، جوار بھاٹا، پرتیما، ملن اور گھر کی عزت کی ناکامی کے بعد فلم انڈسٹری چھوڑنے کا ارادہ کر چکے تھے کہ انہیں فلم ''جگنو'' نے نہ صرف اس ارادے سے باز رکھا بلکہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کا عظیم اداکار بننے کا موقع دیا۔ زخمی کانپوری کا کہنا ہے کہ یہ فلم اپنی موسیقی اور گانوں کی وجہ سے ہٹ ہوئی اور مثال کے طور پر ایک گیت کا ٹکڑا پیش کرتے ہیں۔

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے
ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے اسی کا نام دنیا ہے

وہ کہتے ہیں کہ اس کے گیت نگار ایک غیر معروف شاعر اصغر سرحدی تھے جس کی شاعری کی دھن فیروز نظامی نے بنائی تھی۔ اسے محمد رفیع اور نور جہاں نے گایا تھا جو دلیپ کمار اور نور جہاں پر فلمایا گیا تھا۔ یہ 1947ء کا پُرآشوب زمانہ تھا۔ ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ فلم سپرہٹ ثابت ہوئی۔ اس گیت کی وجہ سے یہ فلم اور اس فلم کی وجہ سے گلوکار محمد رفیع اور اداکار دلیپ کمار کلک کر گئے۔ محمد رفیع نئے نئے انڈسٹری میں آئے تھے اور ان کی مقبولیت اس وقت تک زیادہ نہیں تھی۔

میں نے ازراہ مذاق کہا۔ ”پھر تو یار! تمہیں اور تمہاری برادری کے لوگوں کو چاہیے کہ زخمی کانپوری صاحب کو تمغہ حسن کارکردگی دو۔“

اس نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ ”تمغہ حسن کارکردگی تو انہیں ضرور ملنا چاہیے مگر ہماری طرف سے نہیں، حکومت کی طرف سے ملنا چاہیے۔“

”ہاں!“ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ اس دکاندار سے میں کیا کہتا کہ حکومت تمغے اور اعزازات تو دیتی ہے مگر انہی کو دیتی ہے جن کی پی آر بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ جن کی پہنچ دور تک ہوتی ہے۔ جن کے ماے چاچے کی رسائی مقتدر لوگوں تک ہوتی ہے۔ ایوانِ اعلیٰ تک ہوتی ہے۔ بے چارے زخمی کانپوری کے آگے پیچھے کون ہے جو ان کو کوئی سرکاری اعزاز دلوائے گا۔

ایک دن زخمی صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے یہی ذکر چھیڑ دیا۔ خاموشی سے سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے کہا۔

”نہیں انور بھائی! ایسا نہ کہیں۔ سرکاری اعزازات حاصل کرنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں ان کے حق دار ہوتے ہیں۔ جنہیں بغیر کسی سفارش کے تمغے اور ایوارڈز ملتے ہیں۔“

دیکھا آپ نے وہ کیسے سچے اور کھرے انسان تھے۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”رہی میری بات تو آپ جیسے لوگوں اور میرے پڑھنے والوں کی پسندیدگی ہی میرا تمغہ، میرا ایوارڈ اور اعزاز ہے۔ یہی میرے لیے بہت ہے۔ رب العزت کی طرف سے دی ہوئی یہ عزت ہی میرے لیے میری محنت کا صلہ ہے۔ میں کسی سے کوئی شکوہ شکایت کیوں کروں؟“

بندہ جب پڑھا لکھا اور باشعور ہوتا ہے تو اس کے گفتار و کردار میں بڑی شائستگی ہوتی ہے جو لوگ زخمی کانپوری سے ملتے ملاتے رہے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ کیسے اعلیٰ ظرف کے انسان تھے جہاں ان کے چاہنے والے متعدد لوگ تھے وہاں کچھ بندے ایسے بھی تھے جو ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا، ان پر تنقید کے تیر برساتے۔

”ارے یار! زخمی کی تحریریں بھی ان کی طرح زخمی ہوتی ہیں۔ مستند نہیں ہوتیں۔ فیکٹ اور فیگر کے معاملے میں اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔“

فلم ساز و ہدایت کار وی شانتارام کی عظمت

پنڈت جواہر لال نہرو ایک جہاندیدہ سیاستدان ہی نہیں تھے بلکہ انہیں بھارتی فلم انڈسٹری کے اندرونی اور بیرونی حالات کا بھی بخوبی علم تھا۔ یہ بات زخمی کانپوری نے اپنی ایک تحریر میں بتائی۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بار روس سے وہاں کا ایک فلمی وفد آیا اور پنڈت جی سے دلی میں ملا اور بتایا کہ ہم ایک مطالعاتی دورے پر آئے ہیں اور انڈین فلم انڈسٹری کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نہرو جی نے کہا۔ آپ بمبئی جا کر صرف وی شانتارام سے ملیں وہ آپ کو وہ ساری باتیں بتا دیں گے جو متعدد فلمی لوگوں سے معلوم ہو سکیں گی۔ یہ وفد بمبئی میں وی شانتارام سے ملا اور واقعی انہوں نے بمبئی کی ہی نہیں پوری انڈین فلم انڈسٹری کی تفصیلی معلومات سے آگاہ کیا اور اپنے اسٹوڈیو میں اپنی فلمیں بھی دکھائیں۔ یہ وفد جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اس سے کہیں زیادہ وی شانتارام نے وفد کو بتا دیا تھا۔ وفد نے روس جا کر اپنے کامیاب دورے کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ بھارت جیسے پنڈت جواہر لال نہرو جیسا وزیراعظم ملا ہے جو اپنے ملک کی سیاست پر ہی گہری نظر نہیں رکھتا بلکہ اپنی فلم انڈسٹری پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔

ایسی باتیں کرنے والے کچھ فلمی صحافی ہی ہوتے تھے۔ زخمی صاحب تک بھی ان کی باتیں پہنچتی تھیں مگر انہوں نے کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ نہ کبھی کسی سے شکایت کی۔ ان کا موقف یہی ہوتا تھا، جو ان کا کام ہے وہ کرتے رہیں، جو میرا کام ہے میں کرتا رہوں گا۔“

جب میرے مشورے پر انہوں نے اپنی کتابوں کی اشاعت پر توجہ مبذول کی تو اپنی شائع شدہ تحریروں کو ترتیب دینا شروع کیا اور کچھ فائلیں بنائیں۔ جو کچھ اس طرح کی تھیں۔

1۔ نغمہ نگار۔ اس میں 80 نغمہ نگاروں کے مضامین شامل تھے۔

2۔ گلوکار، گلوکارہ۔ اس فائل میں 40 مضامین تھے۔

3۔ موسیقار۔ موسیقاروں کی فائل میں 50 نامور موسیقاروں پر مضامین تھے۔

4۔ اداکارہ۔ اس فائل میں بھی 50 مشہور ہیروئنز کے مضامین شامل کیے۔

5۔ ہیرو، ہدایت کار۔ اس میں 55 ہیروز اور ہدایت کاروں کے مضامین رکھے۔

مجھ سے ملاقات ہوئی تو مجھے اطلاع دی۔ ”انور صاحب! میں نے اپنے مضامین کی ترتیب و تزئین کا کام شروع کر دیا ہے۔“ اور اوپر درج پانچ فائلوں کا ذکر کیا پھر بولے۔ ”مگر یہ فائنل ورک نہیں ہے۔ میں نے انہیں پڑھ کر ان میں سے منتخب مضامین سلیکٹ کیے ہیں۔“

”تو گویا......“ میں نے کہا۔ ”یہ منتخب مضامین مکمل کتاب کے روپ میں آگئے ہیں۔“

”جی ہاں بس کچھ ضروری تحریروں کے بعد۔ جیسے دیباچہ وغیرہ کے بعد۔ وہ پرنٹنگ کے لیے مکمل مسودہ ہوگا۔“

”گڈ! یہ تو بہت اچھا کام کیا آپ نے۔“

”آپ کا مشورہ بہت صائب تھا۔ میں نے سوچا یہ کام آسان نہیں، قدرے دشوار ہے۔ آہستہ آہستہ ہی مکمل کیا جا سکتا ہے۔ سو کرتے کرتے مکمل صورت میں پہنچا ہوں۔“

”تو گویا! پانچ کتابوں کے مسودے تیار ہو گئے؟ کچھ نام وام بھی رکھا ہے ان کا؟“

پانچ نہیں۔ فی الحال تین کتابوں کے مسودے تیار ہوئے ہیں اور ہر مسودے میں مختلف النوع موضوعات کے مضامین رکھے ہیں کیونکہ اگر ایک ہی طرح کے سارے مضامین ہوتے تو میرا خیال ہے کہ پڑھنے والے اکتا جاتے اس لیے میں نے ورائٹی کا خیال رکھ کر یہ مسودے ترتیب دیے ہیں۔

”تو ان کے کچھ نام بھی رکھے ہوں گے؟“

”جی ہاں رکھے ہیں۔ جو کچھ یوں ہیں۔“

1۔ مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا
2۔ داستاں کہتے کہتے
3۔ ذکر جب چھڑ گیا

”کیوں، کیسے ہیں یہ نام؟“ انہوں نے سوال کر دیا۔

”بہت اچھے ہیں مگر......“

میرا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی بے تابی سے بولے۔ ”مگر کیا؟“

”مگر یہ فلمی مضامین کے مجموعوں کی بجائے افسانوں یا شاعری کے مجموعوں کے نام لگتے ہیں۔“

گلوکار خان مستانہ کا انجام

ذرا دیکھیے زخمی کانپوری کی جستجو اور کھوج کا انداز۔ انہوں نے ایک گلوکار خان مستانہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ جنہوں نے کئی مشہور فلمی گیت گا کر شہرت حاصل کی مگر ہمیشہ تنگ دست رہے۔ ان کا بڑھاپا عسرت میں گزرا۔ نفسیاتی مریض بن گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ بال بڑھے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے، سڑک پر کاغذ کے ٹکڑے چنتے پھرتے تھے۔ اسی کیفیت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ خان مستانہ کی آواز بہت اچھی تھی۔ ان کا سب سے مشہور گیت فلم ”زندگی یا طوفان“ میں گایا ہوا تھا جس کی دھن موسیقار ناشاد نے بنائی تھی جو نخشب کا لکھا ہوا تھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

لوگ یہ گیت محمد رفیع کا سمجھتے ہیں اور سارا کریڈٹ محمد رفیع کے کھاتے میں جاتا ہے۔ فلم ”شیریں فرہاد“ کی یہ قوالی انہوں نے محمد رفیع اور ساتھیوں کے ساتھ گائی تھی۔

آنکھوں میں تمہارے جلوے ہیں ہونٹوں پر تمہارے افسانے
بے تابیٔ دل سے تنگ آ کر پہنچے ہیں یہاں تک دیوانے

اس قوالی کے دو بند خان مستانہ کی آواز میں ہیں۔

فلم ساز ہدایت کار اور اداکار نذیر کی مشہور فلم ”لیلیٰ مجنوں“ (1944ء) جس میں لیلیٰ کا کردار سورن لتا نے ادا کیا تھا اور اس فلم کے بعد دونوں نے شادی کر لی تھی۔ اس فلم کے لیے بھی خان مستانہ نے گیت گائے تھے جو بہت مقبول ہوئے تھے۔

اتنے اچھے گلوکار ہونے کے باوجود خوش حالی کی زندگی بسر نہ کر سکے اور جلد ہی فلم انڈسٹری سے فیڈ آؤٹ ہو گئے اور بڑی المناک موت مرے۔

میری بات پر مسکرانے لگے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میرے تبصرے پر برا نہیں منایا انہوں نے ان کی دھیمی دھیمی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔

”بات دراصل یہ ہے انور بھائی!“ اسی مسکراہٹ کے دوران انہوں نے کہا۔

”میں خود بھی چھوٹا موٹا شاعر ہوں اس لیے......“

قطع کلامی کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ’’نہیں آپ اچھے خاصے پختہ کار اور مستند شاعر ہیں۔‘‘

’’یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ شاعر ہونے کے ناتے اپنی کتابوں کے نام بھی شاعرانہ انداز کے رکھے۔ اس طرح جدت کا احساس بھی ہوتا ہے اور ایسے ناموں کو دیکھ کر پڑھنے والوں کے ہاتھ کتابوں تک متجسس انداز میں بڑھیں گے۔‘‘

زخمی صاحب کی اپنی تحریروں کے عنوانات بھی کچھ اسی طرح کے ہوتے تھے۔ جیسے ایک کتاب میں دیباچہ کے طور پر انہوں نے اپنے بارے میں لکھا جس کا عنوان تھا۔

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا۔

زخمی صاحب نے اپنی کتابوں کی ترتیب و تزئین کا کام بڑے سلیقے اور خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ جس کا صحیح اندازہ ان کی اشاعت کے بعد ہوا۔ تقریباً ان کی ہر کتاب میں مضامین اس انداز میں شامل کیے گئے ہیں کہ کسی پلیٹ کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب ذکر جب چھڑ گیا، کے حوالے سے آپ کو بتاؤں۔ اس میں ہدایت کاروں میں اے جے کاردار، شیخ حسن، شوکت ہاشمی اور ضیاء سرحدی کو اداکاروں میں دلیپ کمار، وحید مراد اور ندیم کو۔ اداکاراؤں میں نور جہاں، مینا کماری کو، موسیقاروں میں نوشاد کو نغمہ نگاروں میں قتیل شفائی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، راجا مہدی علی خان اور رئیس امروہوی کو اور گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں طلعت محمود اور ملکہ ترنم کو شامل کیا ہے جب کہ دیگر مضامین کچھ اس طرح کے ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترقی میں فلموں کا کردار۔ (2) ماضی کے یادگار گیتوں کا درد۔ (3) نغمہ بار فلمیں۔ (4) ڈھاکے کی فلم انڈسٹری کا مختصر جائزہ۔ (5) پہلا دوگانا۔ رخصتی، لوری اور سالگرہ۔ (6) فلموں کے حوالے سے نادر معلومات۔ (7) نخشب اور الیاس رشیدی میں مصالحت۔ (8) جمیل الدین عالی کی قومی گیت نگاری۔

مزے کی بات یہ کہ انہوں نے شخصیتوں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا عام پروفائل نہیں ہے۔ کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ جیسے طلعت محمود کی آواز کی لرزش۔ ساحر لدھیانوی کی رومانی شخصیت اور ان کی فلمی شاعری، وحید مراد کے چند واقعات، اداکار ندیم کے گائے ہوئے چند مقبول گیت، قتیل شفائی اور ان کی فلمی شاعری، رئیس امروہوی اور فلم۔

امر گیت

شاعری اگر اچھی ہو اور اسے گانے والا بھی اچھا ہو تو وہ شاعری اور نکھر جاتی ہے اور اگر اس کی دھن بنانے والا بھی اچھا ہو تو گیت امر بن جاتا ہے جیسے

نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے
مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے

مدتوں پہلے تخلیق ہونے والا یہ گیت آج بھی اسی طرح مقبول ہے جس طرح اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اسے سن کر جھومنے والے لوگ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ کس فلم کا نغمہ ہے کس نے اسے گایا اور اس کی موسیقی کس نے کمپوز کی؟ زخمی کانپوری کا احسان ہے کہ وہ آج کے فلم بینوں اور اس گیت کو پسند کرنے والوں کو بتاتے ہیں۔ یہ ناقابلِ فراموش گیت ہیمنت کمار اور گیتا دت نے الگ الگ گایا تھا جب کہ اس کی دھن ہیمنت کمار نے ہی ترتیب دی تھی اور اس گیت کو لکھنے والے شاعر کا نام ایس ایچ بہاری تھا۔ یہ خوب صورت گیت فلم ’’شرط‘‘ کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہ فلم فلاپ ہوگئی تھی مگر اس کا یہ گیت لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی تازہ ہے۔ نغمہ نگار ایس ایچ بہاری کا نام فلمی تاریخ میں اگر رہ جائے گا تو صرف اسی گیت کی بدولت رہے گا۔

اس طرح شخصیتوں پر ان کی تحریروں کی الگ صورت سامنے آتی ہے۔ زخمی کانپوری کی وژن اور سوچنے کا انداز جداگانہ تھا اس لیے وہ کسی اہم پہلو یا گوشے کو ڈھونڈ کر سامنے لاتے تھے اور اس کی بنیاد پر اپنی تحریر کی عمارت کھڑی کرتے تھے۔

متذکرہ کتاب میں کچھ اور تحریریں بھی موجود ہیں۔ جیسے کچھ یادیں کچھ باتیں، کیا آپ کو معلوم ہے؟ پاکستانی پنجابی فلموں کے مقبول گیت، نام بڑے اور درشن چھوٹے۔ ایک نغمہ ایک نغمہ نگار۔ اردو فلموں کی ترقی کے لیے کراچی کو مرکز بنانا ہوگا۔ فلمی تحریروں کو بھی ادب کا حصہ قرار دیا جائے وغیرہ۔

یہ بات قارئین کو بتانے کی ہے کہ زخمی کانپوری کبھی بھی کسی اخبار یا جریدے سے وابستہ نہیں رہے۔ رپورٹر یا سب ایڈیٹر کے طور پر ملازمت نہیں کی۔ فری لانسر کی حیثیت سے فلم جرنلزم سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ صحافیوں کی کسی تنظیم کی ممبر شپ بھی حاصل نہیں کی۔ نہ ہی صحافت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ وہ اپنے طور پر جو مناسب سمجھتے تھے اس پر

لکھتے تھے۔ انہوں نے جہاں ماضی کی فلمی صنعتوں (برصغیر ہندو پاک اور تقسیم سے پہلے کی) اور فلم والوں کے بارے میں بے شمار مضامین لکھے وہاں موجودہ حالات و واقعات پر بھی لکھا۔ فلم اور فلم والوں کے حوالے سے جو واقعات رونما ہوتے تھے، ان پر بھی لکھتے تھے۔

نخشب جارچوی الیاس رشیدی سے سخت ناراض تھے کیونکہ انہوں نے نگار میں یہ لکھ دیا تھا کہ نخشب کی بھارتی فلمیں پاکستان میں نہ دکھائی جائیں۔ حکومت ان کی اجازت نہ دے مگر ان دونوں کی رنجشوں کو ایک بار معروف تقسیم کار جے سی آنند نے رفع دفع کروادیا۔ یہ دلچسپ واقعہ زخمی صاحب نے بڑے پیارے انداز میں تحریر کیا ہے۔ وہ ایسے ہی واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے اور اپنے پڑھنے والوں کو اپنی تحریروں کی زبان میں سناتے تھے۔

اسی طرح ایک افسوسناک واقعہ کا ذکر بھی زخمی کانپوری نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہدایت کار محبوب خان اور ہدایت کار اے آر کاردار بمبئی سے کراچی آئے تھے۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ کراچی میں اپنے نگار خانے قائم کریں اس کے لیے وہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ ایوب کھوڑو سے ملے۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے ان کی بات سن کر کہا۔ ’’ہمارا کیا شیئر ہوگا؟‘‘

یہ جملہ سن کر دونوں بہت مایوس ہوگئے اور واپس بمبئی چلے گئے اور کراچی کی فلمی صنعت کو جو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچنے والا تھا وہ اس سے محروم رہ گئی۔

فلم دیکھنے والے تماشائی، سلور اسکرین پر نظر آنے والے فنکاروں اور ان فلموں کے ہنر مندوں کے پس پردہ ہونے والے واقعات و حالات جاننے کے شائق ہوتے ہیں۔ کانپوری صاحب کو یہ گر کی بات معلوم تھی اور وہ ایسی باتوں کی جستجو میں سرگرداں رہتے تھے جو عام فلمی صحافی سوچتے بھی نہیں۔ ایسے بے شمار واقعات و حالات کا ذکر زخمی صاحب کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایسی تحریروں سے ہی وہ اپنے قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کرسکے۔

ہمارے ہاں جس نے بھی فلم یا فلم والوں پر دو چار الٹی سیدھی تحریریں لکھ لیں۔ فلمی صحافی بن جاتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ فلمی صحافت کی بھی مٹی پلید کرتا ہے بقول شاعر

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

ایسے ہی چھٹ بھیوں کی وجہ سے فلمی صحافت کی قدر و

روح کی تسکین کے لیے

محمد رفیع بڑی خاموشی کے ساتھ لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ زخمی کانپوری بتاتے ہیں کہ ایک دن انہوں نے نوشاد صاحب سے کہا۔ چھوٹی موٹی نیکی کرنے سے میری روح کو تسکین نہیں ملتی۔ میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مشورہ دیں میں کیا کروں؟ نوشاد صاحب بولے۔ تم ایسا کرو کہ گردے صاف کرنے کی ایک مشین (ڈائیلاسسز کی مشین) خرید کر کسی اسپتال کے لیے وقف کردو۔ پرائیویٹ طور پر یہ علاج بڑا مہنگا ہوتا ہے اس لیے غریبوں کے لیے ناممکن ہے۔ محمد رفیع نے نوشاد صاحب کے اس مشورے پر عمل کیا جس سے غریبوں کو یہ علاج مفت حاصل ہو گیا۔ زخمی صاحب بتاتے ہیں کہ محمد رفیع زندگی بھر غریبوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔ گلوکاری کے علاوہ محمد رفیع کا جنوبی بھارت میں فلم ڈسٹری بیوشن آفس بھی تھا جس کی دیکھ بھال ان کا سالا کرتا تھا۔

خوش قسمتی۔ بدقسمتی

فلمی دنیا میں کیسے کیسے واقعات رونما ہوتے ہیں، ان پر عام صحافی توجہ نہیں دیتے مگر زخمی کانپوری نے انہیں بھی اپنی تحریر کا موضوع بنا کر اپنے پڑھنے والوں کو حیران کردیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا۔ ایک فلم بنی تھی ’’منڈا بگڑا جائے‘‘ جس نے اس دور میں 5 کروڑ کما کر اگلا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ اس فلم کی ہدایت کارہ میڈم شمیم آراء تھیں جب کہ اس کے فلم ساز حاجی شیرا تھے۔ یہ وہ دور تھا جب مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بری طرح ناکام ہورہی تھیں۔ شمیم آراء نے ایسے وقت میں ایک ہلہ گلا سے بھرپور رومانی فلم بنا کر باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ اس فلم کی آمدنی سے جو بہت معمولی بجٹ سے بنائی گئی تھی اس کے فلم ساز نے جی ٹی روڈ لاہور میں گھی کی ایک فیکٹری لگا لی مگر شمیم آراء جس کی ہدایت کارانہ کاوشوں سے یہ فلم سپر ڈوپر ہٹ ہوئی اسے کیا ملا؟ اسے فلم ساز سے معاہدے کے تحت صرف پچاس ہزار روپے ملے۔ عام فلم بین فلمی دنیا کی ایسی اندرونی حقیقت سے کم ہی واقف ہوتے ہیں جنہیں پبلک کرنا زخمی کانپوری ہی کا کارنامہ تھا۔

قیمت متاثر ہوئی ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ صورتِ حال نہیں۔ ہمارے ہاں جب بھی پڑھے لکھے اور باشعور لکھاریوں نے فلم اور فلم والوں پر لکھا ہے ان کی تحریروں سے عام فلم بینوں کے علاوہ سلجھے ہوئے اور شائستہ لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ صفدر برلاس، اے آر سلوٹ، اے کے شاد، علی سفیان آفاقی، اسد جعفری، ولی رضوی، یاسین گوریجہ، دکھی پریم نگری، فدا احمد کار، کلیم عثمانی، بشیر نیاز، اقبال احمد خان، سلیم باسط، شہنشاہ حسین، اے آر ممتاز، عقیل پردار، جمیل قریشی، رضوان حیدر برنی ایسے تعلیم یافتہ اور باشعور فلم جرنلسٹ تھے جن کی تحریریں مستند ہوتی تھیں اور پڑھے لکھے لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ طاہر میر، صلاح الدین ناسک، طفیل اختر، مشتاق سجانی، شاہد سردار، عمر خطاب، یونس ہمدم، ایم ابراہیم، شیخ لیاقت علی، عبدالجبار ساگر، نسرین شاہین، یونس رئیسانی، رفیق مائیکل، سرفراز فرید نیہاش، مرزا افتخار بیگ، پرویز مظہر، اسلم قریشی، نادر شاہ عادل، سید سلیم احمد سلمی، سلیم احمد صدیقی، خلیل رشید، یعقوب رشید، ایم شکیل خان، ناصر رضا، سرور ندیم، رحمٰن یوسف زئی، خالد احمد سید، ایس ایم شاکر، عابد بشیر، نسرین اختر، نرگس ارشد رضا، شفیع موسیٰ منصوری، خرم سہیل، اقبال راہی، ایم شمیم سید پوری، نصیر احمد، ش م رخ، ریاض احمد قریشی، مک یوسف جمال، قیصر افتخار، خرم جنید، ماجد یزدانی اور ایسے ہی کئی اور معتبر لکھاری کارزارِ صحافت میں فلم اور فلم والوں کے بارے میں تحریری خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس موقع پر ان صحافیوں کا ذکرِ خیر بھی ضروری ہے جنہوں نے اخبار و جرائد کا اجراء کر کے فلم انڈسٹری کی خدمت کی۔ ان میں الیاس رشیدی مرحوم، منیر حسین مرحوم، سعید امرت مرحوم، ایس اے چاؤلہ مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں جب کہ ماہنامہ اشارڈ سٹ کے نعیم حبیب اور ہفت روزہ رنگ و روپ کے ملک یعقوب نور کے علاوہ مرحوم الیاس رشیدی کے فرزند ارجمند اسلم الیاس رشیدی بھی قابلِ ستائش ہیں جو ویکلی نگار کو اب تک زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

فلم بینی کبھی سب سے سستی تفریح ہوا کرتی تھی جو اس گرانی کے دور میں سستی نہیں رہی مگر فلمی کاروبار اب بھی زندہ ہے۔ لوگ اب بھی سینما گھر جا کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ جہاں کئی لوگوں کو حاصل ہے وہاں میڈیا کا بھی بہت بڑا سپورٹ اور تعاون حاصل ہے۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرونک میڈیا نے بھی فلموں کی ترویج و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ روزنامے نہ صرف ہفتہ میں ایک بار فلم ایڈیشن شائع کرتے ہیں بلکہ کئی بڑے اخبارات روزانہ شوبز کی خبریں بھی شائع کرتے ہیں۔

یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوا، یہاں تک پہنچنے میں زخمی کانپوری جیسے فلمی صحافی کی کوششوں کا طویل سلسلہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف شوبز کی دلچسپ، معلوماتی اور معیاری تحریریں لکھ کر شوبز اور اس سے وابستہ لوگوں کے متعلق عوام الناس کو فن اور فنکاروں کی طرف متوجہ کیا بلکہ اس انڈسٹری کی ترقی اور فروغ میں بھی اپنا مثبت کردار ادا کیا۔

صحافیوں کا کردار ہر جگہ اور ہر دور میں بڑا تعمیری رہا ہے۔ اب جب کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے پرنٹ میڈیا پر کم توجہ دی جانے لگی ہے۔ اب بھی صحافی اپنا کام کر رہے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا نے بھی ان کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔

زخمی کانپوری چونکہ کل وقتی صحافی نہیں تھے، اس لیے انہوں نے ٹی وی چینلز کے لیے کوئی کام نہیں کیا مگر چینلز اور ان کے فنکاروں اور دیگر معاملات پر لکھے ضرور ہیں۔ زخمی کانپوری کی کتابوں کی تعداد سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت لکھا، بے تحاشا لکھا۔ ثقافت اور کلچر کے پس منظر میں فکر انگیز اور تعمیری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر لکھا۔ ایسی باتیں لکھیں جو عام جرنلسٹ نہیں لکھتے۔ وہ بس سامنے کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں اور رپورٹنگ کے انداز میں حالاتِ حاضرہ پر قلم فرسائی کرتے ہیں۔ یہ زخمی کانپوری ہی کا طرۂ امتیاز تھا کہ انہوں نے شوبز اور اس سے وابستہ لوگوں کے حالات و واقعات کے بارے میں وہ باتیں بتائیں جو عام شائقین فلم کو معلوم نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ محبوب خان نے اپنی شہرۂ آفاق فلم ''آن'' میں نرگس کو کیوں کاسٹ نہیں کیا۔ اس کی جگہ ایک نئی اداکارہ نادرہ کو دلیپ کمار کے مقابلے میں کیوں پیش کیا۔ جب کہ نرگس ان کی پسندیدہ اداکارہ تھیں اور ان کو لے کر محبوب اعظم نے ''مدر انڈیا'' جیسی فلم بنائی تھی۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں ہیں جن کے بتانے والے اور لکھنے والے زخمی کانپوری تھے۔ یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ زخمی کانپوری کی انمول تحریریں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور کتابوں کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئیں۔ جب تک یہ کتابیں باقی رہیں گی زخمی کانپوری کا نام اور کام زندہ و تابندہ رہے گا۔

عینک

ابوالفرح ہمایوں

اسے شوق تھا کہ وہ نوادرات جمع کرے۔ اسی شوق نے اس تک ایک ایسی عینک پہنچا دی جو اس کے لیے وبالِ جان بن گئی۔



یورپ سے درآمد ایک عجیب واقعہ

چارلس رویل سے میری پہلی ملاقات بیریز میں ہوئی۔ بیریز فرانس کے جنوب مغرب کا ایک بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر کی خوبصورتی بیان کرنے کی بجائے میں یہ بتادوں کہ میرے اوّلین شوق میں سے ایک شوق آوارہ گردی بھی ہے۔ جب بھی مجھے موقع ملتا ہے میں کار لے کر نکل پڑتا ہوں۔ یورپ کا بہت کم علاقہ بچا ہے جہاں میں جا نہیں سکا۔ اپنے اسی شوق کی تکمیل میں نکلا تھا کہ بیریز راستے میں آگیا۔ پہلی ہی نظر میں یہ شہر مجھے بھا گیا تھا۔ میں نے ایک دو دن اس

شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا تا کہ خوب اچھی طرح سے اس شہر کی خوبصورتی کو اپنے اندر اتار لوں، اچھی طرح سے یہاں کی گلیاں محلے دیکھ لوں۔ اسی خیال سے بازار کی جانب رخ کرلیا۔ اس بازار میں پرانا فرنیچر فروخت کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی کار ایک جگہ پارک کی اور مختلف شوروموں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ میرے قدم رک گئے۔ سامنے والی دکان میں ایک آئل پینٹنگ لگی ہوئی تھی جو مجھے پسند آگئی تھی۔ دکان میں داخل ہوکر بھاؤ تاؤ کیے بغیر پینٹنگ خرید لی اور دکاندار کو اسے عمدہ طریقے سے پیک کرنے کا حکم دیا اور وقت گزاری کے لیے میں یونہی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

ایک جگہ دیوار سے لگی ایک ڈریسنگ ٹیبل رکھی تھی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے رک گیا۔ میرے قریب ہی ایک صاحب کھڑے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی قدیم آبنوسی میز کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ بالآخر ان کی تفتیش ختم ہوئی۔ انہوں نے میز کو اپنی جگہ پر واپس رکھا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے اپنے آپ سے بولے۔ ''میز تو خوبصورت ہے لیکن میرے پاس اس سے بھی زیادہ خوبصورت اور پائیدار میز پہلے ہی سے موجود ہے۔ بہرحال اگر مناسب قیمت پر مل جائے تو اسے بھی رکھ لوں گا۔'' یہ جملہ انہوں نے رواں انگریزی میں ادا کیا تھا اور اسی بات نے مجھے اس شخص میں دلچسپی لینے پر مجبور کردیا۔

''گویا آپ بھی نوادرات کے قدر دان ہیں؟'' مسکراتے ہوئے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے بھی تاریخی اشیاء سے دلچسپی ہے۔ خصوصاً اطالوی پینٹنگز سے۔'' ساتھ ہی ساتھ میں اجنبی کے چہرے کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔ دراصل اس کے چہرے میں ایک ایسی انجان سی دلکشی اور جاذبیت تھی جس نے مجھے اس کی طرف مائل کردیا تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا لیکن اس کی شخصیت اس بات کی غماز تھی کہ وہ انتہائی ذہین ہے۔ میں نے یہ بھی اندازہ لگالیا کہ وہ برطانوی نہیں بلکہ فرنچ ہے لیکن انگریزی زبان کا دلدادہ ہے۔

باتیں شروع ہوئیں تو میرے اندازے صحیح ثابت ہوئے۔ اس کی باتیں دلچسپ تھیں۔ اس کی خوش گفتاری نے مجھے اور بھی زیادہ متاثر کیا اور پھر اچانک ہی اس نے مجھے اپنے گھر چلنے اور دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ اس نے مجھے اس قدر دلفریب انداز سے دعوت دی تھی کہ میں انکار نہ کرسکا۔ جیسا کہ میں بتاچکا ہوں کہ میں نوادرات کا دیوانہ ہوں اور اس کی تلاش کے سلسلے میں ہر جگہ جانے کو تیار رہتا ہوں لہٰذا میں نے فوراً ہامی بھرلی۔ ہم دونوں اپنی اپنی کار میں بیٹھے۔ وہ رہنمائی کرتے ہوئے آگے آگے چلتا رہا اور میں اس کے پیچھے۔ روانگی سے قبل اس نے بتادیا تھا کہ وہ پیرس شہر سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ایک گاؤں آستارز میں قیام پذیر ہے۔

اس کا گھر بہت بڑے رقبے پر محیط تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے شاندار باغ میں دلکش اور طرح طرح کے خوشنما پھول لہلہارہے تھے۔ بلند و بالا سرو، شیشم اور دیودار کے درختوں نے اس کی شان میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بادشاہ کا وسیع و عریض محل ہو۔ مجھے اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے اس نے آواز لگائی۔ ''ہنری! باہر آؤ۔'' پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہنری میرا پرانا ملازم ہے اور میرے مکان کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری ہے۔''

چند ہی لمحے بعد ایک منحنی سا عینک شخص نمودار ہوا۔ میرے میزبان چارلس روئیل نے میرا اس سے تعارف کرایا اور کھانے کا بندوبست کرنے کا حکم دیا۔ ہم دونوں نے ڈرائنگ روم میں اک ذرا آرام کیا اور پھر نوادرات دیکھنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چارلس روئیل کا انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ اسے اکثر و بیشتر اشیاء کی تاریخ بھی ازبر تھی۔ وہ ہر چیز کے بارے میں اس قدر بے ساختگی کے ساتھ مجھے بتاتا جارہا تھا کہ میں اس کی خوش گفتاری کے سحر میں مسحور ہوکر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ جس قدر دولت مند تھا، اتنا ہی شیریں زبان بھی تھا۔ اس کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

خدا خدا کرکے یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہاں تمہارا وقت کیسے گزرتا ہے؟ میرا مطلب ہے استارز تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہاں نہ زندگی کے ہنگامے ہیں اور نہ دلچسپی کا کوئی سامان۔''

اس نے جواب دینے سے گریز کیا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوکر ہم ایک دوسرے کے مقابل صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے سوچا شاید وہ ناراض ہوگیا ہے۔ ابھی میں معذرت کے لیے موزوں الفاظ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ اچانک وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے کہ یہاں وقت گزارنا مشکل ہے لیکن میں نے اپنی مشکل کا حل تلاش کرلیا ہے۔ یہ بہت پُرسکون جگہ ہے۔ صبح شام تھوڑی سی چہل قدمی کرلیتا ہوں اور یہاں کے دلفریب قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد موسیقی کے سحر میں گم ہوجاتا ہوں۔'' اس نے ایک دیوزاد ریڈیو گرام کی

جانب اشارہ کیا اور پھر اچانک ہی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اِدھر آؤ، میں تمہیں ایک اور چیز دکھاؤں۔''

ڈرائنگ روم کے اندر ہی موجود ایک بھاری بھرکم دروازے کو اس نے کھولا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک انتہائی وسیع و عریض اور خوبصورت لائبریری تھی۔ یہاں نفیس و دیدہ زیب الماریوں میں بھی صاف ستھری کتابیں اعلیٰ ذوق کی گواہی دے رہی تھیں۔ میں نے پُرستائش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرادیا۔

''میں اپنا بیشتر وقت مطالعے میں گزارتا ہوں۔'' اس نے اپنی جادو بھری مسکراہٹ سے ایک بار اور مجھے دیکھا اور پھر بولا۔ ''آؤ اب کھانے کے کمرے کی جانب چلتے ہیں۔ ہنری نے اب تک کھانا چن دیا ہوگا۔'' میں چپ چاپ اس کے ہمراہ چل پڑا۔

کھانا بے حد پُرلطف اور مزیدار تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے چارلس روئیل کی شخصیت نے اس حد تک متاثر کردیا تھا کہ اس کی ہر چیز مجھے دنیا سے انوکھی اور نرالی لگ رہی تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں پہلی ہی ملاقات میں اس کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے تعلقات بڑھانے اور دوستی کا رشتہ مضبوط بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ انگلینڈ سے بھی میں اسے باقاعدہ خط لکھتا رہا اور وہ بھی جواب سے نوازتا رہا۔ میں اکثر و بیشتر پیرس کی طرف جانے کا موقع نکالتا رہتا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر مسرت کا اظہار کرتا۔ مجھے اپنے گاؤں لے جاتا اور اچھی طرح آؤ بھگت کرتا۔

ہماری دوستی خوشگوار انداز میں رواں دواں تھی لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فلک کج رفتار کو شاید ہماری دوستی ناگوار گزری اور اس نے ایک ایسی بیہودہ چال چلی کہ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہوکر رہ گئی۔

استارز کا گاؤں میرے لیے خوشیوں کا ایک خزانہ تھا۔ میں وہاں خالی ہاتھ جاتا اور خوشیوں سے بھرا خزانہ دل میں لیے واپس آتا۔ وہاں گزارے ہوئے لمحات میری زندگی کا حاصل تھے۔ آج بھی جب میں وہاں کی رنگینیاں اور حسین و دلفریب مناظر کا تصور کرتا ہوں تو میرے دل سے ایک آہ سی اٹھتی ہے اور میرے قلب و جگر کو جلا کر خاک کردیتی ہے۔ یہ سب ہوا کیسے، آپ بھی سن لیں۔

ڈھیر سارے دن گزر چکے تھے، میں کہیں گیا نہیں تھا۔ اب کس شہر کا رخ کروں؟ یہی سوچ رہا تھا کہ استارز کا نام ذہن میں آیا اور میں نے وہیں چلنے کا پلان بنالیا۔ مقررہ وقت پر وہ میرے استقبال کے لیے باہر ہی موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بے حد لاغر اور کمزور سا ہوگیا ہے۔ اس کا چہرہ بالکل بے رونق تھا اور وہ بیمار و مضمحل نظر آرہا تھا۔ ایک بات میں نے اور بھی محسوس کی کہ وہ صرف بیمار ہی نہیں ہے بلکہ اس کے دل و دماغ پر کوئی خوف سا چھایا ہوا ہے۔ سہمی سہمی نگاہوں سے وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھتا جیسے وہ اپنے کسی نادیدہ دشمن سے خوفزدہ ہو۔ وہ بار بار چونک اٹھتا اور اپنے بدن کو سمیٹ کر یوں ایک طرف دبک جاتا گویا اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کررہا ہو۔

حسبِ معمول چارلس کے وفادار ملازم ہنری نے کھانے کا انتظام کیا لیکن آج ہنری بھی کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ میں نے اس بات پر کافی غور کیا کہ ادھیڑ عمر ہنری کے چہرے میں جو تبدیلی مجھے نظر آرہی ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اور پھر میں ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ وجہ جان لینے میں کامیاب ہوگیا۔

آج اس کا چہرہ عینک سے بے نیاز تھا۔ مجھے بے حد تعجب ہوا۔ ہنری کی نظر کمزور تھی اور اس کے باوجود وہ عینک کے بغیر اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی عینک کیوں غائب تھی؟ یہ میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے کھانا بھی بے لطف سا لگا۔ شاید اس لیے کہ میرا عزیز دوست جو بیمار تھا۔

خلافِ معمول چارلس کچھ بجھا بجھا اور خاموش سا تھا۔ اس نے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ہم لوگ جلد ہی کھانے کی میز پر سے اٹھ گئے اور سٹنگ روم میں جاکر اجنبیوں کی طرح بیٹھ گئے۔ میں عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ میرے بے شمار سوالات کے جواب میں چارلس ہوں ہاں کرتا رہا بلکہ بعض دفعہ تو وہ میری بات کو یوں ٹال جاتا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ بیزار ہوکر میں بھی خاموش ہوگیا۔ چارلس نے فوراً ہی میری عدم دلچسپی کو محسوس کرلیا اور بڑے ہی معذرت خواہانہ انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری اچھی طرح خاطر مدارات میں نہیں کرسکا، مجھے معاف کردینا میرے دوست۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری آمد میرے لیے باعث زحمت بن گئی ہے۔ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے جو خوشی ہورہی ہے اس کا اظہار الفاظ میں کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری خوشیاں مجھ سے چھن گئی ہیں۔ میں آج کل ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر چونکتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا۔

"کیا تم اپنے عزیز دوست کو اپنی پریشانی اور مصیبت کا حال نہیں بتاؤ گے؟" میں نے دکھی دل سے پوچھا۔ "مجھے بتاؤ! تمہارا دشمن کون ہے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"تمہارا شکوہ بجا ہے۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا لیکن تمہارا یہ اندازہ غلط ہے کہ میں کسی مشکل میں گرفتار ہوں۔" اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بات بالکل معمولی سی ہے، بس ایک عینک اس مصیبت کی جڑ ہے۔"

"کیا کہا؟ صرف ایک عینک کا معاملہ ہے؟" میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ کہیں ہنری کی عینک کا کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

"نہیں بھئی، بالکل نہیں۔ ہنری کی عینک کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ چند لمحے کو رکا اور پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔ "دراصل یہ سارا فساد گارات کی عینک نے پھیلایا ہے......"

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے جا رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ گارات کون ہے؟ کیا وہ دوسری عینک نہیں خرید سکتا؟"

میری کیفیت دیکھ کر چارلس بے اختیار ہنس پڑا۔ "اتنے جذباتی نہ بنو اور توجہ سے میری بات سنو۔ میں اصل قصہ شروع سے سناتا ہوں۔" اس کی ہنسی یک لخت رک گئی اور وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔

اس کے اس عجیب و غریب انداز نے ظاہر کر دیا کہ معاملہ ایسا سیدھا سادا نہیں ہے جیسا کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ یقیناً کوئی بہت ہی پیچیدہ اور پُراسرار واقعہ ہے۔ میں نے اپنے دل کو ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے کو تیار کر لیا۔ "ہاں، اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم یقیناً فرانس کی تاریخ سے لاعلم ہو۔" چارلس نے بڑے بے ڈھب انداز میں بات وہاں سے چھیڑی جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ "میں ڈومینک جوزف گارات کے حالاتِ زندگی تمہیں سناتا ہوں۔ گارات 1749ء میں میرے گاؤں استارز میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی سے بے حد ذہین اور ہوشیار تھا۔ ابتدائی تعلیم اس نے استارز میں ہی حاصل کی اور پھر پیرس چلا گیا۔ جلد ہی اس نے وہاں کی سیاست میں اپنا ایک اعلیٰ مقام پیدا کر لیا۔ 1789ء میں فرانس میں انقلاب آیا۔ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور پیرس کی گلیاں خون سے سرخ ہو گئیں۔ جانتے ہو باغیوں کا سرغنہ کون تھا؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا اور میرے جواب دینے سے قبل ہی بول اٹھا۔ "وہ گارات تھا اور پھر بعد میں شاہ لوئیس شش دہم کی موت کا ذمہ دار بھی وہی بنا۔"

"یہ کیسے؟ یعنی شاہ لوئیس شش دہم کو قتل کرنے میں گارات نے کیا کردار انجام دیا؟" خود کو سوال کرنے سے میں روک نہ سکا۔ "گارات نے تلوار کے ایک ہی وار سے بے بس بادشاہ کا سر قلم کر دیا ہوگا؟"

"نہیں..... بات اس طرح نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہے ہو۔" چارلس نے میری بات کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ "بادشاہ کو گرفتار کر کے اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور عدالت نے اسے سزائے موت سنا دی۔ عدالت نے گارات کو حکم دیا کہ وہ نظر بند بادشاہ کے پاس جائے اور عدالت کا حکم نامہ اس کے روبرو پڑھ کر سنائے۔ گارات کو یہ حکم ماننا ہی پڑا۔ لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجبور اور بے بس بادشاہ کو یہ حکم سنا کر مزید ذلیل کرے۔ گارات کی بینائی ذرا کمزور تھی۔ بادشاہ کے سامنے جا کر اس نے عینک اپنے چہرے پر لگائی اور بادل ناخواستہ موت کا پروانہ پڑھ کر سنا دیا۔ بادشاہ کی حالت اچانک غیر ہو گئی اور وہ غش کھا کر گر پڑا اور اسی حالت میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔"

"لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟ جو کچھ ہوا وہ واقعی افسوسناک ہے لیکن شاہ لوئیس شش دہم کی موت میں تمہارا کیا کردار ہے، جو تم آج پونے دو سو سال گزر جانے کے باوجود بھی شرمندہ اور متاسف نظر آ رہے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"تم نہیں سمجھو گے۔" اس نے بزرگوں کی طرح مجھے ڈانٹا۔ "ذرا توجہ سے یہ واقعہ سنو۔ گارات اپنے آپ کو بادشاہ کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ اگر وہ حکم نامہ پڑھ کر نہ سناتا تو بادشاہ کی حرکت قلب بند نہ ہوتی (اگرچہ پھر بھی عدالت کے حکم کے مطابق موت اس کا مقدر تھی) دراصل گارات بادشاہ کو سزائے موت دینے کے حق میں نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بادشاہ کو تخت سے اتار دینا ہی کافی ہے لیکن اس کے ساتھیوں کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ چند دنوں بعد اس نے عینک کو ہی منحوس قرار دے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس عینک کے اندر کوئی ایسا طلسم پوشیدہ ہے جو کسی انسان کو دیکھ لینے کے بعد اس کی جان لیے بغیر نہیں چھوڑتا ہے۔ اس کا یہ نظریہ صحیح تھا یا غلط، اس پر فی الحال رائے زنی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بہرحال اس نے ساری ذمہ داری عینک پر ڈال کر اس کو ایک دراز میں بند کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ آیندہ وہ کوئی سی بھی عینک استعمال نہیں کرے گا۔"

"لیکن گارات نے عینک کو ضائع کیوں نہیں کر دیا؟ وہ اسے استعمال بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر محفوظ بھی کر لیا، آخر کیوں؟" میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"اس بارے میں میں واقعی لاعلم ہوں۔" میرے استفسار پر چارلس نے جواب دیا۔ "اب کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ گارات کی عمر کافی ہو چکی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ قریب المرگ تھا۔ وہ دنیا کے سب کام چھوڑ چھاڑ کر استارز میں اپنے مکان میں گوشہ نشین ہو گیا تھا اور اپنا تمام وقت عبادت اور دعاؤں میں گزارتا۔ اس زمانے میں ایک برگزیدہ پادری بھی یہاں رہا کرتا تھا جس کا نام میں بھول رہا ہوں۔ دور دراز سے لوگ اس پادری کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے آیا کرتے اور اپنے لیے دعائیں کرواتے۔ گارات نے بھی اس پادری کی پناہ ڈھونڈ لی۔ اب پادری آزادانہ طور پر گارات کے عالیشان مکان میں آنے جانے لگا تھا۔ ایک دن پادری ایسے وقت میں وہاں آ گیا جب کہ گارات کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ پادری اس کے انتظار میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور وقت گزاری کے لیے ایک کتاب اٹھائی۔ اتفاقاً وہ اپنی عینک کہیں بھول آیا تھا اور اب اسے پڑھنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس نے گارات کی ملازمہ مایا سے کہا کہ اگر گھر میں کوئی عینک ہو تو اسے تھوڑی دیر کے لیے دے دے۔"

"عام طور پر کسی کی عینک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہوتی ہے۔ ایسا اتفاق بہت ہی کم ہوتا ہے کہ ایک کی عینک دوسرے کے لیے بھی صحیح ہو۔" میں نے ایک بار پھر دخل اندازی کی۔

"تم درست کہہ رہے ہو۔" چارلس نے میری بات کا برا منائے بغیر کہا۔ "پادری کی فرمائش پر مایا کو یاد آ گیا کہ دراز میں ایک بہت پرانا چشمہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ اس نے وہ عینک نکال کر پادری کے حوالے کر دی۔"

"لیکن تم نے پہلے ذکر کیا تھا ملازمہ کو انتہائی سختی سے تاکید کر دی گئی تھی کہ اس عینک کو بالکل بھی ہاتھ نہ لگائے۔" میں نے پھر اعتراض کیا۔

"ہاں! میں نے ایسا کہا تھا لیکن مایا کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی ہے..... میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔" چارلس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ "میں تو صرف اصل واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ بہرحال مایا نے عینک نکال کر پادری کو دے دی۔ شکریہ ادا کر کے پادری نے عینک آنکھوں پر لگائی اور مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد پادری نے گارات کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ کرسی سے اٹھا اور گارات کا استقبال کرتے ہوئے اپنے دونوں بازو یوں وا کر دیے جیسے وہ گارات کو اپنے گلے لگانا چاہتا ہو۔ گارات بھی آگے بڑھا لیکن اچانک اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور یک ٹک انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اس عینک کو گھورنے لگا جو اس وقت پادری کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھی۔" اتنا کہہ کر چارلس اچانک خاموش ہو گیا اور زمین کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کہانی یہیں پر ختم ہو گئی؟ یا شاید اس سے آگے کے واقعات تمہاری یادداشت میں محفوظ نہیں ہیں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

میراتھن ریس

میراتھن ریس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ یقیناً یہ آپ بھی جاننا چاہیں گے تو سنیے، یوں تو میراتھن یونان کے ایک شہر ایتھنز سے 40 کلومیٹر دور ایک میدان کا نام ہے جہاں 490 قبل مسیح میں یونان اور ایران کے درمیان ایک تاریخی جنگ ہوئی تھی اور اس جنگ میں فتح کی خوش خبری لے کر یونان کا ایک ایتھلیٹ میراتھن سے ایتھنز پہنچا تو اس کی یاد میں 1896ء میں اولمپک گیمز کے ساتھ میراتھن ریس شروع ہوگئی جب کہ 1977ء میں امریکا کے جارج پاکس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میراتھن ریس کو دنیا کے تمام ملکوں میں فروغ دینے کی کوشش شروع کی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ مخلوط میراتھن سے معاشرہ میں آزادی آئے گی اور اگر عورتوں مردوں کی الگ الگ میراتھن ہو تب بھی انہیں عورتیں مرد سب اکٹھا کر دیکھیں گے۔ یوں ان سب میں دوڑنے کی تحریک آئے گی اور معاشرہ میں آہستہ آہستہ کھلا پن آتا جائے گا۔ اس فارمولے کو خاص طور پر مسلم معاشروں سے شرم و حیا، غیرت کو ختم کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا گیا اور آج ہم اپنے معاشرے میں مزید کھلا پن پیدا کرنے کے لیے بڑے فخر کے ساتھ اس ریس میں حصہ لے رہے ہیں۔

مرسلہ: محمد عبدالحمامن۔ کراچی

''نہیں نہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔'' وہ یوں گھبرایا جیسے اچانک ڈر گیا ہو۔ اس کا لہجہ بے حد افسردگی اور پژمردگی لیے ہوئے تھا۔ ''عینک دیکھ کر گارات کا پورا جسم تھرتھر کانپنے لگا۔ شاید اسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب اس نے یہی عینک پہن کر شاہ لوئیس ششم دوم کو سزائے موت کا پروانہ پڑھ کر سنایا تھا اور یہ حکم سن کر بادشاہ کا جسم بھی اسی طرح تھرتھرایا اور کانپا تھا۔ اچانک گارات لڑکھڑایا اور فرش پر کسی پکے ہوئے پھل کی طرح گر پڑا۔ پادری اور مایا نے اسے جلدی جلدی اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا۔ گارات پر غشی کا عالم طاری تھا۔ پادری نے اندازہ لگا لیا کہ اب گارات کی زندگی کا چراغ گل ہونے کو ہے۔ اس نے بستر مرگ پر پڑھی جانے والی دعاؤں کا ورد شروع کر دیا۔ عینک بدستور اس کے چہرے پر موجود تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں گارات موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔'' چارلس کا چہرہ بے حد ستا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس کا کوئی جان سے پیارا داغ مفارقت دے گیا ہو۔

میں خود بھی ایک عظیم شخصیت کی المناک موت پر رنجیدہ تھا۔ چند لمحے کف افسوس ملنے کے بعد میں نے چارلس کو تسلی دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''گارات واقعی بے حد مظلوم تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ لیکن چارلس! اس دردناک حادثے کو گزرے ایک زمانہ بیت گیا۔ اب ان واقعات کو فراموش کر دو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تاریخ کو دہرا کر تم خواہ مخواہ اپنی جان کو روگ لگا رہے ہو۔ ذرا اپنی حالتِ زار پر رحم کھاؤ۔ تمہارے چاہنے والے کتنے کبیدہ خاطر ہیں۔ شاید تمہیں اس کی خبر نہیں۔'' میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ چارلس ماتمی انداز میں آنکھیں بند کیے کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرا دھیان پھر عینک کی جانب چلا گیا۔ ''گارات کی موت کے بعد اس عینک کا کیا حشر ہوا؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ بعد میں وہ عینک کس کس کے ہاتھ لگی۔ ہاں! اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ وہ منحوس عینک اس وقت میری خواب گاہ میں موجود ہے۔'' چارلس نے یوں سادگی سے اتنی بڑی بات کہہ دی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔ سردی اور شدید خوف کی ایک لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ اپنے حواس کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں چارلس کے اور قریب سرک گیا۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری آواز نے میرا ساتھ نہ دیا۔

''چند ماہ قبل کی بات ہے...... میں بایون چلا گیا۔ وہاں ایک دکان میں کچھ اور چیزیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک بوسیدہ سے چمڑے کے کیس میں لپٹی ہوئی اس عینک پر میری نظر پڑ گئی۔'' میرے پوچھے بغیر ہی چارلس نے عینک حاصل کرنے کے پس منظر سے مجھے آگاہ کیا۔ وہ میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ میں کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔ ''پہلے تو میں نے اس عینک کو یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ کوئی شخص اپنی عینک یہاں بھول کر چلا گیا ہوگا لیکن پھر میں نے فطری تجسس سے مجبور ہو کر اسے کھول لیا اور اس کو بغور دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ فریم کی داہنی کمانی پر ایک نام کھدا ہوا تھا۔ یہ نام تھا ''گارات'' مزید غور کیا تو دھندلا دھندلا سا J.D بھی نظر آ گیا۔ انہی دو حروف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا ورنہ صرف گارات تو ایک عام سا نام ہے لیکن J.D کے حروف اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ اس عینک کا تعلق کسی اہم تاریخی شخصیت سے ہے۔''

''ڈومینک جوزف......'' میں نے بے اختیار کہا۔

''یقیناً۔'' چارلس نے تائید کی۔ ''تم بھی تاریخی اشیاء کی اہمیت کو سمجھتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ ایسی اہم چیز کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی اور خاص طور پر جبکہ میں اس کی تاریخ سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی اس عینک کو اپنے خزانے میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر آ کر میں نے بار بار اس کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے خزانے میں ایک اہم اور نہایت ہی شاندار اضافہ ہوا ہے۔''

میں حیرت سے ٹکٹکی باندھے چارلس کی باتیں سن رہا تھا اور گزشتہ کئی منٹوں سے خاموش تھا۔ میری محویت کا یہ عالم اس وقت ٹوٹا جب ہنری نے آ کر اطلاع دی کہ کافی تیار ہے اور ہم لوگ دوسرے کمرے میں آ کر کافی نوش فرما لیں۔

ہنری تو یہ اطلاع دے کر چلا گیا لیکن چارلس اسی طرح گم صم اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھے بھی مجبوراً اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چارلس نے پھر عینک کا قصہ چھیڑ دیا۔ ''میں نے عینک کو میز کی ایک دراز میں ڈال دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح گارات نے اس کو ایک طرف ڈال دیا تھا۔ مجھ میں یہ ہمت نہیں تھی کہ میں اس عینک کو شوقیہ ہی سہی، اپنی آنکھوں پر لگا کر دیکھوں، خاص طور پر ایسے حالات میں کہ مجھے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

چارلس اب میری موجودگی کو فراموش کر چکا تھا اور یوں لگ رہا تھا گویا وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا ہے۔ اس کا چہرہ دوسری طرف دیوار کی جانب تھا اور آواز گلوگیر ہو چکی تھی۔ ''گزشتہ شب جب میں چہل قدمی کر کے واپس آیا تو ہنری میرے استقبال میں باہر ہی موجود تھا۔ اس کے چہرے پر عینک موجود تھی۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اس کی عینک پر توجہ مرکوز کر دی اور یہ دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا کہ وہ عینک اس کی اپنی نہیں بلکہ کارات والی تھی۔ شدت خوف سے میری حالت بری ہو گئی۔ ہو بہو وہی منظر ہوگا جب کسی زمانے میں کارات کو دیکھ کر بادشاہ لوئیس ششم دہم کا ہوا تھا، اور پھر اس کے کئی سال بعد کارات کا ہوا جب پادری نے بھی عینک پہن کر اس کو دیکھا تھا۔ چنانچہ جب ہنری نے وہ عینک لگا کر میری جانب دیکھا تو خوف و دہشت کے مارے میں کانپ اٹھا اور مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ میری پرسش کے جواب میں ہنری نے بتایا کہ گزشتہ روز اس کی عینک ٹوٹ گئی تھی اور کام چلانے کے لیے اس نے عارضی طور پر یہ عینک استعمال کر لی ہے۔ بہرحال میں نے برا بھلا کہتے ہوئے اس سے عینک چھین لی اور دوبارہ دراز میں ڈال دی۔'' چارلس اپنی بات مکمل کرنے کے بعد گہرے خیالوں میں غرق ہو گیا۔

اس کہانی کا طلسم میرے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کر چکا تھا کہ مجھے بھی چارلس کی موت نظر آنے لگی۔ میری ہمت و طاقت نے جواب دے دیا اور میں نے اسی میں خیریت دیکھی کہ اب یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے۔ بظاہر ایسی باتیں بے سروپا سی لگتی ہیں لیکن ان کے اندر یقیناً کوئی ایسا طلسم ہوتا ہے جو بڑے سے بڑے بہادر انسان کا جگر بھی پانی کر دیتا ہے۔ مجھ پر ایک اضطراب کا عالم طاری تھا۔ میں لرزیدہ قدموں سے اٹھا اور کانپتے ہونٹوں سے چارلس سے معذرت خواہ ہوا۔

''چارلس! میرے عزیز دوست! مجھے ایک بے حد ضروری کام کے سلسلے میں فوراً پیرس پہنچنا ہے۔ اگر میں نے دیر کر دی تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ خدا نے چاہا تو دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ مجھے فی الفور اس ہیبت ناک ماحول سے دور ہو جانا تھا۔

چارلس اپنے ہی خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اسے اس بات سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی کہ میزبانی کے اصول کیا ہیں۔ اس نے انتہائی سردمہری سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور میں اپنے دوست کی حالت زار پر افسوس کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی قلق نہیں تھا کہ چارلس کی خوش خلقی کہاں غائب ہو گئی ہے۔ بس صدمہ تھا تو صرف اس بات کا کہ میرے پیارے دوست کا ایک ذہنی مرض انتخاب کر لیا ہے؟ مجھے اپنے آپ سے بھی یہ گلہ تھا کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

تین دن بعد پیرس میں اخبار پڑھتے ہوئے ایک مختصری خبر پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ خبر بڑی حسرت ناک تھی۔ صدمے سے میری بری حالت ہو گئی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ خبر کے مطابق فرانس کی ایک اہم شخصیت چارلس روئیل کا ان کے گاؤں اسٹارز میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم تاریخی اشیاء کے شوقین تھے اور ان کا خزانہ بے شمار نوادرات اور یادگار چیزوں پر مشتمل ہے۔ فرانس کی حکومت ان کے انتقال کے بعد یہ خزانہ قومی ملکیت میں لینے کے لیے قانونی کارروائی کر رہی ہے۔ میں کافی دیر تک رنج و غم کے عالم میں غرق رہا اور پھر اسٹارز کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر اظہار افسوس کرنا اور دعائے خیر کرنا میرا فرض بنتا تھا۔

ہنری نے اپنی شکستہ انگریزی میں مجھے بتایا کہ ان کی اچانک موت کسی کے لیے بھی اچنبھے کا باعث نہیں تھی۔ سبھی لوگ جانتے تھے کہ ان کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ کافی عرصے سے بیمار بھی چلے آ رہے تھے۔

نہ جانے کیا سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اک ذرا اس منحوس عینک کو تو دیکھ لوں جو کم از کم تین عظیم شخصیتوں کی موت کا سبب بن چکی ہے اور آئندہ بھی نہ جانے کیا کارنامے انجام دے گی۔ میری فرمائش پر ہنری نے وہ عینک لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اسے بالکل بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ بس ایک نظر دیکھا اور واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

چارلس روئیل اپنے گاؤں کی مٹی تلے ابدی نیند سو رہا ہے۔ خدا اس کی روح کو سکون کامل عطا کرے۔ کارات بھی اس کے قریب ہی مدفون ہے۔ میں نے ان دونوں مظلومین کے لیے صدق دل سے دعا کی اور پھر آنسو پونچھتا ہوا اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ بے شک ہر انسان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے لیکن کبھی کبھی نہ جانے کیوں میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ عینک والے واقعے میں کتنی صداقت تھی اور کیا میرے دوست چارلس روئیل کی موت واقعی قدرتی تھی؟

میں آج تک اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوں اور نہ جانے کبھی یہ معاملہ حل ہوگا بھی یا نہیں۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا بائیسواں حصہ

پردیس کی زندگی بھی عجیب ہے۔ کبھی تو اتنی آسان کہ دل شکرانے کی نفل پڑھنے کو چاہے اور کبھی اتنی سخت کہ تمام دن فکر و تردد میں گزرے۔ ہمارے ساتھیوں میں سب کے سب معصومیت کے پیکر تھے۔ دل کے اتنے صاف کہ کوئی کسی کی بات کا برا نہ مانتا۔ اگر کوئی بات بری لگتی بھی تو وہ گھنٹے آدھ گھنٹے میں دور ہو جاتی اور پھر سے وہ سب ایک ہو جاتے۔ خان اپنی فیملی کے ساتھ ایک دوسرے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا لیکن موقع ملتے ہی ہمارے اپارٹمنٹ میں

آجاتا۔ اس دن بھی آیا ہوا تھا۔ ہم سب ایک ساتھ بیٹھے ہنسی مذاق کررہے تھے کہ اس کی بیگم کا فون آگیا۔ وہ حد درجہ گھبرائی ہوئی تھی۔

فون سنتے ہی خان بھی پریشان ہو اٹھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اسے پریشان دیکھ کر میں بھی گھبرا اٹھا۔ اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

''مت پوچھو، بیٹھے بٹھائے مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔'' خان نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

''کھل کر بتاؤ۔'' میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا پھر کہا۔ ''ٹھہرو میں بھی ساتھ چل رہا ہوں۔ کپڑے تبدیل کرلوں۔''

شہباز جو کوچ پر بیٹھا، دیوار کے سہارے نیم دراز تھا۔ بڑبڑایا۔ ''ایک نیا سیاپا۔''

میں نے اس کی بڑبڑاہٹ کو نظرانداز کیا اور کمرے میں جاکر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ واپس آیا تو خان دروازے ہی پر کھڑا تھا۔ میں اس کے ساتھ نکل پڑا۔ راستے میں بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ پورے راستے وہ گویا چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو پتا چلا کہ اس کا ایک دوست اس کی کھٹارا گاڑی لے کر گیا تھا۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں کسی گاڑی کو ٹکر مار دی تھی اور اس گاڑی والے نے ہرجانے کا دعویٰ کردیا تھا۔ ہرجانہ اتنا تھا کہ اس سے خان کی گاڑی جیسی دو گاڑیاں آسکتی تھیں۔ ستم یہ کہ گاڑی ٹکرانے کے بعد خان کا دوست فرار ہو گیا تھا۔ گاڑی والے نے خان پر دعویٰ کردیا تھا، بے چارہ خان اس بری طرح پھنس گیا تھا کہ کوئی ہمدرد ہی خان کو اس دلدل سے نکال سکے۔ اس الجھن سے اسے نکالنے کے لیے ہم نے کیا کیا پاپڑ بیلے یہ الگ داستان ہے۔ اس دوران ہم نے بہت کچھ سیکھا کہ پردیس میں انسان کو کن کن مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ دو ہفتے میں یہ کام نمٹ گیا اور ہم سب نے اطمینان کی سانس لی۔

☆......☆

موسم بدلا تو میں نے بھی ہمالیائی ریچھ کی طرح اپنے ٹھکانے سے نکل کر ٹورنٹو اور اردگرد آوارہ گردی کرنے کا ارادہ باندھ لیا۔ یہاں اکتوبر سے مئی تک آؤٹ ڈور سرگرمیاں بند ہو جاتی ہیں۔ مئی ہی میں کینیڈا کروٹ بدلتا ہے۔ آسمان کے رنگ نکھرتے ہیں تو زمین کے راستے بھی کھل جاتے ہیں۔ میں یہاں بند ہوکر بیٹھنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ مجھے اردگرد کے علاوہ دور دور تک دیکھنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری آوارہ گردی کی ہوس میرے مرنے تک فضا میں رہے گی۔ میرا رب انشاءاللہ مجھے اپنی دنیا کے سارے رنگ دکھلائے گا۔ میں اس کی بنائی گئی دنیا کے ہر گوشے میں اپنا سر نکالنا چاہتا ہوں۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں جہاں ہر منزل پر نئے شجر ہوں، مختلف پرندے ہوں، نئے رنگوں کے پھول ہوں، مختلف ذائقوں کے پھل ہوں اور نت نئی قسموں کی تتلیاں ہوں۔ بہت کچھ تو میں پہلے دیکھ چکا ہوں اور اس سے بہت سا انشاءاللہ وہ مجھے ضرور دکھائے گا۔

دنیا کے بہت کم خطے ایسے ہوں گے جن میں بہت زیادہ مماثلت ہو پھر زمین کا اپنا رنگ ہے اور ہر زمین کا آسمان اپنی زمین سے ہم آہنگ ہے۔ کھٹمنڈو کے ہمالیہ کے اپنے انداز ہیں اور پاکستانی کے ٹو کے اپنے۔ پہاڑوں کا حسن اس کے مکینوں سے بھی بنتا ہے اور ہر جگہ کا مکین رہن سہن، بود وباش دوسرے سے مختلف ہیں۔ چین کا قراقرم اور ہے اور پاکستان کا قراقرم دوسری طرح کا ہے۔ سندھ الگ قسم کی داستانوں سے گزرتا ہے اور مسی سپی اور قسم کی تہذیبوں کا گواہ ہے۔ دونوں ہیں تو دریا مگر لہریں مختلف نظاروں اور ویرانوں میں بنتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی زمین اپنے مناظر میں بھلی لگتی ہے اور آسٹریا اپنے آپ میں کم اور طرح کا دکھتا ہے۔ ویرانے مختلف قسم کے انسان بساتے ہیں اور ہر بستی اپنی قسم کے انسانوں کا نقش دکھاتی ہے۔

جن جن ملکوں نے بے تحاشا صنعتی، طبی اور خلائی ترقی کی ہے ان کی ترقی کے مظاہر ان ملکوں میں صاف نظر آتے ہیں۔ بلند وبالا عمارتیں، ہزاروں میل تک پھیلی شاہراہیں، بڑے بڑے اسپتال اور ان میں ہوتیں حیرت انگیز پیوند کاریاں۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ انسانوں کے کرشمے نہیں بلکہ اس رب کے کرشمے ہیں جس نے حضرت انسان کو اس پائے کا دماغ دیا ہے۔ اس دماغ کو جہاں موقع ملا جہاں سہولت ملی تو اس نے چاند پر قدم رکھ دیا۔ خلاؤں کو تسخیر کرلیا پھر بھی کہتا ہے کہ کائنات کا وہ صرف اتنا راز پاسکا ہے جتنا کسی عظیم صحرا میں ریت کا ایک ذرہ۔ انسان کتنا کم مایہ ہے اور رب میرا کتنا عظیم ہے۔

کینیڈا کو بھی اللہ نے بہت نوازا ہے۔ مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل میں پھیلا یہ ملک ہر مقام پر عجیب نظارے لیے ہوئے ہے۔ مجھے تو ابھی ٹورنٹو میں پہلے وہ نرم مقامات دیکھنے ہیں جو کھلے موسموں میں کھلتے ہیں۔

میرا جہاز جب چند ماہ پہلے ٹورنٹو کے پیرسن

ایئرپورٹ پر اترا تو ایسا مجھے محسوس ہوتا تھا کہ سردی بھی آج اس زمین پر اتری ہے۔ مغربی دنیا کے سفروں کی میری ٹھن تو پہلے ہی دن ہوا ہو گئی تھی جب یہاں پہلی رات آئی۔ چند دن تو آنکھیں بھی ٹھیک سے نہ کھلیں اور اگلے چند ہفتے دماغ بند رہا۔ دماغ کی کھڑکیاں وا ہوئیں تو آسمان نے برف کے بند کھول دیے۔ پہلے پہل تو شیشے کی کھڑکیوں سے گرتی برف انتہائی بھلی لگیں۔ تا دیر انہیں گرتے دیکھتے رہتا، وہ درختوں، سبزہ زاروں، عمارتوں اور گاڑیوں کا ان میں چھپ جانا بہت حسین لگا مگر جب نوکری کی تلاش میں بسوں میں سفر شروع ہوئے تو یہی برف باری جان کا عذاب بن گئی پھر کچھ جاب کا اور کیبن سینٹر میں ٹریننگ کا سلسلہ چلا تو ان برف کو میں بھی اوروں کی طرح بھلا لگنے لگا۔ سرجی اور شہباز جیسے سنگی ساتھی ملے تو مسرت کے لمحے میسر ہونے لگے پھر نسرین کہیں سے راستہ بھٹکتی آ ٹکرائی تو بے رنگ ماحول میں نئے رنگ بھر گئے۔ ہیموسال میں جاب بھی ہوگئی اور پھر یاروں کے ہمراہ امریکا سے بھی بخیریت واپس پہنچے تو نسرین کسی اور ادا سے ملی۔ نہ کرتے کرتے اقرار کیسے ہوتا ہے، یہ سبق بھی پڑھ لیا۔ اپنا دل شاید بہت کشادہ تھا جو بیوی بچے بھی باآسانی اس میں گھر کیے بیٹھے رہے اور نسرین بھی اپنے بیٹے سمیت اس میں سما گئی۔ میں اپنے قارئین کو یہ ترغیب قطعی نہیں دے رہا کہ میری طرح اپنے دل کشادہ رکھیں۔

پھر موسم بدلا اور کہیں سے ایک منصوبے کے تحت بہار کو لے آیا۔ ہم جیسے ریگستانی لوگوں نے اس طرح کی بہاریں کہاں دیکھی تھیں۔ صبح تو چند دن کے لیے کچھ پھولوں کو کھلتے اور ہواؤں سے جھومتے دیکھ کر بہار منا لیتے تھے یا پھر کچھ نغمے سن لیے، کچھ اشعار اور یاد کرلیے اور پھر انہیں کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیے اور پھر انتظار کرتے رہتے اور پھر انتظار کا دورانیہ بڑھ جاتا تو مایوس ہوکر دیکھتے تو بہار بھی رخصت ہو چکی ہوتی۔ یہاں کی بہار آئی اور آکر ٹھہر گئی۔ ہم نے تو پہلے چند دن جلدی جلدی سے اپنی اپنی بسنت منالی کہ کہیں صبح سو کر اٹھیں تو معلوم ہو کہ وہ تو چلی بھی گئی مگر جب یہ شہر میں داخل ہوئی تو ٹورنٹو نے اپنی فصیلوں کے سب دروازے بند کردیے اور اسے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ مل سکا پھر ہمیں معلوم پڑا کہ واقعی ہم کینیڈا میں ہیں، پھولوں سے لدے پھندے معطر شہر میں۔

میں نے سوچا کہ پہلے اس شہر اور اس کے قرب وجوار کو دیکھا جائے گا کیونکہ اپنی آوارہ گردی کی شروعات کہیں نہ کہیں سے تو کرنی تھیں۔ کینیڈا کو اگر کیوبک سٹی سے لے کر ونیکور تک مشرق سے مغرب میں دیکھیں تو یہ ہزاروں میل میں فاصلہ بنتا ہے یا تو یہ اپنے انتہائی مشرق میں بھرا پڑا ہے اور یا پھر انتہائی مغرب میں۔ درمیان میں آبادیاں کم ہیں اور ویرانے بے انتہا۔ میں نے پھر اس ملک کو مشرق سے مغرب تک کئی بار کھنگالا اور ہر بار اسے ایک نئے رنگ میں دیکھا۔ اس کے تذکرے؟ تو انشاءاللہ ان صفحات میں آیندہ آئیں گے۔

میرے جیسا بندہ جس کے پاؤں میں چکر ہو، اسے ہیموسال کی نوکری ہی راس آتی ہے۔ اوپر والے کا کرم تھا کہ میں یہاں آ لگا تھا۔ ہم یہاں انسانی خون بناتے تھے اور وہ بھی ایسا جوز زائدالمدت کے باعث ضائع بھی نہ ہو۔ اس کو بنانے کا عمل ایک ہفتے میں ختم ہوتا تھا۔ اگر درمیان میں پہلے دوسرے یا تیسرے دن کوئی ایک مشین بھی خراب ہو جائے تو ساری پروڈکٹ ضائع ہو جاتی تھی۔ ہفتے کے جتنے دن بھی رہتے تو وہ پھر ہمارے فارغ گزرتے تھے۔ نہ کام اور نہ دھندا۔ پھر سب پروڈکشن کے لوگ سارا دن لنچ روم میں بیٹھے شور مچاتے رہتے تھے پھر کمپنی ہمیں وہ باقی دن بمع تنخواہ کے چھٹی دے دیتی۔ ہر ایک کی سوچ ہوتی کہ وہ یہ دن کیسے گزارے۔ مجھے اس ہفتے تین دن بیٹھے بٹھائے نصیب ہوئے تو میں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنایا۔

مفتی کو تو اگر تین دن کی بجائے تین ماہ بھی ملتے تو وہ انہیں اپنے میٹرلیس پر گزار دیتا۔ مفتی دو چیزوں سے مکمل پرہیز کرتا تھا۔ ایک کام سے اور دوسرا ذہنی وجسمانی مشقت سے۔ اس سے تو پوچھنا ہی فضول تھا کہ وہ ان تین دنوں کا کیا کرے گا۔ مطیع اللہ چونکہ پروڈکشن میں کام نہیں کرتا تھا، اسی لیے اسے کوئی چھٹی وغیرہ نہیں ملی تھی۔ ہم کھانا کھا کر لیونگ روم میں بیٹھے تھے کہ مطیع اللہ بولا۔ ''نصیب نصیب کا بات ہے، مفتی جیسی بندے کو فجول (فضول) کا چھٹی مل گیا ہے اور ہم جیسا رہ گئی ہے۔''

بات تو مفتی کے برا منانے والی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس جملے کا کیا مطلب ہے۔ مطیع اللہ سب کچھ کہہ کر اپنی بلوری آنکھیں چھت پر گاڑے سوچوں میں ڈوب گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ چوٹ مار کر انجان بن جاتا ہے۔ سرجی نے حسب عادت ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مفتی کو بھڑکانے لگے۔ ''خوچہ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ بالکل

نکمے، کام چور، سست الوجود اور معلوم نہیں کیا کیا ہیں۔"

مفتی نے ایکدم ٹی وی کی اسکرین سے منہ موڑا اور سرجی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ مطیع اللہ تڑپ کر سرجی سے مخاطب ہوا۔ "خدا تجھے غارت کرے۔ یہ تو میں بولا بھی نہیں۔"

سرجی خفا ہوئے اور کھڑکی کی جانب مڑ کر کے کہنے لگے۔ "تمہارا مطلب تو یہی تھا کہ چل نہ سکوں میرے بارہ نخرے۔"

شہباز جو سدا کا تھکا ہوا لیٹا تھا۔ وہ بھی بول پڑا۔ "پٹھان بھائی کے بعد اب سرجی کا بھی سیاپا۔"

میں نے سرجی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "مفتی ٹھیک ٹھاک تو چلتا ہے اور چلتے ہوئے نخرے کہاں کرتا ہے؟"

مفتی اب غصیلی نظروں سے سرجی کو گھور رہا تھا۔ سرجی بولے۔ "میں نے تو محاورہ بولا ہے۔"

"آیندہ سے، پہلے محاوروں کا مطلب بتایا کرو اور پھر یہ مشکل الفاظ بولو۔" مفتی نے کہا۔

"اس کا مطلب تو بہت آسان ہے کہ کام چور کو ساری مراعات بھی چاہئیں۔" سرجی بولے۔

شہباز بھی اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ مفتی سے بولا۔ "دیکھو یہ پھر تمہیں کام چور، ہڈحرام اور شاید نمک حرام بھی کہہ رہا ہے۔"

مفتی نے ایک عجیب کام کیا۔ وہ یہ کہ پہلی بار ہمارے سامنے ٹی وی بند کیا۔

پھر لال بھبوکا ہوا اور اس کے بعد آلتی پالتی مار کر اپنے میٹرس پر بیٹھا سرجی کو خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ چنگاری مطیع اللہ نے سلگائی اور دنگل مفتی اور سرجی کے بیچ پڑ گیا۔ وہ خود معصوم بنا ابھی تک چھت کو گھور رہا تھا۔

"سرجی یہ آپ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو نمک حرام کہلوانا میں ہرگز پسند نہیں کروں گا۔" مفتی نے کہا۔

"مفتی ایسا انسان ہے جس نے نہ کسی کا نمک کھایا ہے اور نہ ہی کسی کو کھلایا ہے۔ اس لیے نہ یہ کسی کا نمک حرام اور نہ کوئی اس کا تو بس جھگڑا ہی ختم۔" میں نے اسے منانے کی خاطر کہا۔

مفتی چکرا گیا اور بولا۔ "وہ کیسے؟"

میں نے کہا۔ "جب نمک بھی نہیں کھایا تو نمک حرام کیسے ہو گئے، اسی لیے شہباز کی بات غلط ہے۔"

مفتی بولا۔ "مگر یہ شہباز نے تو نہیں کہا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا سرجی کی زبان سے سنا ہے؟"

"نہیں۔"

"تب کس کے منہ سے سنا ہے؟"

"شہباز کے۔"

شہباز، مفتی اور سرجی تینوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات کہی کس نے ہے، خود مفتی بڑبڑا رہا تھا کہ شہباز سے جھگڑا کروں یا سرجی سے؟ وہ بے بس ہو گیا اور بولا۔

"سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ نمک حرام بولا کس نے ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایک گلاس پانی پی کر سوچو تو معلوم ہو جائے گا کہ مطیع اللہ نے کہا ہے۔"

اب مفتی کے علاوہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں اصل مجرم کو سامنے لے آیا ہوں اور مفتی اب اس پریشانی میں بیٹھا تھا کہ اتنا غصہ اس نے اپنے دماغ میں بھر لیا ہے اسے کس پر نکالے۔

مطیع اللہ کو ایک پتلی گلی نظر آئی تو وہ اس میں گھس گیا یعنی بات بدل کر مفتی سے پوچھا۔ "تم تین دن کی چھٹیوں میں بہن کے گھر کیوں نہیں چلی جاتی۔"

مفتی پہلی سوچ سے نکل کر دوسری میں ڈوب کر بولا۔ "سوچ تو یہی رہا تھا مگر ہر وقت کام کرتے کرتے تھکاوٹ اتر آتی ہے۔ سوچتا ہوں آرام کر لوں۔"

مطیع اللہ بولا۔ "لوگوں کی عادت ہے باتیں بنانے کی ایسے ہی تمہیں کام چور کہتے ہیں۔" کوئی اور بات اس سے پہلے ہوتی کہ مطیع نے پوچھا۔ "ندیم بھائی! آپ کا ان دنوں کیا پروگرام ہے؟"

میں نے کہا۔ "پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی میں سینڈز بینک پارک، وہاں سورج ڈوبنے کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔"

یہ سن کر سب نے ایک ساتھ سوالات کیے۔ کس نے بتایا اس کے بارے میں؟

کس کے ساتھ جاؤ گے۔

کتنی دور ہے؟

کیسے جاؤ گے؟

کیوں جاؤ گے؟

اگر کل گئے تو واپس کب آؤ گے؟

میں نے مختصراً بتایا کہ یہاں سے دو ڈھائی گھنٹے کی

مسافت پر ٹورنٹو اور اوٹاوہ کے بیچ اونٹاریو جھیل پر ریت کے اونچے اونچے ٹیلے ہیں، نیلے پانیوں کی جھیل جس کے اوپر نیلے آسمان تلے کئی رنگوں کے بادل تیرتے رہتے ہیں۔ پانی کناروں سے لہروں کی صورت آ کر سنہری رنگوں میں ٹکراتا ہے اور واپس جا کر دوبارہ نیلا ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے پوچھا۔ "کون میرے ساتھ جانا چاہتا ہے؟"

میری خواہش تھی کہ ان میں سے کوئی ایک میرے ہمراہ جائے مگر امید نہ تھی۔ مفتی کا جانا میرے لیے بیکار تھا۔ باقی تینوں کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ کوئی وہاں جانے پر تیار ہوتا ہے کہ نہیں۔ مطیع اللہ نے ہر بات کو جولائی تک ٹال رکھا ہے۔ مفتی سے بھی یہی کہہ رہا تھا کہ کلب جولائی میں چلوں گی اور مجھ سے بھی یہی بولا۔ "جولائی میں چلیں گے۔"

شہباز بولا۔ "اس کی جاب ہے اور چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔"

سرجی معنی خیز لہجے میں بولے۔ "نیلے پانیوں میں خوب صورت چہروں کے عکس دیکھو، ہمیں دیکھ کر اپنی چھٹی خراب کرنی ہے۔"

ان کی بات کا مطلب میں سمجھ گیا تھا مگر مطیع کی طرح بے پروا بن کر چھت تکنے لگا۔

☆......☆

شام اتر رہی تھی۔ سائے لمبے ہو کر دھندلے پڑنے لگے تھے۔ میں کمرے میں لیٹا ڈور وال سے باہر کے نیلے چمک دار آسمان کی وسعتوں میں کھویا آسودگی سے لیٹا تھا۔ سرجی دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آئے اور پھر آہستگی سے دروازہ بند کر کے رازداری سے بولے۔ "باجی نسرین کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ وہ معصوم تو تمہارے ساتھ جانے پر تیار بھی ہو جائے گی۔"

میں بولا۔ "آپ سے وہ بہت کم عمر ہے اسے باجی کیوں کہتے ہیں آپ؟"

جواب دیا۔ "آپ کی وجہ سے عزت کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی اپنی جاب بھی ہے۔ سعد کا اسکول بھی ہے۔ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

کہنے لگے۔ "بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ معصوم اداس آنکھیں لیے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ اس کا بھی دل اچھا گزر جائے گا۔"

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا مذاق کر رہے ہیں مگر میں نے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ کچن میں جا کر اپنے لیے چائے بنائی اور اندر میٹرس پر لیٹ کر پھر سے سوچنے لگا لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچا تو فون اٹھا کر نسرین کا نمبر ملا لیا۔ دوسری بیل پر نسرین کی آواز آئی۔

"سعد بھی کہہ رہا تھا کہ انکل آج فون ضرور کریں گے۔"

"سعد کی ماں سے بھی پوچھ لیتی۔ شاید وہ بھی کچھ کہہ رہی ہو۔"

"سعد کی ماں اپنے بیٹے سے کہہ رہی تھی کہ اپنے انکل سے کہو۔ چند ہفتے ہمارے جانے میں رہ گئے ہیں۔ ملنے میں اتنی دیر کیوں اور ہماری ٹکٹوں کا انتظام بھی کرنا ہے۔ اسی لیے کبھی آ بھی جایا کریں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"سعد سے کہہ دینا کہ انکل پوچھ رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کہیں چلو گے؟ اور کوئی بات نہیں، اپنی ماں کو بھی ساتھ لینا۔" میں بولا۔ وہاں کچھ لمحے کو خاموشی رہی اور پھر کھنکتی ہوئی آواز آئی۔ "سعد سے نہیں بلکہ سعد کی امی سے سیدھا پوچھ لیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ کہیں بھی لے چلو، پر لے تو چلو، مجھے وہاں ہی چھوڑ دینا۔"

میں نے اس سے سیدھا سوال کیا۔ "یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر ایک پارک ہے۔ بیچ بھی ہے چلنا ہے؟ اور شاید رات بھی وہیں گزارنی پڑے۔"

وہ شاید کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوچھا۔ "تم چھٹی کر دو گے؟"

"میری ویسے بھی چھٹیاں ہیں اچھی جگہ ہے ہو سکے تو چلی آؤ۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "میری بھی کل جاب ہے۔ سعد کے اسکول میں تو اطلاع دی جا سکتی ہے مگر میرا اس وقت انہیں بتانا مناسب نہیں۔" کچھ لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "کیا خیال ہے۔ پرسوں کا پروگرام بنا لو۔ میں بھی کل جا کر دو دن کی چھٹی لے لوں گی۔"

میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم پرسوں کے لیے ساتھ کچھ کھانے بھی بنا لینا۔ رات وہیں ٹھہریں گے۔ تم کل آ کر تیاری کر لینا۔ میں بھی رہائش اور ٹرانسپورٹ کا دیکھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے وہاں چھوڑ تو نہیں آؤ گے؟"

"کبھی نہیں۔" میں ہنس پڑا۔ اپنی بات آگے بڑھائی۔ "میں کل شام کو فون کروں گا۔ تم سے جو کہا ہے اس کی تیاری کر لو۔"

فون رکھنے سے پہلے وہ بولی۔ "وہ تو میں ابھی سے

شروع کر دیتی ہوں۔"

بات ختم کی۔ میں باہر لیونگ روم میں آیا۔ سرجی سے بولا کہ میں باہر واک کرنے جارہی ہوں چلنا ہے، ساتھ ہی انہیں اشارہ بھی کر دیا۔ دوسروں سے پوچھا تو ہمیشہ کی طرح واک سے کنی کترا گئے۔ مطیع اللہ بولا۔ "انشاء اللہ جولائی سے واک شروع کروں گی۔"

میں اور سرجی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے باہر آئے۔ شام ڈھل چکی تھی۔ آسمان چاند سے خالی تھا۔ تارے چمک رہے تھے مگر آس پاس کی روشنیوں نے ان کی جگمگاہٹ مدھم کر دی تھی۔ ہم چلتے ہوئے اس پارک میں آبیٹھے جہاں ایک ہفتے پہلے سب پھول سفید تھے اور درخت ایسے لگ رہے تھے کہ جیسے چاندی کی مالائیں پہن لی ہوں۔ آج پہنچے تو حیرت ناک طور پر سب پھول گلابی ہو چکے تھے۔ وہ رات میں دکھتے نہ تھے پر محسوس ہوتے تھے۔ میں نے انہیں آج دن میں ہیمو سال سے واپسی پر دیکھا تھا۔ اب ایسے کہ دلہنوں کا لباس زیب تن کر رکھا ہو۔ خنک ہوائیں نہ جانے کب سے چل رہی تھیں اور متواتر مجھے تازگی دیتی تھیں۔

ہم پارک میں بینچ پر بیٹھے تھے۔ سرجی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ نسرین اور اس کا بیٹا میرے ہمراہ جا رہے ہیں اور ایک رات بھی درمیان میں وہیں آئے گی۔

سرجی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔ "مجھے معلوم ہے۔ وہ شریف لڑکی ہے۔ تمہیں اس سے بھی بہت بہتر کوئی مل سکتا تھا مگر وہ پاگل ہے جو تم پر اس کا دل آ گیا۔"

اپنی بات ایک مختصر وقفے کے بعد جاری رکھی۔ "وہ تم پر اعتماد بھی بے حد کرتی ہے۔ کاش نہ کرتی خرابی تو یہیں سے شروع ہوئی۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور بولا۔ "کیا مطلب؟" "ویسے شام کے بعد معلوم نہیں تمہاری باتیں سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔" میں نے ان کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے سوال کا جواب دیا۔ "اگر وہ اتنا اعتماد اور اعتبار نہ کرتی تو میں اسے کبھی کا چھوڑ کر آگے نکل گیا ہوتا۔ یہ اعتبار مجھے اس کے لیے فکر مند رکھتا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور اپنی بات جاری رکھی۔ "شکل صورت یا دولت پر لڑکیاں اگر کسی کے پیچھے آتیں تو نسرین جیسی حسین و جمیل لڑکی کم از کم میری جانب کبھی نہ کھنچتی۔"

سرجی مدبرانہ انداز میں سر ہلا رہے تھے۔ میری بات ختم ہونے پر بولے۔ "میری آنکھ تو اسی دن پھڑک اٹھی تھی جب پہلے دن تم نے اسے پھول بولا اور وہ تمہیں دوست بول رہی تھی۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا کہ یہ چاند ایک دن چڑھے گا۔"

دوسرے دن میں ناشتا کرنے کے بعد مائیگر سینٹر چلا گیا۔ یہ وہی سینٹر تھا جو کینیڈا کی حکومت نے تارکین وطن کے لیے کھولا تھا کہ یہاں انٹرنیٹ سے اپنی جاب تلاش کر سکیں۔ ہمارے پاس ابھی انٹرنیٹ اپارٹمنٹ میں نہیں تھا۔ وہاں مفت میں انٹرنیٹ، فون اور پرنٹر ہم استعمال کر سکتے تھے۔ میں نے پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی اور سینڈ بیچ پارک کی معلومات انٹرنیٹ سے نکالیں۔ کاؤنٹی کے ساتھ یہ اونٹاریو کی سب سے خوب صورت اور بڑی بیچ ہے جسے سینڈ بیچ کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑے پارک میں ہے۔ رہائش کے لیے پارک میں کیمپنگ کی جاتی ہے جو مجھے ہرگز نہیں کرنی تھی۔ اس کے علاوہ کاؤنٹی میں ہوٹل موجود تھا مگر مجھے زیادہ دلچسپی ان گھروں سے ہوئی جو مکمل سامان اور کچن کے ساتھ کرائے پر اٹھائے جاتے تھے۔ انٹرنیٹ پر میں نے تین چار دو دو بیڈ روم کے گھر مارک کیے اور سینٹر سے انہیں فون کیا۔ ویک اینڈ ہوتا تو کرائے خاصے زیادہ ہوتے۔ چونکہ درمیانی دنوں میں فون کر رہا تھا تو ایک گھر مجھے بہت مناسب ریٹ پر ایک رات کے لیے مل گیا۔ مالکان بھی ارزاں ریٹ پر گھر کرائے کے لیے اٹھا دیتے ہیں کہ کم از کم خالی تو نہیں جائے گا۔ دوسرا ابھی گرمیوں کا سیزن شروع نہیں ہوا تھا کہ لوگ دھڑا دھڑ بیچ پر نہانے کے لیے نکل پڑتے۔ میں نے ان سے ایڈریس لیا اور اپنا کریڈٹ کارڈ دے کر گھر کل رات کے لیے بک کروا لیا۔ ان دنوں ڈاؤن ٹاؤن یونین اسٹیشن سے ایک شٹل سروس کاؤنٹی تک دن میں تین بار چلتی تھی۔ صبح نو، گیارہ اور ایک بجے اس کے اوقات تھے۔ واپسی شام چار، پانچ اور سات بجے ہوتی تھی۔ ان کو فون کیا تو جواب ملا کہ آپ آدھ گھنٹے پہلے آجائیں۔ سیٹیں آسانی سے مل جائیں گی۔ مجھے سب چیزیں آسانی سے اس لیے مل رہی تھیں کہ ابھی باہر نہانے کا موسم ایک ماہ دور تھا۔

یہ دونوں کام کر کے میرے سر سے ایک بوجھ سا تھا جو اترا۔ گو میرے چار گھنٹے صرف ہو گئے تھے مگر میں مطمئن تھا کہ ایک باعزت رہائش اور ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو گیا ہے۔ ٹورنٹو میں یہ میری جہاں گردی کی ابتداء تھی۔ میں آغاز بھی

اچھے طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ان دنوں ڈرائیونگ لائسنس نہ تھا اور اسی لیے میں نے ابھی گاڑی نہیں خریدی تھی۔ لہٰذا مجھے پبلک ٹرانسپورٹ پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ بہرحال پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ نہ ڈرائیونگ کی جھنجھٹ اور نہ ہی پارکنگ کے مسائل۔

اپارٹمنٹ آکر میں نے کچھ آرام کیا اور چائے پیتے ہوئے نسرین کو فون کرنے کے لیے اس کا نمبر ملایا۔ فون پہلی گھنٹی پر ہی اٹھا لیا۔ شاید انتظار میں تھی۔ میں نے جب یہ بتایا کہ رہائش کے لیے دو بیڈ روم کا گھر کرائے پر لیا ہے تو خوش ہونے کی بجائے خفا ہوتی بولی۔ "اتنی فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ تمہاری فیملی آ رہی ہے اور تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ کتنے زیادہ اخراجات ہوں گے۔ ابھی سے بچت نہیں کرو گے تو اپنے لیے مشکلات بڑھا دو گے۔" وغیرہ وغیرہ۔

اسے ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ میری فیملی پہلے نیویارک میں رکے گی۔ سوچا تھا کہ کل اسے بتا دوں گا۔ جب میں نے اقرار کیا تو اسی ناطے قدرتی طور پر وہ اپنا یہ حق سمجھنے لگی کہ مجھے کہیں روکے، کہیں ٹوکے اور کہیں بڑھنے دے۔ عورتوں کو شاید یہ حق جتلا کر تسکین ملتی ہے۔ میں نے بھی اس کی نصیحتوں کو کھلے دل سے سنا اور آئندہ محتاط رہنے کی یقین دہانی بھی کرا دی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح نو بجے کی شٹل سروس استعمال کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں ساڑھے آٹھ بجے صبح یونین اسٹیشن پہنچنا تھا۔ لہٰذا ساڑھے سات بجے گھر سے ہر حالت میں نکل جانا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم سامان لے کر کیل اسٹیشن آجانا۔ اتنا سامان اکیلے اٹھاتے مشکل پیش آتی، میں نے سوچا کہ کیل اسٹیشن اتر کر سامان میں لے لوں گا۔ وہاں سے اگلی ٹرین پر یونین اسٹیشن ایک ساتھ چلے جائیں گے۔ ایک ٹائم مقرر کر کے اسٹیشن پر ملنے کا کہہ کر میں نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں کمرے میں بیٹھا فون کر رہا تھا۔ سرجی آس پاس منڈلا رہے تھے۔ فون بند ہوا تو آکر پوچھنے لگے۔ "آپ لوگ! ایسا نہ ہو کہ اتنے قریب ہو جائیں کہ بچھڑنے میں مشکل پیش آئے۔ اپنا نہیں تو اس کا سوچ لو۔"

"آدھا سوچ لیا ہے اور آدھا حالات پر چھوڑ دیا ہے۔ یا میں بے بس ہو گیا تھا اور یا وہ حاوی ہو گئی تھی یا ہم دونوں بے بس تھے۔" پھر سرجی کی جانب دیکھ کر میں بولا۔

"ایک بات کی یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ میرے قدم کسی غلط راستے پر نہیں جائیں گے اور جو میں سوچ رہا ہوں، اگر وہ پورا ہو گیا تو ایسا کام کروں گا جس سے میرے بچے اور میری فیملی انشاء اللہ مجھ پر ناز کرے گی۔"

دوسرے دن میں صبح جلدی بیدار ہوا۔ نماز ادا کی۔ جینز کی پینٹ، پورے بازو کی شرٹ اور ہلکی جیکٹ پہنی۔ شولڈر بیگ میں رات کا لباس رکھا، ساتھ شیونگ کٹ رکھی اور گھر سے مقررہ وقت پر باہر نکل آیا۔ جب کیل اسٹیشن اترا تو وہ ہمیشہ کی طرح پہلے سے موجود تھی۔ مجھے اب ملی تو پہلے سے زیادہ خوب صورت لگی۔ شاید میری دیکھنے کی نظر بدل گئی تھی کہ زاویہ تبدیل ہو گیا تھا۔ سعد نے ایک چھڑی اٹھا رکھی تھی۔ وہ دو بیگ بمشکل اٹھائے کھڑی تھی۔ میں نے سعد کو پیار کیا۔ جب بیگ میں نے اٹھائے تو ایک دوسرے سے وزنی تھا۔ وہ بولی اس میں کھانا ہے اور دوسرے میں کپڑے وغیرہ ہیں۔ بھاری بیگ میں نے تھاما۔ دوسری ٹرین پکڑی اور آدھے گھنٹے میں ہم یونین اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ وہاں سے باہر نکلے تو ساتھ ہی ایک ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے وہ شٹل ہمیں مل گئی۔

وہ ایک بڑی شاندار اور نئی نکور بس تھی۔ سبز اور سفید رنگ کی دھاریوں سے اس کی شان اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے ٹکٹیں خریدیں۔ اندر داخل ہوئے، دیکھا تو سیٹیں بہت آرام دہ تھیں۔ دو دو یہ ڈبل سیٹیں تھیں۔ دو پر نسرین اور سعد بیٹھ گئے اور بیچ راستے سے ادھر میں جا بیٹھا۔

جب تک ہم نے اپنی اپنی سیٹیں نہیں سنبھالیں۔ مجھے چین نہ تھا۔ بیٹھنے کے بعد میرے بہت سارے تفکرات ختم ہوئے۔ ایک تو مجھے وہ ہوٹل ڈھونڈنا تھا جہاں سے بس ملتی۔ دوسرا میں اب اکیلا نہ تھا۔ ان دونوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر تھی۔ میں یہ تمام راستہ نہ نسرین سے ٹھیک بات کر سکا تھا اور نہ سعد سے۔ حالانکہ وہ دونوں بہت خوش تھے مگر میرے چہرے پر تفکرات دیکھ کر نسرین خود بھی چپ ہو گئی تھی اور سعد کو بھی خاموش کرا رکھا تھا۔ میں بھی دوسرے عام مردوں کی طرح ایک مرد تھا جسے یہ بات اچھی لگتی ہے کہ عورت اس کے مزاج کو سمجھے۔ یہ ہنر نسرین بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ اس کی خوبیاں ایک ایک کر کے مجھ پر واضح ہو رہی تھیں۔ اسے اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ کسی کے دل میں کیسے گھر بنایا جاتا ہے۔ خوش دیکھا تو پاس آ گئی۔ سوچوں میں پایا تو فاصلہ رکھ لیا۔ صرف یہ پوچھ لیا کہ سب ٹھیک ہے ناں؟ ادھورا

جواب ملا تو دوبارہ سوال نہ پوچھا۔ اب میں بس میں بیٹھا اس کے اسی رویے کے بارے میں سوچ کر دل میں مسکرا رہا تھا۔ مجھے جب مطمئن دیکھا تو نظریں بھر کر دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”آخر تم اتنا پریشان کیوں ہو جاتے ہو؟ ہم ٹائم پر تو نکلے تھے اور بس کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھی۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میری بہت سی بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے نوٹ کر لو۔“

وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

میں سعد کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں آدھی بس کاؤنٹی جانے والوں سے بھر گئی۔ باوردی ڈرائیور نے آکر گنتی کی اور پھر سوا دو گھنٹے میں پہنچنے کا اعلان کر کے آہستگی سے کمپاؤنڈ سے بس کو نکالنے لگا۔ ہم QEW ہائی وے پر آ گئے اور پھر شمال کی جانب چل پڑے۔

DVP ہائی وے، QEW اور 1 40 ہائی وے کو آپس میں ملاتی ہے۔ میں نے بائیں جانب کی اپارٹمنٹ بلڈنگز دیکھیں، ان میں سے ایک پر میری پہلی جاب، پہلی سیکیورٹی کی جاب تھی۔ جب نئی صدی شروع ہو رہی تھی تو میں نے نئے سال اور صدی کا استقبال وہیں کیا تھا۔ روزے تھے اور ایک پاکستانی خاتون نے مجھے اپنے ہاتھوں سے سحری بنا کر بھیجی تھی۔ یہ وہ دن تھے جس میں حواس باختہ ہو کر ٹورنٹو میں پھرتا تھا۔ کیا وہ دن تھے جب میں ہر رات اپنے کمرے کی دیواروں سے لگ کر روتا تھا۔ کوئی تسلی دینے والا بھی نہ تھا کیونکہ سبھی کسی نہ کسی صورت میں آنکھوں سے یا پھر دل سے رو رہے تھے۔

عمارتوں اور ہائی وے کے بیچ ایک جنگل نظر آیا۔ گھنا اور دل موہ لینے والا مگر بعد میں ادھر ہی کہیں تھا تو کسی نے بتایا کہ یہ پارک ہے۔ میں حیران ہی رہ گیا تھا جب اس پارک میں گیا۔ بلند و بالا درخت، گہرے سائے، گہری خاموشی، مہیب تنہائی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کیلی فورنیا کے جنگلات میں گھس آیا ہوں۔ پرشور شہر کے بیچ تنہائی کے لیے صرف نارتھ امریکا اور یورپ کے شہروں میں ہی مل سکتے ہیں۔ اگر ہنگامہ خیز دنیا سے آپ ٹورنٹو میں دور جانا چاہتے ہوں تو ہر دو یا تین میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی ایسا ویرانہ مل جائے گا جہاں صرف پرندوں کا شور ہوگا اور ہواؤں کی سرسراہٹ۔

جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو میرا دل و دماغ پاکستان جا پہنچا ہے۔ دل روتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس ملک کو سب نے مل کر کسی نہ کسی حیثیت میں بھنبھوڑا ہے۔ سیاست دان سب سے بڑے مجرم ہیں۔ بس چلے تو انہیں بے بغیر ہی سزا سنا دوں۔

کبھی میں پنڈی کے ایوب گارڈن، اسلام آباد کے چنبلی باغ اور لاہور کے جناح باغ میں انہی درختوں اور پودوں کے سہارے اپنی تنہائیاں گزارتا رہا ہوں۔ پچھلی بار لاہور آیا تو ٹیکسی والے کو جناح گارڈن جانے کا بولا۔ وہاں پہنچا تو عجب منظر تھا۔ کوئی اجڑا دیار تھا کہ کیا تھا؟ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نادر شاہ ابھی دلی اجاڑ کر گیا ہے۔ اتنا تو کسی باربرین نے بھی نہیں لوٹا ہوگا جتنا سیاست دانوں نے مل کر غدر مچایا ہے۔ زندہ قومیں درخت لگاتی ہیں، جنگلات آباد کرتی ہیں تاکہ کل کے بچوں کو سایہ ملے۔ ادھر ہم ہیں کہ درخت اور جنگلات کاٹ کر سریا گاڑھ دیتے ہیں دلوں میں، انہوں نے درخت نہیں بلکہ شہزادے اور شہزادیاں پلانٹ کیے ہیں۔

ہم DVP ہائی وے سے 401 پر آئے تو سڑک تین رویہ سے آٹھ رویہ ہوئی۔ گاڑیوں کے ہجوم ایسے بھاگے چلے جا رہے تھے جیسے پیچھے کہیں آگ ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ ہائی وے کی دونوں جانب بلند و بالا خوب صورت عمارتیں خاموش کھڑی تھیں۔ آسمان وہی ہمیشہ کی طرح نیلو نیل اور کہیں کہیں تیرتے بادل، ہلکی ہوا چل رہی تھی جب ہم بس کے کمپاؤنڈ میں کھڑے تھے۔ وہ ستاتی نہ تھی بلکہ دلاسے دیتی تھی۔

نسرین ونڈ اسکرین کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی جو اتنی محو بیٹھی تھی۔ سعد اس کے بازو پر سر ٹکائے سو رہا تھا اور اس نے ہاتھ میں چھتری مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میں نسرین کے چہرے کی گلابی رنگت، پتلی ناک، بڑی آنکھیں، نازک ہونٹ اور چوڑی پیشانی تادیر دیکھتا رہا۔ وہ معلوم نہیں کہاں کھوئی تھی جو میرے نظروں کی حرارت بھی محسوس نہ کر رہی تھی۔ میں نے سامنے ہائی وے پر بس کو کراس کرتے گاڑیوں کو دیکھ کر یہی سوچا کہ رفاقت کو کبھی کبھی دھیما اور خاموش بھی ہونا چاہیے۔ ہر وقت کا ہنگامہ خیز ساتھ شاید اپنے پریا ساتھی پر گراں گزرتا ہے۔ یہ نہ تھا کہ وہ میری نظروں کو بھانپ نہیں رہی تھی۔ وہ شاید مجھے میرا وقت دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس سے اکثر کہتا تھا کہ دوسرے دل سے کسی کو جیت

لیتے ہیں اور تم عقل سے فتح کرتی ہو۔

ہم پارکنگ سے نکلے تو ٹورنٹو تمام ہوا اور گرد، درخت، جنگل تھے اور سڑک پر چند گاڑیاں اوٹاوہ یا مونٹریال کی جانب جا رہی تھیں۔ ہائی وے تین رویہ ہو گئی مگر رفتار نہ کم ہوئی اور نہ زیادہ۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے وقت پا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تبھی نیند نے موقعے کا فائدہ اٹھا کر مجھے دبوچ لیا۔

میں تب بیدار ہوا جب کسی کے ہاتھ کا نرم لمس کندھے پر محسوس ہوا۔ وہ نسرین تھی جو میرے جاگ جانے پر بھی کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ بس ایک جنت نظیر مناظر میں کھڑی رکی ہوئی تھی۔

وہ بولی۔ ”دو گھنٹے سوئے ہو۔ اچھا کیا آرام بھی مل گیا ہوگا اور دماغ کو سکون بھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”بس کیوں رکی ہوئی ہے؟“

بولی۔ ”ہم کاؤنٹی پہنچ چکے ہیں۔ یہی تمہاری منزل ہے؟“

میں ششدر بیٹھا اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ چند ہزار کی آبادی کا قصبہ تھا اور وہ چند ہزار بھی غائب تھے۔ پانچ سیکنڈ کے لیے کہیں بھی نظر اٹھا کر دیکھو تو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شجر نظر آ جائیں اور سب کے سب رنگ برنگے پھولوں سے بھرے تھے۔ بس ایک خوب صورت چھوٹے سے ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی۔ میں نے فی الحال اردگرد دیکھنا مؤخر کیا اور دوسرے سیاحوں کے ہمراہ نیچے اترا۔ بس کے نچلے کمپارٹمنٹ سے اپنا سامان نکالا اور آس پاس گزرتی عطر بیز ہواؤں میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میرے پاس اس جگہ کا ایڈریس تھا جو میں نے ایک رات کے لیے کرائے پر لی تھی دور نزدیک کوئی ٹیکسی نہ تھی بلکہ سامنے دو رویہ سڑک بھی مکمل خالی پڑی تھی۔ سوچا کہ خدا جانے یہ سب کہاں چلے گئے۔ سعد ماں کے سہارے خاموش کھڑا تھا۔ میں نے نسرین سے کہا۔ ”اندر ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھتے ہیں۔ اسی دوران میں ٹیکسی وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔“

دو منزلہ ہوٹل سارا کا سارا دھانی رنگ سے رنگا تھا۔ جو تھوڑا بہت شور مسافروں کے اترنے سے ہوا تھا۔ وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوٹل کے ریوالونگ دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اردگرد دیکھا تو چند مسافروں کو آرام دہ صوفوں پر کسلمندی سے اونگھتے پایا۔ عملہ بھی غائب تھا۔ نسرین سعد کو میں نے ایک صوفے پر بٹھایا اور خود ریسیپشن کی جانب آیا۔ دو اسٹول رکھے تھے اور دونوں ہی خالی۔ مکمل سکوت چھایا تھا۔ پہلے تو مجھے اچھا لگا اور پھر الجھن ہونے لگی۔ ہمارے مسئلے کا حل یہ خاموشی نہ تھی۔

اتنے میں ایک لڑکی پیچھے دروازے سے برآمد ہوئی۔ مجھے ایسے خوش آمدید کہا کہ جیسے ہوٹل کے آدھے کمرے میں ریزرو کرانے والا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”میں کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

میں نے کسی کیب کے لیے اپنا مدعا بیان کیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں کھری کھری سنا ہی نہ دے۔ جس کی امید کم تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم نے ایک گھر رینٹ کیا ہے اور وہاں تک جانے کے لیے کوئی ٹیکسی چاہیے۔ وہ برا ماننے کی بجائے ویسے ہی مسکراتی رہی۔ دراز سے ایک کارڈ نکالا اور کھڑے کھڑے کسی نمبر پر فون ملا دیا۔ وہ کسی کیب کمپنی کے کنٹرول روم سے بات کر رہی تھی۔ جو کچھ مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ کیب کی بات کر رہی تھی۔ اپنے ہوٹل کا نام بتایا اور پھر شکریہ ادا کیا اور اب مسکراتی ہوئی مجھے وہی کارڈ تھما رہی تھی کہ آئندہ بھی کیب کی ضرورت ہو تو اسی نمبر پر فون کر لینا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور چلتا ہوا واپس نسرین کے پاس پہنچا جو اپنے بیٹے کا سر گود میں رکھے اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی اور وہ شاید سو گیا تھا۔

میں ساتھ جا بیٹھا اور بولا۔ ”کچھ دیر میں کیب آنے والی ہے۔“

وہ میری جانب دیکھ کے مسکرا کر بولی۔ ”اور وہ کیا کہہ رہی تھی؟“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون؟“

مسکراتی آنکھوں سے اس نے کہا۔ ”وہ جس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔“

اس خاموشی میں میرا قہقہہ بلند ہوا جسے میں نے فوراً ہی دبالیا۔ اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اپنی جانب گھمایا اور مسکرا کر بولا۔ ”پاکستان کی ہو یا ایران کی یا کہیں کی بھی مگر عورتیں سب ہی ایک ہی خمیر سے ہوتی ہیں۔“

شیشے کی کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو ٹیکسی آچکی تھی۔ ہم نے سامان اٹھایا اور باہر جانے لگے۔ سعد شاید بس میں بھی سویا رہا تھا اسی لیے اب دوڑ رہا تھا۔ وہ چھتری پکڑے ٹیکسی کی جانب پہلے بھاگا۔ میں نے ریسیپشن پر لڑکی کا مدد کرنے پر شکریہ ادا کیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہاری بیوی بہت خوب صورت ہے۔“

میں نے شکریہ ادا کیا اور پھر نسرین کی جانب دیکھا تو وہ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی کی ڈگی میں سامان رکھا۔ ڈرائیور ایک عمر رسیدہ گورا تھا۔ اسے ایڈریس دیا تو اس نے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی اور باہر سڑک پر لا کر دائیں جانب مڑ گیا۔

صاف اور چمکتی ہوئی سڑک کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے درخت تھے اور یہ بھی پھولوں سے لدے تھے۔ درختوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے خوب صورت گھر نظر آنا شروع ہوئے جو بیشتر سفید رنگ کے تھے۔ ان کے اردگرد دور دور تک مخمل کی طرح سبزہ بچھا تھا اور اسی سبزے میں کئی ایک بلند درخت ہوا سے جھوم رہے تھے۔ یہ خاموشی، سکون اور تنہائی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی اسی سیارہ زمین پر ہوں جہاں کے قصبے میں اتنی خاموشی ہے؟ میں...ابھی تک ہوٹل میں لڑکی کو چند ادھیڑ لوگوں کو اور اب اس ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ رہا تھا۔ گویا یہ گاؤں صرف تین نفوس پر محدود تھا؟

ٹیکسی بائیں جانب مڑی اور پھر سے وہی منظر شروع ہو گئے۔ سامنے سے اب ایک کار ہمارے پاس سے گزری تو مجھے یقین آیا کہ یہاں لوگ بھی رہتے ہیں۔ ہم شاید ایک میل ہی گئے ہوں گے کہ ٹیکسی نے دائیں جانب موڑ کاٹا اور پھر الٹے ہاتھ پر سڑک کنارے چھوٹے چھوٹے گھروں کے تھوڑا سا پیچھے ایک نیلی جھیل نظر آئی۔ میں دم بخود بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ انتہائی دیدہ زیب مکانات، دور دور تک پھیلے سبز گھاس کے قطعے، درخت اور بہت سے پھول۔ یہ منظر میرے بائیں جانب تھا۔ اچانک ٹیکسی سڑک سے بائیں ہی جانب ایک بجری بھرے راستے پر مڑی جس کے آگے تازہ تازہ سفید رنگ ہوا ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا۔

یہاں آنے سے پہلے میں نے بہت سے سفر ایسے کیے جہاں میں کسی ایسے کاٹیج گویا کیبن کو دیکھ سکوں جو ان مناظر میں نظر آتا ہو مگر مجھے ایسا کبھی کچھ نظر نہ آیا جو میں اس روز دیکھ رہا تھا۔ میں جہاں بھی گیا تو مجھے تھوڑا تھوڑا منظر ملا گویا میرے تخیل کے مناظر کسی ایک جگہ مجھے پورے نہ مل سکے۔

ایک چھوٹا سا پرانا مگر صاف ستھرا گھر جس کے اردگرد دور دور تک سبز گھاس کے قالین بچھے ہوں۔ پھولوں بھرے درختوں سے گھرا ہوا ایک گھر جہاں چھوٹے چھوٹے پرندے درختوں پر بیٹھے اپنی میٹھی بولیاں بولتے ہوں پھر پرواز بھرتے ایک شجر سے دوسرے کی جانب اڑتے ہوں۔ گھر کے پچھواڑے پر بہت بڑا گھاس بھرا میدان ہو اور پھر درختوں کے جھنڈ اور اس سے جڑی ایک خوب صورت جھیل۔ جھیل جس کے کنارے پھولوں بھرے پودے ہواؤں میں لہرا کر جھومتے ہوں۔ اس سارے منظر میں تنہائی اور خاموشی ہو۔ آواز ہو تو صرف پرندوں کے چہچہانے کی یا ہواؤں کی۔ کاؤنٹی کے اس گھر کو دیکھنے کے چند سال بعد میں انگلینڈ گیا تھا۔ میں لندن سے بذریعہ ٹرین اسکاٹ لینڈ کے پرانے محلات، آس پاس کی جھیلیں اور جزیرے دیکھنے جا رہا تھا۔ راستے میں لیک ڈسٹرکٹ کے ایک مقام پر ٹرین رکی۔ میں نے منظر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنا چھوٹا سا رک سیک جس میں صرف میرے چند کپڑے اور پاکستانی آم تھے، وہ اٹھائے ٹرین سے اتر آیا۔ میں تین دن اسی قصبے میں گھومتا رہا۔ گھومتے گھومتے ایک جھیل کنارے رک گیا۔ وہ منظر میرے دل میں اترتا چلا گیا۔ نیلے اور سبز شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر خود رو پھولوں کے پودے لہرا رہے تھے۔ پیچھے چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیاں تھیں جن میں روئی کی گالوں جیسی سفید نظر آتیں، سینکڑوں بھیڑیں تھیں۔ جھیل سے ذرا فاصلے پر ایک گھر تھا، بہت قدیم

پُر کیف صاف ستھرا۔ میں وہاں چلا گیا۔ چند لوگ تھے اور خاموشی تھی۔ اس گھر میں دو قبریں نظر آئیں۔ میں چلتا ہوا گیا۔ کتبہ پڑھا تو وہ مشہور شاعر ولیم ورڈز ورتھ کی قبر تھی۔ دوسرا نامانوس نام تھا میرے لیے۔ وہ گھر کھلا تھا۔ اب وہ میوزیم بن گیا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی سے ایک صبح ولیم ورڈز ورتھ نے جھیل کنارے ڈیفوڈلز پھولوں کو لہراتے دیکھا تو اس نے اپنی مشہور زمانہ نظم ڈیفوڈلز لکھی تھی۔ میں کالج میں وہ نظم پڑھا کرتا تھا اور پڑھ کر اپنے خیالوں میں ولیم ورڈز ورتھ کا منظر تخلیق کرتا تھا۔ وہ نظم بذات خود کتنی اچھی تھی یہ تو میں نہیں بتا سکتا مگر اس منظر میں جس طرح وہ فٹ بیٹھتی تھی وہ حیرت انگیز بات تھی۔ اس کھڑکی سے پہلے نظر آتے سبزہ زار پھر درخت اور جھیل اور جھیل کنارے لہراتے پھول۔ یہی منظر میں ٹورنٹو کی پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی کے ایک چھوٹے سے کاٹیج کے باہر کیب سے نکل کر دیکھ رہا تھا۔

گھر کے میل باکس میں میرے لیے ایک لفافہ پڑا تھا۔ لفافے میں سب ضروری معلومات درج تھیں جن کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ گھر پر لگے نمبروں والے قفل کا کوڈ بھی لکھا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ وہاں فون بھی موجود تھا اور ہماری کسی بھی کال کے چارجز میرے کریڈٹ کارڈ سے کاٹ لیے جاتے۔

ہم سامان ڈگی سے نکال کر کیب ڈرائیور سے محو گفتگو تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”سینڈ بنکس بیچ ہمیں لے جا کر تین چار گھنٹے بعد واپس لا سکتے ہو؟“

اس نے بڑی نفاست سے جواب دیا۔ ”گھر میں فون ہے۔ کیب کمپنی کو کال کرو گے اور میں آجاؤں گا، وہ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”بیچ پر چھوڑ بھی آؤں گا، جس ٹائم کا کہو گے لے آؤں گا اور اگر وہاں کے اسٹور سے فون بھی کر لو گے تو تمہارے وقت کے مطابق پہنچ جاؤں گا۔“

مجھے اس سے زیادہ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

ہم نے سامان اٹھایا اور سامنے کی چند سیڑھیاں چڑھ کر لکڑی کے ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔ برآمدے میں تین پلاسٹک کی کرسیاں رکھی تھیں۔ اس سے زیادہ کی گنجائش بھی وہاں نہ تھی۔ کوڈ ملا کر لاک کھولا اور دروازہ اندر کی جانب دھکیل کر ہم تینوں لکڑی کے بنے فرش پر جا کھڑے ہوئے۔

قدموں تلے قالین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا اور سامنے کچن کا کاؤنٹر تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دو کھڑکیاں جو پیچھے جھیل کی جانب کھلتی تھیں۔ کچن کے سامنے اور ہماری بائیں جانب لیونگ روم جہاں صوفے اور کافی ٹیبل رکھی تھی۔ کونے میں چھتیس انچ کا ایک ٹی وی ٹرالی پر رکھا تھا اور ٹی وی کے ساتھ اس کی ریموٹ کنٹرول ایک سفید رومال پر پڑا تھا۔ کافی ٹیبل پر کچھ میگزین بھی رکھے تھے۔ کچن کاؤنٹر کے بیچ چار برنر کا چولہا، ساتھ میں پلیٹیں دھونے کا سنک تھا۔ کاؤنٹر کے ایک کونے میں مائیکرو ویو اور ساتھ ایک قدِ آدم سے بھی بڑا فریج رکھا تھا۔ ہمارے دائیں جانب دو کمرے تھے اور ان دونوں کے بیچ باتھ روم تھا۔ ماسٹر بیڈ روم پیچھے تھا جہاں سے ایک بڑی کھڑکی جھیل کی سمت کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے میں دو چھوٹے بیڈ رکھے تھے اور ایک چھوٹی کھڑکی گھر کے دائیں جانب درختوں میں کھل رہی تھی۔ بائیں جانب کونے میں لانڈری روم تھا۔ لیونگ روم اور کچن کے بیچ چار کرسیوں سے گھری گول بریک فاسٹ ٹیبل تھی۔ ہم نے سامان کافی ٹیبل پر رکھا۔ نسرین نے پہلے کچن کا معائنہ کیا۔ درازوں میں دیگچیاں، فرائی پین، کیتلیاں، چمچ، پلیٹیں غرض کھانے پکانے کی ہر چیز موجود تھی۔ کوکنگ آئل اور برتن دھونے کے لیے ڈش سوپ بھی موجود تھا۔ ٹوسٹر، بنیادی مصالحہ جات قرینے سے کاؤنٹر پر رکھے تھے۔ فریج کھول کر دیکھا تو انڈے، ڈبل روٹی، جام اور ایک گیلن دودھ کی بوتل رکھی تھی۔ فریج پر نوٹ لگا تھا کہ اگر یہ چیزیں استعمال کیں تو اتنی رقم کریڈٹ کارڈ سے منہا کر دی جائے گی۔ گلاس، جگ، کافی کے مگ وغیرہ ایک دراز میں ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ لائٹر اور ٹارچ بھی موجود تھی۔ باتھ روم میں تولیہ، صابن، شیمپو، لوشن سب رکھے تھے۔ ماسٹر بیڈ روم میں صاف ستھرا بستر، کمبل اور تکیے سجے تھے۔ وہاں ایک بڑی الماری میں مزید کمبل اور تکیے رکھے تھے۔ چھوٹے کمرے میں بھی دونوں بیڈ اپنے بستروں سے آراستہ تھے۔

غرض پورا سجا سجایا گھر تھا۔ چابی سے دروازہ کھولیں اور رہنا شروع کر دیں۔

نسرین جب کچن دیکھ رہی تھی تو میں اس دوران کاٹیج کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔

وہ اور سعد یہاں آکر بہت خوش لگ رہے تھے۔ سعد اپنے ساتھ کچھ منصوبے بھی لایا تھا۔ وہ کھلونے ریسلر کو آپس میں لڑا رہا تھا۔ نسرین نے وہ کھانے فریج میں رکھے جو بنا کر

لائی تھی۔ باتھ روم میں جا کر کپڑے لٹکائے۔ میری جانب دیکھ کر بولی۔ ''تم فریش ہو جاؤ۔ میں نے رات کا تمہارا سوٹ اور ٹوتھ پیسٹ باتھ روم میں رکھ دیے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''میرے بیگ سے نکالے ہیں؟''

بولی۔ ''نہیں تو میں خود لائی ہوں۔''

ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی مجھے وہ حیران کر گئی پھر بولی۔ ''میں چائے بناتی ہوں۔''

میرے منہ سے یہی نکلا۔ ''بہت بہتر مہاراج۔'' یہ میں نے اردو میں کہا تھا اور وہ مطلب پوچھنے لگی۔

میں نے اپنا سیٹ اٹھایا اور چھوٹے کمرے میں چلا گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ کہنے لگی۔ ''تم ماسٹر بیڈ میں سعد کے ساتھ سو جاؤ۔ میں اسی کمرے میں سو جاؤں گی۔''

پوچھا کیوں تو بولی۔ ''اس کمرے میں جھیل کی جانب کھڑکی کھلتی ہے۔ تمہیں یہ مناظر اچھے لگتے ہیں۔ صبح اٹھ کر اسے دیکھنا بہت اچھا ویو ہوگا۔''

''صبح اگر جھیل نہ دیکھی تو یہ آنکھیں دیکھ لوں گا۔ ایک ہی طرح کا منظر دکھتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں بولا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''صبح اٹھ کر سب سے پہلے تمہیں اپنی آنکھیں دکھلاؤں گی۔''

''ہاں ضرور مگر غصے سے نہیں پیار سے۔''

''تم ماسٹر بیڈ میں سو جاؤ۔ میں یہاں آرام سے سو جاؤں گی۔'' وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

''اجنبی گھر میں تمہارا اکیلے سونا اچھا نہیں ہے۔''

''اکیلی کہاں ہوں۔ تم بھی تو ہو ناں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اپنے ہوتے تو مجھے اکیلا نہ کرتے پھر مجھے چلے بھی جانا ہے۔''

اس کے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر تھے اور سر میرے سینے پر۔ میں نے اپنے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کیے اور بولا۔ ''تم اب کہیں نہیں جا رہی ہو۔''

یہ سن کر وہ تڑپ کر الگ ہوئی اور حیرت سے میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ شکایتی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں مذاق نہیں میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میں اس کی آنکھوں میں سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ حالانکہ اس وقت بھی میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ میرے چہرے اور آنکھوں میں سچائی دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو یقین کر لو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں آہستگی سے کہا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو دلاسا بھی دیتا جا رہا تھا۔

''پھر بھی نہیں آ رہا۔'' اب اس کی نظروں میں بے اعتباری اور اعتبار دونوں کے سائے تھے۔

''آخری بار ہی کر لو۔'' میں نے مسکرا کر اسے اپنی جانب دوبارہ کھینچ لیا۔

''ایسا مت کہو، آخری بار نہیں آخری دم تک کروں گی۔'' وہ مجھ سے لپٹی اور اپنی گرفت مضبوط کر کے خوشی سے بولی۔

''تفصیلی بات میں بعد میں بتاتا ہوں۔ میں شاور لے کر آتا ہوں۔ تم چائے میرے لیے بنا دو۔'' میں نے اسے علیحدہ کیا اور دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر سے ایک بار بولو۔'' اب اس کی آنکھیں اداس اور نمناک تھیں۔

''تم اب یہیں ٹورنٹو میں رہو گی۔ ایرانی بھائیوں سے ملنے جا سکتی ہو مگر رہو گی یہاں۔'' میں بار بار اسے اپنی بات کا یقین دلا رہا تھا۔

''تو پھر؟'' وہ اس طرح سے بول رہی تھی کہ جیسے اپنے سارے فیصلے میرے سپرد کر چکی ہو۔

''تو پھر یہ کہ تم نے آگے پڑھنا ہے اپنے آپ کو ثابت کرنا ہے کہ اکیلے تم سعد کی پرورش کر سکتی ہو اور میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم بھی وعدہ کرو کہ میرے کہنے پر عمل کرو گی۔'' میں نے جو مختصراً اس کے بارے میں سوچا تھا بتا دیا۔

''جو کہو گے کروں گی۔ بس تم ایک وعدہ کرو کہ کسی حوالے سے بھی کسی رشتے ناطے ہی سہی میرے ساتھ رہو گے۔ باقی کے سارے وعدے مجھ سے لے لو۔ بس یہی ایک وعدہ تمہارا.....'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں موتی تھے۔ میں اس کی یہ خوشی دیکھ کر خوش تھا۔ میں نے ایک لائحہ عمل اپنے ذہن میں بنا لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر من وعن اس پر عمل ہو گیا تو انشاء اللہ اس کی بکھرتی زندگی کو قرار آ جائے گا۔

میں شاور لے کر باہر نکلا تو کافی ٹیبل پر چائے کا مگ اور اس پر چھوٹی پلیٹ پڑی تھی۔ ساتھ سینڈوچ اور خشک میوہ رکھا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھا تو اندر ہی دھنستا چلا گیا۔ سعد کا اس سے پوچھا تو بولی۔ ''ابھی وہ شاور لے گا اور کپڑے چینج بھی کرنے ہیں۔'' وہ اب چہکتی اور مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

وہ مجھے کچھ تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ وہ سارا راستہ سوئی بھی نہ تھی۔ رات کو وہ دیر تک یقیناً کچھ نہ کچھ بناتی بھی رہی تھی جسے آتے ہی فریج میں بھر دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم سعد کو شاور دلا کر ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کر لو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔''

''وہ تمہیں تنگ کرے گا۔''

''وہ تو تم بھی کرتی ہو۔''

''یہی تو ڈر رہتا ہے۔ کہیں مجھ سے تنگ نہ آ جاؤ۔'' اب وہ شوخی سے بات کر رہی تھی۔

''صرف انہی سے تنگ ہوتا ہوں، جنہیں آسانی سے چھوڑا جا سکتا ہے۔ جن کے جانے کا دکھ نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''میں چلی گئی تو دکھ ہوگا؟'' وہ مجھے لفظوں میں شاید آزما رہی تھی۔

''جن کو جانے کا کہہ کر اداسی ہو رک جانے کا کہوں تو سکون ہو۔ اس کے ہمیشہ بچھڑنے کا میں سوچوں ہی کیوں؟'' میں نے آسان سا جواب دیا تو پھر وہ کہنے لگی۔ ''کسی کے چلے جانے کا کبھی دکھ ہوا؟''

''ہاں بہت ہوا تھا۔ بہت رویا تھا۔ مہینوں بھٹکتا رہا مگر اب جا کے معلوم ہوا اسے چھوڑنا ہی بہتر تھا۔ وہ خود پسند تھی۔ جب کسی کا پیار جان بھی لے لے تو پروا نہیں پر بددعا دے تو جان چلی جاتی ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اسے پیار کر کے پچھتا رہے ہو؟'' وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

''نہیں مجھے کھو کر وہ پچھتا رہی ہو گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اسی دوران سعد کمرے سے ماما ماما کہہ کر چلاّنے لگا۔

''شاید اس نے شاور لے لیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور میں گرم چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ میری نظریں سامنے کھڑکیوں کے پار تھیں۔ ایک بل کھاتا راستہ گھر کے ڈیک سے نیچے جھیل تک جا رہا تھا۔ اس پگڈنڈی کے قدموں تلے درختوں کی شاخیں رکھ کر اسے بارشوں میں چلنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔ جہاں یہ پگڈنڈی اختتام کو پہنچتی تھی وہیں نیلی جھیل اس سے آ ملتی تھی۔ مجھے اگر اس منظر میں کوئی رات دن بھی بٹھا دے تو بخوشی جڑ جاؤں۔ دن بھر دیکھتا رہوں اور شب بھر محسوس کرتا رہوں۔ ایسے رومانس پالنا مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے اور اداس بھی رکھتا ہے۔

سعد تیار ہو کر زیادہ نکھر آیا تھا۔ رنگت اور نقوش ماں سے لیے تھے۔ دوڑتا آیا اور چھلانگ لگا کر میرے ساتھ آ بیٹھا۔ نسرین سے میں نے کہا۔ ''اسے کوئی ہلکی جیکٹ پہنا دو۔ ہم دونوں دوست جھیل تک جائیں گے۔''

نسرین بولی۔ ''تو میں کیا کروں گی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ میرے اور میرے اس دوست کی پکنک ہے۔ ہم کسی دوسرے کو اپنے ہمراہ نہیں لے جاتے۔'' میں نے اس کی مسکراتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو اب آپ ذرا آرام کریں۔ ہم اس دوران گھوم کر آتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔ شاید مدتوں بعد کسی نے اس کا خیال کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہم پیچھے ڈیک والے دروازے سے جائیں گے۔ آگے والا دروازہ بند رکھنا۔'' میں نے اپنے جاگرز لیے۔ جیکٹ کندھے پر ڈالی۔ سعد کو بھی ماں نے اپنے تئیں خوب تیار کیا تھا۔ ہم دونوں باہر نکلے اور اس نے ابھی تک اپنی چھتری کو اسی گرفت سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم دونوں ڈیک پر لگے دروازے سے باہر آئے۔ دروازہ سلائیڈ کر کے میں نے دوبارہ اسے اپنی جگہ پر سرکا دیا۔ ڈیک پر ایک پلاسٹک کی گول میز اور چار کرسیاں اسی کے ارد گرد رکھی تھیں۔ میز کے بیچ ایک بڑے سوراخ میں چھتری لگا دی گئی تھی۔ ساتھ باربی کیو کی گرل رکھی تھی۔ مالک مکان نے ہر ضرورت کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ جگہ ایک رات رہنے کی نہ تھی۔ یہاں چند دن رکنا ضروری تھا تاکہ اس مقام کو اپنے دل و دماغ میں پورا بسایا جا سکے۔

راستہ بل کھاتا نیچے جھیل تک اترتا جارہا تھا اور سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔

جھیل یہاں سے ڈیڑھ دو سو گز دور ہوگی۔ اس کے پانیوں پر چمکتے سورج کے لشکارے تھے۔ نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ راستے کے دونوں جانب دور تک جاتے ہری بھری اور ملائم گھاس کے قطعے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گھاس کو کل ہی تراشا گیا ہو۔ گھاس میں کہیں کہیں سرو کے درخت اپنے سائے ڈھونڈ رہے تھے۔ چیڑ کے پودے بے تحاشا نظر آرہے تھے۔ جھیل کنارے درختوں کے جھنڈ تھے اور ہواؤں کی سرسراہٹ تھی۔ ہم نیچے اترتے چلے گئے۔ جھیل کے قریب راستہ دائیں جانب اچانک مڑا اور پھر بائیں جانب جھیل کنارے رک گیا تھا۔ وہیں لکڑی کے بینچ رکھے تھے۔ لوہے کی میز اور آگ جلانے کی جگہ بنی تھی۔ ایک درخت کے نیچے جلانے کی لکڑی ترتیب سے اوپر نیچے رکھی تھی اور قدموں تلے مخمل کی طرح سبز گھاس بچھی تھی اور اوپر بہت سے پھول بھرے درخت تھے۔ میں بینچ پر بیٹھ گیا۔ سعد ساتھ بیٹھا اپنی چھتری کو کھولتا اور پھر بند کررہا تھا۔

وہ جھیل کوئی آدھے میل کے قطر میں ہوگی۔ پانی گہرا نیلا شفاف تھا۔ وہ ایک نیم گول دائرے میں ساری کی ساری مجھے یہاں سے نظر آرہی تھی۔ اس کے کناروں پر درختوں کے کنج تھے جو اپنے سائے جھیل کنارے ڈالتے تھے۔ سب درخت سفید اور گلابی پھولوں سے لدے تھے۔ ہوا درختوں سے نیچی ہوکر جھیل کی سطح کو مرتعش کررہی تھی۔ پانی اتنے شفاف کہ مجھے کناروں پر جھیل کی سطح نظر آرہی تھی۔ جھیل کے اردگرد گھر تھے اور مکینوں کی اپنی کشتیاں کناروں سے بندھی تھیں۔ سفید موٹر بوٹس دور اور قریب سے بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کتنے خوب صورت احساسات ہوں گے جب یہ اپنی کشتی کو جھیل کے درمیان لاکر بیٹھ جاتے ہوں گے۔ شام کا منظر یہاں کتنا سہانا ہوگا جب سورج اپنے تمام تر رنگوں سمیت اپنا عکس نیلے پانیوں پر ڈالتا ہوگا۔ کناروں پر لگے، خودرو پھول گھاس سے سر نکالے آہستہ آہستہ ہوا سے لہرا رہے تھے اور ایک مکمل خاموشی چھائی تھی۔ درختوں، پھولوں کا شفاف عکس ہر جانب پانیوں میں نظر آتا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک پہاڑی پر ہماری رہائش خاموش کھڑی تھی اور درمیان میں دبی گھاس، درخت اور ہوائیں تھیں۔ جس طرف بھی نظر اٹھتی وہاں ایک علیحدہ منظر تھا جو روح کے اندر تک جذب ہوتا جارہا تھا۔

دل چاہتا تھا کہ کنارے کنارے جھیل کا چکر لگاؤں مگر اس کا ہر حصہ کسی کی ملکیت تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ یہاں کوئی کسی کی پراپرٹی میں دل لگانے کے لیے گھومتا پھرے۔

میں نے سعد سے پوچھا۔ ”دوست! یہ جگہ کیسی لگی آپ کو؟“

وہ چھتری کھول کر معصوم چہرے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ والی جگہ ہے۔“ اس نے جھیل کی جانب اشارہ کیا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ماما بھی کہتی ہیں کہ انکل کو جھیلیں بہت پسند ہیں۔“ وہ بولا۔

”آپ کو کیسی لگی؟“

”ماما کو بھی اچھی لگتی ہیں۔ انہیں بلا لاؤں۔“ وہ اٹھا تو میں نے پکڑ کر پھر بٹھا دیا۔

میں نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ! ابھی ماما آرام کررہی ہیں۔“

”وہ اس وقت پہلے تو کبھی نہیں سوئیں۔“

”وہ آج تھک گئی ہیں ناں۔“

”پہلے تو وہ کبھی نہیں تھکتی تھیں۔ آج کیا بہت تھک گئی ہیں؟“

”معلوم نہیں۔ وہ سوکر اٹھیں تو پوچھ لینا۔“

”انکل ہم کیا ماما کے ملک ایران واپس جارہے ہیں؟“ اب کی بار وہ اپنے ذہن کی بات سامنے لے آیا۔

”تم نہیں جانا چاہتے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میرا یہاں اسکول ہے۔ آپ بھی تو ہیں یہاں، میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ معصومیت سے مجھے بتلا رہا تھا۔

”اگر ماما چلی جائیں تو آپ میرے پاس یہاں رہیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”تو آپ بھی ساتھ چلیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ اگر ہم سب ٹورنٹو میں رہیں تو کیسا لگے گا؟“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ میں بھی نہیں جاؤں گا۔“ پھر سوچ کر بولا۔ ”آپ مما کو سمجھائیں وہ مجھے بار بار کہہ رہی ہیں۔“

میں نے اسے گلے لگالیا اور سینے سے لگائے اس سے بولا۔ ”آج آپ کی ماما کو ہم دونوں مل کر سمجھاتے ہیں۔“

وہ خوش ہوگیا اور مجھ سے اپنے آپ کو چھڑوا کر بینچ پر

اوپر نیچے چھلانگیں لگانے لگا۔

پھر میں ان پھولوں کو دیکھنے لگا جو لمحے بھر کو تھم کر پھر سے لہرانے لگے تھے۔ ہوائیں پھر سے چلنا شروع ہوگئی تھیں اور سورج ایک بادل کے پیچھے چھپ کر اپنی کرنیں منعکس کرکے اس کے کناروں پر چمکنے لگا تھا۔

میں نے ایک بزرگ سے پوچھا تھا کہ ”کیا بچے بھی دعائیں دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہاں۔ جب وہ آپ کی بات پر مسکراتے ہیں تو وہی دعا ہوتی ہے۔“

اور آج مجھے سعد بہت ساری دعائیں دے رہا تھا۔

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا اور پھر مجھے اس جگہ سے پیار ہوگیا۔ وہ جگہ اپنی اپنی لگنے لگی۔ آس پاس کے درخت مجھے اپنے دیرینہ دوست لگنے لگے۔ پھول باہر نکلتے، مسکرا کر چھیڑتے اور دوبارہ چھپ جاتے۔ میں نے ایک کنکر جھیل کی سطح پر لڑھکایا اور جھیل نے مجھے جواب لہروں کی صورت دیا جو پھیل کر میری جانب بڑھیں۔ درختوں پر بیٹھے پرندے پہلے تو خاموش تھے اور اچانک وہ نغمے گنگنانے لگے۔ اپنی توجہ مبذول کرانے کے لیے شاخ سے شاخ پرواز بھرنے لگے۔

میں وہاں سے اٹھا اور سعد اسے اشارہ سمجھ کر اٹھ گیا۔

میں واپس چلا تو وہ بھی اچھلتا کودتا میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے ڈریک کی ڈور وال آہستگی سے کھسکائی۔ اندر پاؤں داخل ہوا کہ وہ سوتی ہوئی اٹھ نہ جائے۔ دو بج چکے تھے۔ اسے سوتے ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا تھا۔ میں نے صوفے پر لیٹتے ہوئے سعد سے کہا۔ ”دوست جاکر ماما کو دیکھو۔ سو رہی ہیں یا اٹھ چکی ہیں۔“

وہ دھیرے سے گیا اور واپس آکر بولا۔ ”لگتا ہے ابھی بھی تھکی ہوئی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اب جاکر آہستگی سے پوچھو کہ آپ ابھی بھی تھکی ہوئی ہیں۔“

وہ گیا اور میں چائے بنانے لگا۔ چائے کی پتی اور چینی وہ اپنے ہمراہ لائی تھی۔ چائے بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟ مگر جب کوئی آپ کے لیے بنا لائے تو کتنی تسکین ملتی ہے۔ اس کا اندازہ بہرحال مجھے تھا۔

اس کے بیدار ہوکر باہر آنے کی خبر مجھے اس طرح ہوئی کہ سعد اس سے پہلے دوڑتا ہوا آیا اور بولا۔ ”وہ اب تھکی ہوئی نہیں ہیں۔ وہ جاگ گئی ہیں۔“

اس کے پیچھے نیند بھری آنکھوں سے نسرین دونوں

ہاتھوں سے اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے نکلی۔ ننگے پاؤں تھی اور گہرے براؤن لکڑی کے فرش پر اس کے سفید چمکتے نازک پاؤں دمک رہے تھے۔ مجھے چائے بناتے دیکھ کر میرے پاس چلی آئی اور بولی۔ ”سعد کی جانب سے بے فکر تھی تو گہری نیند آگئی۔“ پھر مجھ سے بولی۔ ”تم ہٹو میں چائے بنا دیتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اپنا یہ تکلف بند کرو۔ چائے بن چکی ہے۔ بیٹھو میں لاتا ہوں۔“

وہ فریج کی جانب گئی اور ایک لفافے سے سموسے نکالے اور پھر مائیکروویو میں گرم کرنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ سموسے کہاں سے لائی ہو؟“

جواب دیا۔ ”پاکستانی گروسری شاپ میں عام ملتے ہیں۔ اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

ایک چھوٹی ڈائننگ ٹیبل بھی کچن میں رکھی تھی۔ میں دو مگ چائے کے بنا کر ٹیبل کے گرد رکھی ایک کرسی پر آبیٹھا۔ وہ سموسے لے کر صوفے پر جا بیٹھی اور بولی۔ ”یہیں بیٹھتے ہیں۔“ میں نے اپنے کندھے اچکائے اور صوفے پر آبیٹھا۔

سعد اپنی ماں سے بولا۔ ”انکل بھی کنارے پر خاموش بیٹھ کر مچھلیاں گنتے رہے۔ میں نے بھی بہت ساری گنیں۔“

میں بولا۔ ”یہ بچہ اب شرارتی ہوتا جارہا ہے۔ تمہارے قابو میں آنے والا نہیں۔“

وہ بولی۔ ”مجھے معلوم ہے تم ہی اسے قابو میں رکھنا۔“

معلوم نہیں وہ نیند لے کر مطمئن تھی یا میری یقین دہانیوں سے۔ میں خود اسے مطمئن دیکھنا چاہتا تھا۔ ماں بیٹے کو مسرور دیکھ کر میں نسرین سے زیادہ مطمئن تھا۔ ہر چیز ویسے ہو رہی تھی جیسا میں چاہتا تھا۔ اس کا انجانا خوف ختم کر کے میں اسے خود اعتمادی دینا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مرحلہ بھی زیادہ دور نہیں۔

سموسوں کے ساتھ گرم چائے کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ میں نے نسرین سے کہا کہ وہ تیار ہو جائے اور اتنی دیر میں، میں کیب کو فون کرتا ہوں۔ میں ڈوبتے سورج کا منظر سینڈ ہنکس بیچ پر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسا حسین منظر پورے اونٹاریو میں اور کہیں نہیں دکھتا۔

جتنی دیر میں ہم تیار ہوئے اتنی دیر میں کیب گھر کے سامنے ڈرائیو وے پر آرکی۔

نسرین نے ضروری سامان پیک کر کے بیگ میں ڈال دیا تھا۔ وہ تھرماس بھی اٹھا لائی جس میں وہ چائے لے کر جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ تھرماس بھی تم لے آئیں۔ اتنا سامان لانے کی کیا ضرورت تھی۔“

کہنے لگی۔ ”خود ہی تو ایک بار بولا تھا کہ اگر چائے نہ ملے تو میں چڑچڑا ہو جاتا ہوں لڑتا ہوں۔“

”تو پھر۔“ میں نے وضاحت مانگی۔

”پھر یہ کہ تمہارے دماغ کو ہر وقت میں پُرسکون رکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں رکھے بولی۔

نسرین کا اتنا زیادہ خیال رکھنا مجھے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اتنی زیادہ چاہت کا میں مستحق ہرگز نہیں ہوں۔ میری بیوی جو میرا خیال رکھتی تھی تو وہ میرے رشتے میں آ چکی تھی۔ اس کے پاس وزنی دلیل تھی کہ یہ اس کا حق ہے یا فرض ہے۔ میں بھی اگر کچھ اسے لوٹاتا تو ایک حق کے ناطے لوٹاتا تھا۔ ادھر نسرین تھی جو کسی ان دیکھے کچے دھاگے سے بندھی وہ سب کرتی جارہی تھی جو میری اوقات سے باہر تھا۔ نہ وہ حق جتاتی اور نہ کچھ مطالبہ کرتی تھی۔ میں گہری رفاقتوں سے آج تک فرار حاصل کرتا رہا تھا اور یہ آہستگی سے مجھے باندھ رہی تھی۔ میں ایک عام آدمی تھا اور عام آدمی کی طرح خوب صورت ساتھ مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ میں آج تک اپنی مرضی سے زندگی گزارتا چلا آرہا تھا اور مجھ پر اپنی محبتوں کا قرض چڑھاتی چلی جارہی تھی۔ اس کی قربت میں تمازت تھی اور اس کی دوری میں سمندروں جیسی اداسی۔ میں اس کے پیار کے آگے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے وہ سب کچھ دینا چاہتا تھا کہ آگے جا کر وہ اس پر فخر محسوس کر سکے۔ اس کے پیار کا لمس مجھے بے چین کر گیا تھا۔ وہ میرے چہرے پر نظریں رکھے کھڑی تھی اور میں نے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

کیب ڈرائیور وہی تھا جو ہمیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمیں سینڈ ہنکس پارک جانا ہے اور غروب کے رنگ دیکھ کر ہم فوراً وہاں سے نکل پڑیں گے۔ کہنے لگا کہ پندرہ منٹ کا فاصلہ ہے، ہمیں وہاں چھوڑ کر شام کے وقت دوبارہ لینے آجائے گا۔ میں نے اپنا کریڈٹ کارڈ نمبر اس کو دیا اور ساتھ ہی کچھ ڈالر نکال کر اسے ٹپ بھی دے دی جو اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور وہ ریورس کر کے سڑک پر لایا تو دائیں ہاتھ مڑ گیا۔

میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ماں اور بیٹا پیچھے بیٹھ گئے۔ بیٹے نے ابھی تک وہ چھتری تھامی ہوئی تھی۔ چھتری پر

گرفت کو شاید سعد اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ بچہ ہو یا بڑا جس پر دل آجائے اس پر اپنی گرفت چاہتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس کاؤنٹی میں کوئی قصبہ، گاؤں یا شہر کچھ تو ہوگا۔“

ڈرائیور نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ ”ینگ مین! آپ لوگ کاؤنٹی کے قصبے پکٹن ہی میں ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہم سینڈ ہنکس پار جاتے ہوئے پکٹن کے مرکزی حصے سے گزریں گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں وہ صرف گزر جانے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ آپ کو وہاں اتر کر دو تین گھنٹے لگانے چاہئیں ورنہ آپ اسے مس کر دیں گے۔“ اس کے کہنے کا صاف مطلب یہ تھا کہ اگر پکٹن کا بازار نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا پھر مجھ سے پوچھا۔ ”واپسی کب ہے؟“

میں نے جواب دیا کہ کل پانچ بجے شام کی شٹل لینی ہے۔

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”اگر آپ کل بارہ بجے تک نکل جائیں تو میں آپ کو یہاں کے دو اہم اور خوب صورت مقامات دکھلا سکتا ہوں۔ ایک تو سامنے پہاڑ پر جھیل ہے اور دوسرا پکٹن کا ڈاؤن ٹاؤن (مرکزی علاقہ)۔“

میں نے گھوم کر نسرین کی جانب دیکھا کہ اس کی رائے بھی لے لوں۔ تو ڈرائیور ہنس کر بولا۔ ”بیوی سے پوچھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔“

میں نے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کے بال پکڑ لیے اور نسرین نے ہنسی دبانے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”واپسی پر تم کو بتائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ ان دو مقامات پر جائیں۔“

ہم نہایت ہموار، صاف ستھری اور بل کھاتی دورویہ سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ ایسے کہ ہم پانی کی سطح پر کسی بحری جہاز میں سفر کر رہے ہوں۔ ہمارے دونوں جانب جنگلات تھے۔ اتنے گھنے کہ ان کے اندر جا کر شام کا ماحول ملتا ہوگا۔ آسمان نیلا اور چمک دار تھا۔ سفید اور بھورے بادلوں کے ٹکڑے ہواؤں کے ساتھ اپنی من موجیاں کر رہے تھے۔ پیچھے پہاڑیاں سی تھیں جن پر جنگلات تھے۔ ڈرائیور نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ اس پہاڑ پر جھیل ہے۔ پہاڑ پر جھیل میرے لیے عجیب بات تھی کیونکہ اردگرد تک نہ کوئی دریا تھا اور نہ کوئی بلند برفانی پہاڑ جو اس جھیل کو پانی سے بھرتے رہتے۔

میری نظریں آس پاس اور سامنے کے مناظر پر تھیں اور ڈرائیور معلومات کے خزانے مجھ پر لٹا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اور میں سنتا جارہا تھا۔ ”سینڈ ہنکس بیچ دنیا کی سب سے بڑی تازہ پانیوں کی ریتیلی بیچ ہے۔ گیارہ میل لمبی ہے۔ سینڈ ہنکس پارک نے تین سمت سے کاؤنٹی کو گھیر رکھا ہے۔ بہت بڑا پارک ہے اور لاکھوں لوگ گرمیوں میں یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں۔“ اس نے ستائشی نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں نے مرعوب نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ میں نے اپنا ردِعمل دیا تو ہماری کیمسٹری ملتی چلی گئی۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اسے بہترین سننے والا مل گیا ہے۔

اس نے مجھے زیادہ مرعوب کرنے کے لیے ایک نئی

چکڑالہ کا نقوی البخاری قبیلہ

ضلع میانوالی کے قدیم ترین مردم خیز گاؤں چکڑالہ کا نقوی البخاری قبیلہ نقوی عالمی شہرت یافتہ ہے جنہوں نے اس گاؤں کی علمی، ادبی، صحافتی، دینی، مذہبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی تعمیر و ترقی میں ایک فعال و نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ حضرت سید محمد حسین بخاریؒ نبیرہ پیرابن حضرت اولیاء سید محمد شریف جو اوچ بلوٹ شریف ڈیرہ اسماعیل خان سے بغرض عبادت و تبلیغ گوشہ تنہائی کے لیے تشریف لائے تھے چکڑالہ نام تجویز کر کے آباد کیا۔ آپ جید عالم دین اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ حضرت مخدوم اعظم سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاری م-1291ء ب 1199ء۔ اوچ شریف بہاولپور کے فرزند دوم حضرت سید علی سرمستؒ کے فرزند ارجمند حاجی سید بہاول حلیمؒ کی نسل مبارک سے تھے۔ اس خاندان کو علمی و ادبی مذہبی و دینی حلقوں میں عزت و احترام وقار و اکرام حاصل ہے۔ پنجاب کے اس معروف گاؤں میں نقوی البخاری قبیلہ کو ان کے علم و فضل و زہد تقویٰ کی وجہ سے ایک اہم اور خاص مقام حاصل ہے۔ چکڑالہ علمائے کرام اور اولیاء اللہ کی سرزمین اور مسجدوں کا گاؤں ہے۔ دینی مدارس بھی کافی تعداد میں ہیں۔ روز و شب درس و تدریس کا سلسلہ صدیوں سے جاری و ساری ہے۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

بات جیسے اپنے ریوالور میں لوڈ کر کے میرے سینے میں اتار دی۔ ”بہت پہلے نیوڈ بیچ ہوا کرتی تھی۔ ساحل پر مرد و زن کسی کو بھی کپڑے کیا چیتھڑے پہننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ سب قدرتی لباس میں نہاتے بھی تھے، پکنک بھی مناتے تھے۔ پکاتے بھی اور کھاتے پیتے بھی تھے۔“ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نسرین منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سیٹ پر پیچھے جا لگی۔ میں لاحول پڑھنے لگا۔ میں اس بیچ پر بھی نہیں آتا اگر گرمیوں کے دن ہوتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابھی بہار ہے اور فضا خنک تھی۔ اس موسم میں لوگ صرف آتی جاتی لہروں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ نہانے کا موسم ابھی آگے آنا تھا۔ میں پارسائی کا دعویٰ تو کبھی کر ہی نہیں سکا مگر دھجیوں میں عورت کو ملبوس دیکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس بار تو میرے اندازے کے مطابق نہانے کے لباس میں کوئی مرد یا عورت موجود نہ تھی مگر اگلے سال میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اونٹاریو کے شمالی علاقوں سے اپنے ایک مہمان کے ہمراہ گزر رہا تھا۔ ہم ایک بیچ میں جھیل کے کنارے کو دیکھنے کے چکر میں گئے تھے۔ نرم ریت پر الٹی سیدھی عورتوں کو ہم پھلانگتے ہوئے گئے تھے۔ میں نے قریب سے بغور معائنہ کیا تو بھید کھلا کہ انہیں کپڑوں میں دیکھنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ بہت سے عیب چھپے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایسی جگہ جانے کی کبھی تمنا ہی نہیں کی اور آج لکھتے ہوئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے بعد سمندروں کے ساحلوں کو میں نے بہت زیادہ انجوائے بھی کیا ہے مگر بیچوں کی طرف نہیں گیا۔

ڈرائیور ہمارے ردعمل سے ذرا محتاط ہو گیا تھا کہنے لگا۔ ”ہم خود قدامت پسند لوگ ہیں۔ تہذیب بگاڑنے والے ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ یہ بے حیائی ہم سے بھی برداشت نہیں ہوتی۔ اب یہ لوگ ہر وقت آپے سے باہر رہتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب کیا معاملہ ہوتا ہے؟“

وہ بڑے تفاخر بھرے لہجے میں بولا۔ ”اب تو ہر لڑکی نے بکنی پہنی ہوتی ہے۔ تھینکس گاڈ! عریانی کے دن چلے گئے۔“

میں نے پھر مدبرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا اور وہ مجھے ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

جنگلات گھنے ہوتے گئے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ کئی میلوں میں پھیلا پارک شروع ہوا ہی چاہتا ہے۔ وہ بولا۔ ”انیسویں صدی میں یہاں......“

نسرین پر میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”تب کچھ اور ہوتا تھا؟“

میری بات کا اس نے بہت لطف لیا اور بولا۔ ”نہیں نہیں اس وقت تو انہیں نہانا بھی نہیں آتا ہوگا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ بہت لمبی لمبی گھاس ہوا کرتی تھی۔ یہ گایوں اور بکریوں کی بہت بڑی چراگاہ تھی پھر لوگوں نے یہاں کے جنگل کاٹ ڈالے اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔“

میں نے کہا۔ ”مگر جنگلات تو اب بھی ہیں یہاں پر؟“

وہ بولا۔ ”یہ حکومت کینیڈا نے بیسویں صدی کے شروع میں دوبارہ لگائے تھے۔“

میں دور دور تک میلوں پھیلے جنگلات دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ سو سال پہلے حکومت نے درخت لگائے ہوں گے اور آج یہ پورا علاقہ خوشحال ہو گیا ہے۔

مجھے سوچنے کی زیادہ ضرورت نہ تھی کیونکہ سامنے پارک کا بیریئر نظر آ رہا تھا۔

کچھ کاریں تھیں چند کیمپنگ ٹریلر تھے اور بہت سی ہیوی موٹر ہومز بھی لائن میں کھڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہم بھی بیریئر سے گزرے اور جانے کے لیے معمولی سی فیس ہوتی ہے جو آٹھ دس ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

یہاں پارک کا تصور پاکستان کے پارکوں سے انتہائی مختلف ہے۔ جو لوگ یورپ یا نارتھ امریکا میں آتے جاتے رہتے ہیں یا ان علاقوں میں بستے ہیں وہ بہتر جان سکتے ہیں۔ یہ پارک اس طرح کے نہیں ہیں کہ آپ وہاں جائیں، گیٹ پر رش ہے، پارکنگ بے ترتیب اور جا بجا ٹھیلے والے نظر آ رہے ہیں۔ لوگ دریاں بچھا کر جلی اور سوکھی گھاس پر بہت سارا کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے رکھے خوش و خرم بیٹھے ہیں۔ کچھ جھولے جن پر بچے اچھل اچھل کر چڑھتے ہیں اور بے تحاشا شور ہوتا ہے۔ پہلے تو ڈسٹ بن ہوتے نہیں اور اگر مہیا کر بھی دیے جائیں تو کوئی ہی شاید استعمال کرتا ہوگا۔ میں پاکستانی پارکس کی حیثیت کم نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تو ان جگہوں پر زیادہ تفریح حاصل کرتا ہوں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ پچاس ایکڑ کے پارک مشکل سے رہ گئے ہوں گے۔ اگر کوئی اتنا بڑا پارک مل جائے تو لاکھوں کی آبادی میں چند ہی ہوں گے اور اسی لیے ہزاروں افراد چھٹی کے دن وہاں کا رخ کر لیتے ہیں۔

مغربی ممالک میں کچھ نیشنل پارکس ہوتے ہیں۔ یہ مکمل جنگل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ سیکڑوں میل کے رقبے

میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کا کچھ حصہ مخصوص کر کے وہاں ہوٹل، ریسٹورنٹس اور دوسری تفریحی سرگرمیاں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ان میں میلوں پھیلی جھیلیں، آبشاریں ہوتی ہیں۔ جنگلی مخلوق آزادانہ گھومتی ہیں۔ یلو اسٹون یہاں ایک نیشنل پارک ہے۔ سیکڑوں میل لمبی تو اس میں سڑکیں ہیں۔ گھنٹوں اپنی پاور فل گاڑیوں پر سفر کرتے جائیں مگر یہ جنگل اور بیابان ختم نہ ہوگا۔ کچھ پارکس صوبائی حکومت کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ ان کا رقبہ بھی پچاس سو میل سے کم نہیں ہوگا۔ ہم جس پارک میں اب داخل ہوئے تھے۔ وہ صوبائی پارک تھا۔ سینڈ بینکس پارک بھی کئی میل میں پھیلا ہوا ہے۔ دو بڑی جھیلیں ہیں جو سیکڑوں میل لمبی اور چوڑی اونٹاریو جھیل سے منسلک ہیں۔ ان میں جزیرے ہیں اور جزیروں پر لوگوں کے مکانات ہیں۔ صوبائی پارکس کے بعد کاؤنٹی پارکس آتے ہیں۔ کاؤنٹی پارکس کو میں ایسے بیان کرتا ہوں کہ جو میرے گھر کے ساتھ ہے وہ بھی کم از کم بیس مربع میل میں پھیلا ہوا ہے پھر سٹی کے پارکس ہوتے ہیں اور وہ بھی اکثر میلوں میں... پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں گھاس پر کوئی بھی بیٹھنا پسند نہیں کرتا کہ گھاس خراب ہوتی ہے مگر لوگوں کے لیے جگہ جگہ پکنک بینچ، میزیں، واش روم، پارکنگ ہر چند بینچوں کے درمیان باربی کیو کی انگیٹھی موجود ہوتی ہے مگر ہم دیسی لوگ عموماً گھاس پر چادریں بچھائے بیٹھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہر قسم کے پارک میں اتنے گھنے جنگل ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ جنگل کی زندگی کو پسند کرتے ہیں تو ان کے لیے چار پانچ میل لمبے لمبے مختلف ہائکنگ ٹریل بنا دیے جاتے ہیں۔ ہر موڑ پر نشان لگے ہوتے ہیں۔ راستے میں واش روم موجود ہیں۔ کوئی تھک جائے تو ان کے لیے جنگل کناروں پر بینچ ہوتے ہیں پھر یہاں جنگلوں کے درمیان ایک حصہ کیمپنگ کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ کسی کے پاس کیمپر یا ٹریلر ہو تو ان کے لیے علیحدہ جگہ مخصوص ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ٹینٹ لگانے ہوں تو ان کے لیے سائٹ مختلف جگہ پر ہوتی ہے۔

کیمپر یا ٹریلر کیا ہوتا ہے ایک چلتا پھرتا چھوٹا سا گھر۔ جس میں ایک دو کمرے، لیونگ روم، باتھ روم اور کچن ہوتا ہے۔ صوفے رکھے ہوتے ہیں اور ٹی وی بھی ہوتا ہے۔ ہر ٹریلر اپنی مخصوص جگہ پر جنگل کے اندر پارک کیا جاتا ہے۔ بجلی اور پانی کے کنکشن وہاں زمین میں لگے ہوتے ہیں۔ ٹریلر سے تاریں اور پائپ نکال کر ان سے منسلک کر دینا کافی ہے۔ ٹریلر میں پاور اور پانی آ جاتا ہے۔ نہ بجلی جاتی ہے اور نہ پانی ختم ہوتا ہے۔ ٹریلر والے کرسیاں نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں اور دو چار دن گزار کر واپس گھروں کو سدھار جاتے ہیں۔ اسی طرح سے ٹینٹ لگانے والے اپنی مخصوص جگہوں پر ٹینٹ لگاتے ہیں۔ ساتھ میں کھانا بنانے کے لیے چولہے بنے ہوتے ہیں۔ سامنے صاف ستھرے ہاتھ روم ہیں۔ قریب کوئی نہ کوئی جھیل ہوتی ہے۔ پیدل چلنے کے لیے واکنگ ٹریل بنے ہیں اور آٹھ ڈالر ایک رات کے لیے کرائے پر ٹینٹ لگانے کی جگہ مل جاتی ہے۔

اس پارک میں پانچ سو ٹریلر کی کیمپنگ کی سہولت موجود ہے اور سیکڑوں ٹینٹ کیمپنگ کے مقامات پر ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ایک ٹینٹ دوسرے کے سامنے لگا ہے۔ دو ٹینٹ کے درمیان پرائیوسی کے لیے پچاس پچاس فٹ سے زائد کا کم از کم فاصلہ ہوگا بلکہ ان کے درمیان کئی بلند درخت بھی ہوں گے۔

امریکا اور کینیڈا میں ہر ملک کے اندر کئی ہزار کیمپنگ سائٹس ہوں گی اور تمام میں ہر طرح کی سہولت موجود ہوں گی۔ گرمیوں میں روزانہ ہزاروں ٹریلر کسی نہ کسی کیمپنگ کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ گرمیوں کے تین ماہ میں تو جگہ بھی بمشکل ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر کیمپنگ میں لکڑی کے کیبن بھی جنگل میں بنے ہوتے ہیں۔ یہاں لاکھوں لوگ گرمیوں میں کیمپنگ کے لیے نکلتے ہیں۔ سو ڈالر میں پورا گھرانا چند دن کے لیے تفریح حاصل کر لیتا ہے۔

اتنی زیادہ تفصیل سے مجھے یہ بتانا مقصود تھا کہ اپنے پاکستانیوں کو اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی بھی مل جائے اور معلومات بھی مل جائیں۔ مجھے یہ معلومات اس طرح سے ملی ہیں کہ میں نے ان ممالک میں بہت زیادہ کیمپنگ کی ہے۔ جہاں میں آج آیا ہوں یہ میرا کسی کیمپنگ پارک میں آنے کا پہلا موقع تھا اور میں حیرت سے اس قدر مختلف پارک کو دیکھ رہا تھا۔

ہم بیریئر کراس کر کے اندر داخل ہوئے۔ ایک بڑی پارکنگ میں ہماری کیب رکی۔ ہمیں شام سات بجے ادھر ہی ملنے کا ڈرائیور نے کہا۔ ہم اترے اور وہ مڑ کر واپس چلا گیا۔

نسرین کے پاس ایک بیگ تھا۔ اسے میں نے لے لیا۔ اٹھایا تو بھاری تھا۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ ”اس میں کیا ڈالا ہوا ہے؟“

بولی۔ ”سب سامان جو ضرورت پڑ سکتا ہے۔“ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ”مجھے دے دو اگر تمہیں بھاری لگ رہا ہے۔“

میں نے ہنس کر اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ ہم پارک انتظامیہ کے سیاحتی سینٹر کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے پارک کا نقشہ ہاتھ میں تھما دیا نقشے پر ٹریل کے نقشے۔ ساری بیچز کا محل وقوع اور بہت ساری معلومات درج تھیں۔ ساتھ ایک شاپ کھلی تھی۔ کولڈ ڈرنکس اور مختلف اقسام کے جوس انہوں نے سامنے کاؤنٹر پر سجائے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ پینے کا... پانی اور جوس لے لوں۔ میں کاؤنٹر تک گیا تو نسرین نے کہنی پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب کیا بات ہے۔“

وہ بولی کہ اگر پانی، جوس یا کچھ کھانے کو لے رہے ہو تو وہ میں پہلے ہی سے بیگ میں ڈال کر لے آئی ہوں۔ میں نے پوچھا۔ ”تو جو وزن اٹھائے تم گھوم رہی ہو۔ وہ ان اشیاء سے بھرا ہے؟“

وہ بولی۔ ”جب ارزاں ملتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ ان کی مہنگی چیزیں خریدیں۔“

سعد چھتری تھامے ہم دونوں کو سر اٹھائے باتیں کرتے سن رہا تھا دنیا جہان کی معصومیت اس کے چہرے پر تھی۔

یہاں متعدد بیچز تھیں۔ ایسٹ لیک بیچ، ویسٹ لیک بیچ، آؤٹ لٹ بیچ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ہمارے سامنے اس وقت سینڈ بنکس بیچ تھی۔ ہمارے اور جھیل کے درمیان ریت ہی ریت تھی۔ جہاں ریت ختم ہو رہی تھی وہاں درخت تھے۔ کچھ لوگ درختوں کے نیچے چادریں بچھائے ریت پر لیٹے تھے۔ کچھ پانی میں اپنی پینٹ کے پائنچے اوپر چڑھائے چلتے نظر آرہے تھے۔ یہ موسم وہ نہ تھا کہ وہ جھیل کے پانیوں میں گھس جاتے۔ یہاں جھیلیں اونٹاریو لیک کی خلیج میں تھیں۔ تین جانب کاؤنٹی کے پارک نے انہیں گھیر رکھا تھا اور جنوبی سمت میں یہ اونٹاریو جھیل سے مل کر کسی سمندر کی تصویر بن رہی تھی۔ شفاف پانیوں میں نیلا آسمان جھیل کے پانیوں کو بھی نیلا کر رہا تھا۔ میں جب جھیلوں کو نیلا کہتا ہوں اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آسمان نیلا اور چمک دار تھا۔ لیک اونٹاریو کا دوسرا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے پار امریکا تھا۔ ساحل پر جھاگ اڑاتی لہریں ایک سُر میں آتیں اور مختلف سُر میں واپس چلی جاتیں۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے اور بادلوں تلے مختلف پرندوں کے جھنڈ نیچی پرواز کر رہے تھے۔

جھیل کی جھاگ اڑاتی لہریں جب ساحل سے ٹکراتیں تو وہاں کئی ننگے پاؤں کے بوسے لے کر واپس آنے کے لیے لوٹ جاتیں۔ ساحل کے قریب پانی سبز اور سرمئی تھے اور اتنے شفاف کہ ننگے پاؤں چمکتے تھے۔ خنک تازہ ہوا بار بار آکر ٹکراتی اور تازگی کے تحفے دے کر جنگل میں گھس جاتی تھیں۔ درختوں کے پتے، پھول اور ٹہنیاں ان ہواؤں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ زیادہ لوگ تھے اور نہ ہی تنہائی تھی۔ جتنے بھی لوگ تھے ان کے قہقہے لہروں اور ہواؤں کے شور میں دب گئے تھے۔ ساحل پر سورج چمک رہا تھا۔ چھاؤں جنگل کنارے درختوں کے نیچے تھی۔ وہاں اگر کچھ بینچیں تھیں تو وہ اب سیاحوں کی ملکیت تھیں۔ بہت سوں نے ریت پر چھاؤں میں چادریں بچھائی تھیں اور جسموں کو دھوپ اور چھاؤں کی زد میں کر رکھا ہوا تھا۔ ان کو تو کپڑے اتارنے کا موقع چاہیے ہوتا ہے۔ بہانہ بھلے نہانے کا ہو یا سن باتھ کا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں بھی کوئی چادر لے آنی چاہیے تھی۔ ریت پر بیٹھنے سے الجھن ہوتی ہے۔ نسرین قریب آئی اور بولی۔ ”کتنی دیر جھیل اور آسمان دیکھتے رہو گے۔ کہیں جا کر پہلے بیٹھتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بینچ ہی فارغ نہیں اور ہمارے پاس بچھانے کے لیے کوئی چادر بھی نہیں ہے۔ کہاں بیٹھیں؟“

بولی۔ ”چادر تو میں لائی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ درختوں تلے ایک خالی جگہ کی جانب بڑھ گئی۔

ہم نے دھوپ چھاؤں والی ریتیلی زمین پر ایک بڑی چادر بچھائی۔ سب نے اپنے جوتے اتارے اور چادر پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کا بیگ کھینچ کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور اوپر درخت کے پتوں اور پھولوں کو دیکھنے لگا جو میرے سر پر سرسرا رہے تھے۔ نسرین اپنے دونوں پاؤں جوڑے، گھٹنے ٹھوڑی سے لگائے دھوپ کے سیاہ چشمے لگائے بیٹھی تھی۔ سعد کھسکتا ہوا میرے پاس آیا اور کان میں بولا۔ ”ماما کو سمجھائیں کہ وہ ایران واپس نہ جائے۔“

میں نے اس کے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھے اور کہا۔ ”تم بات شروع کرو پھر میں بھی کہتا ہوں۔“

وہ دوبارہ سے کھسکتا ہوا ماں کے پاس جا بیٹھا۔ نسرین بغور یہ دیکھ رہی تھی، مجھ سے بولی۔ ”یہ تم سے کیا کہہ رہا تھا؟“

اتنے میں سعد نے اپنے دونوں ننھے ہاتھ ماں کے گھٹنوں پر رکھے اور بولا۔ ”انکل کہتے ہیں کہ میں تمہاری ماما کو سمجھاؤں گا کہ وہ ایران واپس نہ جائے“ پھر ماں کی

گردن میں بازو حمائل کرتا ہوا بولا۔ ”ماما اب انکل بھی کہہ رہے ہیں پلیز مت جائیں ناں۔“

نسرین نے سعد سے کہا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ تمہارے انکل مجھے جانے سے روک بھی رہے ہیں؟“ پھر میری جانب دیکھ کر بولی۔ ”انہوں نے مجھ سے تو نہیں بولا۔“ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

میں تیزی سے اٹھا اور اپنے ہاتھ بڑھا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور بولا۔ ”پلیز اب تو مت جاؤ۔ تم چلی گئیں تو سعد کے انکل بہت اداس ہو جائیں گے۔“

وہ گھبرا گئی۔ بولی۔ ”ہاتھ تو چھوڑو۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے وعدہ کرو۔ تب چھوڑوں گا۔“

آہستگی سے بولی۔ ”سعد کیا کہے گا؟“

میں نے اسی آہستگی سے کہا۔ ”پہلے وعدہ دو۔“

اس نے سعد سے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی مگر تمہارے انکل کو پہلے ایک وعدہ دینا ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بھی وعدہ لے لو۔“

بولی۔ ”وہی ایک ہی وعدہ۔“

میں نے پوچھا۔ ”کون سا؟“

سعد جواب تک تالیاں بجا رہا تھا۔ اس کی جانب گھوم کر بولی۔ ”اگر یہ وعدہ کریں کہ ہمیں کبھی نہیں چھوڑیں گے.... تب۔“

اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں تلے سے نکال کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا اور بولی۔ ”تو کیا تم وعدہ دیتے ہو؟“

اس معصوم سی حرکت نے میرے اندر طوفان سا اٹھا دیا۔ بیوی بچے ذہن کے کینوس پر ابھر آئے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر مضبوطی سے اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر رکھ دیا اور بولا۔ ”ان لہروں، ہواؤں، آسمان، بادلوں اور پرندوں کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔“ پھر مجھے ایسا لگا کہ فضا تھم گئی ہو، ہوائیں ٹھہر گئی ہوں۔ نظریں پتھر بن گئی ہوں۔ پرندے رک گئے ہوں۔ درخت ساکن ہو گئے ہوں اور لمس گرفت میں بدل گئے ہوں۔

پھر جیسے فضا میں ارتعاش پیدا ہوا، ہوائیں چل پڑیں۔ نظریں کچھ اٹھیں اور کچھ جھک گئیں۔ پرندوں نے پروازیں بھریں، درخت پھر سے جھومنے لگے اور گرفت چاہت میں بدل گئی۔ ہم دونوں کچھ نہ بھی کہتے ہوئے بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ میں فرشتہ نہیں ایک انسان تھا۔ میں پتھر بنا تھا مگر اس کی محبت اتنی شدید تھی کہ میں موم بنتا گیا۔ میں ان لمحوں کا اپنی کیفیت کا کوئی جواز نہیں دوں گا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس نے مجھے توڑ دیا تھا۔ میں اتنا مضبوط نہ تھا جتنا سمجھتا تھا اور نہ ہی مجھے اتنا مضبوط بن کر دکھانا تھا۔ میں ایک کمزور انسان تھا اور کمزور ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں اپنے اندر سے مطمئن تھا نہ مجھے کوئی اعتراف گناہ تھا اور نہ احساس ثواب۔

میں ایک سرشاری کے عالم میں تھا اگر یہاں ہم تنہا ہوتے تو میں اسے اپنے گلے لگا لیتا۔ اسے اپنی روح میں اتار لیتا۔ وہ جو مجھے دیکھ کر اپنا وجود ہی بھول جاتی تھی۔ اسے اپنے پر اختیار نہ رہتا تھا۔ میں کیسے اسے نظر انداز کر دیتا۔ ہماری خاموشیوں نے اتنا کچھ کہہ ڈالا کہ ہمیں سننے سنانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

میں دوبارہ سے خاموش لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر شگوفے پھوٹتے تھے۔ اس کے چہرے پر سورج کی کرنیں منعکس ہوتی دکھلائی دیتی تھیں۔ اس نے میرے لیے تھرماس سے چائے ایک مگ میں انڈیلی۔ ایک پلیٹ میں چند سینڈوچ دیے۔ میں چائے پینے لگا۔ چائے ابھی تک گرم تھی۔ میرا کچھ کھانے کا دل نہ کرتا تھا۔ پلیٹ میں نے اسے واپس کر دی۔ اس نے ایک سینڈوچ سعد کو دیا اور دوسرا واپس رکھ دیا۔

ہم تینوں ننگے پاؤں ساحل پر آئے۔ لہریں مجھ سے ٹکرائیں تو ریت پاؤں تلے گدگدی کرنے لگی۔ سعد ایک اور فیملی کے بچوں کے ہمراہ ریت پر کچھ جانور اور گھر بنانے لگا۔ اس فیملی کے گورے مرد نے مجھ سے کہا۔ ”آپ لوگ واک کریں میں آپ کے بیٹے کا خیال رکھتا ہوں۔“

جھیل کی لہروں کا پانی خنک تھا۔ ٹھنڈک میرے پاؤں سے پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ ہمارے بائیں جانب تاحد نظر نیلے پانی تھے اور ان پر رواں کشتیاں۔ لوگ مچھلی کے شکار کے لیے دور دور جھیل میں نکل جاتے ہیں۔ جہاں جھیل کا افق اور آسمان آپس میں مدغم ہو رہے تھے ہمیں وہاں بحری جہاز نظر آ رہے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیسی جھیلیں ہیں جہاں بحری جہاز بھی چلتے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ تجارت کا پرانا راستہ ہے۔ لیک اونٹاریو سے لارنس دریا اور پھر یہ دریا بحر اوقیانوس میں جا کر گرتا ہے اور یہ سمندر نارتھ امریکا اور یورپ کے بیچ ہے۔ یورپ سے اونٹاریو تک کی تجارت اسی راستے سے ہوتی ہے۔

ہمارے بائیں جانب ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ یہ کسی صحرا کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ ایسا صحرا جس میں بلند درخت بھی ہواؤں سے جھومتے تھے۔ مجھے کسی نے بعد میں بتایا کہ جب تیز ہوائیں چلتی ہیں تو اس صحرا میں بگولے بھی اٹھتے ہیں۔ مجھے یہ اشتیاق ہی رہا کہ کسی نیلی جھیل اور صحرائی بگولوں کی ایک ساتھ میں تصویر کشی کروں۔ جھیل کا باقی ساحلی حصہ ان ریتیلے ٹیلوں کی وجہ سے آنکھوں سے اوجھل تھا۔ درمیان میں اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ اچانک ٹیلوں کے پیچھے سے ہزاروں پرندے ایک ساتھ آسمان کی جانب بلند ہوئے۔ ان کے پروں کی سرسراہٹوں سے لہروں کی گونج بھی دب گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سیاہ ہو گیا ہو....

یہ کینیڈین گیس (مرغابیاں) تھیں۔ جنوبی امریکا کے ملک ارجنٹائن اور چلی سے لاکھوں کی تعداد میں پرندے ہجرت کر کے امریکا اور کینیڈا پہنچتے ہیں۔ ان کے آنے کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اتنی زیادہ مرغابیوں کو دیکھ کر اور ان کی کیں کیں کا شور سن کر ہم دونوں دم بخود تھے۔ تادیر وہ ہمارے اوپر سے پرواز کر کے کسی اور جگہ بیٹھنے کے لیے گزرتے رہے۔ ایک سماں انہوں نے باندھ دیا تھا۔ وہ اب نچلی پرواز کر رہے تھے۔ جیسے ہمارے سروں پر سے گزر رہے ہیں۔ ان کے پروں کی چھپ چھپ ہمارے کانوں کے قریب تھی اور پر جیسے ہمیں چھوتے تھے۔ ان کا عکس جھیل کے شرمئی اور سبز پانیوں میں پرواز کرتا نظر آتا تھا۔ لہروں کی زیر و بم کے ساتھ ان کی پرواز ایک تلاطم کی طرح دکھتی تھیں۔ نسرین پہلے تو گھبرا گئی اور مڑ کر سعد کو تشویش سے دیکھنے لگی۔ وہ ڈر گئی تھی کہ کہیں ڈائنا سارز پرندوں کی طرح اسے اچک نہ لیں۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ہم کسی جراسک پارک میں نہیں بلکہ زندہ انسانوں سے بھری ایک جھیل کے ساحل پر ہیں۔ اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ وہ میرا بازو پکڑ کر بولی۔ ”پلیز واپس چلتے ہیں سعد ڈر رہا ہوگا۔“

ہم انہی لہروں پر چلتے ہوئے واپس ہوئے۔ اس کی چال میں تیزی تھی۔ بیٹے کی وجہ سے اس کا دل دہل رہا تھا۔

ہم واپس پہنچے تو سعد دور سے بھاگتا بھاگتا آیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانسوں میں چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔ ”آپ لوگوں نے یہ پرندے دیکھے ہیں؟ میری ٹیچر نے اسکول میں بتایا تھا۔ یہ کینیڈین مرغابیاں ہیں۔ یہ کینیڈا کا قومی پرندہ ہے۔ یہ تو بہت سارے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بتاؤں گا۔ یہ تو بہت نیچے تھے۔ میں انہیں اچھل کر چھونا چاہتا تھا۔ اتنے سارے تو میری کلاس میں کسی نے نہیں دیکھے ہوں گے۔“

وہ جوش میں بہت کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اس سے کہا۔ ”تمہاری ماما تو کہہ رہی تھیں کہ سعد اتنے پرندے دیکھ کر ڈر گیا ہوگا مگر میں نے کہا میرا دوست تو بہت بہادر ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔“

وہ مجھ سے کہنے لگا۔ ”آپ ماما کو یہ بھی سمجھائیں کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے ڈر نہیں لگتا۔ ڈر تو ماما کو خود لگتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ کی ماما کو یہ بھی سمجھا دیں گے کہ سعد بڑا ہو گیا ہے۔“

پھر مجھ سے کہنے لگا۔ ”مجھے بچہ نہ کہیں میں بڑا ہو گیا ہوں۔“

ہم واپس اسی جگہ آئے جہاں بیٹھے تھے۔ دھوپ ریت پر چمک رہی تھی۔ نسرین نے پوچھا۔ ”کچھ کھانا ہے؟“

میں نے انکار کیا تو بولی۔ ”صبح سے ایک سموسہ کھایا ہے۔ کچھ تو لے لو۔ اس وجہ سے تمہارا وزن بھی گر گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شام کے بعد گھر جا کر کھاؤں گا۔ اب ٹریک پر چلتے ہیں۔“ ہم چادر پر بیٹھے تھے۔ اس نے زبردستی چائے کا کپ اور ایک سینڈوچ مجھے تھما دیا۔

ہم اپنا سامان بمع چادر بیچ پر چھوڑ آئے تھے۔ یہاں نہ کوئی آپ کا سامان چوری کرتا ہے اور نہ ہی اس کے قریب پھٹکتا ہے۔ اگر کوئی چیز گری پڑی ملے تو پہلے وہ اسے اٹھائے گا ہی نہیں اور اگر اٹھایا تو سیدھا سیاحتی سینٹر کو جائے گا۔ یہ بھی نہیں کہ کوئی چوری چکاری نہیں ہوتی۔ میں صرف عمومی بات کر رہا ہوں۔

وہ زیادہ لمبا ٹریک تھا۔ غالباً ڈیڑھ دو کلومیٹر طویل ہو گا۔ پیدل آنے جانے کا راستہ بنا تھا۔ ہم تینوں اس پر چلتے جا رہے تھے۔ سعد بھی چھتری سنبھالے ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔ ٹریک پر درخت بھی تھے اور آس پاس کہیں نہ کہیں سبزہ تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے لیے وہ ایک عجب منظر تھا۔ میں خود ریگستانی علاقوں کا رہنے والا ہوں مگر کسی صحرا کے پہلو میں میٹھے پانیوں کی سینکڑوں میل لمبی کوئی جھیل نہیں دیکھی تھی۔ میں نے نخلستان میں چشمہ اور کھجور کے درخت تو دیکھے تھے مگر جنگلی زرد اور گلابی پھولوں بھری نہ دیکھی تھی۔ ٹھنڈے پانیوں سے ٹکرا کر اٹھنے والی ہوا شادابی سے چلتی ہماری جانب آتی تھیں۔ ہم کیا پھول بھی مسکرا رہے تھے۔ پاؤں ہمارے ریت میں دھنسے اس لیے نہ تھے کہ چلنے والوں نے ریت کو بھی دبا دیا تھا۔ راستے میں ایک ٹیلے کے اوپر جگہ

کو پلٹنہ کر کے بینچ پر رکھ دیے گئے تھے، جن کا چہرہ جھیل کی جانب تھا۔ ہم تقریباً سو فٹ سے زیادہ کی اونچائی پر ہوں گے۔ نسرین بولی۔ ”کچھ دیر کو ستالیں؟“

میں نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں، ذرا آرام بھی ہو جائے گا اور یہاں سے منظر بھی بہت خوب صورت نظر آرہا ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی۔ میرا رخ جھیل کی جانب تھا۔ اونچائی سے اس کا نظارہ اور بھی دلکش تھا۔ لہروں کا شور نہ تھا مگر ساحل سے جھاگ اڑاتی لہریں دور سے بھی دکھتی تھیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ پرندوں کے غول تھے جو نچلی پرواز کر رہے تھے۔ سورج زوال کی جانب رواں تھا۔ دھوپ کی شدت مدھم پڑ گئی تھی۔ ہوا کی خنکی پہلے سے زیادہ تھی اور اسی لیے نسرین نے سعد کو جیکٹ پہنا دی تھی۔ نیلا شفاف آسمان، بادل، پرندے، جھیل اور اس کی لہریں اور کناروں سے ٹکراتی جھاگ یہ منظر مجھے تادیر باندھے رکھتا اگر میں نسرین کو نہ دیکھتا جو اپنی ہنسی دبائے سرخ ہو رہی تھی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا کہ کچھ نہیں ہوا۔

”کچھ تو کہو، اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے تاکہ میں بھی ہنس سکوں۔“ میں نے سنجیدگی سے اس سے کہا۔

وہ بولی۔ ”نہیں کچھ نہیں، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”بتا دیا تو غصہ نہیں آئے گا اور کچھ نہ بتایا تو پھر غصہ تو آئے گا۔“

بولی۔ ”میں نے زندگی میں سوچا بھی نہ تھا کہ ریت کے ٹیلوں پر میں بھی چلوں گی۔ ایسے پرندوں اور بادلوں کو دیکھوں گی۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ نہ جانے تمہارے ساتھ مجھے کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ لہٰذا مجھے ہنسی آگئی۔“

”کیا تم بور ہو رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”ہرگز نہیں، میں نے کبھی اتنی فراغت نہیں دیکھی کہ ساحلوں پر مناظر دیکھنے چلی آؤں۔ جب آئی تھی تو عجیب لگ رہا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے اچھا لگنے لگا۔ خاص کر جب تم پرندوں کو اتنی چاہت سے دیکھ رہے تھے۔ تمہارے نیویارک جانے سے دو دن پہلے جب ہم جھیل کنارے ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ تم مجھ سے زیادہ نظاروں میں کھوئے تھے۔ مجھے برا نہ لگا تھا۔ مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے کتنا اہم ہے پھر ہم ہمبر پارک گئے تو وہاں بھی تمہاری ایسی ہی حالت تھی اور جب تم میرے اپارٹمنٹ میں رکے اور تادیر کھڑکی کھولے باہر چاند کو دیکھتے رہے تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ ”آگے کہو۔ مجھے تمہارا یہ سب کہنا اچھا لگ رہا ہے۔“

اس نے بات آگے بڑھائی۔ ”میں بہت مسرور ہوں۔ سب اچھا لگ رہا ہے۔ عادی نہ تھی پر وہ بھی ہو جاؤں گی اگر تم نے مجھے ساتھ رکھا تو......“

”تم کیا ایسے راستوں پر میرے ہمراہ چل سکو... گی؟“ میں نے سوال پوچھا۔

”چل لوں گی اگر نہ چل سکی تو فٹ رکھنے کے لیے جم جوائن کرلوں گی اور پھر بھی نہ چل سکوں تو بے شک مجھے ساتھ نہ رکھنا۔“ اس نے اپنا عزم ظاہر کیا۔

میں بولا۔ ”وعدہ تو پہلے ہی لے چکی ہو۔“

بولی۔ ”وعدہ بھلے وہی ہو مگر بار بار سننا کیوں اچھا لگتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پیار کے ابتدائی دنوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ہی بات گھما پھرا کر خطوں میں لکھی جاتی ہے اور پڑھی بھی جاتی ہے۔ وعدہ ساتھ رہنے کا ہو تو اس سے خوب صورت جملہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب وعدے لے رہی ہو اور دیکھنا کل کو وعدے یاد دلاؤ گی۔ تم نے تو پہلے کوئی پیار نہیں کیا، مگر میں اس دشت کا پرانا مسافر ہوں۔“

یہ کہہ کر میں خود ہنس پڑا۔ پھر اسے رنجیدہ دیکھ کر کہا۔ ”آج تمہارے ساتھ ہوں اور کل کا وعدہ کیا ہے۔ بس میری اس بات پر بھروسا کرو کہ وعدہ پہلے ایک بار توڑا تھا مگر اب بالکل نہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں رنجیدہ نہیں بلکہ سنجیدہ ہوں۔ تمہارے لہجے کی مضبوطی بتاتی ہے کہ تم پر بھروسا کر کے میں نے بالکل ٹھیک کیا ہے اور میں نے بولا تھا ناں کہ تم ایک وعدہ کرو اور باقی کے سب وعدے میں کروں گی تو میرا ہم سے یہ وعدہ ہے کہ کبھی بھی تم کو تمہارا وعدہ یاد نہیں دلاؤں گی۔“

اب اس کے لہجے کی مضبوطی مجھے چونکا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ یہ اعتماد مجھے اتنے بڑے گورکھ دھندوں میں الجھا دے گا اس کا پتا نہ تھا۔ انسان کی زندگی کتنی بے اختیاری ہے اس کا پتا اب چل رہا تھا کہ انسان کیا کچھ نہیں سوچتا۔ کیسے کیسے پروگرام بناتا ہے مگر قسمت کی چال سب پر بھاری ہوتی ہے۔ اس کا ادراک کچھ ہی دن میں ہو گیا تھا۔ اس وقت نسرین کے پہلو میں بیٹھا بہت کچھ سوچ رہا تھا اور قسمت اپنی چال چلنے کی تیاری میں تھی۔

(جاری ہے)



شاعر

سلمی اعوان

برصغیر کے پہلے نوبل انعام یافتہ شاعر پر ایک مختصر سی تحریر دلپذیر کہ اس شاعر میں ایسی کیا خوبی تھی جس نے اسے ممتاز بنایا۔

دیگر زبان کے ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک تحفہ

رابندر ناتھ ٹیگور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی 1969 کی اُس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکا یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آڈیٹوریم میں اُن کا ڈراما چترانگدا اسٹیج ہو رہا تھا۔ رم جھم برستی بارش میں رقص اور ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکا یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی یہ پیش کش حد درجہ کمال کی تھی۔

بنگالی زبان سے اِسے میں نے اُردو میں جیسور کی اُردو اسپیکنگ فاخرہ آصف سے سمجھا جو پانچ چھ گھنٹوں میں میری دوست بن گئی تھی۔ فاخرہ انگریزی میں ایک ایم اے کرنے کے بعد اب بنگالی میں دوسرے ایم اے کے فائنل ایئر میں تھی۔

رات کو جب میں چوبی بیڈ پر لیٹی تو پہلی بار گھر سے دور قدرے افسردہ سی سونے کی کوشش میں تھی کہ محسوس ہوا جیسے وہ چھوٹا سا کمرا ایک مدھم سے سرمدی نغمے کے سُر میں بہنے لگا

ہے۔ پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ میری روم میٹ حبیب فاطمہ جو فینی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹا سا ٹرانسسٹر رکھے اس میں سے نکلتے بولوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر جانا کہ ٹیگور کی نظم ہے۔ گانے والی کلکتہ کی کوئی گلوکار ہے۔ تھوڑا سا مطلب بھی جانتی تھی۔

آسمان کے سوا تمہیں اے سورج
اور کون اپنا سکتا ہے
میں تو تمہارا سپناد یکھ سکتی ہوں
خدمت نہیں کر سکتی

فینی بیس اکیس سال کی انتہائی شوخ و شنگ، لااُبالی سی، ڈھاکا کی لڑکی جو فاخرہ کی طرح بنگالی ادب میں ایم اے فائنل میں تھی۔ دونوں کلاس فیلو تھیں۔

اکثر و بیشتر فینی کمرے میں چلتے پھرتے گنگنایا کرتی

بانگلا ماٹی
بانگلا جل
امار سونار بنگلا
امی تمائے بھالو باشی

یعنی بنگال کی مٹی، بنگال کا پانی، میرا سنہرا بنگال، مجھے تجھ سے محبت ہے۔

مجھ جیسی لڑکی مطلب جان کر محظوظ ہوتی۔ یوں بھی ریڈیو، کبھی ٹی وی پر بھی ایسے نغمے جنہیں رابندر و شنگیت کہا جاتا ہے سننے کو ملتے۔ یہ دل کے ساتھ ساتھ روح کو بھی مسرور کر دیتے۔ تاہم اس پیاس کو اس واقعے نے بڑھا دیا تھا جو مجھے اواخر اکتوبر کے ایک دن پیش آیا۔

اس فسوں خیز سی ڈھلتی شام کے منظر نے میرے قدموں کو ساکت کر دیا تھا کہ میں اتفاقاً قریبہ ہال کی مرکزی عمارت کے عقبی لان میں بنے پوکھر (تالاب) کی جانب نکل آئی تھی۔ تقریباً تین ماہ سے ابر آلود آسمان اور دھواں دھار بارشوں کے نظاروں کی عادی آنکھوں کو اب ڈھاکا کے آسمان کو نکھرا ہوا دیکھنا جہاں ایک جانب پھولتی شفق کے لال گلال رنگوں نے آگ سی سلگا دی تھی۔ ڈوبتی طلائی کرنوں کی دم توڑتی فضاؤں میں نہاتے، ہنستے، مسکراتے سانولے سلونے چہروں والی لڑکیاں جن کے گھٹاؤں جیسے کھلے آوارہ بال، کہیں اُن کے سینوں، کہیں بازوؤں اور کہیں پشت پر بکھرے رہتے اور شیش ناگوں کا سا تاثر اُبھارتے تھے۔ آدھی آستینوں والے بلاؤز میں پھنسے بازو چپو ہاتھوں میں تھامے نوکا (کشتی) کھیتے تھے۔ مترنم آواز میں گیتوں کی صورت فضاؤں میں سُروں کے راز کھولتی تھیں۔

مجھے محسوس ہوا تھا پوکھر (تالاب) کا ہلکورے لیتا پانی جیسے ہواؤں میں بکھرے مترنم گیت کی تھمکی پر دھیرے دھیرے.... رقص کر رہا ہو۔ کیسا موہ لینے والا منظر تھا جو بندے کو پل بھر میں کھینچ کر کسی طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے۔ بنگال کو حسن فطرت کی سرزمین، گیتوں کی دھرتی، سُروں کی دنیا ایسے تو نہیں کہا گیا۔ یہی جادو ہے بنگال ہے۔ سحر آفرین گیت کے بول، اس کی غنائیت، آواز کا لوچ اور رس جیسے میرے اندر اُتر کر میرے ریشے ریشے میں گھل سا جاتا تھا۔

سلہٹ کی خوبصورت مستورہ جو ایک تلے والے میرے فلور پر روم نمبر 28 میں رہتی تھی۔ کشتی سے اُتر کر میرے پاس آگئی۔ آتے جاتے میری اُس سے اچھی ہیلو ہائے رہتی تھی۔ بنگالی گیت میں میری اتنی دلچسپی اور انہماک دیکھ کر اس نے پہلے انگریزی میں مجھے اس کا ترجمہ بتایا۔ بتایا کیا اچھی طرح سمجھایا پھر لہکتے ہوئے ایک اور گیت گایا۔

جودی تور ڈاک سُنے کیو نہ آشے
تو بے ایکلا چولو ایکلا چولو ایکلا چولو رے

اس کا بھی مطلب سمجھا اور ساتھ ہی میں نے جانا کہ یہ ٹیگور کے گیت ہیں۔ یوں ان تین ماہ میں مجھے بنگالی کی کچھ شد بدھ ہو گئی تھی۔

اب میری شامیں اکثر و بیشتر پوکھر کنارے گزرنے لگیں۔ لڑکیوں سے ٹیگور اور نذرل اسلام کے گیتوں کو سنتے، بحث مباحثے کرتے، اپنے کمرے میں ٹرانسسٹر پر بھی کبھی مدھم آواز میں ان گیتوں سے محظوظ ہوتے اور کامن روم میں ٹی وی پر پُرکشش چہروں کو ان شاعروں کے منتخب کلام کو سناتے دیکھنے میں دونوں شاعروں میں فرق سمجھنے لگی تھی۔ ٹیگور کی شاعری میں موسیقیت کے جو دریا سے رواں رہتے تھے وہ اپنے سامع کو اپنے ساتھ بہانے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔

ٹیگور سے محبت، اس کے بارے میں جاننے اور اس کی شاعری سے واقف ہونے، اس کے ڈراموں اور رقص ڈراموں کا شوق بھی مجھے اُسی زمانے میں ہوا۔ فینی اور فاخرہ دونوں نے اس شوق کو مہمیز دی۔

فاخرہ ڈراموں کی بھوکی تھی۔ جونہی بلبل اکیڈمی یا کہیں اوپن ایئر میں ٹیگور کا کوئی ڈراما اسٹیج ہونے کی بھنک اس کے کانوں میں پڑ جاتی۔ بس لگنی (بے چینی) لگ جاتی۔ اب کوئی ٹیسٹ ہے۔ کوئی آسائنمنٹ دینی ہے۔ وقت کم ہے۔ کوئی فکر نہیں۔ لفنگی تھی پوری۔ میں اس سے بھی بڑی لفنگی کہ دیندار گھر سے تعلق کے باوجود لاہور سینما میں چلنے والی ہر فلم کے پہلے شو میں سہیلیوں کے ساتھ گھر میں میلاد کی کسی محفل، قرآن خوانی کی کسی تقریب میں شرکت کے بہانے ہلہ بولنے میں مشہور۔ نتیجتاً کبھی بال نچتے اور کبھی برقعے کا اپر سر سے اتر کر گلے میں جھولتا۔

تو اب جب روک ٹوک ہی کوئی نہ تھی تو فاخرہ سے چار قدم آگے ہی چلنا تھا۔ تھی تو فینی بھی ایسی ہی مگر پڑھائی پر سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔

''چنڈالیکا'' وہ ڈراما تھا جس کا خمار پورے دو دن کسی تیز نشے کی صورت میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔

''میری بات سنو۔''

کیچڑ میں اُگے کنول کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ بیک گراؤنڈ میں ٹیگور کی ایک نظم کے مصرعے سے شروع ہونے والے ڈرامے کا مرکزی خیال چھوت چھات کے نظریے کی مذمت اور پیار و محبت آفاقی جذبہ ہے جیسے پیغام کا علمبردار تھا۔ کمال کی پیشکش تھی۔

''کال مرگیا۔'' ڈرامے کی پیشکش جگن ناتھ ہال کے اسٹوڈنٹس کی طرف سے اوپن ایئر میں ہوئی تھی۔ ''ڈاک گھر'' اور ''مکتا دھارا'' دونوں بلبل اکیڈمی میں دیکھے۔

رابندر و شنگیت کے مقابلے جب جب ہوتے۔ فینی بتاتی اور چل پڑتی۔ بلبل اکیڈمی میں ہی میری ملاقاتیں ڈاکٹر لطف النساء سے بھی ہوتیں جس نے ٹیگور پر ڈاکٹریٹ کی تھی اور جو یہاں ڈائریکٹر تھی۔

ٹیگور کے بارے میں میں نے کسی ایک سے کسی ایک وقت میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے مختلف ٹکڑوں میں سنا۔ میں انہیں لکھ لیتی تھی۔ یہی لکھے ہوئے کاغذ ڈھاکا یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میرے ساتھ لاہور چلے آئے تھے۔ انہی سنبھالے ہوئے ٹکڑوں کو میں نے کھولا ہے۔

7 نومبر 1969ء

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی کا دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا ہے۔ اوپر تلے کی کلاسوں نے تھکا دیا ہے۔ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے چادر کو اپنے اوپر ڈال لیا اور آنکھیں ذرا آرام کی غرض سے موند لی ہیں۔

تبھی فینی کی ''باپ رے باپ'' کی آواز نے چونکا دیا ہے۔

''کیا ہوا؟'' میری آنکھوں میں استفہامیہ سی علامات محسوس کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''رابندر ناتھ ٹیگور چودہ بہن بھائی تھے اور وہ ٹھاکر گھرانے کا آخری بچہ تھا۔''

فینی اپنے سامنے ایک موٹا سا رسالہ کھولے پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔

''تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے؟ میری نانی کے گیارہ بچے تھے۔ پرانے وقتوں میں بچوں کا یہی حساب کتاب ہوتا تھا۔ ہاں تم ٹیگور کو پڑھ رہی ہو۔''

''ہاں آسائنمنٹ بنانی ہے۔''

میری دلچسپی دیکھتے ہوئے اُس نے بلند آواز میں پڑھنا اور بتانا شروع کر دیا تھا۔ مہینا مئی کا تھا۔ تاریخ سات اور سال 1861ء۔ کلکتہ شدید گرمی اور حبس کی لپیٹ میں ہے۔ شہر کے قدیمی علاقے جوڑاسانکو کی ایک معزز شخصیت دیبندر ناتھ ٹھاکر کے گھر چودھواں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس نے رسالے کا ایک صفحہ کھولتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کیا۔ ''یہ ہے وہ گھر۔''

ایک عظیم الشان دو منزلہ کلاسیکل طرز تعمیر کی حامل عمارت جس کی بلند و بالا کھڑکیوں کی لمبی آہنی سلاخوں اور چوبی پٹوں نے بڑی انفرادیت دے رکھی تھی۔ درختوں اور پھول بوٹوں سے گھری کشادہ انگنائی والی ٹھاکر باڑی۔

ٹوپی اور کامدار پٹی والا گھیر دار مغلیہ اسٹائل کا فراک پہنے

رابندر ناتھ ٹیگور ایک نظر میں

پیدائش: 7 مئی 1861ء کلکتہ
موت: 7 اگست 1941ء کلکتہ
معروف مجموعہ: گیتا نجلی
نوبل پرائز: 1913ء
دلچسپی: کہانی کار، شاعر، موسیقی کار، ڈراما نگار، مصور
مادری زبان: بنگالی
اہم تصانیف: گیتا نجلی، گورا، گھرے باہیرے، جن گن من، رابندر سنگیت، آمار شونار بنگلہ وغیرہ۔
بیوی: مرنالنی دیوی (1902-1883)
بچے: پانچ (دو بچپنے میں مر گئے)

رویندر ناتھ ٹیگور کی نظم ''جن گن من'' کو بھارت کا قومی ترانہ بنایا گیا۔ ''آمار شونار بانگلہ، امی تومائے بھالو باشی'' کو بنگلہ دیش نے قومی ترانہ بنایا۔ شری لنکا کا قومی ترانہ بھی ٹیگور کی نظم سے اخذ کیا گیا۔

چودہ سالہ خوبصورت لڑکا بھی فینی نے دکھا دیا تھا۔

گھر میں رابندر ناتھ کی بجائے رابی (سورج) کے نام سے پکارا جانے والا یہ بچہ اپنے بچپن ہی سے بڑا منفرد اور عجیب سی عادات کا حامل تھا۔ بچے کی حرکات و سکنات بتاتی تھیں کہ ذہانت و فطانت میں غیر معمولی ہے۔ روایتی تعلیم سے اُسے کوئی رغبت نہ تھی۔ اسکول داخل کروایا تو بھاگ کر گھر آ گیا۔ سرے سے ہی منکر ہو گیا کہ اسکول تو جانا ہی نہیں۔ میرا تو وہاں دم گھٹتا ہے۔ مجھے تو تنگی ہوتی ہے اورینٹل سیمناری کے بعد بنگال اکیڈمی اور پھر مشہور زمانہ سینٹ زیورس میں بھیجا گیا مگر کسی جگہ بھی یہ فطین بچہ ٹکنے کا نام نہ لے رہا تھا۔

کیسا بچپن تھا جو کھلونوں سے محروم تھا۔ کھلونوں سے کھیلنے ہی نہیں دیا گیا۔ سارا دن گھر کی چار دیواری میں رہتا۔ باہر نکلنے کا تب نہ رواج تھا اور نہ اجازت ملتی تھی۔ ٹیگور گھرانے کے اصول بڑے پختہ اور سخت تھے۔

فینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ”کیا یہ غیر فطری نہیں کہ آپ ایک بچے سے اُس کا بچپن ہی چھین لیں؟“

میں چپ تھی، کہیں خیالوں میں ڈوبی کچھ سوچ رہی تھی۔

فینی نے سلسلہ گفتگو پھر جوڑ دیا۔ اس بچے کے لیے باہر کی دنیا سے کٹاؤ کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ بڑے کمرے کی کھڑکی سے باہر راہگیروں کو چلتے پھرتے، پھیری والوں کو سودے کے لیے ہانکیں لگاتے دیکھتے اور سنتے، گاڑیوں کو دوڑتے بھاگتے، آسمان پر اڑتے پرندوں، بادلوں کو جھومتے، راتوں کو گھر کی چھت پر چاند اور ستاروں کو دیکھتے، اُن سے باتیں کرتے وہ سوچ و فکر کی کن دنیاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا احساس صرف اُسے تھا۔

یقیناً یہ اس کے احساسات ہی تھے کہ جب اس نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں تو Bichitr saadh جیسی نظم میں ایک چھوٹے سے طالب علم کے جذبات و احساسات میں اُن کا بچپن ہی تو بولا ہے کہ جہاں بچہ کہیں پھیری والا، کہیں باغ کا مالی اور کہیں پہرے دار بننے پر مچلتا ہے کہ یہ سب کردار اپنی مرضی کے مالک اور کسی کے پابند نہ تھے۔ ذرا ایک بند دیکھیے۔

ایک پھیری والا سر پر اپنی ٹوکری لیے
دیتا ہے صدائیں چوڑیاں لینا
اس کا دل جہاں جانا چاہے جاتا ہے وہ
لوٹ کر بھی اپنی مرضی سے گھر آتا ہے وہ
اس کو کیا پروا گھڑی میں دس بجیں یا ساڑھے دس
اس کو جلد و دیر سے کیا، اس کو کیسی پیش و پس
ایسے میں دل چاہتا ہے سلیٹ اپنی پھینک دوں
پھیری والا بن کے گلیوں میں یونہی پھرتا رہوں

ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ سچ تو تھا کہ ایک عظیم انسان کے بچپن کے اِس پہلو نے کتنا مسرور کیا تھا؟

فینی ابھی کچھ اور پڑھنے، مجھے سنانے اور لوننگ کرنے کے موڈ میں تھی۔ مگر باہر اُس کے نام کی پکار تھی۔ دربان لڑکا کہتا تھا۔ ”آپا آپ کا وزیٹر۔“ وہ ساڑی کا پلو ٹھیک کرتی اور چپل گھسیٹتی باہر نکل گئی۔

15 نومبر 1969ء

اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ ڈپارٹمنٹ سے واپس آ کر ابھی میں نے کمرے میں کتابیں اپنی ننھی سی میز پر رکھی ہیں کہ جب فاخرہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کوریڈور میں ہی کھڑے کھڑے اُس نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے پوچھا ہے کہ مجھے کھانے کے لیے جانا ہے کیا؟

میں نے ساڑی بدلنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کو ترجیح دی ہے۔ لمبے کوریڈور میں چلتے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ آج ٹیگور کے بچپن پر ایک کتاب اُسے لائبریری سے ملی ہے۔ اتنی دلچسپ ہے کہ لائبریری میں بیٹھے بیٹھے اُس نے آدھی سے زیادہ پڑھ بھی لی ہے اور اُسے ایشو کروا کے لے بھی آئی ہے، کمال کی لکھی گئی ہے۔

اور جب ہم دونوں بھات ماچھ (مچھلی چاول) کھاتی تھیں۔ وہ بولی تھی۔ گہرا دکھ اور تاسف اس کے لہجے میں کھل کھل کر باہر لپکتا تھا۔

”اب کون آج کی اندھا تعصب رکھنے والی اس بنگالی نسل کو سمجھائے کہ وہ جو بنگالی ادب کا باپ ہے جس کی عالمانہ عظمت اور شاعری کا اعتراف ایک دنیا نے کیا۔ اُسے عربی فارسی پر کتنی دسترس تھی اور وہ حافظ کا کتنا بڑا عاشق تھا؟ نہ صرف وہ بلکہ اُس کا باپ دیبندر ناتھ بھی۔ اپنی مادری زبان بنگالی کے علاوہ، انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت میں غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ حافظ شیرازی کے دلدادہ تھے۔ ان کی بنگالی سوانح عمری میں حافظ کے اشعار جا بجا موتیوں اور نگینوں کی طرح سجے نظر آتے تھے۔

یوں بھی ٹیگور خاندان لباس، آداب، نشست و برخواست اور بود و باش میں مسلمانوں، اُن کی تہذیب، اُن

کے فنون لطیفہ سے متاثر اور بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خصوصی نسبت اور تعلق رکھتا تھا۔ اِس گھرانے کی ایسی ہی وجوہات پر ہندوان کو ”دھریوں“ اور ہندو نما مسلمان سمجھتے اور کہتے تھے۔

باپ نے اپنا کمال فن بیٹے کو چھوٹی سی عمر میں ہی دیا اور اُسے مشرقی علوم میں طاق کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ بلوغت تک آتے آتے اُسے اِن زبانوں پر دسترس حاصل ہو چکی تھی۔

پکی مسور کی دال والی پلیٹ اٹھا کر فاخرہ نے منہ سے لگائی۔ دو تین گھونٹ بھرے اور دکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب ذرا تقابلی جائزہ تو لو۔ تب اور اب کا۔ وہ اگر انقلاب کا زمانہ تھا تو یہ وقت کیا نئے رجحانات کو اپنے اندر سمیٹنے اور وسعتیں دینے کا نہیں؟ وہ کیا بنگالی نہیں تھے؟ تھے مگر صاحب ظرف تھے اور یہ بنگلہ کے پرستار جو اُردو کا گلا گھونٹ دینے کے متمنی ہیں۔ Son of the Soil کے نعرے لگانا ہی بس اُن کا منتہائے مقصود رہ گیا ہے۔“

شام کو پوکھر کنارے میں اُس سے ”میرا بچپن“ کے بارے سن رہی تھی۔

میں ٹیگور کی بھرپور یاد جس رُخ سے سامنے آتی ہے وہ شہر ہے کلکتہ شہر کا وہ قدیم ترین حصہ جہاں شاعر نے جنم لیا تھا۔ جہاں بس، موٹر گاڑی، ٹرام کچھ بھی نہ تھا۔ چھکڑے سارا دن گرد و غبار اڑاتے اور گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر کوچوان تابڑ توڑ چابکوں سے حملے کرتے تھے۔ عورتوں کا اندر باہر جانا دم گھٹا دینے والی پالکیوں میں ہوتا۔ اگر کوئی عورت اچانک غیر مرد کے سامنے آ جاتی تو اس کا گھونگھٹ فوراً آدھ گز نیچے آ جاتا۔ گھر کی ڈیوڑھی پر بیٹھا دربان پورے گھر کی نگہبانی کرتا۔ اِن کرداروں کی تفصیل بڑی دلچسپ تھی۔

شہر میں نہ گیس تھی نہ بجلی۔ جب مٹی کے تیل سے روشنی ہوئی تو پہلے پہل اسے بھی دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ تب گھروں میں نوکر ارنڈی کے تیل کے دیے جلاتے۔ جس کمرے میں ہم پڑھتے وہاں دو بتیوں کا ایک دیا دیوٹ پر جلتا۔

ماسٹر صاحب ٹمٹماتی روشنی میں ”پہلی کتاب“ کھولنے کا کہتے۔ پہلے تو میری جمائیاں شروع ہوتیں۔ پھر آنکھیں بھی بند ہوتیں اور کبھی کھلتیں۔ اب ماسٹر صاحب کی پھنکار دبے دبے لفظوں میں اس کا فلاں شاگرد پڑھائی میں اتنا ہوشیار، فلاں لکھنے میں اتنا تیز، فلاں کوتے (شاعری) پڑھنے میں سونا۔ ایسی سب باتیں میرے سر پر سے ہوا کے کسی جھونکے کی طرح گزر جاتیں۔

اِن یادوں کا ایک اہم کردار برجوشیور بڑے دلچسپ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ٹیگور کی زبان میں کہ وہ ہم نظر انداز بچوں کی دیکھ بھال یعنی کھانے، نہلانے اور ہمارے دیگر جملہ امور کی نگرانی کے لیے لایا گیا تھا۔ اس کی طبیعت بڑی لالچی تھی۔ ہماری تھالیوں میں کبھی کھانا پروس کر نہ رکھتا۔ جب کھانے کو بیٹھتے تو ایک ایک پوری کو دور سے ہاتھ میں گھماتا ہوا دیتا اور پوچھتا کہ ”اور چاہیے“۔

یہ ”اور چاہیے“ جس لب و لہجے میں کہتا اُس کا ایک ہی مطلب ہوتا۔ بس کرو اب۔

میں تو بالعموم یہی کہتا۔ ”نہیں اور نہیں چاہیے۔“

میرے دودھ کے کٹورے پر بھی اس کی حریصانہ نظریں ... منڈلاتی ہی رہتیں۔

یہ کم کھانا بھی کچھ کھانے کا سودا نہ رہا کہ زیادہ کھانے والوں سے مقابلے میں توانائی میں کمزور نہ تھا۔

اِس طاقت اور توانائی کا ثبوت اِس بات سے ملتا تھا کہ جب جب اسکول سے بھاگنے کو جی چاہتا۔ منصوبہ بندی میں کوئی بھی بیماری مثلاً نزلہ، زکام، کھانسی، بخار وغیرہ سبھی ماتھے پر آنکھیں رکھ لیتیں۔ ٹھینگا دکھاتیں۔ اب انہیں بلانے کے لیے میرے طرح طرح کے جتن، کبھی پانی میں بھگویا ہوا جوتا پہن کر دن بھر گھومنا، کاتک کے مہینے میں کھلی چھت پر سونا۔ مجال جو اُسے مجھ پر ذرا سا بھی رحم آ جائے۔ مجال تھا جو کچھ ہو جائے۔

کہانیوں کے سننے کا چسکہ اُن کی طلسماتی دنیا، میرے خواب اور سوچیں۔ پہلی بیٹھک برجوشیور کے پاس جمتی۔ رامائن سنتے سنتے کشوری چاٹو جے آ جاتا۔ اُس سے رامائن کتھا نظم کی صورت سنی جاتی۔ اس کے گلے سے سخن کی لڑیاں جھرنوں کی سی اٹھکیلیاں اور کلیلیں کرتی بہتیں۔ یہ محفل جب ختم ہوتی میں ماں کے کمرے میں جاتا۔ ماں اُس وقت اپنی کاکی کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی۔ میں جاتے ہی شور مچانا شروع کر دیتا۔ وہ فوراً ہاتھ کے پتوں کو پھینکتے ہوئی کاکی سے مخاطب ہوتی۔ ”لے جاؤ اور کہانی سناؤ اُسے۔ جب تک یہ سو نہیں جائے گا اس کا یہ غل غپاڑہ ایسے ہی رہے گا۔“

ہم لوگ برآمدے میں رکھے لوٹے کے پانی سے پاؤں دھو کر نانی کو بستر پر گھسیٹ لاتے۔ اب دیوتاؤں کی کہانی، راجکماری کی کہانی کب تک یہ چلتی۔ میں تو کہیں خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا۔ کہانی ہمیشہ میری کمزوری رہی۔ یہ دن میں بھی جب میں اکیلا ہوتا میرے ساتھ رہتی۔ کبھی پالکی میں، کبھی

پیدل، کبھی کسی اڑن کھٹولے پر، کبھی جنگلوں میں، کبھی دریاؤں پر۔

سچ تو یہ ہے کہ بچپن کی یہ تصوراتی سیر بڑے ہوکر دنیا کے اسفار کی صورت میں مجھے نصیب ہوئی۔ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی نے سفر کرنے کی خواہش کو ایڑ لگائی تھی۔ بچپن کی تنہائی، جوانی اور اُدھیڑ عمری میں دوستوں کی معیت میں نئی دنیائیں دیکھنے کی متمنی تھی جس کی تکمیل بہت احسن طریق سے ہوئی۔

''کہانیوں کی دنیا میں کھونا مجھے بہت پسند تھا۔ شاید نہیں یقیناً کہانیاں افسانے اور ناول اُسی شوق اور تجسس نے لکھوائے۔''

فاخرہ سے میں نے کسی ناول کے بارے پوچھا جو اس نے پڑھا ہو۔

''ارے ایک دو۔ میں نے تو کئی پڑھے ہیں۔ افسانے بھی بہتیرے۔ ناولوں میں مجھے گھورے بائیرے، جوگا جوگ، دولی بون اور گورا بہت پسند ہیں۔''

کہیں کابلی والے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا۔ یہ افسانہ میں نے پڑھا ہے۔ ذہن میں جزئیات بھی اُبھر آئی تھیں۔

''چلو اب سنو۔'' فاخرہ نے پھر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

''کہانی کے جلد ختم ہونے پر بھی مجھے ہمیشہ اعتراض ہوتا۔ خوف، ڈر، بے قراریاں، اضطراب سب میرے اندر سے نکل کر ہونٹوں پر سوال جواب کی صورت پھدکتے۔ جہاں کہیں کہانی میں سنسنی خیز موڑ آتا۔ اضطراب میں ڈوبا ہوا جملہ ''پھر کیا ہوا'' فوراً لبوں پر آجاتا۔

ایک اور کام کرنا بھی میرا معمول تھا۔ وہ تھا میری ماسٹری، میری اُستادی۔ گھر کے سارے ستون کھمبے میرے شاگرد ہوتے۔ میں انہیں خوب لتاڑتا، خوب مارتا۔ نہیں پڑھو گے تو نالائقو بڑے ہوکر قلی بنو گے۔ ان کی خوب خوب پٹائی کرتا۔

یہ منظر بھی میرے پسندیدہ منظروں میں سے ایک تھا کہ جب گھر میں مہمان آتے۔ گھر کی ڈیوڑھی کے سامنے بڑی بڑی بگھیاں آکر رکتیں۔ مرکزی دروازے پر بڑے بھائیوں میں کوئی ایک مہمانوں کے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا۔ نوکر اُن پر گلاب دانیوں سے گلاب پاشی کرتے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے دستے تھمتے۔ بھائی بصد عزت و احترام انہیں اوپر لے جاتے۔ خاطر مدارات کا سلسلہ، روشنیوں سے چمکتے کمرے اور گھر سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

گھر دار عورتوں کے سجنے سنورنے کے طور طریقے سنتے ہوئے بھی لطف آتا تھا۔ میں تو ہنستی چلی جاتی تھی۔

گلی میں ''بیلے پھول، بیلے پھول'' کی صدا بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ موسم بہار کیا آتا یہ پھول ڈالیاں اور ان کی خوشبو گلیوں کو مہکا دیتیں۔ گھر والیوں کے لانبے بالوں کے بھاری جوڑے، اُن کے شانوں پر پڑے بیلے ہاروں سے سج جاتے۔ جدھر سے گزرتیں خوشبوئیں بکھیرتی چلی جاتیں۔ ہاتھ منہ دھونے سے پہلے آئینہ ہاتھ میں پکڑ کر بالوں کو سنوارا جاتا۔ گھر میں خود سے بنائی ڈوری سے جوڑا باندھا جاتا۔ نائن کا گھروں میں آنے کا بھی بڑا رواج تھا۔ یہ بھی ایک کردار تھا۔

میرے بچپن میں چاکلیٹ نہیں ہوتی تھی۔ گلابی ریوڑیاں، خوشبو میں بسے تل سے لدے پھندے چینی کے ڈھیلے سے، کس مزے کے ہوتے۔ بھنے ہوئے مسالے والے ٹھونگے، وہ سستا سا تل والا گجا۔ برف کی ہانڈی میں لگی کلفیاں۔ جب پھیری والا آواز لگاتا۔ ہائے دل کیسا اُتھل پتھل ہونے لگتا۔

''ہائے ٹیگور کے بچپن کی کچھ چیزیں تو معاشرت کے فرق کے باوجود ہمارے بچپن جیسی بھی تھیں۔'' بچوں جیسی خوشی نے میری آنکھوں سے جھانکتے ہوئے گویا کہا تھا۔

اُنیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں کے ہندوستانی بنگال کی تہذیبی معاشرت کی جھلکیوں کی خوبصورت اور دل کش تصویر نے دل شاد کیا تھا۔ شام بہت مزے کی گزری تھی۔ کیسا مزے کا بچپن تھا۔

27 نومبر 1969ء

آج رقیہ ہال میں پندرھواں فیسٹ Feast ڈے تھا۔ لڑکیوں نے سرشام ہی ڈائننگ روم کے گرد منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ کامن روم میں بھی رش تھا۔ فاخرہ اور میں بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھیں۔ ٹی وی پر گیتوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ دفعتاً ایک دلکش چہرہ اپنی دلکش آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ یہ فردوسی بیگم تھیں۔ پوربو پاکستان یا پوربو بنگال کی مترنم آواز، گیت جو وہ گا رہی تھیں وہ ٹیگور گیت تھا۔

اُف ایسا لگا تھا جیسے سارا ماحول ایک انوکھے سے سُر میں بہنا شروع ہوگیا ہے۔ فاخرہ گیت کا ساتھ ساتھ ترجمہ کیے جاتی تھی۔

اے دنیا میں نے صبح کے ہنگاموں میں
تیرے باغ سے ایک پھول توڑا
اُسے اپنے سینے پر رکھا
اس کا کانٹا دل میں چبھ گیا
شام ڈھلی تو میں نے دیکھا
پھول نڈھال تھا پر درد باقی تھا
ایک سے ایک بڑھ کر حسن اور خوشبو میں
تجھ میں پھول تو بہت پیدا ہوں گے
مگر میری گل چینی کا وقت
بہت عرصہ ہوا کہ ختم ہوا
اور اب جب کہ رات طاری ہے
گل نہیں پاس مگر درد باقی ہے

10 دسمبر 1969ء

ڈاکٹر لطف النساء سے تعارف فینی کے توسط سے ہوا تھا جس کے ساتھ میں اکثر ڈرامے دیکھنے اور گیت سننے آتی تھی۔ اس وقت دسمبر کی اُداس سی شام میں بلبل اکیڈمی کے ٹھنڈے ٹھار بھائیں بھائیں کرتے کمرے ایک عجیب سا یاس فضا میں پھیلا رہے تھے۔ دو کمروں میں کچھ لوگ نظر آئے تھے۔ ایک میں شاید کوئی ڈراما اور راما کا سلسلہ تھا اور دوسرے میں سُر سنگیت کی محفل برپا تھی۔

خوش قسمتی ہی تھی کہ لطف النساء سے ملاقات ہوگئی۔ دراصل یہاں آنے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پرانے ڈھاکا مشہور مصور زین العابدین سے ملنے اور اُن کا انٹرویو کرنے گئی تھی۔ واپسی پر یونہی ٹیگور کی ہڑک سی اٹھی تھی اور اکیڈمی چلی آئی۔

لطف النساء محبت کے شیرے سے گوندھی ہوئی عورت ہے۔ اس کے اندر ویسٹ پاکستانیوں کے لیے کوئی بغض اور تعصب ہو تو ہو مگر اس کا چہرہ جیسے متانت کی لطافت اور پیار کی نرم پھوار میں بھیگا بھیگا سا رہتا ہے۔ جب جب بھی ملاقات ہو۔ گندوراج کے پھول کی طرح کھلی نظر آتی ہے۔

آج بھی جپھی ڈال کر ملی۔ زین العابدین سے ملنے کا سن کر خوش اور ٹیگور کے بارے میں میری کچھ جاننے کی خواہش پر مزید خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

رمضان میں یونیورسٹی بند ہونے اور عید پر گھر جانے کا پوچھنے پر میں نے فوراً کہا تھا ''ارے نہیں آپا رمضان تو یہیں ہاسٹل میں اور عید اپنی کلاس فیلو کے ساتھ باریسال منانے جاؤں گی۔ اپنے دیس کے اِس حصے کے رمضان کی رونقیں اور عید کو بھی تو دیکھوں۔''

باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈراما، موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صنف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساتھی تھا جو کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انہوں نے نہ لکھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندر یوں اُترے کہ وہ تحریر جاوداں ہوگئی۔ جو لفظ چنا اُسے معتبر کردیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید قسم کی جذباتیت اور تیز حسیات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں ٹیگور کے ہاں خیالات کی جدت ہے۔ تیز رفتار تخیل کی جولانیاں ہیں۔ رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گنگناتی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے ایک عظیم شاعر بنادیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ یورپ میں پڑھا گیا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیا نے اُسے کس کس انداز میں تعظیم دی۔ کسی نے کہا۔ ٹیگور شاعرِ کائنات ہے۔ کسی نے کہا وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی جہتوں کو نئے انداز میں دریافت کیا اور وہ نئے نئے راستوں پر چلی۔ شاعری کی مروجہ پرانی ریت و روایتیں اور تنگ راستے سکھوں سے اُس نے اپنا تعلق واسطہ نہ رکھا۔

الیگزینڈر سرگیوویچ پشکن کی طرح جس نے روسی زبان کو اپنی بے مثال شاعری سے مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لاکھڑا کیا۔ ٹیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ ٹیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

انگریزی ترجمے نے اُس کی شہرت چار دانگ پہنچادی تھی۔

”آپا یہ ترجمہ کس نے کیا تھا؟“

”ارے کسی نے بھی نہیں اُس نے خود کیا تھا۔ دیکھو تو ذرا پتا نہیں وہ کیوں اس احساسِ کمتری میں مبتلا تھا کہ اُس کی انگریزی اچھی نہیں۔ ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن عجیب سی بات ہوئی۔“

”یہ چیت کے دن تھے۔ آموں کے بور کی خوشبوئیں نتھنوں میں گھس گھس کر عجیب سی کیف آور مستی کے جذبات پیدا کررہی تھیں۔ عطر بیز ہوائیں دل کے تار جھنجوڑے جارہی تھیں۔ جب اُس نے گیتا نجلی (بہار کا گیت) اٹھائی۔ کاپی قلم پکڑا اور ترجمہ کرنا شروع کردیا۔ حتیٰ کہ کاپی ختم ہوگئی تو اُسے جیب میں ڈالی اور لندن جانے کے لیے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔ جہاز میں دوسری کاپی بھی بھر گئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جہاز میں روتھسٹائن بھی سوار تھا۔ اس نے بصد اصرار ترجمہ دیکھنے کی خواہش کی۔ پڑھ کر تو وہ حیران رہ گیا۔ یہی کاپیاں اس نے ایٹس yeats کو بھجوادیں۔ وہ بھی پڑھ کر گنگ سا رہ گیا۔

ایٹس نے گیتا نجلی کا پیش لفظ لکھا اور کہیں چھوٹی موٹی اصلاح کی۔ ”گیتا نجلی اس کی لافانی شاہکار تخلیق ہے۔“ ایٹس yeats لکھتا ہے۔ یہ ترجمہ ہر جگہ میرے ساتھ جاتا۔ بسوں، ٹرینوں، ریسٹورنٹوں میں۔ میں ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتا اور اسے سراہتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب راستہ چلنے والے انہیں راہ میں گنگنائیں گے۔ کشتیوں پر ملاح انہیں گائیں گے۔ عاشق اپنے معشوق کے انتظار میں، محبوبہ اپنے چاہنے والے کے انتظار میں، خدا سے محبت کرنے والے اس کے حوالے دیں گے۔“

ڈبلیو بی ایٹس جیسے انگریزی ادب کے عظیم شاعر کا یہ خراجِ تحسین یقیناً ٹیگور کے لیے بڑا امتیاز تھا۔ ٹیگور کی یہی سحر کاری اُسے ممتاز کرتی ہے۔ مترنم سادہ سا اسلوب منفرد کرتا ہے۔ سندھا سنگیت (شام کا نغمہ) سے اس کی غنائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں یاسیت کا بھی غلبہ رہا۔ مگر یہ وقت جلد گزر گیا۔ پربھات سنگیت (صبح کا نغمہ) میں ذرا دیکھیے صبح کی روپہلی دھوپ میں پھیلی ہوئی زندگی اس کے لیے کتنی دلا آویز ہے۔

میں اور کچھ نہیں چاہتا
بس اگر چاہتا ہوں تو اتنا سا
اسے دیکھتا رہوں
مسحور رہوں
ہر چیز بھول جاؤں
گم سم رہوں

مانسی (محبوبہ) کو پڑھیں تو شاعر کی فنی پختگی کا نقطۂ کمال محسوس ہوتا ہے۔

”اے بار پھر اؤ مورے“ (اس بار مجھے لوٹا دو) اُس کی ایسی ہی ایک شاہکار نظم ہے۔ اسی طرح ”لامتناہی راستہ“ کا گیت ہے۔ اُس بچی کا گیت جو چھوٹی سی ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

میں اشک بار اُس لڑکی کو دیکھتا ہوں
محبت سے لبریز آنکھوں والی بچی
میری کشتی سفر پر چل پڑے گی
اور بچی بھی اپنا کام پورا کرے گی
وہ مجھے نہیں جانتی
میں اُسے نہیں جانتا
مگر میں سوچتا ہوں
وہ کسی نامعلوم بستی اور نامعلوم اجنبی گھر میں۔
دُلہن بن کر جائے گی
پھر ماں بنے گی
اور پھر سب کچھ ختم ہوجائے گا

ٹیگور کا یہ گیت کتنی سچائی اور کڑی حقیقت پر ہے۔

ٹیگور کے نزدیک انسان خدا کا پرتو ہے۔ ہر ایماندار، نیک اور جفاکش انسان میں خدا پنہاں ہوتا ہے۔ اسے خانقاہوں، مسجدوں اور مندروں میں محسوس کرنے والوں سے وہ کہتا ہے۔

یہ عبادت (بھجن) یہ تسبیح خوانی چھوڑ
دروازہ بند کرکے خانقاہ کے ویران اُجڑے گوشے میں
تُو کس کی پوجا کررہا ہے؟
آنکھیں کھول اور دیکھ خدا تیرے سامنے ہے
وہ کہاں ہے؟
وہاں جہاں کسان سخت زمین میں ہل چلاتا ہے
جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے پتھر کوٹتے ہیں
دھوپ اور بارش میں کام کرتے ہیں
خدا تو اُن کے پاس ہے

گیتا نجلی کی زیادہ نظمیں اور گیت حمدیہ اور مناجاتی ہیں۔ اپنی عبادت اور سپردگی کے باعث اس کے ہاں یہ پختہ یقین ہے کہ موت کے بعد جو زندگی ملے گی وہ بہتر اور اچھی ہوگی۔

حسنِ فطرت سے اُسے عشق ہے۔ یہ صبح شام موسموں کے بدلتے رنگوں کے ساتھ کیسے پرانے پیرہن اُتار کر نئے پہنتی ہے۔ اُن پرانے اور نئے رنگوں میں حُسن و رعنائیوں کے جلوے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کرتے ہیں۔

اُن کی ازدواجی زندگی کے بارے کچھ سننے اور کچھ جاننے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ یہ تمنا فینی نے ہی پوری کی کہ اس کا تھیسس تھا ہی ٹیگور پر۔ یوں بھی وہ بہت پڑھا کو لڑکی تھی۔ جھٹ سے اعتراض پھٹ سے نقطہ چینی کردینا بھی اُس کے لیے کھیل تماشے جیسی ہی بات تھی۔ باتیں کرتے کرتے چٹکلے چھوڑنا بھی اُسے بہت پسند تھا۔ وہ بنگالی و غیر بنگالی تعصب سے بالا بڑی خاص قسم کی چیز تھی۔ فینی جیسی لڑکیاں ہزار لڑکیوں کے ہاسٹل میں بس دو تین ہی ہوں گی شاید۔

10 فروری 1970ء

جنوری بڑا مصروف مہینا تھا۔ عید کے بعد سیکنڈ ٹرم شروع ہونے والی تھی۔ نپٹتے نپٹاتے فروری آگیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ہم کمرے میں اکٹھی تھیں۔ اُس نے ٹرانسسٹر کی نوب بند کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ آج نو بجے نہ سوجائیں تو باتیں ہوسکتی ہیں۔“

”فینی، ٹیگور پر بات کرنے کے لیے نیند جیسی چیز کی قربانی کی کیا حیثیت ہے؟“

چلیے اس عظیم شخصیت کی ازدواجی زندگی کا بھی رخ دیکھ لیں۔ دُلہن کا نام بھوتا رینی۔ تیرہ سالہ کم پڑھی لکھی عام سی لڑکی تھی یہ۔ بینی مادھوپ رائے چودھری کی بیٹی تھی۔ دُلہا اس وقت کوئی تیئس برس کا تھا۔ عمر میں دس سال چھوٹی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دنیا کے جینئس انسان کی بیوی بن رہی ہے لیکن

قسطنطنیہ

قسطنطنیہ دنیا کا نہایت اہم اور عظیم الشان شہر ہے۔ جس جگہ اب قسطنطنیہ آباد ہے یہاں پر پالی زنتیم نامی ایک چھوٹا سا شہر تھا جسے کسی خانہ بدوش قبیلے نے آباد کیا تھا۔ اس شہر پر بہت سے حادثات گزرے ہیں۔ بعد ازاں 327ء میں قسطنطین اوّل نے اس شہر پر حملہ کیا اور پھر اسے آباد کیا۔ جس کی وجہ سے اس کا نام بزنتیم سے قسطنطین پڑ گیا جسے بعد میں قسطنطنیہ کہا جانے لگا۔ مسلمانوں کے عہد میں بنو امیہ نے اسے فتح کیا۔ اسی جنگ میں حضورؐ کے صحابی حضرت ابوایوب انصاری شہید ہوئے اور اسی شہر کی فصیل کے نیچے دفن ہوئے۔ اس شہر نے صلیبی دور بھی دیکھا قریباً سوا گیارہ سو سال تک یہ عیسائیوں کا دارالحکومت رہا اور پھر سلطان محمد فاتح نے عیسائی سلطنت کا خاتمہ کرکے اسلامی دارالسلطنت بنایا۔ جب خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ ہوا تو ترکوں کی مسلم حکومت نے انقرہ کو دارالحکومت بنایا مگر قسطنطنیہ کی اہمیت اور شان و شوکت مسلم دنیا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ جھنگ

وقت نے بتایا کہ اس نے خود کو اس اعزاز کا اہل ثابت کیا۔

ٹیگور نے جوانی کا کچھ حصہ شیلائی داہ اور شہزاد پور اپنی زمینداری پر اور کچھ وقت بیرونِ ملک کے دوروں اور سیر سپاٹوں میں گزارا۔ یہ وہ وقت تھا جب اپنی بیوی کے ساتھ اُن کی ملاقاتیں کم رہیں۔ مگر دونوں کے درمیان خطوط کا تبادلہ ضرور رہا۔

فقیٰی کی جملہ بازی اس موقع پر بھی ہوئی۔ تاہم یہ ہندوستانی معاشرت کا ایک حصہ تھا اور زمانہ کافی آگے بڑھ جانے کے باوجود آج بھی ایسی ہی صورتِ حال کسی حد تک ہے۔ میرے ردِعمل اور جواب نے اُس نٹ کھٹ کو چپ کروا دیا تھا۔

شوہر نے جو نام دیا وہ مرینالنی دیوی تھا۔ اس نام کا بھرم رکھنے کے لیے اُس کم عمر لڑکی نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود دوسری زبانیں سیکھیں۔ ادب، موسیقی اور آرٹ کی باریکیاں جانیں۔ اپنے شوہر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوئی۔

رابندر ناتھ کو اس منزل تک پہنچانے میں مرینا کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کبھی شوہر کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں۔ شانتی نکیتن میں جب کھلے آسمان تلے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو کہیں سے مدد نہ ملی۔ ایسے میں وفا شعار بیوی نے سب زیورات قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ یہ اور بات ہے کہ ٹیگور نے اسے پسند نہ کیا لیکن جب وشو بھارتی (یونیورسٹی) قائم کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی کے پیہم اصرار پر یہ مدد قبول لینے پر راضی ہو گئے۔

تاہم یہ بات فقیٰی کے لیے خاموشی سے بتانے پر مرکوز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کے تبصرے نما اعتراض بھی تھے۔

آخر مرینالنی کا ذکر ٹیگور کی کسی تحریر میں کیوں نہیں ملتا؟ کبھی کوئی چیز اُس کے نام سے منسوب کیوں نہ ہوئی؟ کیوں آخر؟ اُس نے آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں اور تیکھے لہجے میں بولی۔

’’ایسی وفا شعار بیوی۔ ٹیگور جب کبھی باہر سے آتے تو وہ اُن کے لیے بہت اہتمام سے کھانا بنواتی۔ ٹیگور سادہ کھانے کو ترجیح دیتے۔ مسالوں اور تیل کی زیادتی پسند نہ کرتے۔ مرینا ان سب باتوں کا دھیان رکھتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بہت چاؤ سے دسترخوان سجاتی۔ اُنہیں کھانے کے لیے آنے کا کہتی۔ اب انتظار میں دیدہ دل بچھائے بیٹھی ہے اور ٹیگور پر تخلیقی آمد کا نزول ہو گیا اور وہ آنے کی بجائے تخلیقی عمل میں مصروف ہو گئے۔ کیسی صابر شاکر عورت تھی کہ پیشانی پر خفیف سی سلوٹ لائے بغیر اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کاموں میں مداخلت کرنا اس کے لیے گناہ کے برابر تھا۔ کھانا تب پروستی جب وہ اس کا اِذن دیتے۔ رات اکثر دیر تک کام میں مصروف رہتے۔ صبح دم بھی جلد اٹھتے۔ غسل، عبادت، ناشتا، لکھنے کی میز، اُس کی صفائی ستھرائی۔ سردیوں گرمیوں کے کپڑے سب کا دھیان رکھنا نوکر کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذمہ داری بھی سمجھتی۔‘‘

ٹیگور فطرتاً بے پروا تھے۔ تخلیقی عمل سے فارغ ہوتے تو کاہلی اور سستی در آتی۔ بھول جاتے کہ جو کچھ تخلیق ہوا اور لکھا گیا ہے اُسے سنبھالنا بھی ہے۔ تاہم یہ مرینا دیوی تھی کہ جو اُن کی چھوٹی سے چھوٹی تحریر کو طریقے سلیقے سے سنبھالتی۔

ٹیگور نے مرینا کو جتنے خط لکھے۔ اس نے اُن کی جی جان سے حفاظت کی۔ ایک خوبصورت منقش صندوقچے میں محفوظ کرتی۔ شوہر کو اُس کے اپنے لکھے ہوئے خطوط کا شمار اب ادبی نقطۂ نظر سے ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ کہا جاتا ہے کہ رابندر کی مشہور کہانی استری پتر میں مرینا کی ذات کے کچھ عکس ملتے ہیں۔ آخری عمر میں زبان بند ہو گئی تو رابندر نے لکھا۔

اتنی فرصت نہ ملی
یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تم
دل کی آخری باتیں کہہ جاتیں
خاموش رخصت
ہجر کا درد لیے
میں چاروں اور فضول تسکین کی تلاش کرتا رہا‘‘

ایک جگہ اور دیکھیے وہ مرینا کے ہجر میں کیا کہتے ہیں؟

تم اپنا وہ اچھا لگنا میری آنکھوں میں نقش کر کے
میری آنکھوں میں اپنی نگاہ رکھ گئی ہو
آج میں اکیلے ہی دونوں کا دیکھنا دیکھ رہا ہوں
تم میرے من میں بس رہی ہو
میری آنکھوں کی پتلیوں میں اپنی
نگاہِ شوق کی لکیر بنا کر
میری زندگی میں تم جیے جاؤ جیے جاؤ
میرے دل کے ذریعے سے اپنی مراد مانگو
تا کہ میں دل میں سمجھوں کہ نہایت پوشیدہ طور سے
تم آج مجھ میں ’’بن‘‘ کر بس رہی ہو
میری زندگی میں جیے جاؤ جیے جاؤ

15 مارچ 1970ء

اِس ضمن میں جس اور نمایاں شخصیت سے میری بھرپور بات چیت رہی وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ابو سعید چوہدری تھے جو بعد میں بنگلہ دیش بن جانے پر ملک کے صدر بھی بنے۔ اُن کے ساتھ ملاقات بڑی دلچسپی کی حامل تھی۔

اُن دنوں ہاتھ کی لکیروں سے میرا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وی سی ہمارے ڈپارٹمنٹ کی ایک تقریب میں آئے۔ فیکلٹی ممبرز ان کے ساتھ کھڑے تھے جب میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور بنگلہ میں کہا۔

’’سر مجھے آپ کا ہاتھ دیکھنا ہے۔ وقت آپ نے بتانا ہے کہ کب آپ کے پاس آؤں؟‘‘

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ’’سر میں بہت اچھا ہاتھ دیکھتی ہوں۔ حسینہ واجد کا ہاتھ بھی میں نے دیکھا ہے۔ میرے پاس اس کے ہاتھ کے پرنٹ بھی ہیں۔ اُس وقت میرے تن پر آبی رنگی بنگال کی خوبصورت ساڑی تھی۔ شانوں پر گھنے سیاہ بال لہراتے تھے۔ سانولی رنگت کے ساتھ میں مکمل طور پر ایک بنگالی لڑکی نظر آتی تھی۔‘‘

میرے ہیڈ سر نے مسکراتے ہوئے پہلے مجھے اور پھر انہیں دیکھا اور میرا تعارف ویسٹ پاکستانی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔

یونیورسٹی لیول کے اساتذہ اور اسٹوڈنٹس کے درمیان ہونے والی لطیف سی چھیڑ چھاڑ اور جملہ بازی والے ماحول کے درمیان بالآخر میں نے انہیں رضامند کر ہی لیا۔

ہاتھ دیکھنے، پرنٹ لینے اور اس کے نتائج کو ایک طرف کیجیے کہ اس خوبصورت سلسلے سے اس کا تعلق بس اتنا سا ہے کہ اِن ملاقاتوں کے بعد میں نے انہیں اخبار خواتین کے لیے انٹرویو بھی کر لیا۔ انٹرویو میں ایک صاحب علم شخصیت میرے سامنے آئی تھی۔ جنہوں نے ٹیگور کی شاعری کے کئی اور نمایاں پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں پہلی چیز شاعری کا بے ساختہ پن ہے۔ آنکھ سے نکلنے والے کسی بے اختیار و بےتاب آنسو کی طرح، ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بکھر جانے والی کسی مسکراہٹ کی طرح۔ ٹیگور کی شاعری، ان کے گیت، سریلے اور نغمہ بار ہیں، اپنے آپ میں مکمل، ان کی شخصیت کے عکاس، فکر و نظر میں آزاد۔

ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی، قوم و ملت کی

علامہ سید محمد باقر ہندی چکڑالوی

(1881ء۔1966ء)

ممتاز جید عالمِ دین چکڑالہ ضلع میانوالی میں علامہ سید گل محمد نقوی کے علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1909ء میں عربی فاضل کا امتحان اورینٹل کالج لاہور میں دیا۔ اوّل آئے گولڈ میڈل کا اعزاز پایا۔ علامہ سید شریف حسین خان رئیس اعظم جگراؤں سے اسباق پڑھے اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تعینات ہوئے۔ بعد ازاں 1912ء میں حوزہ علمیہ نجف الاشرف عراق میں اکتسابِ علم کیا۔ درجہ اجتہاد پر فائز ہو کر مجتہد ہوئے۔ 1915ء میں سند حاصل کرنے کے بعد وطن مالوف چکڑالہ ضلع میانوالی تشریف لائے اور پہلے دینی مدرسہ کی بنیاد 1916ء میں اپنے برادرِ بزرگ علامہ سید طالب حسین نقوی کے ساتھ ڈال کر رکھی۔ دس سال کے عرصے کے بعد 1926ء سے 1945ء تک چک نمبر 38 ٹی آر خانیوال میں پھر تعلیمات محمد و آلِ محمد پھیلاتے رہے۔ 1946ء سے 1966ء تک بدھو رجبانہ تحصیل شورکوٹ جھنگ میں علوم محمدؐ و آلِ محمدؐ کے دریا بہاتے رہے اور جلیل القدر جید علمائے کرام پیدا کیے۔ علمی وقار بلند کیا۔ آپ زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت پیر سید نفضل حسین شاہ نقوی البخاری کے ہم عصر تھے۔ آپ مخدومِ اعظم حضرت سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاری (پ، بخارا 595ھ 1199ء م اوچ شریف بہاول پور 690ھ۔ 1291ء) کے دوسرے فرزند ارجمند حضرت سید علی سرمست اور ان کے فرزند جلیل حضرت حاجی سید بہاول حلیم کی نسل مبارک سے بانی چکڑالہ ضلع میانوالی حضرت سید محمد حسین بخاری نبیرہ پیر ابن اولیاء سید محمد شریف آف بلوٹ شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی اولاد امجاد ہیں۔ آپ قبیلہ نقوی البخاری کے قابل فخر چشم و چراغ تھے۔ 9 جون 1966ء کو کہاوڑ کلاں ضلع بھکر میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک اربابِ علم ادب کے لیے زیارت گاہ، مرجع خلائق ہے۔ پاکستان میں آج جو علم کی چہل پہل ہے خصوصاً پنجاب میں وہ سب آپ کی مرہونِ منت ہے۔ آپ کے ہزاروں شاگردانِ رشید ہیں جو آپ کے مشن پر کاربند عمل ہیں۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

بندشوں کو توڑتی ہے۔ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے کہ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے اسی لیے وہ اس کی توہین برداشت نہیں کرتا۔

ان کے یہاں کوئی مخصوص نظریہ یا نمایاں فلسفۂ حیات نہیں ملتا۔ مذہباً ٹیگور کا تعلق برہمو سماج سے تھا۔ یہ فرقہ صرف بنگال میں ہے۔ بنگال کی بیشتر عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ برہمو سماج صرف وحدانیت خداوندی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی فنکارانہ زندگی کے تحت الشعور میں یہ تصور ہمیشہ قائم رہا کہ اُن کا مرکز مسرت بس تخلیق ہی ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسی کا اظہار کریں۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ میں اُن سب لوگوں سے جو مجھے مسند پر بٹھانا چاہتے ہیں کہتا ہوں کہ مجھے نیچے زمین پر ہی بیٹھنے دیں۔ وہ جو کھیل کے قواعد و ضوابط طے کرتا ہے اُس نے میرے لیے کوئی بزرگانہ سا کردار نہیں چنا۔ میری زندگی کا رس جو قدرت نے مجھے بخشا ہے وہ اسی مٹی، اسی دھرتی اور اسی گھاس پر ہی نچڑنا چاہیے۔ وہ سب لوگ وہ جو دھرتی پر پہلا قدم اٹھاتے ہیں اور پھر اسی کی گود میں چلے جاتے ہیں۔ میں اُن کا دوست ہوں۔ میں شاعر ہوں۔ میں کوی ہوں۔

اُن کے ہاں مسائل حیات کے تعمیری پہلو، تہذیب نفس، کردار کی پاکیزگی، حق گوئی و بیباکی کے لیے ایک دائمی پکار ملتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں۔ کوئی نہیں ملتا تو کہتے ہیں۔

جب تیری پکار پر کوئی نہ تیرا ساتھ دے
تنہا ہی چل تو اکیلا ہی چل

گیتا نجلی زیادہ زیر بحث رہی۔ بہت زیادہ پڑھی گئی۔ انگریزی ترجمے نے دنیا میں گھما دی۔ نوبل انعام یافتہ ٹھہری۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شاہکار ہے۔ مگر میرے نزدیک "بلاکا" اس سے بھی بڑا مجموعہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گیتا نجلی کے نیچے دب سی گئی اور یوں اُبھر کر سامنے نہ آئی جیسے اُسے آنا چاہیے تھا۔

یہ شعری مجموعہ محبت، انسان، خدا اور انسانیت کے گرد گھومتا ہے۔ ٹیگور نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وشنومت کو وشنو اور برہما کو برہمنوں کے چنگل سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ مسیحیت کو سمجھو۔ اسلام کا مطالعہ کرو۔ محبت لافانی ہے جو خدا اور بندے کے درمیان ہونی چاہیے۔

شبنم سے بھیگا ہوا صبح کا یہ منظر کیسا حسین ہے
درخت سورج کی کرنوں میں
جھلملا سے رہے ہیں
اسی لیے میں سمجھتا ہوں
یہ دنیا عالم خیال کے بے کراں سمندر
کی موجوں پر ناچتا ہوا ایک کنول ہے
میں سمجھتا ہوں
میں اسی کا پیغام ہوں
میں اس کے گیت کی تان ہوں
میں زندگی میں روح زندگی ہوں
میں ظلمت کے سینے کو چاک کر کے
نکلنے والے اُسی
رقصاں نور کی درخشاں کرن ہوں

میرے لیے یہ امر بھی کچھ تعجب انگیز سا تھا کہ ابو سعید چوہدری اقبال، حافظ اور مولانا روم سے بھی بڑے متاثر تھے۔ اقبال کو ٹیگور کے پلّے کا شاعر مانتے تھے۔ ان کی گفتگو میں دو تین بار ٹیگور کا اِن تین بڑی شخصیات کے ساتھ موازنہ بھی سامنے آیا۔ ٹیگور کے عاشق ایکس آرونسن کے بارے میں باتوں نے میرے اوپر فکر و آگہی کے نئے دروازے کھولے۔ آرونسن ایک بے چین، مضطرب، علم کی پیاسی روح، تلاش حق کے لیے بھٹکتی کبھی جرمنی کبھی فرانس ٹیگور کے ناول Home and the world سے متاثر شانتی نکیتن آ پہنچی تھی جہاں انہوں نے انگریزی ادب پڑھانا شروع کیا تھا۔ یہاں آرونسن کی ایک تحریر ٹیگور کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہماری ملاقات جب بھی ٹیگور سے ہوتی۔ مجمع میں یا تنہائی میں، وہ باتیں کر رہے ہوں یا خاموش ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنیادی طور پر وہ ایک تنہا آدمی ہیں جو اپنے خیالوں میں غرق رہتا ہے۔ گیتوں کو گانے والا۔ خوابوں کا بننے والا۔ وہ مجمع کے لیے کوئی پیغام رسا نہیں ہے۔ جس کی آس میں مجمع اکٹھا ہوتا تھا۔

کیسا شاعر تھا جسے رکشا چلانے والا اور پتھر کوٹنے والا اگر گاتا تھا تو وہیں حکمرانوں کی آنکھوں کا بھی تارہ تھا۔ دلّی کی سیاحت کے دوران اندرا گاندھی میموریل دیکھنے گئی تو ان کی اسٹڈی میں جو نظم موجود تھی وہ ٹیگور کی ہی تھی۔

جہاں ذہن میں ڈر اور خوف نہ ہو
جہاں انسان سر بلند ہو کر جیے
جہاں علم کا حصول ہر خاص و عام کے لیے ہو
جہاں یہ ہماری دنیا ٹکڑوں میں بٹ کر تقسیم نہ ہو

بائیسکل

شکیل صدیقی

گھوڑے کی سواری کا نعم البدل تلاش کرتے کرتے سائیکل ایجاد ہو گئی لیکن اس ایجاد نے کیسی کیسی شکل اختیار کی یہ بھی جاننا ضروری ہے۔

ایجادات کی کہانی کا پس منظر

بائیسکل کا قصہ آئے اور پطرس بخاری کے مرزا نہ یاد آئیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ان کے لازوال مضمون کا نام "مرحوم کی یاد میں" تھا۔ جنھوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے یقیناً اس سے محظوظ ہوئے ہوں گے مگر اس وقت میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بائیسکل وجود میں کیسے آئی، اس نے کیسے کیسے رنگ تبدیل کیے۔ رنگ سے مراد ہے اس کی ہیئت میں کیسی کیسی تبدیلیاں ہوئیں لیکن نہیں اس سے پیشتر فرانس میں ہونے والی بائیسکل ریس "تور دی فرانس" کا ذکر ہو جائے تو بہتر ہے

جوفرانس اور اس سے ملحقہ ممالک میں ہوتی ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موٹر سائیکل، اسکوٹر اور ٹرائی سائیکل کی ایجاد کے باوجود اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ خاص طور پر ہر سال جولائی کے مہینے میں بائیسکل ریس ہوتی ہے جس کی ساری دنیا میں بہت اہمیت ہے۔

یہ ریس یکم جولائی 1903ء میں اب سے 114 برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ سالِ نو 2017ء میں 104 ویں ریس ہو چکی ہے۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ یہ ریس تین ہفتوں تک ہوتی ہے اور اس کے 21 مرحلے ہیں۔ ایک روز میں ایک مرحلہ طے کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف فرانس ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ جن کی بیس یا بائیس ٹیم بنائی جاتی ہیں۔ ہر ٹیم میں نو سائیکل سوار ہوتے ہیں۔ ریس کا اختتام پیرس میں ہوتا ہے اور تقریباً 3500 کلومیٹر فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔ جیتنے والے کھلاڑی کو پیلے رنگ کی جرسی پہنائی جاتی ہے اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ پیلی جرسی اس لیے کہ لا آٹو اخبار پیلے رنگ کے کاغذ پر شائع ہوتا ہے۔

ریس کا آغاز سفید جھنڈا لہرا کر کیا جاتا ہے۔ کھلاڑیوں کو ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کی اجازت ہے، وہ ایک دوسرے کو نزدیکی کی بنا پر چھو بھی سکتے ہیں، لیکن دھکا نہیں دے سکتے۔ دھکا دینا غیر اخلاقی حرکت ہے۔

پہلے سال میں جیتنے والے کھلاڑی کو 20,000 فرانک دیے گئے تھے۔ اس کے بعد انعام کی رقم بڑھا دی گئی اور جیتنے والے کو ایک فلیٹ بھی رہائش کے لیے دیا جانے لگا۔ 1988ء میں جیتنے والے کو ایک کار، رہائش کے لیے فلیٹ اور 500,00 فرانک دیے گئے۔ جب یورو (سکہ) لین دین میں استعمال ہونے لگا تو جیتنے والے کھلاڑیوں کو 450,000 یورو انعام میں دیے جانے لگے۔

ریس کا یہ سلسلہ فرانس کے دو بڑے اسپورٹس کے اخبارات منعقد کرتے ہیں، جن میں لی ویلو (اشاعت 80,000) اور لا آٹو (اشاعت 25,000 جو بڑھ کر 65,000 ہوگئی) شامل ہیں۔ پانچ سال بعد ان دونوں اسپورٹس اخبارات کی اشاعت لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ ریس کاروباری افراد اور صحافیوں کے تعاون سے ہوتی ہے۔

ابتدا میں یہ ریس رات میں بھی ہوتی تھی، لیکن تین برس بعد صرف دن میں ہونے لگی، کیونکہ جج صاحبان نے رات کو بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔

فرانس کی یہ ریس سائیکل کی رہینِ منت ہے۔ اگر سائیکل ہی نہ ہوتی تو لوگ ریس کا آغاز کیسے کرتے؟ تو ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سائیکل کیسے عالمِ وجود میں آئی۔ بائیسکل کا مطلب ہے دو پہیوں والی سواری جس میں توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک ہینڈل لگا ہوتا ہے۔ 1818ء میں فرانس میں سب سے پہلا سائیکل چلانے کا مظاہرہ ایک میدان میں کیا گیا۔ اس سائیکل میں لکڑی کے فریم کے ساتھ صرف دو پہیے تھے۔ لکڑی کے فریم کو قابو کرتے ہوئے زمین پر پاؤں رکھ کر اسے چلایا جاتا تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہینڈلوں کی جگہ ایک تختہ لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے اس سائیکل کو دیکھ تو لیا، لیکن کوئی اس سے متاثر نہیں ہوا۔ کسی نے سائیکل چلانے والے سے یہ تک پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہ کیسے بنی اور اس پر کتنی لاگت آئی۔ گویا اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ سائیکل چلانے کا مظاہرہ کرنے والے کا نام کارل فون دریاکس تھا۔ وہ جرمنی کا سول سرونٹ تھا۔ سائیکل اس کے نزدیک گھوڑے کا متبادل تھی۔

اسے یہ نیک خیال اس لیے آیا کہ گھوڑے بیمار بھی پڑ جایا کرتے تھے اور غلے کی کمی کے باعث موت کا شکار ہو جایا کرتے تھے جب کہ سائیکل چارہ نہیں کھاتی اور نہ دولتیاں جھاڑتی ہے۔ اس سائیکل پر موجد نے ایک گھنٹے میں آٹھ میل کا سفر طے کیا تھا۔

اس سائیکل کا وزن 22 کلوگرام تھا جس کے وھیل بیرنگ میں پیتل کے بش لگے ہوئے تھے۔ اس کے اگلے پہیے میں بریک بھی لگایا گیا تھا۔ کچھ افراد کو یہ سواری پسند آئی، مگر ناپسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اسے چلانے سے ٹانگوں پر زور پڑتا ہے۔ چونکہ سائیکل پر قابو پانا آسان نہیں تھا، اس لیے سڑکوں پر حادثات بھی ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے آواز بھی اٹھائی کہ اس پر پابندی عائد کر دینا چاہیے۔

سائیکل ابھی پوری طرح متعارف بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی وجہ سے حادثات بھی ہونے لگے۔ گلاسگو نیوز پیپر نے 1842ء میں یہ خبر شائع کی جو آج بھی عجائب گھر میں موجود ہے کہ ایک عجیب و غریب چیز جسے بائیسکل کہا جاتا ہے ایک نامعلوم شخص نے ایک چھوٹی لڑکی سے ٹکرا دیا، جس سے اسے چوٹ لگی۔ پولیس نے اس شخص پر پانچ شلنگ جرمانہ عائد کر دیا۔

ایک فرانسیسی شخص میچوکس نے 1860ء میں اسے

سائیکل میں تبدیلی کی اور اس میں پیڈلوں کے ساتھ کرینک شافٹ کا اضافہ کیا۔ جس کا سامنے کا پہیا کافی بڑا تھا۔

بہرحال 1868ء میں پہلی بار لوگ اس کے نام سے روشناس ہوئے کیونکہ ڈیلی نیوز میں اس پر تفصیلی مضمون شائع ہوا تھا۔

1886ء میں ایک چینی بن ہم نے دوسری سائیکل ایجاد کی۔ تیسری سائیکل کی ایجاد کا سہرا ڈینس جانسن نامی شخص کو جاتا ہے جس کا تعلق لندن سے تھا۔ اس نے دونوں پہیوں کا باہم منسلک کرنے کے لیے لکڑی کے تختے کی جگہ ایک لہریے دار پٹی لگائی تھی۔ اس سائیکل کے پہیے بڑے تھے۔

ایک لوہار نے دماغ سوزی کر کے نئی سائیکل ایجاد کر ڈالی، جس کا پچھلا پہیا اگلے سے بڑا تو تھا ہی مگر دونوں پہیوں کے وسط میں ایک سلاخ لگا کر انہیں باہم جوڑ دیا گیا تھا۔ جب کہ اگلے پہیے کے وسط سے دو سلاخیں ویلڈ کر کے اس میں ہینڈل بھی لگا دیا گیا تھا۔

1887ء میں کچھ پیش رفت ہوئی اور ایسی فولادی سائیکلیں بھی ایجاد کی گئیں جن میں تین یا چار پہیے لگے تھے لیکن اسے لوگوں نے مسترد کر دیا، اس لیے کہ یہ سائیکلیں بھاری تھیں اور انہیں چلانا دشوار تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد گلاسگو میں دوسرے لوہار گیون ڈیلزل نے سائیکل میں چند تبدیلیاں کیں اور ایک آرام دہ سیٹ دونوں پہیوں کے وسط میں جوڑ دی۔ جس سے سائیکل پر بیٹھنا آسان ہوگیا۔ وہ کپڑا فروش بھی تھا، لہٰذا اس نے سائیکل پر کپڑا رکھ کر دور دراز کے علاقوں کا دورہ کیا اور اپنے کاروبار کو فروغ دیا۔ اس کی سائیکل کا نمونہ اب بھی گلاسگو کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

1889ء میں تامس میکال نے جو کلمارنوک (فرانس) میں رہتا تھا سائیکل کے ڈیزائن میں تبدیلی کی اور دونوں پہیوں کے درمیان میں پیڈل جوڑ دیا جس سے سائیکل چلانے والے کی ٹانگوں پر زور پڑنا بند ہوگیا۔ اس کی ایجاد بہرحال لوگوں میں مقبول ہوئی اس لیے کہ اس کا فولادی فریم ہلکا تھا اور سائیکل چلانے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔ تاریخ کے مطابق اس کی ایجاد کی ہوئی سائیکلیں مارکیٹ میں فروخت ہوئیں۔

بعد کے برسوں میں سائیکلیں ایجاد ہوئیں اور ان میں پہلے سے زیادہ تبدیلیاں بھی ہوئیں، لیکن دونوں پہیوں کے درمیان ربط کے لیے چین (زنجیر) نہیں لگائی گئی

تھی۔ اسی دوران نیویارک کی ایک کمپنی نے خواتین کے لیے ایک سائیکل ایجاد کی، جس کا فریم بے حد ہلکا اور سبک تھا۔ اسے چلاتے وقت ٹانگوں پر زور نہیں پڑتا تھا۔ یہ بے حد آرام دہ سائیکل تھی، لہٰذا خواتین میں مقبول ہوئی۔ اس میں دونوں پہیوں کے درمیان فولادی پائپ بھی نہیں لگا تھا، کیونکہ یہ خاص طور پر خواتین کے لیے بنائی گئی تھی۔ تیز رفتاری سے چلاتے وقت اندیشہ تھا کہ خواتین دوسری سواریوں سے نہ ٹکرا جائیں۔ چنانچہ موجد نے اس کی دائیں ہینڈل پر ایک گھنٹی بھی لگا دی۔ 1890ء میں فضا گھنٹیوں کی آواز سے مرتعش ہوگئی۔ کچھ خواتین کو اس کا سفر بے حد دلچسپ لگا۔ اسی لیے چند خواتین نے پیرس سے ایوگنون تک سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا اور یہ سفر آٹھ دنوں میں طے کیا۔ ان کا یہ سفر گویا ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا تھا، اس لیے اس کی خوب تشہیر ہوئی اور اخبارات نے ان کی تصاویر بھی شائع کیں۔

سائیکل پر لہریے دار (سانپ نما) چونکہ فولاد کے بھرت سے بنا تھا، اس لیے اس کے ٹوٹنے کی شکایات عام ہوگئیں۔ اس اثنا میں میچاکس (MICHAUX) کمپنی نے مضبوط فریم کے ساتھ ایک سائیکل مارکیٹ میں متعارف کی جو عوام میں مقبول ہوئی۔ میچاکس نے اپنے اس اقدام سے مارکیٹ پر قبضہ جما لیا اور اس کمپنی کی بنائی ہوئی سائیکلیں خوب فروخت ہوئیں۔

امریکا کے لوہار اس معاملے میں پیچھے نہیں تھے۔ ایک موجد الممعت نے فولادی پہیوں پر ٹھوس ربڑ چڑھا دیا اور پہیوں کے وسط میں بال بیرنگ کا استعمال کیا، جہاں سائیکل کی تیلیاں آکر جڑتی تھیں۔ سائیکل کے موجد نے تو اسے بہتر بنانے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن امریکا میں سائیکل اتنی مقبول نہیں ہوئی جتنی کہ یورپ میں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے مقابلے میں امریکا کی سڑکیں خراب تھیں۔ چنانچہ سائیکل چلانے والوں کو دقت پیش آتی تھی۔ برطانیہ کی سڑکیں بہت بہتر تھیں اس لیے وہاں یہ سواری تیزی سے مقبول ہوئی۔ فضا میں گھنٹیوں کی آواز گونجنے لگی۔

1891ء میں یوجین میئر نے ایسی سائیکل ایجاد کی جس کا تعلق فرانس سے تھا۔ اس نے سائیکل کا فریم بے حد ہلکا پھلکا رکھا اور زیادہ فاصلہ طے کرنے کے خیال سے اگلا پہیا بڑا رکھا۔ اس کے پہیوں میں تیلیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھیں۔ جس سے مضبوطی پیدا ہوگئی۔

پانچ فروری کے یوم یکجہتی کی اہمیت کیا ہے یہ جاننے کے لیے تحریک آزادی کشمیر کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ کشمیری عوام کی تحریک آزادی اسی روز سے شروع ہوگئی تھی جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کے ساتھ بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر کے تحت 16 مارچ 1846ء کو کشمیر کا 75 لاکھ روپے نانک شاہی کے عوض سودا کیا۔ 13 جولائی 1931ء کو سری نگر جیل کے احاطے میں کشمیریوں پر وحشیانہ فائرنگ کے نتیجے میں 22 مسلمان شہید اور 47 شدید زخمی ہوگئے۔ اس واقعہ پر لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لیے کشمیر کمیٹی قائم کی اور شاعر مشرق علامہ اقبال کو اس کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا۔ نومبر 1931ء میں تحریک احرار نے غیر مسلح جدوجہد اور سول نافرمانی کے ذریعے جموں کشمیر کو آزاد کرانے کا مطالبہ کیا۔ گلینسی کمیشن قائم کیا گیا۔ 1934ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں کشمیریوں کے ساتھ اظہار یکجہتی اور ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف ملک گیر ہڑتال کی گئی۔ 1946ء میں قائد اعظم نے مسلم کانفرنس کی دعوت پر سری نگر کا دورہ کیا جہاں قائد کی دوراندیش نگاہوں نے سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور جغرافیائی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا۔ مسلم کانفرنس نے بھی کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے 19 جولائی 1947ء کو سردار ابراہیم خان کے گھر سری نگر میں باقاعدہ طور پر قرارداد الحاق پاکستان منظور کی لیکن جب کشمیریوں کے فیصلے کو نظر انداز کیا گیا تو مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی قیادت میں 23 اگست 1947 کو نیلا بٹ کے مقام سے مسلح جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 15 ماہ کے مسلسل جہاد کے بعد موجودہ آزاد کشمیر آزاد ہوا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اقوام متحدہ پہنچ گئے اور بین الاقوامی برادری سے وعدہ کیا کہ وہ ریاست میں رائے شماری کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ مقامی عوام کی خواہشات کے مطابق کریں گے۔ سلامتی کونسل کی ان قراردادوں میں کشمیریوں سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا لیکن اپنے وعدے کو پورا کرنے کے بجائے ہندوستان نے مسلم تشخص کو ختم کرنے کے لیے تقسیم کے وقت ساڑھے تین لاکھ کشمیریوں کو جموں میں شہید کیا لیکن 13 نومبر 1947ء کو شیخ عبداللہ نے اندرا گاندھی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں (اندرا عبداللہ ایکارڈ) کے نام سے موسوم ہے۔ دہلی ایکارڈ شیخ محمد عبداللہ کو اس کی خواہش کے باوجود 1953ء کی پوزیشن نہ دلا سکا۔ 25 فروری کو کانگریس نے بغیر کسی الیکشن کے شیخ عبداللہ کو سری نگر کے تخت پر مسلط کیا تو 25 فروری 1975ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان اور آزاد و مقبوضہ کشمیر میں بروز جمعتہ المبارک مکمل ہڑتال کی کال دی۔ زبردست اور تاریخی ہڑتال ہوئی اور سری نگر کے لال چوک میں کشمیری عوام نے ایک مرتبہ پھر سبز ہلالی پرچم لہرایا۔ بھارت نے 4 اور 13 مارچ 1975ء کو بالترتیب بھارتی لوک سبھا اور راجیہ سبھا سے اس معاہدہ کی توثیق کروائی۔ پاکستان نے اقوام متحدہ سے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور شملہ معاہدے کے مندرجات کی خلاف ورزی ہے۔ 1981ء میں جب ریاستی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان کیا گیا تو تمام کشمیری سیاسی جماعتوں نے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے ذریعے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مسلم متحدہ محاذ کے راہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ الیکشن جیت کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کی اس قرارداد کو ریاستی اسمبلی میں نامنظور قرار دیں گے۔ حریت کانفرنس کے موجودہ سربراہ سید علی گیلانی اور جہاد کونسل کے صدر سید صلاح الدین نے بھی ان انتخابات میں حصہ لیا۔ 23 مارچ 1987ء کو ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم متحدہ محاذ کی واضح اور فیصلہ کن فتح کو دھونس اور دھاندلی کے ذریعے شکست میں تبدیل کرکے ہندوستان نے کشمیری عوام کی پُرامن ذریعے سے تبدیلی لانے کی خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔ یہی وہ نقطہ آغاز تھا کہ جمہوری طریقے سے جدوجہد کرنے والے اور انتخابات میں حصہ لینے والی قیادت مسلح جدوجہد شروع کرنے پر مجبور ہوگئی۔ شیخ عبداللہ جس نے کشمیریوں کے دلوں پر برسوں حکومت کی اور شیر کشمیر کا لقب پایا۔ وہی شیخ عبداللہ اندرا عبداللہ ایکارڈ کے بعد غدار کشمیر قرار پایا۔ دہلی کی تہاڑ جیل میں شہید کشمیر مقبول بٹ نے اپنے خون سے جس انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اسے کشمیر اور پاکستان حریت پسندوں نے اپنے خون سے آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ ہندوستانی سرکار کے اعصاب شل ہوئے تو حریت پسندوں کی تلاش میں گھر گھر تلاشی، کریک ڈاؤن اور خواتین کی عصمت دری معمول بن گئی۔ جس کے ردعمل میں کشمیر سے پہلے درجنوں پھر سینکڑوں اور بعد میں ہزاروں افراد کے قافلے کنٹرول لائن کو عبور کرکے آزاد کشمیر پہنچنا شروع ہوگئے۔

مرسلہ: فارقلیط خان۔ مظفر گڑھ

چند برس بعد برطانیہ کے جیمز اسٹارلے نے ٹھوس فولادی ڈھانچے کی جگہ فولادی پائپ استعمال کیے جن سے ڈھانچا مزید ہلکا ہوگیا۔ سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ جیمز اسٹارلے کو سائیکل کی صنعت کا بابا آدم سمجھا جانے لگا۔ اس کی ایجاد کردہ سائیکل کا اگلا پہیا بہرحال بڑا تھا اور اس کا قطر ساٹھ انچ کے قریب تھا۔

سائیکل کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اتنی نہیں جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ لوگ اب بھی گھوڑے دوڑانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سائیکل ایک واہیات سواری ہے۔ اس پر کوئی معزز شخص سوار ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ان کے پیش نظر سائیکل سے ہونے والے حادثات بھی تھے۔ جب سائیکل کی رفتار تیز ہوتی تھی تو سوار اگلے پہیے سے گر پڑتا تھا اور اسے چوٹیں آتی تھیں۔ سوار جب بریک لگاتا تھا تو سائیکل سے گر پڑتا تھا اور اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔

یوں تو ملکہ برطانیہ کے پاس بھی ایک سائیکل تھی مگر اس بات کا کوئی ثبوت اب تک نہیں ملا کہ انہوں نے کبھی سائیکل چلائی ہو۔

فرانس ان دنوں ایران سے جنگ کرنے میں مصروف تھا، اس لیے سائیکل کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا مگر برطانیہ میں اس صنعت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ جن لوگوں کو یہ سواری بھا گئی تھی، وہ اس کا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کونٹری، آکسفرڈ، برمنگھم اور مانچسٹر سائیکل کے مراکز بن گئے۔ وہ ممالک جو انگریزوں کے غلام تھے، وہاں سائیکل کو فروخت کرنا آسان ہوگیا۔

1892ء میں سائیکل کے دونوں پہیوں کو چین (زنجیر) سے باہم منسلک کردیا گیا۔ اس خیال سے کہ چین ٹانگوں کو رگڑ نہ پہنچا دے اسے ٹین کے کور سے ڈھانک دیا گیا۔ اس کے دونوں پہیے تقریباً برابر تھے۔ یہ آجکل کی سائیکل سے بہت حد تک مشابہ تھی۔ اسے دہپٹ نامی مؤجد نے تیار کیا تھا۔

اسی برس آئزک جانسن نے جو افریقی، امریکی تھا، نے اپنی سائیکل کو پیٹنٹ کرایا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ درمیان سے فولڈ ہوجاتی تھی، اس طرح سے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور لے آنے میں سہولت ہوجاتی تھی۔

سائیکل چلانے کا شوق بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ 1895ء میں ایک خاتون ایلی لنڈزی نے اپنی سائیکل پر

ساری دنیا کا چکر لگایا اور خوب شہرت پائی۔ حیرت انگیز بات ہے کہ اس نے اپنے دنیا کے سفر میں آلپس جیسے پہاڑ کو بھی سائیکل پر بیٹھ کر عبور کیا تھا۔

خواتین خاص طور پر سائیکل پر بیٹھتے وقت اپنے اسکرٹ کی بنا پر پریشان ہوجاتی تھیں۔ پیڈل پر پاؤں مارتے وقت وہ اٹھ جاتا تھا یا اس وقت جب کہ ہوا تیز چل رہی ہوتی تھی، چنانچہ ان کے لیے خاص قسم کا اسکرٹ بنایا گیا جس کے نچلے حصے میں لاسٹک لگی ہوئی تھی جو اسکرٹ کو نیچے سے چپکا لیتی تھی اور اڑنے نہیں دیتی تھی۔

سائیکل کے ڈھانچے پر مزید توجہ دی گئی اور اسے اسٹیل کے پائپوں سے بنایا جانے لگا۔ مضبوط اور پائیدار، پھر دیکھنے میں دلکش۔ ہر پرزہ دھوپ میں جماچم ہوجاتا۔ بریک سسٹم بہتر ہوگیا تو حادثات میں کمی واقع ہوگئی۔

برطانیہ نے اس صنعت کو اتنا فروغ دیا کہ 1895ء میں نیدرلینڈ میں 85 فی صد سائیکلیں برطانیہ کی استعمال ہوتی تھیں۔ برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں سائیکل سے لوگوں کو والہانہ عشق ہوگیا تھا، لیکن 1900ء سے 1910ء تک امریکا میں اس کا رجحان ختم ہونے لگا۔ اس کی بجائے لوگوں نے آٹوموبائل کی طرف توجہ دینا شروع کردی۔ 1920ء میں اسے بچوں کا کھلونا کہا گیا۔ 1940ء میں جتنی سائیکلیں امریکا میں تیار ہوئیں وہ صرف بچوں کے لیے تھیں۔ جب کہ یورپ کے بیشتر ممالک میں سائیکل ریس ہونے لگی تھیں اور بالغ افراد کو یہ ہلکی پھلکی سواری اس لیے پسند تھی کہ کاروں کی نسبت اس کی سڑکیں علیحدہ تھیں اور اس میں پیٹرول نہیں ڈلوانا پڑتا تھا اور اس کی بیٹری بھی ڈسچارج نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس میں سرے سے بیٹری کا استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آٹو اور موٹر سائیکل کی ایجاد کے بعد بھی لوگوں کا میلان اس کی طرف رہا۔ برطانیہ میں فلپس، ہرکولیس اور ٹرمپ کے بڑے کارخانے تھے جو ہر برس لاکھوں کی تعداد میں سائیکلیں تیار کرتے تھے۔ 1920ء میں چھ ہندوستانیوں نے دنیا کے گرد چکر لگایا اور 71000 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں فوجیوں نے بھی سائیکل کا استعمال کیا۔ بیسویں صدی میں سائیکل نے مقبولیت حاصل کرلی اور اس کے دس لاکھ ماڈل فروخت ہوئے۔

سائیکل کے ٹھوس پہیوں کی جگہ ٹائر اور ٹیوب استعمال کیے جانے لگے جو فولادی فریم پر چڑھائے جاتے تھے۔ اس سے فولادی پہیوں کی ٹوٹ پھوٹ میں کمی واقع ہوئی۔ البتہ سفر

کے دوران یہ خیال ضرور رکھنا پڑتا تھا کہ ٹائر میں مطلوبہ ہوا کی مقدار ہے کہ نہیں۔ بریکنگ سسٹم کو مزید درست کیا گیا اور اسے ہینڈل کے ساتھ لگا دیا گیا کہ سائیکل سوار جب چاہے اسے دبا سکے۔ رات کو سفر کرنے والوں کے لیے اس کے سامنے کے رخ پر ہیڈ لیمپ لگایا گیا جو چھوٹے سے جنریٹر سے روشن ہوتا تھا۔ سائیکل کے پچھلے پہیے کے ساتھ اسٹینڈ لگایا گیا تاکہ سائیکل کو اس کے سہارے سے کھڑا کیا جا سکے۔

چین نے 1948ء میں آزاد ہونے کے بعد سائیکل کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ حکومت نے جو سائیکل متعارف کرائی اس کا نام پرواز کرتا کبوتر تھا۔ پالیسی میکروں کا کہنا تھا کہ ایک تو ہمارے ملک میں پیٹرول کا خرچ کم ہوگا، دوسرے یہ کہ عوام اناس سائیکل چلائیں گے تو ان کی ٹانگوں کی ورزش ہو جائے گی۔ تیسرے یہ کہ فضا آلودہ نہیں ہوگی۔ موٹر گاڑیوں کی بہتات سے فضا میں کاربن اور جلے ہوئے پیٹرول کی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اپنے رہنماؤں کی تلقین کو مدنظر رکھتے ہوئے سائیکلیں خریدیں۔ جس کے نتیجے میں پہلے برس میں تیس لاکھ سائیکلیں فروخت ہوئیں۔ اگلے برسوں میں ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ چین کے بعد انڈیا میں بڑے پیمانے پر سائیکلیں بننا شروع ہوئیں (جن کی تعداد موٹر سائیکلیں بننے کے بعد بہرحال کم ہوگئی)

1980ء میں سویڈن کی کمپنی ''ایتارہ'' نے پلاسٹک کی سائیکل بنائی۔ مگر لوگوں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ فولادی سائیکل کے مقابلے میں پلاسٹک جلد ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ ایسی سائیکل خریدنے کے بعد وہ خود کو کوسنے کے سوا کیا کرسکیں گے۔ البتہ اس سائیکل کو ترجیح دی جو پندرہ سے بیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی تھی اور اس میں ٹانگوں کی طاقت بھی کم خرچ ہوتی تھی۔ سڑک اچھی ہو اور سائیکل سوار کی ٹانگوں میں طاقت بھی ہو تو یہی سائیکل پچیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھی چلائی جا سکتی ہے جیسا کہ سائیکل چلانے کے انعامی مقابلوں میں ہوتا ہے۔

البتہ جب اسپورٹس سائیکلیں مارکیٹ میں آنے لگیں تو لوگوں نے اس کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ ان سائیکلوں کا ڈھانچا بہت مضبوط تھا اور اس کے ہینڈل مڑے ہوئے تھے، تاکہ سوار کو اسے موڑنے میں آسانی ہو۔ ٹائر خصوصیت سے پائیدار تھے، تاکہ وہ طویل سفر کرسکیں۔ پھر پہاڑوں پر چلانے والی سائیکلیں متعارف ہوئیں جن کے ٹائر ضرورت کے مطابق بڑے رکھے گئے تھے۔

وہ سائیکلیں جو ریس کے مقابلوں میں حصہ لیتی ہیں ان میں بریک نہیں لگائے جاتے اس لیے کہ ریس میں حصہ لینے والوں کے ٹریک علیحدہ ہوتے ہیں اور انہیں ایک ہی سمت میں جانا ہوتا ہے پھر یہ کہ سائیکل سوار نہایت آسانی سے سائیکل کی رفتار دھیمی کرسکتا ہے، اس لیے کہ ان سائیکلوں میں گیئر فکس ہوتے ہیں اور فری وہیل نہیں ہوتا جبکہ فری وہیل کے بغیر سائیکل کا رکنا ممکن نہیں۔ چنانچہ جب پچھلا پہیا گھومتا رہتا ہے کرینک بھی گھومتا رہتا ہے۔ سائیکل کی رفتار دھیمی کرنے کے لیے سوار پیڈلوں پر دباؤ ڈالتا ہے، جو بریکنگ سسٹم کا کام کرنے لگتے ہیں۔ بہرحال یہ اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنے کہ سامنے کے پہیے پر لگے ہوئے بریک۔

2000ء میں سائیکلوں میں کمپیوٹر لگایا جانے لگا اور سادے گیئر کی جگہ الیکٹرونک گیئر استعمال ہونے لگے۔ اس کے علاوہ اسے رکھنے کی جگہ کی بچت اور سائیکل کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جانے کے لیے جو سہولت درکار ہوتی ہے، اس کے لیے سائیکل کے دو حصے کر دیے گئے ہیں اور درمیان میں قبضے لگا دیے ہیں جس سے سائیکل کو درمیان سے فولڈ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے علیحدہ سے کوئی دام نہیں ہوتے۔ بہت سے ریلوے اسٹیشنوں پر سائیکلیں پارک کرنے کی جگہ مخصوص کر دی گئی ہیں۔ جہاں کوئی کرایہ بھاڑا نہیں لیا جاتا۔ سائیکل کی دکانیں کھلے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے جہاں سے آپ سائیکل کرائے پر لے کر اپنا کام نمٹا سکتے ہیں۔

ابتدا سے لے کر اب تک سائیکل بنانے کے میٹریل میں کافی فرق آچکا ہے۔ ابتدا میں سائیکلوں میں جو میٹریل استعمال ہوا وہ ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا تھا، تاکہ اس کا وزن کم رہے مگر مضبوطی اور پائیداری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ 1930ء میں سائیکلوں کے فریم اور فورک ٹیوب میں بھرت استعمال کیا گیا پھر 1980ء میں اس کا فریم اسٹیل کے بجائے ایلومینیم کا بننے لگا۔ جبکہ مہنگی سائیکلوں میں کاربن فائبر استعمال ہونے لگا۔ کاربن فائبر اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ سائیکل کا مکمل فریم صرف 2.2 پاؤنڈ کا بن جاتا ہے۔ بہت سی سائیکلوں میں ایک زنجیر استعمال ہوتی ہے جو سوار کی ٹانگوں کی طاقت کو پچھلے پہیے تک منتقل کرتی رہتی ہے۔

جہاں تک گیئر کا تعلق ہے تو اس وقت جبکہ سائیکل کسی پہاڑی سے نیچے اتر رہی ہوتی ہے تو اس میں طاقتور گیئر استعمال ہوتے ہیں، لیکن ہموار سطح پر میڈیم گیئر اور پہاڑی پر چڑھنا ہو تو کم طاقت کے گیئر استعمال ہوتے ہیں۔

سفر کرنے والی سائیکلوں میں ایسا اہتمام کیا جاتا ہے کہ جن میں سامنے اور پیچھے کے رخ پر چھوٹے ریک لگے ہوتے ہیں، فینڈر اور مڈگارڈ لگے ہوتے ہیں۔ ان میں سفری بیگوں کے علاوہ پانی کی بوتلیں رکھنے کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ جب سائیکل پانی سے گزرتی ہے تو مڈگارڈ اور فینڈر سوار کی پانی سے حفاظت کرتے ہیں۔ جبکہ چین گارڈز سوار کے کپڑوں کی حفاظت تیل سے کرتے ہیں، مبادا اس کے کپڑے چین سے رگڑ نہ کھا جائیں۔

سائیکل میں اسٹینڈ بھی لگا ہوتا ہے تاکہ جب اسے سیدھا کھڑا کرنا ہو تو اس سے مدد لی جا سکے۔ چوری سے حفاظت کے لیے اس میں تالا بھی لگایا جا سکتا ہے۔ آگے اور پیچھے باسکٹ بھی لگی ہوتی ہیں تاکہ ان میں سامان رکھا جا سکے۔ بچوں کے بیٹھنے کے لیے اس میں پیچھے کی طرف ایک سیٹ لگی ہوتی ہے۔

اب سائیکلوں میں کمپیوٹر بھی لگائے جاتے ہیں تاکہ اس کی رفتار چیک کی جا سکے، سوار کے دل کی دھڑکن کو جانچا جا سکے۔ اس کے علاوہ سائیکلوں میں روشنی کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے تاکہ سوار کو رات میں پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ ریفلکٹر، آئینے اور گھنٹی بھی لگی ہوتی ہے۔ پانی کی بوتل لگانے کا انتظام بھی ہوتا ہے جس سے سوار سفر کے دوران پیاسا ہو تو پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتار سکے۔ سواروں کے لیے اب ہیلمٹ بھی بنائے جا رہے ہیں تاکہ حادثے کے وقت یا سڑک پر پھسلنے کی بنا پر اسے چوٹ نہ لگے۔

پنکچر لگانے کے لیے سائیکلوں کے ساتھ اب اوزاروں کا تھیلا بھی دیا جانے لگا ہے، جس میں مختلف قسم کے لیورز، سینڈ پیپر (تاکہ پنکچر ہونے کی صورت میں ٹائر کو رگڑ کر صاف کیا جا سکے) ربر سلوشن اور پنکچر لگانے کے لیے ربر کے گول ٹکڑے وغیرہ ہوتے ہیں۔

سائیکل چلانے کے دوران چونکہ اس کے اسکریوز ڈھیلے ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا ٹول بکس فراہم کیا جاتا ہے جس میں پتلا سا رینچ ہوتا ہے، اس کے علاوہ بال بیئرنگ، اسکریو ڈرائیور اور چین ٹول بھی ہوتا ہے۔

سائیکل سے خاص طور پر مضافاتی علاقوں میں آمد و رفت میں آسانی ہوگئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کی جگہ سائیکل نے لے لی ہے پھر رفتار میں بھی فرق پڑا اور کم وقت میں کام ہونے لگا (سائیکل کی جگہ اب موٹر سائیکل اور اسکوٹر نے لے لی جس سے مزید وقت بچنے لگا ہے) سائیکل کی افادیت بہرحال برقرار ہے۔ ابتدا میں جب کارخانے رہائشی علاقوں سے دور ہوا کرتے تھے تو مزدور سائیکلوں پر ہی کام پر جایا کرتے تھے (اس زمانے میں موٹر سائیکلیں نہیں چلتی تھیں) برطانوی حکومت نے مزدوروں کو سہولت دینے کے لیے اس پر ٹیکس نہیں لگایا۔ سائیکل مارکیٹ میں آنے کے بعد نیدرلینڈ کی حکومت نے ریلوے پر فری پارکنگ لاٹ بنانا شروع کر دیے، اس کے علاوہ سائیکلوں کی مرمت کے لیے بھی دکانیں کھولی گئیں۔ لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ سائیکل چلائیں تاکہ دوہرا فائدہ حاصل ہو۔ جسمانی ورزش ہو جائے (ایک میل سائیکل چلانے سے 22 کیلوریز یا حرارے خرچ ہوتے ہیں) اور وہ کم وقت میں کام پر پہنچ سکیں۔ غریب اور مفلس افراد نے جب سامان لے جانے اور لے آنے کے لیے سائیکلیں استعمال کرنا شروع کیں تو..... مجموعی طور پر ان کی غربت 35 فیصد تک دور ہوگئی۔ ابتدا میں امریکا اور برطانیہ میں خواتین نے احتجاج کیا کہ لمبے اسکرٹ کی وجہ سے انہیں سائیکل چلانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا انہیں کم لمبا اسکرٹ پہننے کی اجازت دی جائے (ان کے اسکرٹ کی لمبائی عدالت کی طرف سے مقرر تھی) انہیں چھوٹا اسکرٹ پہننے کی اجازت دے دی گئی۔ جب سائیکلیں بڑے پیمانے پر بننا شروع ہوئیں تو کارخانوں میں کام بڑھ گیا اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ روزگار ملنے لگا۔ ایران میں خواتین کے لیے اسلامی سائیکل بننا شروع ہوگئی ہیں جو عبایہ پہننے والیاں بہ آسانی چلا لیتی ہیں۔ 2009ء تک دنیا میں 130 ملین سائیکلیں فروخت ہو رہی ہیں۔ جن میں سے صرف چین میں 60 فیصد بنتی ہیں۔

سائیکل چونکہ ہلکی پھلکی ہوتی ہے، چنانچہ اس کی چوری کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ دنیا میں جتنی سائیکلیں بنتی ہیں اس کی پچاس فیصد چوری ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی سب سے بڑی سائیکل بنانے کا شرف جنوبی آسٹریلیا کو حاصل ہے جو 135.10 فٹ لمبی ہے، جسے چار افراد مل کر چلاتے ہیں۔ موٹر سائیکل کے ایجاد ہونے کے بعد سائیکل کا مستقبل تاریک نہیں ہوا ہے۔ مضافاتی علاقوں میں اب بھی سائیکلیں استعمال ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر کے چھوٹے موٹے پرزے تو اس میں لگ ہی رہے ہیں، الیکٹرونک کے پرزے لگانے کے بعد یقیناً اس کی افادیت اور مانگ میں اضافہ ہوگا۔



قسط نمبر: 13

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب منتخب صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہوجائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کررہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ رہا تھا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کرہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہورہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کرہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی نعیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ نعیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسیج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات نے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جارہا تھا۔ میں نے عزیز خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ دونوں پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کردیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف جھنڈر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کرکے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہوچکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آرہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر آئی تھی اور نعیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ نعیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیز نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور اس سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغوا کا سن کر پریشان ہوگیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کردیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ صمر کو کہاں رکھا ہے۔ بحفاظت نکال لیا۔ پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی کینٹ کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کررہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آگئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کی ایک کو گرفتار کرلیا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کرکے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظرانداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہوگیا اور بھاگ کر زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہوگیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خادمہ کمرے کی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پاکر خادمہ سے رسی لانے کو کہا۔ کسی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آگئے تھے۔ کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ نعیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا۔ نعیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجھ کو قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھابھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ نیاری کا بچہ بچہ پی پی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا۔ ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچے تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر میں جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن داکہ سے سامنا ہوگیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے کنٹینر گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہوگیا۔ اگلے دن زنیرہ نے میرے سامنے اخبار پھیلا دیا جس میں خبر لگی تھی کہ ثوبیہ کے گھر والے دیت پر راضی ہوگئے ہیں۔ میں کالیا کے ساتھ اسکوٹر پر جا رہا تھا کہ گندے پانی میں اسکوٹر الٹ گئی۔ تبھی ایک گاڑی بھی گلی میں آگئی۔ اس سے ہم پر فائر ہوئے۔ ہم ساکت پڑے تھے کہ کسی کی آواز آئی۔ لگتا ہے دونوں مرگئے۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آئے ہم نے حملہ کردیا اور پھر میں زخموں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو اسپتال میں تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد میں سائیں داد کے ساتھ ٹھٹھہ کے جنگل میں پہنچا۔ وہاں سبز رنگ کے تین آدمی نظر آگئے جو ہم پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔

اب آگے پڑھیں

وہ تینوں کسی آسیب کی طرح میری طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ دو سامنے سے اور ایک دائیں جانب سے۔ ان کے ہاتھوں میں سرکنڈوں کے نکیلے ٹکڑے دبے ہوئے تھے، جس سے وہ مجھے ادھیڑ ڈالنے کے لیے بہت بے چین نظر آرہے تھے۔

چھٹکی ہوئی چاندنی میں میری طرف بڑھتے ہوئے ان کے سبز ہیولے بڑے پُراسرار نظر آرہے تھے۔ میرا اور ان کا فاصلہ دم بہ دم گھٹتا چلا جارہا تھا۔ میں ان تینوں کے مقابلے میں تنہا، بے یار و مددگار اور نہتا بھی تھا۔ اس پر مستزاد میری آنکھیں کیچڑ پڑنے کی وجہ سے جلن کا بھی شکار تھیں، میں آنکھوں کو مسل بھی نہیں سکتا تھا، ایسی صورت میں مزید میری آنکھیں خراب ہوجاتیں اور جو تھوڑا بہت مجھے نظر آرہا تھا میں اس سے بھی محروم ہوجاتا۔ وجہ یہی تھی کہ میرے ہاتھ کیچڑ زدہ ہورہے تھے۔ کپڑوں کی حالت تو پہلے ہی کیچڑ سے تربتر تھی۔

اس کیچڑ زدہ دلدلی زمین پر دوڑنا بھی میرے لیے محال ہی تھا جس سبز آدمی سے میں تھوڑی دیر پہلے نبرد آزما تھا وہ سامنے سے جبکہ اس کے دو ساتھی دائیں کنارے سے دلدل میں اتر کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ آخرالذکر ان دو آدمیوں کے عقب سے میں نے اچانک ہی ہیولے کو کسی بھوت کی طرح ابھرتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں بھی مجھے ایک لمبا سا سرکنڈا نظر آیا تھا۔ جو اس نے پیچھے سے ایک سبز آدمی کی پشت میں گھونپ دیا تھا۔

رات کے دم بہ خود سناٹے میں اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بڑی خوفناک محسوس ہوئی۔ عقب والے ہیولے نے اسے دھکیلا تو اس کے ساتھ والا حملہ آور کی طرف پلٹا مگر اسی اچانک نمودار ہونے والے ہیولے نے اس کے پیٹ میں وہ سرکنڈا پیوست کردیا۔ وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح ایک دل خراش چیخ کے ساتھ کیچڑ میں گرا۔ نجانے یہ کون میرا نجات دہندہ تھا جو اس مشکل اور نازک وقت میں میرے کام آرہا تھا۔

”سائیں داد!“

دفعتاً میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس خوش کن خیال سے ہی میرے وجود میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ سامنے سے آنے والا سبز آدمی اپنے دونوں ساتھیوں کا عبرت ناک انجام دیکھ کر فوراً ہی محتاط ہوگیا اور مجھ سے توجہ ہٹا کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوکیلا سرکنڈا میرے نجات دہندہ کی طرف زور سے اچھال دیا۔ اس کا نوکیلا سرا تو نہیں البتہ اس کی ضرب اس کی پیشانی پر گئی، وہ کیچڑ میں کھڑے کھڑے لہرایا اور پھر شاید اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ میں نے سبز آدمی کو وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ اس کی جانب بڑھتے دیکھا تو میں نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے قریب آگیا۔

میرا نجات دہندہ گرنے کے بعد سنبھل کر اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اس خبیث سبز آدمی کو خونخوار غراہٹ کے ساتھ اس پر جھپٹتے دیکھا۔ جوشِ غیض کے میرا بھی برا حال تھا، میں نے بھی یہی حرکت کی اور اسے عقب سے دبوچا۔ اس کے بال میرے ہاتھوں میں آگئے۔ وہ نجات دہندہ کے ساتھ گتھم گتھا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹھوڑی اور سر کے پچھلے حصے کو پکڑ کر جھٹکے سے گھما دیا۔ اس کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ وہیں کیچڑ میں غرق ہوگیا۔

”کک..... کون ..... ہو تم؟“ میں اپنے نجات دہندہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”نن..... نوبی!“ وہ اتنا ہی کہہ پایا اور میں اس کی آواز پر چونک گیا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا وہ سائیں داد ہی تھا۔

”سائیں داد! میرے دوست!“ میں خوشی سے چیخا اور اسے سنبھالا دیا۔ ”تم ٹھیک تو ہو ناں میرے یار!“

وہ ہانپنے لگا۔ بولا۔ ”تت..... تم تو ٹھیک ہو ناں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ لل..... لیکن مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ہم نے اس پُراسرار مخلوق پر فتح حاصل کرلی ہے مگر تم کہاں رہ گئے تھے؟“ میں نے ایک گہری تشویش تلے اس سے پوچھا۔

”مجھ پر انہی کے کسی ساتھی نے اچانک عقب سے حملہ کیا تھا اور پرے کھینچ کر لے گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا تمہیں پتا نہیں چلا تھا؟“

”نہیں دوست! میں تو کافی آگے نکل گیا تھا، میں یہی سمجھ رہا تھا کہ تم میرے پیچھے چلے آرہے ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”آگے بڑھو ہم خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔“ وہ بولا۔

”ٹھہرو!“ میں نے کہا اور گرے ہوئے سبز آدمی کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ سبز آدمی کے بہروپ میں کوئی عام انسان ہی تھا۔

”یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟“ میں زیرِلب بڑبڑایا۔

سائیں داد بھی ہونٹ بھینچے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''بہروپیے لگتے ہیں یہ لوگ، کسی خاص مقصد کے لیے ہی انہوں نے یہ بھیس بھر رکھا ہوگا۔''

''آگے بڑھو۔'' وہ بولا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا۔ وہ تھوڑا زخمی نظر آرہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو سہارا دیے کنارے کی طرف آگئے اور پھر اس منحوس دلدل سے باہر نکل آئے۔

ہمارے اطراف میں گہرا اور دم بخود سا سناٹا طاری تھا۔ آسمان صاف اور تاروں بھرا نظر آتا تھا۔ چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا مگر اس کی ضیا پاشیاں اردگرد کے ماحول کو منور کیے ہوئے تھیں۔ جنگل میں دل دھڑکا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ذرا سستانے کے بعد ہم دونوں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے بائیں جانب دلدل کا پاٹ چوڑا ہوتا جارہا تھا۔ تھوڑا اور آگے بڑھے تو وہ ایک جھیل کا منظر پیش کرنے لگا، اس کے بعد بائیں جانب گھومتے ہی ہمیں ایک خاصے چوڑے پاٹ کا کھالا نظر آیا۔ سائیں داد نے ذرا رک کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا۔

''یہ کٹاؤ ہے اور پاس کے سمندر سے نکالا گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ آگے جا کر ایک بڑی سی نہر کی صورت اختیار کر لے گا۔''

اس کا خیال درست ثابت ہوا، وہ آگے جا کر ایک بڑی نہر کی سی شکل میں آگیا اور تب ہی ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ چند فرلانگ کے فاصلے سے ہمیں سامنے ہی اس کے کنارے پر جھیر کی جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان کوئی چمکتی ہوئی سی شے دکھائی دی۔

''آگے بڑھتے رہو لولی! ہماری منزل قریب ہے۔'' اچانک سائیں داد نے جوش تلے کہا اور ہم نے پھر آگے بڑھنا شروع کردیا۔ جلد ہی ہم فولاد کی سی چمک دیتے ہوئے اس شے کے قریب پہنچ گئے جو اب ایک بڑی سی لانچ کی شکل میں نظر آرہی تھی۔

''یہی وہ لانچ ہے جس کے بارے میں تمہیں شانو کھو جانے بتایا تھا۔'' سائیں داد بولا اور میں متحیرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''المیر'' لانچ میری دم بہ خود نظروں کے سامنے تھی۔ لانچ ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی اور اس کے مستول بھی گرے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی باڈی کو زنگ اور لونا کھا چکا تھا۔ ایک سائیڈ سے پانی کے اندر جھکے ہوئے ہونے کے باعث لانچ کے اندر خاصا پانی بھر چکا تھا۔ چاند کی طلسماتی روشنی میں ایک طرف کو جھکی جھکی لانچ کا منظر خاصا اسرار بھرا نظر آتا تھا۔ کچھ گوشے اب بھی تاریکی میں غرق تھے۔ صرف بیرونی حصے صاف نظر آرہے تھے۔ عرشے کی ریلنگ بھی ایک طرف سے ٹوٹ کر نیچے جھول رہی تھی۔ ہم نے احتیاط سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے عرشے کا رخ کیا اور کسی طرح اس پر چڑھ گئے۔ اب ہم المیر لانچ کے عرشے پر تھے۔ ہمارے اردگرد جنگل تھا اور ایک طرف پانی۔

جھینگروں کی جھائیں جھائیں اور مچھروں کی سمع خراش آوازیں ہمیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ قریب کسی دبکے ہوئے جانور کی ہم پر نظر پڑی تھی، جو اپنے حلق سے عجیب سی آوازیں خارج کرتا ہوا ایک طرف کو بھاگا تھا۔ کوئی مچھلی پانی کی سطح پر ابھری اور پھر ڈبکی لگا گئی۔

''عرشے میں تو کوئی نظر نہیں آرہا۔'' معاً سائیں داد نے نیچی آواز میں مجھ سے کہا۔ ''ہمیں اس کے کیبن اور بار بردار حصے کی طرف جانا ہوگا۔''

''لیکن نیچے اور اندر اندھیرا ہے۔ ہماری ٹارچیں بھی نہیں رہیں۔ تاریکی میں بھلا ہم کیا اور کیسے کچھ دیکھ پائیں گے؟'' میں نے کہا۔

''تم ادھر ہی رکو میں نیچے جنریٹر روم میں جا کر روشنی کا بندوبست کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''نہیں، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' میں نے فوراً اس سے کہا۔ ''روشنی کی صورت میں کوئی بھی ادھر متوجہ ہوسکتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں دو مخالف پارٹیوں کے آدمی پہلے ہی سے خفیہ طور پر اس لانچ کی نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ پہلے والے کوئی اور تھے اور دوسرے سبز آدمیوں کے بہروپ میں کوئی اور...... وہ اب ختم ہوچکے۔ لہٰذا اب ہم ادھر ہی اطمینان سے بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرسکتے ہیں اور روشنی پھیلتے ہی اندر کا جائزہ لیں گے۔''

سائیں داد کو میری بات پر صاد کرنا پڑا۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ہم وہیں ایک صاف سی جگہ پر پشت ٹکا کر بیٹھ گئے۔ ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کائی زدہ سی نباتات کی بو ہمارے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ فضا سیلی سیلی اور مرطوب سی تھی۔ ہلکی ٹھنڈ کا احساس بھی ہونے لگا۔ ہم کبھی اونگھتے جاگتے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے وقت بتانے لگے، ایک موقع پر میری آنکھ ہی لگ گئی تھی، یہ تو شکر ہوا کہ سائیں داد کی بروقت آنکھ کھل گئی، اسی نے ہی مجھے جگایا تھا۔

''اٹھو دوست! صبح کاذب کی روشنی پھیل چکی ہے۔ چلیں نیچے؟''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر صبح کاذب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب کافی کچھ دیکھنے میں آرہا تھا۔

میں نے سب سے پہلے عرشے کے وسط میں آکر اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر ہم کیبنوں کی طرف بڑھ گئے۔ اندر بیشتر کھڑکیاں اور پورٹ ہولز کھلے تھے۔ ان سے اندر روشنی پڑ رہی تھی۔ لانچ بظاہر صحیح سالم ہی نظر آرہی تھی۔ اندر جابجا کچرا اور نجانے کیا کیا الابلا پھیلا ہوا تھا۔ کافی عرصہ ایک ہی جگہ ایک ہی حالت میں لنگر انداز رہنے کے باعث اندر کا نظام سارا ہی درہم برہم نظر آرہا تھا۔

ایک دو کیبنوں میں تو کوئی قابلِ ذکر شے دکھائی نہ دی تھی البتہ جب ہم سب سے نچلے کیبن میں گئے تو وہاں کچھ بوریاں ایک دوسرے کے اوپر بکھری پڑی نظر آئیں، ہم نے ان کا جائزہ لیا تو اس میں گلی سڑی سبزیاں اور فروٹ بھرے ہوئے تھے، فروٹ بھی گل سڑ گیا تھا۔ جن سے بڑی ناقابلِ برداشت بدبو اٹھ رہی تھی۔ دوسری اجناس بھی تھی جن کو پھپھوندی لگ گئی تھی۔ میں نے انہیں ہاتھ لگانے سے اجتناب ہی برتا تھا اور سائیں داد کو بھی اس کی ہدایت کردی۔

''میرا خیال ہے شانو نے تم سے جھوٹ بولا ہے یہاں تو ایسا کچھ نہیں نظر آرہا۔'' بالآخر اس آخری اور نچلے گودام نما کیبن کی تلاشی کے بعد سائیں داد مایوس ہو کر بولا۔

''لیکن اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''ہوسکتا ہے اس کا کوئی اور مقصد ہو، وہ تمہیں اس ویرانے میں قتل کروانا چاہتا ہو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہماری ان سے مڈبھیڑ بھی ہوچکی ہے۔ وہ ضرور اسی کے ساتھی ہوں گے۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، شانو سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے، وہ فقط ہم سے اپنا کام نکلوانا چاہتا ہے اور بدلے میں ہمارا کام اس کے ذمے ہے۔''

''دیکھو لولی! میں تمہارے ساتھ ہوں، مزید تلاشی کہو تو لے لیتے ہیں۔'' سائیں داد بولا۔

''تم ایک کام کرو سائیں دادا!'' بالآخر میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا۔

''بولو دوست!'' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

''تم ایک بار پھر اس سے اوپر والے کیبن کا ذرا اچھی طرح سے اور ٹھونک بجا کر جائزہ لو میں تب تک اسی کیبن کو دوبارہ دیکھتا ہوں۔'' وہ میری بات سن کر چلا گیا۔ میں نے اسے دانستہ اس کیبن سے نکالا تھا کیونکہ میں دیکھ رہا تھا وہ اس بدبودار کیبن سے کترا رہا تھا اور جب تک وہ یہاں موجود رہتا، یہی رٹ لگائے رکھتا کہ ہمیں یہاں کچھ نہیں ملنے والا جبکہ مجھے جانے کیوں شک سا ہو رہا تھا کہ اسی کیبن میں مجھے مطلوبہ اشیاء مل سکتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دل کڑا کیا۔ بوریوں کو اِدھر اُدھر کرتا رہا، تو اچانک میری نظر اس کی تہہ میں پڑی تو میں چونکا۔ بوریوں کے نیچے پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کچھ اوزار اٹھا رکھے تھے جو ایک پرانے زنگ آلود ٹول بکس سے ملے تھے۔ وہ میں نے ایک پیٹی پر آزمائے اور ایک پیٹی کھول دی۔ اس کے اندر سے تھیلیاں برآمد ہوئیں، جسے بڑی مہارت سے سربمہر کیا گیا تھا کہ وہ کھلنے نہ پائیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ایک تھیلی کو تیز دھار والے اوزار سے چیرا تو اندر سے سفید پاؤڈر گرنے لگا۔

''ہیروئن۔''

میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اسی طرح میں نے چند اور تھیلیاں اور دوسری پیٹی کو کھولا تو اس کے اندر سے بھی مختلف قسم کی منشیات برآمد ہوئیں۔ میں دنگ رہ گیا۔ شانو کی بات درست ثابت ہوئی (جس کا مجھے یقین بھی تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا) لیکن اس کے ساتھ ایک اور چونکا دینے والی بات بھی وقوع پذیر ہوئی۔ انہی پیٹیوں کو اِدھر اُدھر کرنے اور کھولنے کے دوران مجھے ان کے نیچے سے بھی ایک اور پیٹی کی جھلک دکھائی دی۔ میرے چونکنے کی وجہ یہی تھی۔ ان کا سائز اور شیپ ان پیٹیوں سے مختلف تھا اور رنگ بھی، منشیات والی پیٹیاں عام لکڑی کی تھیں اور ان کی چوڑائی تقریباً ڈیڑھ دو فٹ تھی، لمبائی بھی کم و بیش اتنی ہی تھی۔ یوں سمجھ لیں بارہ تیرہ کلو کے آم کی پیٹی کی طرح جبکہ آخر الذکر پیٹی کی لمبائی لگ بھگ چار سے پانچ فٹ اور چوڑائی ڈھائی سے تین فٹ تھیں اور ان کی لکڑی بھی عام نہیں تھی۔ وہ مضبوط اور مہنگی والی نظر آتی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ ان میں ضرور منشیات ہی ہوں گی لیکن دل میں کھٹک سی جاگی کہ اسے بھی کھول کر تصدیق کرلینے میں کیا حرج ہے؟ ایسی پیٹیوں کی تعداد اگرچہ منشیات والی پیٹیوں سے کم ہی تھی مگر آٹھ دس سے زیادہ نہیں تھیں اور اوّل الذکر پیٹیوں کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ میں نے کوشش کر کے ایک لمبی پیٹی کو نیچے سے کھینچنا چاہا تو میں حیران رہ گیا۔ میں

اسے بہ مشکل چند انچ ہی اپنی جگہ سے کھسکا سکا۔ وہ متابلتاً بھاری تھیں۔ ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے عقب سے کسی کی آہٹ سنائی دی، میں یک دم پیچھے مڑا اور بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہوگئی۔ وہ سائیں داد تھا۔ مجھے اس کے اتنی جلدی آنے کی توقع نہ تھی۔ وہ شاید دوسری بار سرسری سا ہی جائزہ لینے کے بعد لوٹ آیا تھا۔

میں نے اسے سب بتا دیا تو وہ حیران ہوگیا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے ہی ان کی کردہ مخصوص ساخت چوبی پیٹی نیچے سے کھینچ کھانچ کر نکالی اور کیبن کے فرش پر لے آئے۔ اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اوزاروں کے ذریعے اسے کھولا اور جیسے ہی ڈھکن اٹھایا میں سرتاپا لرز گیا۔

☆......☆

ہم دونوں پھٹی پھٹی نظروں سے کھلی پڑی پیٹی کو تکے جارہے تھے۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ چہروں پر سناٹوں کی سی کیفیات ثبت تھیں۔

"نن...... نوی! بھاگ چلو۔" معاً ہی میرے ساتھ دم بہ خود سے کھڑے سائیں داد کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ "مم...... مجھے تو یہ کوئی بہت ہی خطرناک چکر لگ رہا ہے۔"

"سائیں داد! تم نے جانا ہے تو جاؤ میں اس راز سے پردہ چاک کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں اور اسے پایۂ تکمیل تک ہی پہنچانے کا عزم رکھتا ہوں۔" میں نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ سائیں داد سے کہا۔ "تمہاری مہربانی کہ تم نے یہاں پہنچنے میں میری مدد کی۔"

میری بات سن کر وہ بے چارہ ذرا شرمسار سا ہوا اور اسی لہجے میں بولا۔

"معاف کرنا یار! میں ذرا ڈر سا گیا تھا۔ میں بھلا تمہیں یہاں اکیلا کیسے چھوڑ کر جاسکتا ہوں لیکن مجھے تو یہ منشیات سے بھی اونچا کیس لگتا ہے۔"

"یہ جو بھی ہے سارا ہی اونچے درجے کا معاملہ ہے سائیں داد!" میں نے کہا اور پھر کھلی پیٹی کی طرف متوجہ ہوکر اس پر جھکا۔

پیٹی کے اندر جدید اسلحے کی کھیپ رکھی ہوئی تھی۔ جن میں خودکار رائفلیں، میگزین اور بلٹ باکسز رکھے ہوئے تھے۔ میں نے دوبارہ اس کا ڈھکن اسی طرح اس پر چڑھا دیا۔ ہم دونوں ہی گھبرائے ہوئے تھے بلکہ سائیں داد بے چارہ تو کچھ زیادہ ہی پریشان اور بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی تشویش غلط بھی نہ تھی۔ اگر پولیس یہاں آجاتی اور ہم ایسے میں دھر لیے جاتے تو یہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والی ایک ایسی عبرت ناک کہانی ہوتی جس کا اختتام لمبی اور کڑی سزا کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔

میرے اندر بری طرح دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ یہ چکر اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ منشیات کی حد تک تو شانو کی بات درست ثابت ہوئی تھی لیکن یہ خطرناک اسلحہ اور نجانے کس مقصد کے تحت اسمگل کیا گیا تھا، نیز کہاں سے اور کس مقصد کے لیے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ پتا نہیں اس سلسلے میں شانو نے ہم سے جھوٹ بولا تھا یا پھر وہ اسلحے کی اس کھیپ سے ناواقف تھا۔

"اب کیا ارادے ہیں نوی سائیں؟" وہ بولا۔

"تصدیق ہوچکی، اپنا کام ختم۔ واپس لوٹتے ہیں۔" بالآخر میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور جیسے میری بات سن کر سائیں داد نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

ہم دونوں کیبن سے باہر آگئے اور ابھی ایک چکردار آہنی زینے کے قریب ہی پہنچے تھے جو اوپر عرشے کی طرف جاتا تھا، وہاں سے ہمیں کچھ گڑبڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹکے۔

"اس طرف!" میں نے ہلکی سرگوشی میں سائیں داد سے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہاں عرشے کا اندرونی حصہ نکلا ہوا تھا اور خلا سا بن گیا تھا۔ ہم وہاں دبک گئے۔

میں نے ذرا سن گن لینے کی کوشش چاہی تو جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اوپر کچھ لوگ آن دھمکے تھے کیونکہ اب ان کے بڑھتے ہوئے قدموں کی ہی نہیں بلکہ باتیں کرنے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم ذرا اور اندر کی طرف دب گئے۔ ہمارے سر اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے میں نے تین افراد کو نمودار ہوتے دیکھا اور بری طرح چونک گیا، حالانکہ وہ تینوں ہی میرے شناسا نہیں تھے۔ باوصف اس کے میرے چونکنے کی وجہ بڑی خاص تھی اور وہ یہ کہ ان تینوں میں سے ایک آدمی پولیس افسر کی وردی میں ملفوف تھا، جو خاصا فربہ اور توندیل کے علاوہ خاکستری رنگ کا تھا۔ قد درمیانہ تھا، بلکہ موٹا ہونے کے باعث درمیانے سے بھی چھوٹا ہی نظر آتا تھا۔ دوسرا کوئی ایک قدآور اور تنومند آدمی تھا۔ اس نے بیش قیمت شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا

اسمارٹ فون نظر آرہا تھا جبکہ تیسرا آدمی وہی سبز انسان تھا۔ اب ایک ہی رنگ روپ کے باعث یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ یہ انہی میں سے ایک تھا جن کے ساتھ میری خوف ناک مڈبھیڑ ہوچکی تھی یا پھر یہ کوئی اور تھا۔ ہاں! ایک اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ مڈبھیڑ ہونے والے ان تین سبز انسانوں میں سے ایک کو ہم شاید موت کے گھاٹ اتار چکے تھے جبکہ باقی شدید زخمی ہوگئے تھے۔ اگر یہ انہی میں سے ایک ہوتا تو زخمی ہوتا لیکن یہ بالکل بھلا چنگا نظر آرہا تھا جس کا مطلب تھا یہ ان کا ساتھی تو ہوسکتا تھا مگر ان تینوں میں سے نہیں تھا۔ تاہم اس کا انداز مودبانہ تھا اور وہ ان دونوں کے پیچھے چل رہا تھا۔

بہرطور میں نے دیکھا یہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ لوہے کی ریلنگ نما سیڑھیاں اترتے نیچے آرہے تھے۔

"سائیں انسپکٹر صاحب! آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں نے یہاں اپنے آدمی لگا رکھے ہیں۔" اسمارٹ فون والا آدمی کہہ رہا تھا۔ مخاطب پولیس افسر ہی تھا۔

"یہی نہیں بلکہ!" وہ رکا اور معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ساتھ کھڑے اس لمبے تڑنگے سبز آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اسے دیکھ رہے ہو ناں انسپکٹر صاحب! ایسے سبز آدمیوں کی اس جنگل میں بڑی دہشت ہے۔ میں نے ایسے چار پانچ آدمی چھوڑ رکھے ہیں۔ تمہارے بڑے صاحب انسپکٹر وجاہت سیال کے تعینات کردہ اہلکار انہی کی وجہ سے ہی یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوئے تھے۔"

"او...... اچھا...... اچھا۔" وہ موٹا پولیس والا مطمئن انداز میں ہنستے ہوئے اپنا سر ہلانے لگا۔ "تمہاری ذہانت کی داد دینی پڑے گی۔" وہ بولا۔ "لیکن بہتر ہوگا کہ اب مال کو جلد از جلد یہاں سے نکال لینا چاہیے کیونکہ اکبر کا یہ راز افشاں ہونے کا خطرہ ہے۔"

"اسی لیے تو آپ کو یہاں بلایا تھا کہ یہ سب قانونی آڑ میں ہوجائے تو تمہارے اس افسر سیال کو بھی کوئی گل کھلانے کا موقع نہ مل سکے جس پر ہر وقت ایمان داری اور فرض شناسی کا بھوت سوار رہتا ہے۔" شلوار قمیص والے آدمی نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کام کو پھر آج شام تک پایۂ تکمیل تک پہنچا دینا چاہیے۔"

"بالکل انسپکٹر سائیں! وڈے سائیں کا بھی یہی کہنا ہے۔"

"تو بس پھر آج پانچ بجے میں اپنے چند آدمیوں کے ساتھ یہاں آکر دکھاوے کے طور پر تھوڑی ہلکی سطح کی منشیات لے جاؤں گا اور تم لوگ اپنا اصل مال لے جانا یہاں سے۔"

"بالکل سائیں۔ وڈے سائیں کی بھی یہی پلاننگ ہے۔ وہ بھی آجائیں گے۔ ہمارے ساتھ ایک ٹرک بھی ہوگا۔" شلوار قمیص والے آدمی نے خوش ہوکے کہا۔

"چلو پھر مجھے ذرا ایک نظر مال کا دیدار تو کرادو۔" وردی والا بولا۔

اس کے بعد دونوں سیڑھیاں اتر کر اسی کیبن کی طرف بڑھنے لگے۔ جہاں منشیات اور اسلحہ چھپا کے رکھا گیا تھا۔

"ولی داد!"

معاً ہی مجھے اپنے کان کے بالکل قریب سائیں داد کی سرگوشیانہ آواز میں خودکلامیہ بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

"تم نے کچھ کہا سائیں داد؟" میں ہولے سے اس سے مستفسر ہوا۔

"یہ ولی داد ہے، میں اسے جانتا ہوں۔ وہ شلوار سوٹ والا آدمی جس کے ہاتھ میں اسمارٹ فون ہے۔" سائیں داد نے بتایا۔ "یہ اسی جاگیردار وڈیرے حاجی مہران خان کا خاص آدمی ہے۔"

"اوہ! کیا واقعی۔" میرے منہ سے نکلا۔ اس کا مطلب ہے شانو کھوجا کی باتیں غلط نہیں تھیں۔ "آؤ ذرا دیکھیں چل کر یہ کیا باتیں کررہے ہیں؟"

"نہیں نوی!" سائیں داد بولا۔ "اب مزید وقت ضائع کرنا عقل مندی نہیں ہوگی۔ ہمیں اسی وقت انسپکٹر وجاہت سیال سے مل کر اسے یہ سب بتانا ہوگا۔ تم نے سنا نہیں کہ لوگ یہ سارا غیر قانونی اور خطرناک مال یہاں سے نکال لے جانے کی راہ ہموار کرچکے ہیں۔" اس کی بات پر میں نے اپنے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن سے کچھ سوچا اور پھر خاموشی سے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے عرشے پر آئے تو ٹھٹک گئے۔ لانچ کے دوسری طرف کنارے پر ایک ڈبل کیبن اور چوڑے ٹائروں والی گاڑی کھڑی تھی۔ وہاں دو گن مین کھڑے دکھائی دیے جو بیڑی پینے کے دوران ٹھٹھہ مار کے ہنس رہے تھے۔

"اس طرف سے نکل چلو۔" سائیں داد نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ "اگر ان میں سے کسی کی بھی نگاہ ہم پر پڑگئی تو یہ ہمیں بلادریغ گولی ماردیں گے۔"

سائیں داد نے نکاسی کے جس راستے کی طرف اشارہ کیا تھا وہ لانچ کی جنوبی سمت تھی۔ وہاں سے ہم ایک موٹے

رسے کے ذریعے عرشے سے نیچے اترے اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چلتے ہوئے دوسری طرف کے کنارے پر پہنچے۔ وہاں سے ذرا خشکی میں آتے ہی ہم نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔

مہم کی متوقع کامیابی کے جوش تلے میرے اندر جیسے ایک نئی طاقت سا گئی تھی۔ منشیات اور اسلحہ کی بھاری کھیپ کو یہاں سے پار لگانا اور اس کے بعد ملک وقوم پر اس کے اثرات کیا پڑنے والے تھے اس کا اندازہ ہر ذمے دار اور محب وطن آدمی بہ خوبی لگا سکتا تھا۔

قرائن سے مجھے یہی نظر آتا تھا کہ حاجی مہران خان کے آدمیوں نے ایک راشی پولیس افسر کی مدد سے اس غیر قانونی مال کو "پار" لگانے کا پکا بندوبست کر دیا تھا۔

ہم دونوں جیسے تیسے اور گرتے پڑتے کیمر کے اس پُر خطر جنگل کی حدود سے باہر نکل آئے۔ وہاں سے میں نے کسی میر بحر کی جھونپڑی میں جا کر اپنی حالت بہتر کی اور منہ ہاتھ دھو کے کپڑے دھوئے اور گیلے ہی پہن کر باہر آ گئے کہ دھوپ میں یہ خود ہی سوکھ جائیں گے، پھر وہاں سے میں نے ایک قریبی پی سی او جہاں ایزی لوڈ بھی ہوتا تھا، زنیرہ کو کال کی۔

میں نے اسے اشاروں کنایوں میں اپنی مہم کی کامیابی کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی کہا۔

"کسی طرح مجھے ٹھٹھہ کے انسپکٹر وجاہت سیال سے ملنے کا وقت لے کر ایک ملاقات اس سے کروانے کا بندوبست کر دو لیکن ذرا جلدی۔"

میں نے اسے پی سی او کا نمبر دے دیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ ایک گھنٹے بعد ہی پی سی او والے چھوکرے نے بتایا کہ میرا فون آیا ہے، میں دھڑکتے دل کے ساتھ کیبن میں گھس گیا اور کال ریسیو کی۔ وہ زنیرہ ہی کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں جہاں موجود ہوں وہاں کا پتا بتا دوں، انسپکٹر اپنے آدمی ہمیں لینے کے لیے روانہ کر دے گا۔

میں نے اسے پتا بتا دیا۔ بہ قول زنیرہ کے اپنے ایک جاننے والے پولیس انسپکٹر سے اس کا پتا لیا تھا اور ملاقات کا وقت بھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک کار ہمیں لینے آن پہنچی۔ مجھے حیرت ہوئی اس میں صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر۔ وہ نیچے اتر آیا۔ ہم تب تک پی سی او کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کار کی نمبر پلیٹ گرین کلر کی تھی اور اس میں سندھ گورنمنٹ لکھا ہوا تھا۔ وہ کار سے اتر کر اندازے سے ہماری طرف بڑھا تو ہم نے اسے بتا دیا کہ ہم ہی وہ اس کے مطلوبہ افراد تھے۔

"میرا نام خادم حسین ہے، انسپکٹر صاحب نے مجھے تم دونوں کو ہی لینے کے لیے بھیجا ہے۔" اس نے کہا اور پھر ہم اس کے ساتھ کار میں سوار ہو گئے۔ ذرا ہی دیر بعد کار فرانے بھرتی ہوئی ایک پوش کالونی میں پہنچ کر ایک کشادہ مکان کے سامنے رک گئی۔ ہم کار سے اتر آئے۔ گیٹ پر ایک چوکیدار نما آدمی موجود تھا۔ یہ بنگلا نما گھر تھا اور جس کے بڑے سے آہنی گیٹ پر گولڈن براس کی نیم پلیٹ پر ایس ایچ او وجاہت سیال کا نام درج تھا۔ ہمیں اندر ایک اوطاق نما کمرے میں بٹھا دیا گیا۔

"کیا انسپکٹر صاحب گھر پر ہی موجود ہیں؟" میں نے اسی آدمی سے پوچھا جو ہمیں لایا تھا۔

"نہیں، وہ پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں بتا دیا ہے وہ پہنچنے والے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم ہمارے لیے چائے اور بسکٹ لے آیا۔ ہم نے پانی منگوایا۔ پھر چائے پینے لگے۔ ابھی ہم نے چائے ختم ہی کی تھی کہ ہمیں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند ثانیوں بعد ہی اسی دروازے سے جو بنگلے کے باہر بھی کھلتا تھا۔ ایک مضبوط تن و توش کا پُر رعب شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر پولیس انسپکٹر کی وردی تھی۔

وہ ایک نوجوان شخص تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ قد برابر تھا اور جسمانی ساخت بھی۔ چہرے پر باریک مونچھیں تھیں۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ہم سے ملا۔ اس کے بعد ہمارا گہری نظروں سے جائزہ لیتا ہوا سامنے والی ایک نسبتاً آرام دہ کرسی پر براجمان ہو گیا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور اس کے بعد سائیں داد کا۔ نیز اس سے ساری باتیں راز میں بھی رکھنے کی درخواست کی۔ پھر میں نے گفتگو کی ابتدا، حاجی مہران خان اور اس کے بیٹے عزیر خان سے شروع کی وہ ایک پُر جوش سی دلچسپی سے میری تمام باتیں سنتا جا رہا تھا حتیٰ کہ میں نے اپنی مذکورہ مہم کے بارے میں بھی آخری تفصیلات دینے کے بعد اختتام کیا تو اس کا چہرہ اچانک جوش سے سرخ ہو گیا۔ اس نے اسی جوش کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ کر ہمیں گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"تم لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے اس لیے کہ تمہاری باتوں میں ذرا بھی مغالطہ محسوس نہیں ہوا ہے۔ مجھ سے جس پولیس والے کا تم نے ذکر کیا ہے وہ ہمارے ہی تھانے میں ایک سب انسپکٹر ہے۔ اس کا نام دل مراد ہے۔ اس کے

بارے میں سب کو معلوم ہے کہ وہ ایک راشی پولیس افسر ہے۔ خیر تمہارے بتائے ہوئے حلیے سے تو یہی لگتا ہے وہ..... باقی ہم خود ہی آج شام پانچ بجے چھاپہ مار کر دیکھ لیں گے۔ میں ایک طویل عرصے سے اس لانچ کی تلاش میں تھا۔"

ہم نے چند گھنٹے وہیں آرام کر کے گزارے اس کے بعد شام چار بجے ہی انسپکٹر سیال پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ کیمر کے ان ساحلی جنگلات کی طرف روانہ ہو گیا۔ پولیس کی تین موبائلز تھیں اور ایک جیپ میں وہ خود تھا اور ہم دونوں۔ باقی دو گن مین تھے۔

چھاپہ کامیاب پڑا۔ حاجی مہران خان ہی نہیں بلکہ وہ راشی سب انسپکٹر دل مراد اور اس کا خاص آدمی جسے سائیں داد بھی جانتا تھا۔ ولی داد بھی گرفتار ہوا، انہی میں میر محمد کے آدمی بھی تھے۔ ہماری تصدیق کے بعد یہ چھاپہ کامیاب قرار پایا تھا مگر انسپکٹر سیال نے ہمیں ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا۔

اس کامیابی کے بعد ہم نے ایک تیز رفتار کوچ کے ذریعے کراچی کا رخ کیا۔

سائیں داد کو میں نے ملیر اس کے گھر روانہ کر دیا اور خود استاد بھابھا کے اڈے پر آ گیا۔

وہاں کالیا کی طبیعت کا میں نے سب سے پہلے پوچھا تو پتا چلا وہ کافی بہتر تھا۔

"ابے لے جگری!" تھوڑی دیر بعد میری زبانی گزشتہ کارگزاری کی رپورٹ سننے کے بعد وہ ایک دم حیران ہو کے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"کمال کر دیا تو نے جگری! سب کو کھڈے لگا دیا تو نے۔"

"ہاں کالیا! اس بار حاجی مہران خان اور میر محمد نہیں بچیں گے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "مہران خان کا دست راست لاڈلہ سائیں بھی بری طرح نرغے میں آ جائے گا۔ انسپکٹر وجاہت سیال نے میر محمد اور لاڈلہ سائیں کی گرفتاری کے لیے ڈی آئی جی سے بھی خاطر خواہ مدد لے لی ہے۔ معاملہ حساس اور قومی نوعیت کا تھا اسی لیے فوری ایکشن لیا جا رہا ہے۔"

"واہ جگری! دل خوش کر دیا تو نے۔ سب کو ہی اندر کر دیا۔ مان گئے تجھے استاد!" کالیا خوش ہو کر بولا۔

"آخر تیرا ہی شاگرد ہوں میرے یار کالیا!" میرے لہجے میں اپنے اس یار بے بدل کے لیے ستائش تھی۔ وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

"اپنے اس کانے سیٹھ ستار کا کیا حال ہے؟"

"زخم چاٹ رہا ہے۔"

"اب کون رہ گیا؟"

"شاہ میر..... میرا اصل دشمن!" میں نے کہا۔

"ہم!" کالیا نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی۔ "یہ بہت قد آور دشمن ہے۔ تو بھی! بہت احتیاط سے اس پر ہاتھ ڈالنا ہوگا لیکن تو بتا رہا تھا کہ اکبر لانچ والے معاملے میں سی گوڈیز کے بن رائد اور را کا بھی نرغے میں آ سکتے ہیں۔"

"ہاں! ان کے خلاف ثبوت تیار کیے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا لیکن مجھے اپنی آواز گھٹی گھٹی سی معلوم ہوئی تھی جیسے فوراً ہی محسوس کرتے ہوئے کالیا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس سلسلے میں کوئی شک ہے؟"

"ہاں یار! کالیا، کچھ ایسا لگتا ہے کہ بن رائد پر پولیس کا ہاتھ ڈالنا ابھی اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"یہی میں بتانا چاہ رہا تھا تمہیں جگری!" کالیا ایک دم بولا۔ "بن رائد صاف مکر جائے گا کہ وہ کسی کو بھی نہیں جانتا۔"

"ہم!"

"اسے پھانسنے کے لیے تجھے کیمر کے جنگل جیسی مہم جوئی اختیار کرنا پڑے گی۔" وہ ہنس کر بولا تو میں بھی ہنس دیا۔

خوشی کے اس موقع پر ہماری گفتگو ایک بار پھر مایوسی کی طرف جانے لگی تو کالیا اسی طرح ہی اسے ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے اس کی یہ عادت پسند تھی۔

"سن جگری! اپنے سدو بھائی کی معلومات اور تیری اس روزی کی بندرگاہ والی مہم کے مطابق اگر را کا اور بن رائد رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں تو تیرا بڑا اور اصل دشمن شاہ میر بھی نرغے میں آ سکتا ہے اسی لیے ان دونوں کو اپنی نظروں سے ذرا بھی اوجھل مت ہونے دینا۔"

کالیا نے بڑے پتے کی جو بات کی تھی وہ میرے ذہن میں بھی تھی لیکن ابھی مجھے فوری طور پر ایک اور ضروری کام نمٹانا تھا۔ کالیا کو ابھی کچھ روز بیڈ ریسٹ کی ہدایت تھی اسی لیے میں نے خود ہی اسے نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا، وہاں فہیم بھی موجود تھا اور اپنے معذور بھائی کی طرف میں جب بھی دیکھتا تھا میرے پورے وجود میں کرب اور رگوں میں لہو لاوا بن کر دوڑنے لگتا تھا۔ ایسے میں میری نظروں کے سامنے بار بار بے رحم اور سفاک شاہ میر کا چہرہ گردش کرنے لگتا تھا۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس مردود اور جلاد صفت انسان نے میرے بھائی کے

ساتھ جو ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا ہے وہ ہی میں اس کے اکلوتے جوان بیٹے ثمیر شاہ کے ساتھ کروں گا لیکن اس سے پہلے مجھے فرحانہ سے ایک ملاقات کرنا تھی۔

مجھے دیکھنا یہ تھا کہ فرحانہ اور ثمیر ایک دوسرے میں کس حد تک ''انوالو'' ہیں؟

میں وہاں سے اپنی ویسپا اسکوٹر میں ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں پہنچا۔ عاصمہ بہن مجھے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر زنیرہ کے ساتھ بن رائد اور شاہ میر کے سلسلے میں مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔

باتوں باتوں میں جب عاصمہ میرے لیے چائے وغیرہ بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تو میں نے زنیرہ سے کہا۔

''میں عاصمہ بہن کو یہاں تمہارے پاس بہت خوش اور مطمئن دیکھ رہا ہوں۔ اس کے لیے میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں زنیرہ!'' میری بات پر وہ مسکرا کر بولی۔

''مشکور تو مجھے تمہارا ہونا چاہیے نومی! عاصمہ کی صورت میں مجھے ایک بہن مل گئی ہے۔ بہت دل بہلاتی ہے میرا۔ بہت اچھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بہت سگھڑ بھی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہے۔ مجھے نت نئی ڈشیں کھلا کھلا کر اس نے خاصا موٹا کر ڈالا ہے اور میں بھی ہوں کہ اس کے لذیذ کھانے کے آگے دل ہار جاتی ہوں اور ہاتھ ہی نہیں رکتا میرا۔ خالہ نجو سے بھی اس کی بڑی دوستی ہوگئی ہے۔'' میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا اور بولا۔ ''عاصمہ ہے ہی ایسی محبت کرنے والی اور کام کی لڑکی۔ اسے گھریلو کاموں میں بہت مزہ آتا ہے۔ گھر میں بھی اسی کی وجہ سے بڑی رونق لگی رہتی تھی مگر افسوس! اب تو شاید وہ آشیانہ ہی بکھر گیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں مغموم سا ہوگیا اور مجھے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ فضا سوگوار ہوتے ہی زنیرہ نے مجھے الٹی میٹم دے ڈالا۔

''خبردار..... خبردار! نو جذباتی سینٹی، سب کچھ اللہ کے فضل سے ٹھیک جا رہا ہے۔ ہر کوئی اپنی جگہ بہت خوش اور محفوظ ہے۔''

''ہاں! یہ تو تمہاری بات صحیح ہے زنیرہ!'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

''لیکن میری خواہش ہے کہ ہم تینوں بہن بھائی ایک بار پھر ساتھ اور اکٹھے ایک چھت تلے رہیں۔ اپنے گھر جا کر، میرا خیال ہے اس کا وقت آگیا ہے۔ ہمیں اب اپنے گھر کا رخ کرلینا چاہیے۔''

''ہرگز نہیں۔ تمہاری جنگ ابھی ختم کہاں ہوئی ہے نومی!'' زنیرہ نے کہا۔ ''تمہارے دشمن ایک سے بڑھ کر ایک خطرناک اور ظالم ہیں۔ موقع ملتے ہی انتقامی کارروائی کرنے سے گریز نہیں کرتے اسی لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ جو جہاں ہے اسے ابھی وہیں رہنے دو تو اچھا ہے۔''

میں کچھ کہنے والا تھا کہ اچانک زنیرہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''نومی! میں ایک بات سوچ رہی تھی عاصمہ سے متعلق۔''

''ہاں، ہاں کہو، تم بھی تو اس کی بڑی بہن کی طرح ہو۔'' میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

وہ کچھ سنجیدہ ہوکے مجھ سے بولی۔ ''عاصمہ کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے؟ میرا خیال ہے تمہیں اب تک اس کے فرض سے سبکدوش ہوجانا چاہیے۔''

اس کی بات پر میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

''ہاں، زنیرہ! ہمیں واقعی اس بارے میں سوچنا چاہیے لیکن حالات ہی ہمارے اچانک کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے کہ سب کچھ ادھورا رہ گیا ورنہ تو تمہیں کاشف کے بارے میں علم ہے ہی۔''

''ہاں! میں نے اسی لیے ہی تو یہ بات چھیڑی ہے۔'' وہ بولی۔ ''کاشف نے مجھ سے بات کی تھی فون پر۔'' اس نے بتایا اور میں اس کی بات پر چونک سا گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''ارے کیا واقعی؟ اس بدھو نے بھلا تم سے کیسے رابطہ کرلیا؟''

''ہش..... بدھو کیوں کہتے ہو اس بے چارے کو، تمہارا ہونے والا بہنوئی ہے وہ۔'' زنیرہ نے مجھے ٹوکا تو میں ذرا خفیف سا ہوکے مسکرا دیا، بولا۔ ''میرا مطلب تھا کہ وہ ایک سیدھا سادہ اور معصوم سا نوجوان ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ عاصمہ بہن سے مخلص ہے۔''

''باتوں باتوں میں عاصمہ سے میری اسی سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ اسی نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کاشف روز اسے فون کرتا ہے اور وہ بے چین بھی رہتا ہے آج کل۔ لگتا ہے دونوں کے دلوں میں پیار کی آگ ہے برابر کی لگی ہوئی۔'' زنیرہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ آگے بولی۔ ''پھر عاصمہ نے ہی مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، میں نے

اجازت دے دی تو عاصمہ نے اپنے ہی سیل فون سے میری اس سے بات کرائی اور خود شرما کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کاشف مجھے باجی جان کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اس کے والدین جلد ہی اس کی شادی کرنے والے ہیں اور چونکہ وہ اپنے ماں باپ کو اپنی پسند سے آگاہ کر چکا ہے اس لیے یہ کہہ رہا تھا، وہ تمہارا بھی پوچھ رہا تھا۔''

''ہوں!'' میرے منہ سے نکلا۔ ''تمہارا خیال ہے وہ ملنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں! مگر تم سے!'' زنیرہ نے مسکرا کے کہا۔ میں ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچتا بن گیا۔

''کیا سوچنے لگے؟''

''یہی کہ موجودہ حالات میں یہ اہم ذمے داری کس طرح نمٹاؤں؟ ایسے میں جبکہ بھائی فہیم بھی۔'' کہتے کہتے میں رک گیا۔ میرا دل بھر سا آیا تھا۔ زنیرہ فوراً تشفی دیتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''کیوں آزردہ ہوتے ہو نومی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ عاصمہ میری بہن کی طرح ہے۔ مجھے خوشی ہوگی اگر یہ سارا انتظام اور بندوبست اسی گھر سے کیا جائے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں کاشف سے کہہ دوں گی کہ وہ کل ہی اپنے والدین کو ادھر لے آئے۔ تم فہیم بھائی کو بھی یہاں لے آنا۔ بات کرلیتے ہیں پوری تسلی کے ساتھ ان لوگوں سے۔''

''لیکن زنیرہ! اس اہم گفتگو کے لیے ہم بہن بھائیوں کا اپنے گھر میں ہونا ضروری تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم کون سا لڑکے کا رشتہ کر رہے ہو؟'' وہ بولی۔ ''ایسا وہی لوگ سوچتے ہیں جو بیٹے کی بجائے بیٹی کا رشتہ طے کر رہے ہوں کہ آخر ان کی بیٹی شادی کے بعد کہاں رہے گی، عاصمہ تو گھر سے رخصت ہوکے اپنے گھر جائے گی لیکن ٹھیک ہے۔ گھر تمہارا ہے، کہہ دینا مرمت وغیرہ کا کام ہو رہا ہے۔''

''وہ تو لازماً ہوگا۔ گھر تھوڑا بہت مرمت طلب تو ہے، ابتدائی باتیں یہاں طے ہوجائیں۔ یوں بھی ہم اب تینوں بہن بھائی اپنے گھر میں شفٹ ہوسکتے ہیں۔ اب کوئی ایسا خطرناک مسئلہ نہیں رہا۔'' میں نے بھی کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہاں کا کیا بتائیں گے ان لوگوں کو کہ یہ کس کا گھر ہے؟ اور تمہارا کیا رشتہ ہے، وغیرہ؟''

میری اس آخری بات پر زنیرہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر بولی۔

''تم کہہ دینا، میں تمہاری دور کی رشتے دار لگتی ہوں بس!''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ابھی ان لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنے کا کہہ دیں، تب تک میں گھر میں رنگ و روغن کا کام کر والوں تو پھر وہیں سب کچھ کرلیا جائے؟''

''نہیں نعمان! اس طرح لڑکے کے گھر والے خوامخواہ ہی شکوک و شبہات میں پڑ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں بلا لو۔'' زنیرہ سنجیدگی سے بولی۔ ''کچھ بات تو آگے بڑھ جائے تاکہ ان کی بھی تسلی ہوجائے۔ لڑکی کا معاملہ ہے جس قدر جلد ممکن ہو نمٹا لیا جائے اور پھر کاشف اور عاصمہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ یوں لڑکے کے گھر والے بھی اپنے بیٹے کی پسند پر رضامند ہیں۔''

میں نے کچھ سوچنے کے بعد زنیرہ سے کہہ دیا کہ وہ انہیں کل شام چائے پر بلا لے۔

☆.....☆

میں زنیرہ سے رخصت ہوکر گھر سیدھا لاری اڈے پہنچا۔ وہاں کے تھوڑے بہت معاملات نمٹائے اس کے بعد فاخرہ کو فون کیا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ میری بات سن کر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''نعمان صاحب! کیا ابھی ضروری ہے ملاقات؟''

وہ کہیں باہر اور مصروف جگہ پر تھی کیونکہ پس منظر میں موٹروں اور گاڑیوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''ہاں!'' میں نے کہا۔ ''ملاقات تو ضروری ہے لیکن آپ اگر کہیں باہر ہیں تو میں انتظار کرلیتا ہوں۔''

''کون ہے بھئی کہہ دو نا باہر کہیں مصروف ہو۔'' اچانک مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی، یوں لگا جیسے کوئی اس کے بالکل قریب بیٹھا ہو، وہ شاید کار میں سوار ہو رہے تھے یا ہو چکے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں اس مردانہ آواز پر ایک خیال جھماکے کی طرح چمکا۔ کہیں یہ ثمیر تو نہیں تھا؟

''ہاں! میں باہر ہی ہوں۔'' فرحانہ کی آواز ابھری۔ ''اچھا ٹھیک ہے میں تھوڑی دیر بعد تمہیں کال بیک کرکے بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا اور میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

چند ثانیے کچھ سوچتا رہا اور پھر ایک فیصلہ کرکے میں نے لنچ لاری اڈے میں ہی منگوا کر کیا اور پھر ویسپا پر سوار ہوکر سدو بھائی کے پاس پہنچا۔ اسے میں نے کچھ ہدایات دیں اور اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اپنی اپنی بائیکس

پر کلفٹن روانہ ہوگئے۔
آتش زدگی والے واقعے کے بعد سے دونوں باپ بیٹی اپنے طارق روڈ والے گھر سے کلفٹن والے بنگلے میں شفٹ ہوگئے تھے۔
مذکورہ بنگلے کے قریب پہنچ کر میں نے سدو بھائی سے کہا کہ وہ اپنے سیل فون کی طرف سے الرٹ رہے، ہوسکتا ہے میں اسے کال نہ کرسکوں تو کوئی اہم میسج ضرور کرسکتا ہوں۔ اس نے میرا اشارہ سمجھ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔
میں اپنی ویسپا کو آگے بڑھا لے گیا اور سیدھا فاخرہ کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ اسٹینڈ پر لگا کر میں نیچے اترا اور گیٹ کی جانب بڑھا ہی تھا کہ ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا وہاں آکر رکی۔ میں نے اس طرف دیکھا اور چونک گیا۔ میرے چونکنے کی وجہ سے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود فاخرہ نہیں تھی بلکہ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اس کی شبیہ پوری پوری اپنے باپ سے ملتی تھی اس لیے میں ٹھیک ٹھیک طور پر یہ اندازہ لگانے میں کامیاب رہا تھا کہ یہ نوجوان میرے ازلی دشمن شاہ میر کا وہی بیٹا ثمیر شاہ تھا جس کے بارے میں کچھ دن پہلے ہی مجھے سدو بھائی بتا چکا تھا کہ اس نے شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو فاخرہ کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اس نے اس کی تصویر بھی دکھا رکھی تھی۔ تاہم آج اس سنپولیے کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔
اپنے دشمن کے بیٹے کو دیکھ کر میری چشم تصور میں اپنے بدنصیب بھائی نعیم کی کٹی ہوئی ٹانگیں گھوم گئیں اور میرا اندر نفرت وانتقام کی آگ سی یکایک بھڑک اٹھی۔
''خون کے بدلے خون اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ!''
یہی ایک گردان میرے اندر بار بار ہونے لگی۔
فاخرہ نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، وہ کچھ پریشان سی نظر آنے لگی۔ تاہم اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میری طرف دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں اپنا ایک ہاتھ ہلا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ کار گیٹ کی طرف بڑھا لے گئی جسے چوکیدار کھول چکا تھا۔ فاخرہ نے چوکیدار کو میرے سلسلے میں اشارہ کردیا تھا اسی لیے مجھے بھی اندر داخل ہونے سے اس نے روکا نہیں تھا۔
کار وسیع پورچ میں جا کے رک گئی اور فاخرہ جلدی سے نیچے اتر آئی۔ اسی دوران نوجوان بھی نیچے اتر آیا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک ملازمہ دوڑی چلی آئی تھی اور فاخرہ اسے کار سے سامان وغیرہ اتارنے کی ہدایات دے رہی تھی، تب تک میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔
''ہائے نومی! ان سے ملو یہ مسٹر ثمیر شاہ ہیں۔'' فاخرہ نے اس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔
''اور یہ ہیں نعمان۔'' اس نے میرا بھی نام کی حد تک تعارف کرا دیا۔ میں نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ ثمیر شاہ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ مجھے بڑی نخوت سے نظر انداز کرتا ہوا اپنی گردن موڑ کر ملازمہ سے مخاطب ہو کے بولا۔ ''ذرا دھیان سے وہ شوپیس نکالنا میڈ! بہت نازک ہے وہ۔'' کہتے ہوئے وہ جان بوجھ کر اس طرف بڑھ گیا تھا۔
وہ مجھے اپنے باپ کی طرح ہی گھمنڈی اور مغرور لگا تھا۔ اس کی مجھے نظر انداز کرنے کی حرکت پر میرا اندر سے خون کھول اٹھا تھا۔ میں نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ نہایت خجالت کے ساتھ گرا دیا تھا۔ تاہم سوچنے لگا تھا کہ کیا یہ مجھے اپنے باپ کے دشمن کی حیثیت سے جانتا تھا یا پھر اس کا مزاج ہی اتنا اکھڑ تھا۔
ایسے میں فاخرہ مسکراتی ہوئی مجھ سے بولی۔ ''آیئے نعمان صاحب! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ پاپا بھی اندر ہی ہیں۔ ویسے سب خیریت تو ہے ناں؟''
رانا بشیر کی بھی اندر موجودگی کا سن کر میں تھوڑا چونکا تھا۔ پھر وہ گردن موڑ کر ثمیر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''آجاؤ ثمی! سیما سب لے آئے گی تم فکر نہ کرو۔''
''یہ تھوڑا موڈی ہے نومی! تم پلیز اس کے کسی رویے کا برا مت منانا، دراصل راستے میں اس کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ کسی کار والے نے غلط سائیڈ سے آکر ہماری کار کو ٹکر مارنے کی کوشش چاہی تھی۔ یہ یہاں کی ٹریفک سے سخت نالاں رہتا ہے، مجھے بھی ڈانٹ دیتا ہے اکثر۔'' وہ مجھ سے یہ سب کہتی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اندر آگئی۔ اس نے غالباً ثمیر کی میرے ساتھ بے رخی بھانپ لی تھی۔
''آپ میری آمد پر کچھ پریشان سی ہیں۔ میں تو آپ کے فون کا ہی انتظار کرتا رہ گیا۔ اس لیے خود ہی چلا آیا۔'' میں نے شکایتی انداز میں کہا تو وہ ذرا خفیف سی ہو کے بولی۔
''سوری نعمان صاحب! دراصل ثمیر میرا بوائے فرینڈ ہے۔ آج پہلی بار میں اسے پاپا سے ملوا رہی تھی۔'' مجھے اس کی بات پر ایک جھٹکا لگا تھا۔ گویا رانا بشیر بھی اپنے دشمن کے بیٹے کو آج پہلی بار دیکھنے والا تھا۔ تو کیا وہ اسے پہچان لیتا یا پھر آگے کیا معاملہ ہونے والا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے مجھے اپنے اندر سنسنی کا احساس ہوا۔ خیر ہم دونوں ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ فرحانہ نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور

تھوڑی دیر میں لوٹنے کا کہہ کر اندرونی گوشے میں کھلنے والے ایک دروازے کی طرف بڑھ گئی۔
میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ طارق روڈ کی رہائش گاہ سے یہاں کلفٹن والی جگہ آکر بسنا ان دونوں باپ بیٹی کا پرانا خواب تھا۔ آتشزدگی والے واقعے کے بعد تو انہوں نے جلدی اپنے اس خواب کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ دونوں ڈائریاں بھسم ہو چکی تھیں اور میں جان چکا تھا کہ یہ کس کی حرکت تھی اور یہ بھی کہ رفعت خانم مرڈر کیس کا اصل مجرم کون تھا۔ جانتا تو رانا بشیر بھی تھا لیکن اس پر صرف شبہ تھا مگر اب شاہ میر سے ٹیلی فونک اور اس کے نمائندے بن رائد سے بالمشافہ ملاقات اور گفتگو کے بعد سے اسے بھی یقین ہو چلا تھا کہ کون اس کی بیوی کا قاتل ہوسکتا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ رانا بشیر ان حقائق کے بعد کون سا قدم اٹھانے والا تھا جبکہ میں سمجھتا تھا کہ رانا بشیر میرے لیے شاہ میر کی قبر کھودنے کے لیے بہترین معاون ثابت ہوسکتا تھا یا نہیں؟ نیز ان سارے گھن چکروں میں اب فرحانہ کا کردار کیا ہوسکتا تھا؟ یوں میں بالکل ٹھیک وقت پر پہنچا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ رانا بشیر ثمیر سے کس حد تک واقف ہے؟ جبکہ یہ سب مجھ سے واقف نہیں تھے کہ میں اندرون خانہ کیا کچھ جان چکا تھا۔ دیکھنا یہ بھی تھا مجھے کہ آیا ثمیر نے یہاں اپنی پہچان کس حیثیت سے کروا رکھی تھی اور رانا بشیر ثمیر کی اصلیت سے کس حد تک واقف تھا۔ یوں گویا میرے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے والا تھا۔ چنانچہ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے سے اور کیا کچھ سامنے آنے والا تھا۔
اچانک کمرے میں آہٹ ابھری، میں نے دیکھا ثمیر اس ملازمہ سیما کے ساتھ سامان کے بڑے بڑے شاپرز اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے تئیں پوری کوشش چاہی تھی کہ کوئی ایسا تاثر نہ دوں جس سے ثمیر کو میری طرف سے کوئی ذرا سا بھی شبہ ہوسکے۔ نہ ہی یہ بھی کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اس کی بے رخی کا برا بھی منایا تھا۔
''جاؤ اب میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ اور یہ فرحانہ کہاں گئی؟ چلو اسے بھی بلا لاؤ۔'' وہ سیما سے یہ کہتا ہوا میرے دائیں ہاتھ کے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے براجمان ہوگیا۔ اب وہ میری طرف گھور رہا تھا اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر میں دانستہ ہولے سے مسکرایا تھا۔ بے رخی اور خار باز مغرور لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی اس نازیبا حرکت کا کسی نے برا ہی نہیں منایا تو الٹا وہ خود ہی تپ جاتے ہیں۔ یہی ثمیر کے ساتھ ہوا۔
''بڑے ہی ڈھیٹ قسم کے انسان ہو تم۔'' بالآخر وہ چڑ کر مجھ سے بولا۔ ''جب فرحانہ نے تمہیں ملنے اور آنے سے انکار کردیا تھا تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟''
''آپ نے کچھ کہا؟'' میں دانستہ اسے جلانے کے لیے انجان بن کر بولا۔
''نہیں دیواروں سے کہہ رہا تھا کچھ۔'' وہ چڑ کر بولا۔
''ارے واہ کیا اس نئے گھر کی دیواریں باتیں بھی کرتی ہیں انسانوں سے؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔
''نیا گھرا تو گویا تم کافی عرصے سے ان دونوں مال دار باپ بیٹی کے ساتھ نتھی ہو۔ کیا عزائم ہیں آخر تمہارے؟'' اس نے زہریلے طنز سے کہا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ میں ادھار چکانے کی صورت میں اسے دق کر رہا تھا۔
''وہی جو تمہارے عزائم ہیں مسٹر ثمیر!'' میں نے دانستہ اسرار بھرے لہجے میں کہا تو وہ چونکا اور اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔
''کیا مطلب؟''
اسی وقت فرحانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ رانا بشیر بھی تھا۔
''ہیلو انکل! ہیو اے نائس ڈے۔'' وہ فوراً صوفے سے کھڑے ہو کر رانا بشیر سے مسکرا کے بولا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سر کے خفیف سے اشارے سے ہی رانا بشیر کو سلام کرنے پر اکتفا کر کے دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔ ثمیر کو یہ عجیب لگا تھا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ رانا بشیر مجھے وہاں دیکھ کر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ کیا شک تھا کہ فرحانہ نے اسے میری آمد کے بارے میں بھی بتا دیا ہوگا۔
بہرطور دونوں باپ بیٹی میرے سامنے کے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔
''نیا گھر مبارک ہو رانا صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ماشاء اللہ بڑا خوبصورت ہے۔''
''انکل یہ ہے کون؟ لگتا تو ایسا ویسا سا ہی ہے۔ پھٹیچر قسم کا لیکن میں دیکھ رہا ہوں یہ بہت فری لگ رہا ہے آپ لوگوں سے، کیا کوئی رشتہ دار ہے آپ کا؟'' ثمیر نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے رانا بشیر سے کہا تو میں نے ثمیر کو مخاطب کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔
''اے مسٹر! اب ذرا آگے منہ سنبھال کر بات کرنا تو دولتیوں والا گھمنڈ تمہارے مزاج سے ہی نہیں کردار سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ تمہارے جیسے کم ظرفوں کو میں ان کی اوقات یاد

دلانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتا ہوں۔''

''او کم آن ثمیر! پلیز ریلیکس، یہ نعمان صاحب ہمارے پرانے واقف کار ہیں۔'' میری جوابی کارروائی نے بالآخر فرحانہ کو بولنے پر مجبور کر ہی ڈالا تھا جبکہ ثمیر کا چہرہ مارے طیش کے مسخ ہو کے رہ گیا تھا۔ اس پر اس کے مردود و ملعون باپ شاہ میر کی مجھے پوری پوری چھاپ محسوس ہوئی۔ وہ اسی کی طرح غصہ ور اور گھمنڈی نظر آ رہا تھا۔ وہ میری طرف غضب آلودہ نظروں سے گھورتا ہوا ایک دم چراغ پا ہو کر صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم!'' وہ شدت غضب ناک لہجے میں میری جانب اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے کپکپاتے ہوئے بولا۔

''آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟'' اسی وقت رانا بشیر چلا کے بولا۔

''یہ دونوں نہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں تو پھر اتنا غصہ ایک دوسرے پر کیوں کر رہے ہیں بیٹی؟ معاملہ کیا ہے آخر؟ اور...... اور یہ کون شخص ہے جو مجھے اتنی بے تکلفی سے انکل کہہ رہا ہے؟''

وہ فرحانہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہو گیا کہ ثمیر بھی آج واقعی پہلی بار یہاں آیا تھا۔ ممکن تھا فرحانہ اسے آج پہلی بار ہی اپنے پاپا سے ملوانے لائی تھی۔ بات واضح ہونے لگی تھی کہ کوئی بھی ایک دوسرے کی اصلیت نہیں جانتا تھا اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا اتفاق کے زمرے میں ہو رہا تھا لیکن نہیں ایک اور خیال اچانک ہی میرے ذہن طباع میں ابھرا تھا۔ وہ یہ کہ ممکن ہے اس میں بھی شاہ میر کی کوئی گہری چال ہو اور اس نے ضرورت پڑنے پر اس بار اپنے حواریوں کے علاوہ اپنے بیٹے کو بھی مہرہ بنا کے آگے سرکایا ہو۔

''میرا خیال ہے، فرحانہ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا، ابھی اس آدمی کی وجہ سے بدمزگی ہو گئی ہے، جس کا مجھے افسوس ہے۔''

میں نے دیکھا ثمیر نے خود پر قابو پاتے ہوئے فرحانہ سے یہ کہا تھا۔

''تم بیٹھو تو سہی، میں ابھی سب ٹھیک کیے دیتی ہوں پلیز!'' فرحانہ نے کہا اور پھر اس کے ایماء پر ثمیر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بیٹھ گیا۔

ابھی تک میں صحیح طور پر اس کے بارے میں یہ اندازہ قائم نہیں کر پایا تھا کہ کیا ثمیر غائبانہ طور پر کسی حوالے سے مجھے پہچان کر ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے تھا یا پھر اس کا مزاج ہی ایسا تند خو اور گھمنڈی تھا؟

فرحانہ نے اس بار خاصی متانت اختیار کرتے ہوئے قدرے شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نعمان صاحب! دراصل ثمیر کے موڈ کے خراب ہونے کی وجہ ایک طرح سے آپ ہی ہیں۔ جب میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ میں آج کے دن بزی ہوں اور آپ ملاقات کا پروگرام کل کا رکھ لیں تو آپ نے کیوں نہیں میری بات مانی، یہی نہیں آپ یہاں بغیر بتائے چلے بھی آئے۔ درحقیقت میں آج پہلی بار ثمیر کو پاپا سے ملوانے کے لیے گھر لا رہی تھی۔ جس کا پاپا کو بھی علم تھا۔'' فرحانہ کی بات پر مجھے صاف لگا تھا کہ اس نے ثمیر کا غصہ سرد کرنے کے لیے اور اپنے باپ کے سامنے اس کا موثر دفاع کرنے کی غرض سے یہ سب کہا تھا۔ نیز مجھے فرحانہ کی طرف سے کبھی بھی ایسی کوئی خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ وہ دیگر لوگوں پر بالخصوص ثمیر پر مجھے ہی ترجیح دے گی۔ ازیں علاوہ ڈائریاں نظر آتش ہونے کے بعد یا اس سے پہلے تب تک اس کی مجھ میں دلچسپی صرف اسی حد تک تھی کہ میں اس کی ماں کے اصل قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا، جو شاید گزرتے وقت کے ساتھ اس کا مجھ سے وہ مقصد یا مفاد بھی اب دم توڑ چکا اس لیے بھی میں اس کے لیے غیر اہم ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا باپ اصل قاتل کے بارے میں جان چکا تھا جس کے اکلوتے بیٹے کے ساتھ وہ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔

بہرکیف میں نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ فرحانہ کی یہ تلخ اور کڑوی گولی جیسی بات پی لی اور مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے اس سے بولا۔

''اٹس او کے، مس فرحانہ! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ آپ ثمیر کو پاپا سے ملوا دیں، میں تب تک خاموش ہو لیتا ہوں۔''

میں نے دیکھا رانا بشیر سوچتی ہوئی نظروں سے میری طرف تکے جا رہے تھے۔ وقت اور حالات نے پلٹا کھا لیا تھا۔ پہلے میں فرحانہ کے لیے اہم اور رانا بشیر کے لیے غیر اہم تھا مگر اب اس کے برعکس ہونے لگا تھا۔ رانا بشیر کی بن رائد سے ملاقات اور شاہ میر سے ٹیلی فونک گفتگو کے بعد میں اس کے لیے اہم اور ثمیر کی انٹری کے بعد میں فرحانہ کے لیے غیر اہم ہونے لگا تھا۔ مجھے ایسا کوئی شوق بھی نہ تھا تاہم فرحانہ کی غیر دلچسپی کی بڑی وجہ اس کی ماں رفعت خانم کے اصل قاتل والا

معاملہ (فرحانہ کے لیے) مایوس کن رہا تھا۔ اس پر مستزاد دونوں ڈائریوں کا نظر آتش ہونا بھی تھا۔ گویا جو تھوڑی بہت کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔ فرحانہ نے اب صبر کر لیا تھا اور ثمیر کے ساتھ نئی زندگی کی ابتداء کرنے کے بارے میں کوشاں تھی۔ اب انہیں کیا معلوم تھا کہ تقدیر میرا ساتھ دینے پر تلی بیٹھی تھی کہ ادھر ڈائریاں برباد ہوئیں تو ادھر رفعت خانم مرڈر کیس میرے سامنے عیاں ہو چکا تھا اور اب بھی میں ان دونوں باپ بیٹی کے سامنے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار بیٹھا تھا مگر یہ سب مجھے سوچ سمجھ کر اور غیر جذباتی ہو کے کرنا تھا۔ اسی سبب میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

''اب کیا فائدہ یہاں آ کر تم رنگ میں بھنگ تو ڈال ہی چکے ہو۔ بہتر ہو گا کہ آپ اپنی بات کی ابتداء کریں۔'' فرحانہ جیسے برا سا منہ بنا کے بولی۔ تب ہی اچانک رانا بشیر نے کسی گہری قسم کی زود فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

''اچھا بیٹا! موڈ خراب مت کرو اپنا۔ اچھا تو یہ ہیں وہ برخوردار ثمیر میاں جن سے تم ہمیں ملوانا چاہتی تھیں۔''

''جی پاپا! یہی ثمیر ہیں۔'' وہ ہولے سے بولی۔

رانا بشیر نے بڑی فراست سے تلخی کی فضا کو ختم کرنا چاہا تھا۔ میں بھی چپ تھا، دیکھنا چاہتا تھا کہ اب کیا دھماکا ہونے والا تھا جب ثمیر یہ بتاتا کہ وہ کس کا بیٹا تھا اور اگر چھپانے کی کوشش کرتا تو اس کا صاف مطلب ہوتا کہ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ دونوں باپ بیٹوں (شاہ میر اور ثمیر شاہ) کی ملی بھگت تھی کیونکہ میں تو اب ساری حقیقت جان چکا تھا۔

''میرا خیال ہے انکل! پہلے آپ انہیں فارغ کر دیں۔ میں پھر کبھی آپ سے مل لوں گا۔'' ثمیر نے رانا بشیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ان کے ساتھ باتیں ہماری ذرا رازدارانہ نوعیت کی ہیں جو تنہائی میں ہی ممکن ہو سکتی ہیں۔'' رانا بشیر نے میری طرف ایک نظر اٹھا کے دیکھنے کے بعد ثمیر سے کہا۔ ''تم بتاؤ برخوردار! کیا کرتے ہو؟ تمہارے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ فرحانہ بیٹی نے اکثر تمہارا ذکر کیا تھا میرے سامنے۔''

''جی انکل! میرے پاپا ایک بڑی عالمی آئل کمپنی کے ڈائریکٹرز میں سے ہیں۔ جو مشرق وسطیٰ میں آج کل ایک بڑے آئل فیلڈ کے پروجیکٹ میں مصروف ہیں۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ثمیر نام ہے میرا۔''

وہ بول رہا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رانا بشیر یک ٹک اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔

''تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شاہ میر!'' ثمیر نے بتایا اور میں نے دیکھا پھر جیسے ایک دھماکا ہو گیا۔ یہ نام سنتے ہی رانا بشیر جسے ابتدائی گفتگو میں ثمیر پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ شاہ میر کا نام سنتے ہی وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اسی وقت اس سے بولا۔

''ثمیر! تم اس وقت جا سکتے ہو۔ مجھے مسٹر نعمان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

میرے متوقع مگر فرحانہ کے لیے اپنے باپ کا یہ رویہ حیران کن اور پھر سخت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ وہ اچانک کھڑے ہو کر باپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رانا بشیر نے اس سے پہلے ہی بیٹی کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں کہا۔

''تم خاموش رہو بیٹی!'' اس کے بعد وہ دوبارہ حیران پریشان صوفے پر بیٹھے ہوئے ثمیر سے مخاطب ہو کے سرد لہجے میں بولا۔

''مسٹر ثمیر! میرا خیال ہے تم نے میری بات سن لی ہے۔''

تب میں نے دیکھا ثمیر کے چہرے پر تلخی امڈی اور وہ ایک شکایتی سی نظر قریب کھڑی فرحانہ پر ڈالتے ہوئے رانا بشیر سے بولا۔

''اٹس فائن انکل! میں جا رہا ہوں، شاید میں نے غلط جگہ کا انتخاب کر لیا تھا۔''

''یقیناً۔'' رانا بشیر نے کہا اور ثمیر غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

''پاپا! آئی کانٹ بلیو، بی بی...... یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ...... وہ...... آپ کے کہنے پر ہی آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔''

فرحانہ روہانسے لہجے میں بولی لیکن رانا بشیر نے ہولے سے ڈانٹ کر فرحانہ کو خاموش کرا دیا تو وہ روتی سسکتی ہوئی کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں تب تک سدو بھائی کو اپنے سیل فون پر جلدی جلدی ایک میسج کرنے میں مصروف تھا۔

''تم اسے جانتے تھے نعمان؟ کون تھا یہ؟'' رانا بشیر نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''میرا خیال ہے پہچان تو آپ بھی اسے گئے تھے۔'' میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔ وہ جواباً ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں! لیکن...... تم۔''

"آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ میں اسے پہچانتا ہوں؟" میں نے پھر سوال کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حوالے سے یہ بات مجھ سے کر رہا تھا۔

"یونہی پوچھ لیا تھا میں نے کیونکہ تم ان کے ساتھ آئے تھے۔"

"ہم الگ الگ آئے تھے۔" میں نے کہا اور انہیں بتا دیا۔

"اوہ اچھا۔"

"آپ تو جان گئے ہیں اسے پوچھ سکتا ہوں کون تھا یہ؟" میں نے دانستہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ میرے اس سوال پر رانا بشیر کچھ سوچتا بن گیا۔ پھر ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

"بات ذرا طویل ہے لیکن مجھے شاید تمہیں ساری تفصیل بتانا پڑے گی، یوں سمجھو نعمان! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں اس نوجوان کو اپنی بیٹی فرحانہ کے ساتھ دیکھ کر سخت فکرمند ہو گیا ہوں۔" وہ اب خاصا تشویش زدہ نظر آنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ مجھے پوری بات بتا دیں تو بہتر ہوگا۔ رہا مدد کا سوال تو ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ پورے خلوص سے تعاون کرنا ہمارے دیرینہ مفاد میں ہی ہوگا۔"

"یقیناً!" وہ ایک دم بولا اور پھر چند ثانیے خاموش رہتے ہوئے مناسب الفاظ تلاشتا رہا۔ مجھے تو سب معلوم تھا لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیا بتاتا ہے؟ نیز کسی مغالطے یا جھوٹ کا سہارا تو نہیں لینا چاہتا مگر اس نے ڈھیرے ڈھیرے مجھے شاہ میر کی پوری کہانی سے لے کر اب تک سب سچ سچ بتا دیا تو میں نے اسرار بھری مسکراہٹ سے جب اسے یہ بتایا کہ میں پہلے ہی سے یہ سب جانتا تھا تو رانا بشیر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"گ گ..... کیا واقعی، تم یہ سب جانتے تھے؟" وہ غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں! اور یہ بھی کہ ثمیر میرے اور آپ کے دشمن نمبر ایک شاہ میر کا اکلوتا بیٹا ہے۔" اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ سب پہلے سے جانتا تھا، میں اپنی "سورسز" کے بارے میں تو اسے تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا تاہم اس کی تسلی کی خاطر میں نے اسے کچھ مذکورہ ہوٹل میں اس کی شاہ میر کے "نمائندے" بن رائد سے اس کی ملاقات اور شاہ میر کی اس ہونے والی ٹیپ کی گئی ٹیلی فونک کال کے بارے میں بتا دیا۔ یہ معلومات مجھے سدو بھائی سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہی نہیں جب میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میری بن رائد سے ایک ملاقات اس کے جہاز "سی گوڈیز" پر بھی ہو چکی ہے، نیز اس قاتل خونیں گماشتے راکا سے بھی میں دو دو ہاتھ کر چکا ہوں تو وہ گنگ ہو کے رہ گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب رانا بشیر ایک دم مجھ سے بڑے ہی ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "نعمان بیٹے! تم ایک باہمت اور بہادر نوجوان ہو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے نعمان! اب تو تمہیں بھی اصل حقائق کا علم ہو ہی چکا ہے کہ اصل مجرم کون تھا لیکن شاہ میر اب میری اور میری بیٹی کی جان کا بھی دشمن بن چکا ہے، تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ وہ کس قدر خطرناک اور اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ وہ ایک ڈان ہے ایک سپر ڈان۔ مجھے پورا یقین ہے اس نے جان بوجھ کر میرے خلاف ایک چال چلی ہے اور میری جذباتی کمزوری سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کو میری بیٹی کے پیچھے بھی لگا دیا ہے۔"

"یہ بات ابھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے رانا صاحب!" میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ "فرحانہ اور ثمیر کی دوستی محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے اس کے لیے ہمیں فرحانہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے حقیقت جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

"میں ابھی فرحانہ بیٹی کو بلواتا ہوں، میں نے بھی بلاوجہ غصے میں اسے ڈانٹ دیا۔" رانا بشیر بولا تو میں نے اسے منع کر دیا اور رخصت ہونے کی غرض سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلوں گا۔ میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔ فرحانہ سے ابھی آپ کچھ مت کہیے گا۔ میں خود اس سے کبھی یہاں آ کر تفصیلی بات کر لوں گا۔ اس کے بعد آپ کو گرین سگنل دوں گا کہ پھر آپ اپنے طور پر اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے برخوردار! میں تمہاری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کروں گا۔" رانا بشیر بھی یہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور آخر میں بولا۔ "مجھے ڈر ہے کہیں یہ معاملہ جذباتی نہ صورت اختیار کر جائے کیونکہ فرحانہ کو میں نے اکثر اس سنپولیے ثمیر کی تعریفیں کرتے سنا ہے، آئی تھنک وہ اس میں پوری طرح انٹرسٹڈ ہے۔"

"دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے، فرحانہ بھی اتنی نادان نہیں ہے کہ اپنی ماں کے قاتل کے بیٹے کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا سوچے لیکن بہرحال ابھی تو یہ سب کہنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ چلتا ہوں۔ آپ کی ضرورت پڑی تو میں رابطہ کروں گا مگر آپ بھی محتاط رہیے گا اور مجھے ایک ایک بات سے مطلع کرتے رہیے گا۔"

"ضرور!" رانا بشیر نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں اس کی رہائش گاہ سے نکلا اور ویسپا میں سوار ہوا۔ اسے اسٹارٹ کر کے میں تھوڑی دور جا کر اس جگہ رکا جہاں میں نے سدو بھائی کو چھوڑا تھا۔ حسب توقع وہ وہاں نہیں تھا۔ میں ثمیر کے سلسلے میں اسے ایس ایم ایس کر چکا تھا۔ وہ یقیناً اس کے تعاقب میں نکل چکا تھا۔

میں نے سیل پر اس سے رابطہ کیا۔ وہ بائیک پر ہوتا تھا تو ہینڈ فری استعمال کرتا تھا تاکہ بائیک چلانے کے دوران وہ فون پر بھی آسانی سے بات کر سکے۔

"ہاں سدو! کہاں پہنچے؟" رابطہ ہوتے ہی میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"جناب! میں ثمیر کا تعاقب کرتے ہوئے ڈیفنس کے فیز فائیو پر اس کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ وہ اندر جا چکا ہے۔"

"اور تو کوئی اس کے ہمراہ نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے وہ اکیلا ہی تھا؟"

"جی ہاں جناب!" اس کا جواب اثبات میں تھا۔ آگے بولا۔ "اس نے راستے سے ایک نوجوان کو پک کیا تھا اور اب ڈیفنس فیز فائیو والی اپنی کوٹھی پر پہنچ چکا ہے۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا ہوں، ابھی پہنچا ہوں۔"

"اچھا! ذرا اس نوجوان کا ناک نقشہ بتاؤ گے؟" میں نے یونہی پوچھا تو سدو نے مجھے اس نوجوان کا حلیہ بتا دیا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔

"اب کیا حکم ہے جناب؟" مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

"تم ایک کام کرو سدو! وہیں کھڑے رہو، میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رکھنا اگر اس نوجوان کو شاہ میر کی کوٹھی سے نکلتے دیکھو تو اس کا تعاقب کرنا اور ساتھ ہی میری بھی رہنمائی کرتے رہنا۔ میں بھی تمہارے پیچھے آتا رہوں گا۔"

"سمجھ گیا جناب!"

اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور تھوڑی دیر وہاں کھڑا اس نوجوان کے بارے میں سوچتا رہا اس کے بعد میں نے بھی ہینڈ فری نکالا اسے اپنے موبائل فون کے ساتھ اٹیچ کیا اسے جیب میں رکھنے کے بعد مائیک کو اپنے چہرے کے قریب کر دیا اور اوپر سے ہیلمٹ پہن لیا۔

ڈیفنس کی طرف روانہ ہوتے ہی جب میں کالا پل پر پہنچا تو ہینڈ فری پر مجھے ٹون کی آواز سنائی دی، میں نے ایک ہاتھ سے ہیلمٹ کا شیشہ اوپر کیا اور منہ کے قریب جھولتے مائیک کو ذرا اور قریب کر لیا۔

کال سدو بھائی کی تھی۔

"ہاں! بولو سدو؟" میں نے کہا۔

"سر میں نکل پڑا ہوں، وہ نوجوان ایک ٹیکسی میں روانہ ہو گیا ہے۔ میں اس کے تعاقب میں کورنگی روڈ پر آ چکا ہوں اور فی الحال میرا رخ قیوم آباد کی طرف ہے۔" اس نے بتایا۔

"گڈ! میں بھی اسی روڈ پر ہوں آگے محمود آباد والا چوراہا آئے گا۔ میں وہاں سے آگے نکل جاؤں گا۔ اب سیل اپنا آف مت کرنا۔ مسلسل رابطے میں رہنا اور مجھے بتاتے جانا راستہ۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے جواب دیا۔ میں نے اپنی ویسپا کی رفتار تیز کر دی۔ ذرا ہی دیر بعد سدو بھائی نے بتایا کہ وہ ایک اوور ہیڈ برج پر آ چکا ہے اور اب ٹیکسی کا رخ کورنگی کراسنگ کی طرف ہے۔

ہم مزید تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے اور جب کورنگی کراسنگ نزدیک آ گیا تو سدو نے بتایا ٹیکسی یہاں سے سیدھے ہاتھ پر ایک رہائشی علاقے بھٹائی کالونی کی طرف مڑ گئی ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے اپنی بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی اور بھٹائی کالونی کورنگی کراسنگ جا پہنچا۔

وہاں اسی سیکٹر میں ایک مکان کے پاس مجھے سدو بھائی مل گیا۔ میں نے اسے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد اس مکان کا جائزہ لینے لگا۔ مکان نو تعمیر شدہ لگتا تھا۔ جیسے چند دنوں پہلے ہی خریدا گیا ہو۔ ایک سو بیس گز کا مکان تھا جس کا رنگ و روغن چمک رہا تھا۔ بڑا سا آہنی گیٹ تھا۔ مکان ون یونٹ بنگلے کا منظر پیش کرتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ نوجوان کون ہو سکتا ہے؟ کیا ثمیر کا کوئی ساتھی؟ ایسا ساتھی جو اس کا رازدار ہو؟ ایسے ہی خوامخواہ یہ خیال میرے ذہن میں در آیا تھا۔ شاید دشمنوں کی جاسوسی کرتے کرتے اب تو ہر شے سے محتاط رہنے اور ان سے متعلق ذرا ذرا سی بات سوچنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ مذکورہ

نوجوان ثمیر کا کوئی دوست بھی ہوسکتا تھا۔

میرے اندر بے چینی فقط یہ تھی کہ میں ایک بار اس نوجوان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ کون تھا یہ؟ بہرطور میں نے مکان نمبر اچھی طرح ذہن نشین کرلیا اور اس کا محل وقوع بھی۔ اس کے بعد لوٹ آیا۔

میں وہاں سے سیدھا استاد بھابھا کے اڈّے پر پہنچا۔ کالیا کی حالت کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ اس نے میری ہدایت پر چند لڑکوں کو خبریں حاصل کرنے پر لگا رکھا تھا۔ کالیا نے ہی مجھے بتایا۔

عزیر خان رہا ہو چکا ہے مگر اب اس کا باپ لمبے چکر میں اندر ہو چکا۔ یہ تو تھی پرانی خبر۔ میر محمد کے ساتھ شانو کھوجا بھی گیا اندر جبکہ اصل دشمن شاہ میر کے دونوں گماشتے بن رائد اور راکا۔ پولیس کی تفتیش تلے زیرِ حراست ہیں۔ انہیں ان کی خوبصورت لانچ سمندری شہزادی کے اندر نظر بند رکھا گیا ہے۔

"واہ یار! کالیا بڑی دھماکا خیز خبریں ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو چھپا رستم ہے میرے یار جگری!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "ایک دم دھاکڑ رستم کتنے بڑے بڑے مگرمچھوں کو کس مہارت سے قانون کی گرفت میں دے ڈالا ہے کہ ان کی گردنیں بری طرح پھنس چکی ہیں۔" اس کے لہجے میں میرے لیے ستائش تھی۔ میں نے کہا۔

"ارے میرے یار کالیا! یہ سب میں نے تجھ سے ہی تو سیکھا ہے اور پھر تیری ہی مدد سے تو یہ سب ممکن ہوسکا ہے ورنہ ہم کتنے بڑے بڑے چکروں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔"

"بہلامت!" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ہم تو صرف مارا ماری جانتے ہیں مگر تیرا دماغ ایک اعلیٰ درجے کے ہتھیار جیسا کام کرتا ہے۔ جال بننا اور اسے پھیلانا تو کوئی تجھ سے سیکھے۔"

میں نے اس بار سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کالیا! جب تک میرا اصل دشمن شاہ میر زندہ ہے۔ میں اسے اپنی مکمل فتح نہیں سمجھتا۔"

"وہ بھی ایک دن ہماری گرفت میں ہوگا۔" کالیا نے پرعزم ہوکے کہا۔ پھر اس نے ثمیر کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کے سلسلے میں میری مہم جوئی کہاں پہنچی تھی؟

میں نے اسے آگاہ کردیا۔ وہ حیران ہوا بولا۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ یہ سارا چکر وہ اپنے باپ شاہ میر کی ہدایت پر چلا رہا ہے کیونکہ رانا بشیر اس کے لیے گلے کا پھندا بن چکا ہے بلکہ اس کی تو زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہے۔"

"میں اس صورتِ حال سے غافل نہیں ہوں کالیا!" میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ "لیکن ابھی رانا بشیر، شاہ میر کے گلے کا چھچھوندر بنا ہوا ہے، جسے وہ نہ نگل پا رہا ہے اور نہ ہی اگل سکتا ہے۔"

ہم کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے رات گزاری۔

اگلے دن میں عاصمہ بہن اور فہیم کو لیے اپنے گھر میں شفٹ ہوگیا۔ اس سے پہلے میں نے گھر کی اچھی طرح صفائی ستھرائی کروائی تھی۔ محلے والے بھی میری واپسی پر خوش ہوگئے تھے۔ حاجی کریم بخش سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔ محلے میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ محلے میں داخلے کے لیے ایک آہنی گیٹ لگوا دیا گیا تھا اور وہاں بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے ساتھ دو چوکیداروں کو بھی مختلف اوقات میں تعینات کردیا گیا تھا جو ہر آنے جانے والے کی نگرانی کرتے تھے اور کسی بھی غیر متعلقہ افراد کو تصدیق کیے بغیر اندر نہیں چھوڑتے تھے۔

محلہ کمیٹی کے اراکین نے گھر گھر سے ہر ماہ بطور "مینٹیننس" پانچ سو مقرر کر چکے تھے۔ سب کی سیکیورٹی کا معاملہ تھا اسی لیے لوگوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

ہم تینوں بہن بھائی ایک بار پھر اپنی چھت تلے اکٹھے ہوکر بے حد خوشی محسوس کرنے لگے لیکن فہیم کی معذوری پر عاصمہ بہن اور بالخصوص میرا دل بے حد کڑھا کرتا تھا۔ میں اس کا جلد سے جلد انتقام لینا چاہتا تھا اور ثمیر میرا اگلا ہدف تھا۔

اس کے اگلے دن کاشف اور اس کے ماں باپ بھی عاصمہ بہن کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئے۔ انہیں عاصمہ پسند آئی تھی۔ عاصمہ نے مہمانوں کے لیے چائے پر خاصا پُرتکلف اہتمام کر رکھا تھا۔ پکوڑے اور سموسے اس نے گھر پر ہی تیار کیے تھے چنوں کی چاٹ بھی بنائی تھی۔ باقی تھوڑا بہت میں بازار سے لے آیا تھا۔ اس سے بھی کاشف کے والدین کو لڑکی کے سگھڑاپے کا اندازہ ہوا تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے کی "پسند" کو بے حد سراہا بھی تھا۔

چاچا انور شاہ کو بھی ہم نے اس اہم نشست میں شامل رکھنا ضروری سمجھا تھا، وہ ہمارے "بڑوں" جیسی حیثیت رکھتے

تھے اور ان سے مشورہ کیے بغیر ہم کوئی بھی ایسی اہم بات کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔

ساری گفتگو بڑی تسلی اور اطمینان بھرے انداز میں ہوتی رہی۔ بڑی خوش اسلوبی سے یہ رشتہ طے ہو جانے پر ہر کسی کے چہرے سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں کہ اچانک ایک موقع پر کاشف کی ماں جو بیگم ارشد کہلاتی تھیں۔ گھر کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"بیٹا! لڑکی ہمیں پسند آئی ہے۔ یہ ماشاء اللہ بہت نصیبوں والی ہے کہ اس نے ہمارے کاشی بیٹے کا نصیب بھی چمکا ڈالا۔ اسے بہت اچھی نوکری مل گئی ہے۔"

"اچھا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے ایک نظر قریب بیٹھے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے تو یہ پہلے بھی جاب کر رہے تھے؟ کیا وہیں ان کی ترقی ہوئی ہے؟"

"جی نہیں نعمان بھائی! وہ جاب میں نے چھوڑ دی ہے۔" کاشف نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی خاص نوکری نہیں تھی۔ اس بار مجھے اپنے مطلب کی اور مقابلتاً اچھی جاب ملی ہے۔ کمپنی نے گھر بھی خرید کر دیا ہے۔ بالکل نیا گھر۔ اپنے ایمپلائز کے لیے اس کمپنی نے ایک سو بیس گز کے مختلف جگہوں میں پلاٹ لے رکھے تھے۔ انہی پر گھر بنوائے گئے تھے۔"

"اچھا! بہت خوشی ہوئی یہ سن کر۔ اللہ یہ رشتہ ہم دونوں خاندانوں کے لیے عزت و بابرکتوں والا ہو۔"

"آمین!" ہم سب کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"نیا گھر کون سے علاقے میں ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"بھنائی کالونی۔" کاشف نے بتایا اور میں چونک پڑا۔ پھر ایکا ایکی سدو بھائی کے بتائے ہوئے اس حلیے والے لڑکے کا موازنہ میں نے کاشف کے حلیے سے کیا تو میرا ذہن اندر سے بری طرح ٹھنکا۔ میں نے جب اگلا سوال کاشف سے کیا تو مجھے اپنی آواز پھنسی پھنسی سی محسوس ہونے لگی۔

"بھنائی کالونی کے کون سے سیکٹر میں ہے؟ وہ نیا گھر؟"

"جی بھائی جان! وہ سیکٹر ای میں ہے۔" کہتے ہوئے کاشف نے جب اپنے نئے گھر کا پتا بتایا تو میں اپنی جگہ سن ہوکے رہ گیا۔ تو گویا سدو بھائی نے اس روز جس نوجوان کا تعاقب کیا تھا وہ یہی کاشف تھا؟ میں سوچنے لگا۔

میں نے فوراً اپنی کیفیات پر قابو پالیا اور پوچھا۔

"جاب کی نوعیت کیا ہے؟"

"اکاؤنٹ اور تھوڑا بہت فیلڈ ورک ہے۔"

"کمپنی کون سی ہے؟"

"ایک بڑی آئل کمپنی ہے۔ گلفو آئل جس کی برانچز مشرقِ وسطیٰ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ قطر، بحرین، امارات اور دبئی وغیرہ۔" کاشف نے بڑے فخر سے بتایا۔ میں بڑے غور سے کاشف کا چہرہ تکنے لگا۔ مجھے وہاں ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہ کچھ چھپانے یا ظاہر کرنے کی کوشش چاہ رہا ہو کہ اسے پس پردہ حقائق کا علم نہ ہو۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ محض اتفاق سے کاشف کو وہاں جاب ملی تھی یا پھر یہ ان دونوں باپ بیٹے شاہ میر اور ثمیر شاہ کی کوئی گہری سازش کا دخل تھا۔

میں اس سلسلے میں کاشف کو مزید کریدنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر یہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا لیا۔

بہرکیف کاشف کے والدین تاریخ پکی کرنے کے لیے بضد تھے۔ مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اب تازہ ترین صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے سردست انہیں ٹال دیا مگر جلد تاریخ دینے کا وعدہ ضرور کرلیا۔ اس پر اس بار ارشد صاحب بولے۔

"نعمان میاں! یہ فرض جتنی جلد ہوسکے تو نمٹا لو کیونکہ کاشف بیٹا کہہ رہا تھا کہ..........." وہ اپنے بیٹے کی طرف ایک نظر ڈال کر بولے۔ "کمپنی والے بہت جلد اسے چند مہینوں کے لیے امارات بھیجنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عاصمہ بیٹی اس سے پہلے ہی ہماری بہو بن کر آجائے تو کاشف کے بعد ہمیں اداسی نہ ہو۔"

کاشف کے باپ ارشد بیگ کی بات سن کر میں تھوڑا چونکا۔ بولا۔ "تو کیا شادی کے بعد کاشف اکیلا امارات چلا جائے گا؟" اس پر بیگم ارشد جلدی سے بولی۔ "تو کیا ہوا؟ خدانخواستہ کوئی ہمیشہ کے لیے تھوڑی چلا جائے گا۔ چند ماہ کی بات ہے لوٹ آئے گا، اب دیکھو ناں اتنی اچھی نوکری بھی تو ملی ہے جو روز روز نہیں ملتی اور پھر عاصمہ کون سا اکیلی ہوگی۔ ہم ہیں ناں اس کے ساتھ، تم کیوں دل چھوٹا کرتے ہو۔ نعمان بیٹے؟"

خاتون کا مجھے بیٹا کہنا اچھا لگ رہا تھا مگر میرے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، اصل بات کچھ اور تھی۔ تاہم میں خاموش رہا لیکن تاریخ میں نے پھر بھی پکی نہیں ہونے دی اور تھوڑا ٹائم مانگ لیا۔ خاتون تو تاریخ لینے پر بضد تھیں اور کاشف کی بھی

دلی خواہش یہی تھی جبکہ ارشد بیگ نے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ جانا اور اپنی بیگم کو سمجھا دیا۔
مہمان رخصت ہوگئے تو فہیم نے مجھ سے پوچھا۔
''بھائی جان! خیریت تو ہے؟ آپ اچھے خاصے خوش خوش دکھائی دیتے ہوئے آخر میں ایک دم فکرمند سے کیوں نظر آنے لگے تھے؟'' اثنائے راہ عاصمہ بھی آگئی تھی۔ وہ چپ تھی۔ میں نے بات بناتے ہوئے جبراً مسکرا کر کہا۔
''ارے بھائی! آخر اتنے بڑے اور اہم فرض سے سبکدوش ہونا آسان بات تھوڑی ہے۔ بڑوں کو فطری طور پر کئی فکریں لاحق ہونے لگتی ہیں۔'' اس کے بعد میں نے قریب سر جھکائے کھڑی عاصمہ کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''یہ ہماری لاڈلی بہن جو ہے ناں اس سے ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں بڑی رونق ہے۔ خیر سے یہ اپنے گھر کی ہونے والی ہے اب۔ سوچتا ہوں اس کے بغیر کیسے ہم دونوں بھائی وقت گزاریں گے۔'' میری بات پر فہیم بھی مغمومیت سے مسکرا دیا۔
''بھائی جان!'' عاصمہ بڑے دلار سے میرے ساتھ آن لگی اور میں پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

☆......☆

میرے پاس کاشف کا فون نمبر تھا۔ اگلے دن میں لاری اڈے پر پہنچا اور کاشف کو فون کر کے کہا کہ وہ آج کسی وقت شام چھ بجے سے پہلے میرے لاری اڈے والے دفتر آ کر مجھ سے مل لے، میں نے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔ وہ میری بات پر تھوڑا حیران تو ہوا تاہم اس نے حامی بھر لی اور کہا کہ وہ تین بجے تک آجائے گا۔
میں نے اپنے کمرے کے وال کلاک میں دیکھا جو صبح کے دس بجا رہا تھا۔ اس کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ اچانک میرے سیل پر میسج کی بپ ابھری۔ سیل میرے سامنے میز پر ہی پڑا تھا۔ میں نے اٹھا کر اسکرین میں دیکھا تو میرا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ فوزیہ کا ایس ایم ایس تھا۔ اس نے کال کرنے کا کہا تھا۔ میں نے فوراً اس کا نمبر جو اسپیڈ ڈائل پر تھا، یعنی صرف تین کے نمبر کو پنچ کر دیا۔ کال جا رہی تھی۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ فوزیہ کی مترنم سی آواز ابھری۔ اس نے پہلے مجھے سلام کیا اور پھر بولی۔
''کیسے ہیں آپ؟ طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟''
''تمہارے بغیر میری طبیعت کیسی ہوسکتی ہے جاناں!''
میں نے کہا۔ جانے کیوں فوزیہ سے مخاطب ہوتے ہی میری طبیعت رومینٹک ہونے لگتی تھی۔
''بنائیں مت۔ اتنے دنوں سے یاد نہیں کیا، نہ ایک میسج تک کرنے کی آپ کو فرصت ملی اور اب ایسی بےچینی دکھا رہے ہیں جیسے......'' اس نے دلار سے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔
''پسند آئی مجھے تمہاری یہ بات۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''سچی بات یہی ہے کہ تم مجھے ایک پل کے لیے بھی نہیں بھولتیں لیکن بس کیا بتاؤں حالات نے مجھے ایسے دھارے پر ڈال دیا ہے فوزیہ کہ میں اپنے آپ کو بھی بھول چکا ہوں۔''
''نعمان! کب ختم ہوگی تمہاری یہ جدوجہد؟ آخر کب ہم ایک ہوں گے؟ اب تو گھر میں بھی میرے سلسلے میں باتیں ہونے لگی ہیں۔'' وہ ایک دم سنجیدہ سی ہونے لگی تو میں نے بھی قدرے چونک کر کہا۔
''خیریت ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کیسی باتیں؟''
''میری شادی کے سلسلے میں۔'' اس کی آواز واضح طور پر کپکپا رہی تھی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ حالات کی ایسی کشاکشی نے مجھے واقعی خود سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے اس طرف کبھی توجہ ہی دینا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ میرے اور فوزیہ کا یہ سلسلۂ الفت ابھی محض ہم دونوں تک ہی محدود ہے۔ اسے بڑوں تک کب اور کیسے پہنچانا تھا اس کے بارے میں کبھی میں نے سوچنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ اب فوزیہ نے یہ بات کہہ کر مجھے اچانک ایک نئے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ خاصے تفکر بھرے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے رشتے کی باتیں کون کر رہا ہے؟''
''گھر کے بڑے۔ ہماری ایک خالہ ہیں وہ کچھ (کوئٹہ) سے آئی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس ہی رہ رہی ہیں۔ ان کے شوہر بھی ساتھ ہیں۔ انہوں نے ہی بابا جانی سے میرے سلسلے میں بات کی ہے۔''
''کیا ان کا کوئی بیٹا بھی ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت قدرے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
''نہیں وہ بےاولاد ہیں۔'' فوزیہ نے جواب دیا اور میں نے بےاختیار سکون کا سانس لیا۔ بولا۔ ''تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ بڑے بوڑھے گھر کی جوان اور کنواری لڑکیوں کے لیے ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔''
''ولل......لیکن کیا!''

''لیکن کیا؟''
''انہوں نے بابا جانی کو ایک رشتہ بتایا ہے۔ اپنے ہی خاندان کا لڑکا ہے، مسعود نام ہے اس کا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہے۔ ماں باپ زمیندار ہیں۔ بلیری، میں ان کی بڑی زمینیں ہیں اور وہ ان کا اکیلا وارث ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے، جو بابا جانی نے خالہ سے اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر کہی تھی کہ یہ ''گھرانا'' پہلے سے ہی ان کی نظر میں تھا۔
لڑکے کے باپ کے ساتھ بابا جانی کی کسی زمانے میں جان پہچان بھی رہ چکی ہے۔ کبھی دوستوں کے ساتھ وہ ان کے علاقے میں تکری (پہاڑی) بکروں کا شکار بھی کھیلنے جا چکے ہیں۔ بابا جانی نے تو خالہ سے بات کرنے کے بعد انہی کے ایماء پر لڑکے کے باپ کو فون کر کے ہلکی پھلکی بات بھی کر ڈالی ہے۔ دونوں طرف سے اشاروں کنایوں میں رضامندی بھی محسوس ہونے لگی ہے۔'' فوزیہ گھٹی گھٹی سی آواز میں یہ سب بتاتی جا رہی تھی اور اس کے لحظہ بہ لحظہ ڈھتے ہوئے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔
میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''فوزیہ! پلیز، خود کو سنبھالو اور حوصلہ رکھو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بس تم ایک وعدہ کرو کہ میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔ آگے میں سب دیکھ لوں گا۔''
''نعمان! میرا تو جینا مرنا ہی اب تم ہو۔ تم ساتھ کی بات کرتے ہو، میں نے تو اپنی روح و جان اسی دن سے ہی تمہارے نام کر دی تھی جب تم نے اپنی محبت کی مہر ثبت کی تھی۔ یہ دل و جان اب صرف تمہارا ہی نام لیتا ہے اور کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس بےقرار دل کے خانۂ نہاں میں اب ایک ہی مورت بستی ہے اور وہ تم ہو......صرف تم۔''
فوزیہ کی جذبات سے پُر آواز مرتعش ہوتی جا رہی تھی۔ میں آج پہلی بار اسے اتنا جذباتی، غم گسار اور ٹوٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی کہ پتا نہیں کہیں وہ حوصلہ ہی نہ ہار بیٹھے۔ وہ فطرتاً حد سے زیادہ حساس طبیعت کی مالک تھی، معذوری نے اسے مزید اندر سے روند ڈالا تھا۔
''نعمان!'' دوسری طرف سے پھر مجھے اس کی رندھی ہوئی سی آواز آئی۔
''آں...... ہاں، بولو فوزیہ! مگر پلیز تم اپنا دل چھوٹا مت کرو۔''
''محبت خودغرض ہوتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

برطانوی ماہرین نے لہسن کو کان کا درد دور کرنے میں مفید قرار دے دیا۔ برطانوی ماہرین صحت کا ماننا ہے کہ لہسن ایک قدرتی اینٹی بائیوٹک ہے اور اس کی وجہ سے جسم میں کئی طرح کی بیماریاں ختم ہوتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق اگر آپ کو کان میں تکلیف ہو تو رات کو سونے سے قبل لہسن کے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر کان میں رکھ لیں اور جب صبح آپ جاگیں گے تو کان کے درد سے مکمل نجات پا چکے ہوں گے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جو جراثیم کان میں انفیکشن کا باعث بنتے ہیں لہسن انہیں ختم کر دیتا ہے۔ اس سے قبل یہ نسخہ جرنل آف میڈیکل سائنس میں ایک چینی ماہر نے اپنے مقالے میں شائع کیا تھا۔ اس تحقیق کے ساتھ ہی ماہرین کا مشورہ ہے کہ اگر کسی قسم کی الرجی ہو تو اس نسخے کو آزمانے سے پہلے ڈاکٹرز سے ضرور رجوع کریں جب کہ اس طرح کے نسخے بچوں پر آزمانے سے گریز کریں۔

مرسلہ: ثمینہ وسیم۔ ملتان

''ہاں! ہوتی ہے خودغرض۔'' میں نے بھی اثبات میں جواب دے ڈالا۔
''تم نے سچ بول کر میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا نعمان! میں واقعی خودغرض ہوں۔ تمہیں پانے کی چاہ میں یہ بھی فراموش کر جاتی ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا ہوں، محض ایک بوجھ تم مجھے پالو گے تو میں تمہیں کیا دے دوں گی بھلا؟ سوائے ایک معذور زندگی کے لیکن تمہیں پا کر میں تو جیسے ساری دنیا کی دولت پالوں گی مگر تمہیں میری صورت میں کیا ملے گا۔ بیساکھیاں، یا پھر ایک وہیل چیئر۔''
''خاموش ہو جاؤ فوزیہ!'' میں نے اسے مصنوعی غصے تلے ڈانٹ دیا۔ ''میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔'' وہ شاید دکھ اور خوف جدائی کے ڈر سے مایوسیوں کی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔
''خودغرضی سے میری مراد صرف اپنی محبت کا حصول، یعنی تم تھیں۔ میرا محور میری سوچ، میرے راستے میرے واسطے سب تم سے ہیں فوزیہ! تم میرے لیے محبت بھرا گلشن ہو، بھلا پھول بھی بوجھ ہوتے ہیں کسی پر پگلی!'' میں نے آخر میں ایک دم محبت پاش لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب تم وعدہ کرو گی، کبھی

دوبارہ ایسا مت کہنا مجھ سے اور نہ ہی اپنی معذوری کا ذکر کروگی۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، اندھی چاہت کی ہے تم سے میں نے۔"

"آہ نعمان! کس قدر خوش قسمت ہوں میں کہ مجھے اتنی چاہتوں والی بے لوث و بے غرض محبت ملی ہے تمہاری صورت۔" وہ جذبات تلے کراہ کے بولی۔ "لیکن نعمان! کبھی کبھی میرا اندر، میرا ضمیر مجھے کچوکے بھی لگاتا ہے کہ...!"

"ہم اصل موضوع سے ہٹ رہے ہیں فوزیہ!" میں نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔

"تم آگے کچھ بتا رہی تھیں؟"

"بس! یہی کچھ تھا بتانے کو اور کیا بتاؤں؟" اس کی لرزتی آواز ابھری۔

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا لڑکے کے ماں باپ نے تمہیں دیکھا ہے؟ مم میرا مطلب ہے قریب سے؟" میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ بات حساس تھی مگر فوزیہ میرا اشارہ سمجھ گئی فوراً جواب دیا۔

"ہاں! انہیں معلوم ہے کہ میں دونوں ٹانگوں سے معذور ہوں۔ خالہ انہیں بتا چکی ہے اور خالہ نے ہی یہ رشتہ ڈھونڈا ہے۔"

"اس کے باوجود؟" میرے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

"ہاں! اس لیے کہ لڑکے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔" فوزیہ نے جیسے کرب ناک انکشاف کیا۔

"کک... کیا مطلب؟ وہ... وہ بھی معذور ہے؟"

"وہ جسمانی طور پر بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحت مند ہے۔ لل... لیکن... وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔"

"کک... کیا؟" میں چیخ پڑا۔

"ہاں! اس کا جسم تو بیس بائیس سال کا ہے مگر ذہن سات آٹھ سالہ بچے کا سا ہے۔" اس کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔

"مم... مجھے یقین نہیں آرہا۔ ایک باپ اپنی اولاد کے لیے اتنا برا بھی سوچ سکتا ہے؟"

"انہوں نے اپنی طرف سے اچھا سوچا ہے میرے لیے۔ بھلا ایک معذور لڑکی کے ساتھ کون اپنی ساری زندگی بتا سکتا ہے۔"

"خدا کے لیے فوزیہ! یہ معذوری کی گردان چھوڑو۔ میری تو یہ نہیں سمجھ میں آرہا ہے کہ عطا صاحب اتنے سمجھدار اور وضع دار انسان ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کی زندگی جہنم میں کیوں جھوک رہے ہیں، کچھ بھی سہی لیکن والدین تو اپنی اولاد کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔"

"اس سلسلے میں بابا جانی کی اپنی ایک منطق ہے۔" فوزیہ دکھی لہجے میں بولی۔

"کیسی منطق؟" میں نے گھٹے گھٹے دل سے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں بیٹی! اگر میں چاہے دولت کے بل بوتے پر یا کسی ایسے غریب آدمی سے تمہارا نکاح کروا بھی دوں جس میں کوئی بھی جسمانی نقص نہ ہو لیکن یاد رکھنا بیٹی اس کی طرف سے ایک دھڑکا ضرور لگا رہے گا کہ وہ یہ بوجھ ساری زندگی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ بوجھ صرف ماں باپ ہی اٹھا سکتے ہیں لیکن چوں کہ بیٹیوں کا معاملہ اور ہوتا ہے اور وہ بھی میرے جیسی بیٹیوں کا تو اس میں بہت سوچ سمجھ کر ایسے رشتے قائم کرنے پڑتے ہیں۔"

"تو گویا تمہارے بابا جانی نے تم سے اس سلسلے میں تمہاری مرضی بھی پوچھی تھی؟" میرا لہجہ تلخ سا ہوتا جارہا تھا۔

"ہاں!" وہ بولی۔ "بابا جانی مجھے اپنی طرف سے اعتماد میں لینے کی غرض سے یہ سب کہہ رہے تھے۔ انہیں بھلا میرے دل کی حالت زار کا کیا پتا تھا؟" وہ بولے۔

"بیٹی! ہر ماں باپ اپنی اولاد کی بہتری کے بارے میں ہی سوچتے ہیں۔ ہم تمہاری بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کیونکہ اللہ نے دنیا میں ہر کسی کا جوڑا پیدا کیا ہے اور جوڑا وہی کامیاب رہتا ہے جو اپنے جیسا ہو، گل شیر کا بیٹا مسعود ذہنی معذور سہی لیکن وہ گل شیر خان کی ساری جاگیر کا اکیلا وارث ہے۔ وہ تمہارے قابو میں رہے گا۔ نوکر چاکر ٹھاٹھ باٹھ والی زندگی گزاروگی تم۔ ورنہ دوسرا آدمی تو بیٹی تمہیں طعنے دے دے کر ہی ادھ موا کردے گا۔"

"بابا جانی کی اس عجیب و غریب منطق سے میں متفق نہیں تھی مگر میں خاموش رہی۔" وہ سسکنے لگی اور میں اندر سے جھیر جھیر ہونے لگا۔

فوزیہ میری پسند اور میری محبت تھی لیکن عام تناظر میں دیکھا جاتا تو عطا محمد جیسے باپ اولاد کی بہتری کے نام پر اپنی بیٹیوں کو اس طرح اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کردیتے ہیں۔ وہ دنیا کی آسائشوں اور آرام و سکون کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ عورت ذات کے بھی کچھ ارمان اور جذبات ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ہر شے روپیا پیسا نہیں

ہوتا۔ وہ ایک ساتھی کی بھی تمنا رکھتی ہیں، ایک سچے ساتھی کی جو دکھ سکھ میں اس کے ساتھ ہو۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوگا فوزیہ!" بالآخر میں نے اس کی بدستور سسکتی ہوئی آوازوں کو سنتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ تمہیں اس رشتے سے انکار ہے۔"

"تو کیا میں انہیں تمہارا بتا دوں؟" وہ ایک دم بولی۔

میں ذرا سوچتا بن گیا پھر بولا۔ "ابھی شاید یہ قبل از وقت ہوگا۔ تم اپنے باپ سے ایسا کہہ بھی نہیں سکتیں۔ ہاں! میں اس کے بارے میں اب سنجیدگی سے سوچتا ہوں لیکن ابھی تم فوری طور پر اس رشتے سے انکار کر ڈالو۔"

"بابا جانی سے میں اس وقت تو کچھ کہنے کی جرأت نہ کرسکی تھی۔ تاہم انہوں نے مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیا ہے۔ کل جواب مانگا ہے انہوں نے ٹھیک ہے میں، انکار تو میں نے ویسے بھی کرنا ہی تھا۔ کل میں انہیں اپنے جواب سے آگاہ کردوں گی۔"

"گڈ! اس طرح ہمت بنو فوزیہ! یہ ہم دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کل... لیکن نعمان! میرا دل اب جانے کیوں بے چین اور پریشان رہنے لگا ہے، پلیز، تم بھی کچھ قدم آگے بڑھاؤ۔" وہ متوحش سے لہجے میں بولی۔ "آج ایک رشتہ آیا ہے کل اور بھی آسکتا ہے۔ اس کا بھی مجھے نہیں پتا، کہیں بابا جانی اسے اپنی ضد نہ بنالیں۔"

"میں نے کہا فوزیہ! میری جان! میں آج سے ہی اس معاملے پر غور کرنا شروع کردوں گا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں سب سے پہلے چاچا انور شاہ سے کچھ مشورہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

فوزیہ کو کچھ تسلی ہوئی اور پھر رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں نے سیل فون دوبارہ سامنے میز پر رکھ دیا اور پُرسوچ انداز میں اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ عاصمہ بہن کی شادی کا بھی معاملہ چل پڑا تھا۔ ایسے میں میرا معاملہ آسان بات نہ تھی جبکہ حقیقت یہی تھی کہ میں تو اپنے اس "معاملے" سے بالکل ہی بے فکر تھا کہ اپنے وقت میں یہ کام ہو ہی جائے گا۔

بالآخر خاصی سوچ و بچار کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں اس بارے میں چاچا انور شاہ سے بات کرکے دیکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ہمارے بڑے وہی تھے۔ ہم اپنے ذاتی معاملات ان کے مشورے کے بغیر آگے نہیں بڑھا سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس روز عاصمہ کے رشتے کے لیے آئے ہوئے کاشف کے والدین کی آمد پر ہم نے چاچا انور شاہ کو بھی ان کے سامنے اپنے "بڑے" کی حیثیت سے شامل کیا تھا۔

☆......☆

کالیا کی حالت بہت بہتر ہوگئی تھی۔ وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا اس کی وجہ اس نے مسکراتے ہوئے یہی بتائی تھی کہ میرے سر سے کافی بوجھ اترنے لگا تھا۔ مافیائی ناسور کیفر کردار تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی باقیات اپنے زخم چاٹنے پر مجبور تھی۔ وہ بار بار قانون کی گرفت میں آتے اور چھوٹتے رہے تھے مگر اس بار میری مستقل مزاجی اور پُرعزم ثابت قدمی کے باعث وہ مکمل طور پر قانون کی پکڑ میں آچکے تھے اور لمبے عرصے کے لیے جیل جا چکے تھے۔ اصل دشمن شاہ میرا ابھی باقی تھا اور دیکھا جاتا تو وہی میرا اصل ہدف تھا اور میری زندگی کا مقصد بھی۔

اس وقت جب میں اور کالیا شمیر کو اغوا کرنے کے منصوبے پر غور کررہے تھے تو فرحانہ کی کال آگئی۔ اس نے مجھ سے فوراً ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے کل صبح لاری اڈے والے دفتر آنے کا وقت دیا تو وہ بے چینی سے بولی۔

"نہیں نعمان صاحب! پلیز، بات بہت ضروری ہے، میں آپ سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔" میں اس کی بات سن کر مستفسر ہوا۔

"فون پر کچھ بتا سکتی ہیں؟"

"نہیں۔"

"تب پھر آپ کل ہی آجائیں، آج کا پورا دن میں مصروف ہوں۔"

دوسری جانب چند ثانیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی اس کے بعد اس کی بھنچی بھنچی سی آواز ابھری۔

"مم... میں نے دراصل شمیر کے سلسلے میں آپ سے کچھ دریافت کرنا تھا۔"

"ہم!" میرے منہ سے خیال انگیز ہمکاری خارج ہوئی۔ بولا۔ "میرا خیال ہے رانا صاحب نے آپ کو اس کی حقیقت سے آگاہ کردیا ہے۔"

"حقیقت کیا ہے۔ وہ میں آپ سے بھی جاننا چاہوں گی۔" وہ بولی۔

"کیا آپ میری بات کا یقین کرلیں گی؟" میرے

لہجے میں ہلکا سا طنز عود آیا تھا۔

''آپ سے تفصیلی گفتگو کے بعد ہی میں کسی نتیجے پر پہنچ سکتی ہوں تاکہ...... تاکہ......'' وہ کچھ کہتے ہوئے رکی تو میں نے کہا۔

''جی! بولیں، کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟''

''میرا مطلب تھا کہ اگر ثمیر سے متعلق آپ کی اور پاپا کی باتیں مجھے درست لگیں تو میں اس سلسلے میں ثمیر سے بھی بات کر سکتی ہوں۔'' میں اس کی بات پر تھوڑا چونکا اور بولا۔

''اچھا! جب آپ کو ہماری باتوں کا یقین ہو جائے گا تو اس کے بعد بھی کیا آپ یہ ضرورت محسوس کریں گی کہ ثمیر سے ملنے کی... کوشش کریں؟''

''نعمان صاحب! آپ نے زندگی میں کبھی محبت کی ہے؟'' فرحانہ کے اچانک اس سوال سے میں لمحہ بھر کو گڑبڑا سا گیا۔ میری چشم تصور میں فوزیہ کا چہرہ گھوم گیا۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ لہٰذا مختصراً اثبات میں جواب دیا۔

''ہاں!''

''میری مراد بہن بھائی یا ماں باپ سے نہیں ہے۔'' وہ جیسے وضاحت طلب لہجے میں بولی۔

''میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ آگے بولیں۔''

''میری مراد، کسی لڑکی سے تھی۔''

''میں نے کہا نا، میرا مطلب بھی وہی ہے۔''

''تب پھر مجھے بتائیں آپ اگر اس لڑکی کے ماں باپ یا اس کے خاندان والے آپ کے کسی خاندان کے کسی فرد کے قاتل نکل آئیں تو کیا آپ اس لڑکی سے محبت کرنا چھوڑ دیں گے؟ اس سے آپ قطع تعلق کر لیں گے؟''

بڑا عجیب سا سوال پوچھ لیا تھا اس نے۔ مجھے اس کی وجہ یہی سمجھ میں آ رہی تھی کہ میری وہاں واپسی کے بعد دونوں باپ بیٹی کے درمیان اس اہم موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی ہوگی۔ چونکہ معاملہ ایک بیٹی اور خطرناک اور خونی دشمن کا تھا، اسی لیے رانا بشیر نے بغیر کسی لحاظ و مروت کے بیٹی کو ثمیر کے باپ سے متعلق ساری حقیقت بتا دی ہوگی۔ اتنی بڑی بات جھوٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ رانا بشیر نے یقیناً میری مہم جوئی کا بھی حوالہ دیا ہوگا۔ ایک باپ بیٹی سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اسی لیے فرحانہ کو اپنے باپ کی بات پر یقین کرنا پڑا ہوگا۔

لہٰذا اب مجھے فرحانہ کے اس انداز کے سوال نے باور کرا دیا تھا کہ وہ کسی اور انداز سے اپنے عاشق کا دفاع کرنے کی کوشش میں تھی۔ مثلاً باپ کا کیا بیٹا کیوں بھگتے۔ بیٹے کے خیال باپ کے مجرمانہ خیالات سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا فرحانہ کی اس سلسلے میں ثمیر سے کوئی بات ہوئی تھی یا نہیں۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا نعمان صاحب؟'' مجھے خاموش اور سوچتا پا کر وہ دوبارہ مستفسر ہوئی تو میں نے ایک گہری سانس لے کر جواب میں کہا۔

''یہ انحصار کرے گا کہ بیٹا باپ کے کالے کرتوتوں سے واقف ہے یا نہیں، ہے تو کیا وہ اس کی مذمت کرتا ہے؟''

''فنٹاسٹک بہت اچھا جواب دیا آپ نے۔'' وہ ایک دم کھل اٹھی۔

''کیا آپ کی ثمیر سے اس موضوع سے متعلق بات ہو چکی ہے؟''

''ہاں!'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تاثرات تھے اس کے؟''

''اس نے یہی جواب دیا تھا اگر وہ غلطی پر ہیں تو میرا ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں۔''

''غلطی پر؟'' میرا دماغ ایک دم بھنا گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب کے دفاع کے لیے ہر ممکن طریقے سے کوشاں تھی۔ کسی نے درست ہی تو کہا ہے کہ محبت خودغرض ہوتی ہے۔

''کیا بات کر رہی ہیں فرحانہ صاحبہ! ثمیر کا باپ آپ کے لیے ہی نہیں بلکہ میرے لیے بھی ایک خونی مجرم کی حیثیت رکھتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے جی میں تو آئی کہ میں اپنے بھائی نعیم سے متعلق اس کی بربریت اور انسانیت سوز حرکت کے بارے میں بتا دوں لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا۔ کیا فائدہ ہوتا اس کا۔ فرحانہ کی تان پھر ایک ہی بات پر ٹوٹتی۔ یعنی باپ کے کالے کرتوتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں، یوں وہ اپنے محبوب کو اس سے مستثنیٰ قرار دلوانے کے چکروں میں تھی۔

''تو آپ پھر ثمیر سے کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ میرے لیے فرحانہ کی ان خودغرضانہ باتیں اس کے لیے بھی نفرت ابھارنے کا سبب بن رہی تھیں۔

''ثمیر محض یہ کہہ کر خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا مس فرحانہ! وہ اگر آپ سے سچی محبت کرتا ہے تو اسے اپنے باپ کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے آپ کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ آپ کے محبوب کا باپ نہ صرف آپ کی ماں کا قاتل ہی نہیں بلکہ میرے بے گناہ باپ کا بھی قاتل ہے۔''

اس نے جواب دینے کی بجائے فون بند کر دیا۔ مجھے فرحانہ کی اس حرکت پر بے انتہا غصہ آیا۔ میں نے پُرطیش انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اسی وقت، فرحانہ کے اسی نمبر پر کال بیک کر ڈالی۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی تھی۔

''کال کٹ گئی تھی یا آپ نے دانستہ کاٹ دی تھی؟'' مارے طیش کے میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں۔ حالانکہ یہ میرے مزاج کا حصہ نہیں تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں کچھ اسی قسم کی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔

''آپ نے مزید کیا بات کرنی ہے اب؟'' اس نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے دانستہ کال کاٹی تھی۔ یہ جانتے ہی جوشِ غیض سے میرا رواں رواں مرتعش ہونے لگا تھا۔

''مس فرحانہ! شاید آپ سچ سے خوف زدہ ہو گئی تھیں اسی لیے کال کاٹ دی لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیں اور ثمیر کو بھی بتا دیں۔ میں نچلا بیٹھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ اگر مجھے اس کے بیٹے ثمیر کی بھی قبر کھودنا پڑی تو میں دیر نہیں کروں گا۔ یہ بات میری طرف سے ثمیر کو بھی بتا دینا اور تم بھی یاد رکھنا۔''

جواباً غصے میں وہ کچھ کہنے لگی تھی مگر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆

اسی روز تین بجے کاشف میرے کہنے پر لاری اڈے پر آن پہنچا دوست محمد کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ کاشف نامی اس نوجوان کو سیدھا میرے کمرے میں لے آئے۔

اب کاشف میری میز کے سامنے والی کرسی پر براجمان تھا اور میری طرف کچھ الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ بولا۔ ''سب ٹھیک تو ہے ناں نعمان بھائی؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! سب ٹھیک ہی ہے۔'' میں نے کہا اور غور سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم شاہ میر کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں، بالکل! وہ میرے چیف باس اور ثمیر صاحب کے والد صاحب ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''مگر شاہ میر کو آپ کیسے جانتے ہیں؟'' اس نے بھی پوچھ لیا۔ میں بھانپتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا اور مجھے اس کے چہرے سے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جو میرے شکوک کو تقویت بخشتے۔ وہ مجھے واقعی انجان لگ رہا تھا۔ یعنی وہ ثمیر یا شاہ میر کا آلۂ کار نہیں تھا یا پھر یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ کاشف کو ان کی آئل کمپنی میں ایک اچھی جاب مل چکی تھی۔ البتہ یہ الگ بات ہو سکتی تھی کہ اسے مستقبل میں میرے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن دیکھنا یہ تھا کہ میں کاشف سے ان دونوں باپ بیٹوں کے خلاف کیا کام لے سکتا تھا؟ اور آیا یہ بہتر ہوتا بھی یا نہیں کیونکہ کاشف میرا ہونے والا بہنوئی تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایسے کسی حالات کا شکار ہو۔

''نعمان بھائی! مجھے پریشانی سی ہو رہی ہے، پلیز کوئی مسئلہ ہے تو ذرا کھل کر بات کریں۔'' مجھے سوچتا ہوا خاموش پا کر اس نے کہا تو میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''کاشف! تم تو ہمارے حالات سے اچھی طرح واقف ہو لیکن کچھ باتیں تمہیں ابھی نہیں معلوم ہیں۔ یوں بھی ان کا جاننا تمہارے لیے اتنا ضروری نہیں ہے۔ تم!'' میں اتنا کہہ کر ذرا رکا پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم شاہ میر اور ثمیر شاہ سے دور ہو جاؤ؟''

میری بات اس کے لیے چونکا دینے والی ثابت ہوئی۔ بولا۔ ''نن...... نعمان بھائی! یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اتنی اچھی جاب کو میں بغیر کسی وجہ کے چھوڑ دوں؟ مگر کیوں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس لیے کہ تم ان دونوں باپ بیٹے کی اصلیت سے واقف نہیں ہو۔ یہ دونوں ہائی پروفائل کریمنلز ہیں۔'' میں نے جیسے انکشاف کیا۔

''کک...... کیا......؟'' کاشف کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''تمہیں زیادہ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کاشف میاں!'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میرے ہونے والے بہنوئی نہ ہوتے تو اور بات تھی لیکن اب چونکہ تم سے ہمارا رشتہ قائم ہونے والا ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ تمہارے کسی نقصان کی سزا ہم سب کو بھگتنا پڑے۔''

کاشف چند ثانیے خاموش رہا پھر بولا۔ ''بہتر ہوتا نعمان بھائی آپ مجھے ان کے بارے میں تھوڑی تفصیل بتا دیتے۔''

''کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ میں کہہ رہا ہوں وہ لوگ غلط ہیں؟ کیا میں تمہارا کسی قسم کا نقصان چاہوں گا؟''

''وہ تو ٹھیک ہے نعمان بھائی! لیکن......'' وہ کچھ کہتے

کہتے رک گیا۔ کچھ سوچتا رہا اس کے بعد وہ مجھے بغیر کوئی حتمی جواب دیے چلا گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اس بارے میں اچھی طرح سوچ کر کوئی ایک فیصلہ کرلے جو میں چاہتا تھا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچا اور کالیا سے ملا۔ وہ اب کافی بھلا چنگا ہوگیا تھا۔

میں نے کالیا کو تیار کیا اور ثمیر کے اغوا کا پلان بتایا۔

''جیسا تحفہ شاہ میر نے میرے بھائی کی ٹانگیں کاٹنے کی صورت میں مجھے دیا تھا اب وہی تحفہ میں اسے لوٹانا چاہتا ہوں کالیا!''

''ابے لے جگری! ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور ٹانگ کے بدلے ٹانگ...... دیر کس بات کی ہے۔'' ثمیر کو اغوا کرنے کا میرا مقصد جان لینے کے بعد وہ فوراً اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''یہ بتا ثمیر کو اغوا کر کے لے جانا کہاں ہوگا؟ جہاں ہم اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ سکیں۔'' میرے لہجے میں سفاکی تھی۔ حالات دگرگوں نے مجھے بھی دشمنوں کے خلاف سفاکانہ اقدام اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔

''جگری! اس انتقام کے بعد ہم نے ایک اور انتقام بھی شاہ میر سے لینا ہوگا۔ ہم پر حملے کا۔'' وہ بولا۔

''اس کے بیٹے والا حساب چکتا کرتے ہی ہمارا اگلا قدم شاہ میر پر حملہ کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''شاہ میر پر میں پے در پے حملے کر کے اسے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ ہم پر اپنے غنڈوں کے ذریعے حملے کروا سکتا ہے تو ہم بھی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔''

''ثمیر کو اغوا کر کے صفورا والے مکان میں لے چلیں گے۔ میں جمی کو فون کر دیتا ہوں۔''

شاہ میر کی رہائش گاہ میں نے دیکھ رکھی تھی۔ ہم دونوں استاد بھابھا کے اڈے سے پرانے ماڈل کی خیبر کار لے کر روانہ ہوگئے۔

ڈیفنس فیز فائیو کا علاقہ نسبتاً ویران ہی ہوتا تھا۔ کار ایک خالی پلاٹ پر کھڑی کر کے اس کا بونٹ ہم نے اوپر اٹھا دیا۔

''تو گاڑی پر جھکا رہے، یہی تاثر دینا کہ اس کی خرابی دور کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔'' کالیا نے کہا۔ ''میں اندر نقب لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کے بعد اپنے سیل پر تجھ سے رابطہ کروں گا۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ یہاں سے شاہ میر کی کوٹھی چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

میں گاڑی پر جھک گیا اور ساتھ ہی گردوپیش پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں کبھی بونٹ پر جھک جاتا اور کبھی سر اٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ ایک بار جب میں بونٹ پر جھکا تو میرے کانوں سے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ میرے قریب ہی رکی تھی۔ میں نے سر اٹھا کے اس طرف دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔ کار میرے بالکل قریب کھڑی تھی اور اس میں فقط ایک ہی سوار تھا جس نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال رکھا تھا۔

وہ فرحانہ تھی۔

میں سیدھا کھڑا ہوگیا تھا اور یک ٹک اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل پر دونوں ہاتھ رکھے گردن موڑے میری جانب تکے جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نیچے اترے گی لیکن چند سیکنڈوں بعد ہی اس نے اپنی کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

میرے فرحانہ کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوچکے تھے۔ میری یہاں موجودگی پر وہ ضرور کھٹک گئی ہوگی۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ میں اسے شاہ میر اور ثمیر کے سلسلے میں جارحانہ قسم کی دھمکی دے چکا تھا۔ وہ ضرور یہاں ثمیر سے ملنے آئی ہوگی۔ میں پریشان سا ہوگیا تھا۔ وہ ضرور ثمیر سے ملتے ہی میری یہاں اشتباہ انگیز موجودگی کے بارے میں اسے نہ صرف آگاہ کرسکتی تھی بلکہ میری طرف سے محتاط بھی رہنے کا کہہ سکتی تھی۔

کالیا کو روانہ ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوچکے تھے۔ میں نے کالیا کو کال کر ڈالی۔ میں اسے فرحانہ کی آمد اور دیکھ لیے جانے کے بارے میں آگاہی دینا چاہتا تھا مگر کالیا نے کال کاٹ دی۔ تشویش آمیز انداز میں، میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ایسی کسی مہم کے دوران ہم ایک بات کا خیال رکھتے تھے کہ اپنے فون کو سیل ٹون سے ہٹا کر وائبریشن پر کر دیا کرتے تھے ورنہ فون بیل کی آواز دوسروں کو چونکا سکتی تھی۔

بڑی عجیب اور مشکل صورت حال ہوچکی تھی۔ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی صورت حال تھی۔

میں تھوڑی دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد میں نے کار کا بونٹ گرا دیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پھر کار اسٹارٹ کر کے میں نے آگے بڑھا دی۔ میرا رخ شاہ میر کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ جب میں اس کے بلاک والی گلی میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ رہائش گاہ کے گیٹ کے باہر مجھے فرحانہ کی کار کھڑی نظر آگئی تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ ایک گن مین گیٹ پر کھڑا نظر آیا تھا۔ میں اس کے قریب

سے اپنی کار گزار کر لے گیا۔ ٹھیک اسی وقت میری نگاہ بیک ویو مرر پر پڑی اور میں نے اپنی کار کی رفتار آہستہ کرلی۔ ایک تیم شحیم سے آدمی کو میں نے گیٹ سے نکلتے اور فرحانہ کی کار میں سوار ہوتے دیکھا۔ پھر اس کے فوراً بعد میں... کار کو اسٹارٹ کر کے اندر لے گیا۔ میں تب تک دائیں جانب مڑ گیا تھا۔ جانے کیوں میرا ذہن ٹھٹکا تھا۔ فرحانہ کی یہاں آمد اور پھر اس کی کار کو کسی اجنبی کا اندر لے جانا آخر کیا معنی رکھتا تھا؟ اس بات سے میں ٹھٹک سا گیا تھا۔

میں نے قریب میں کوئی خالی جگہ دیکھ کر کار روک دی اور ابھی نیچے اترنے ہی لگا تھا کہ کالیا کی کال آگئی، جو میں نے فوراً ریسیو کی۔

''ابے لے جگری! یہاں تو اور ہی کھچڑی پک رہی ہے۔'' دوسری جانب سے اس کی مخصوص آواز ابھری۔

''کیا مطلب؟ جلدی بتا۔'' میں نے پوچھا۔

''میں ابھی اندر ہی تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ وہاں آگئی۔'' وہ بتانے لگا۔ ''سن! اسے اغوا کرلیا گیا ہے۔ وہ بے ہوش ہے اور اب اسے اس ایک آدمی کے ساتھ کسی اور جگہ روانہ کیا جارہا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر بری طرح چونک گیا۔ بولا۔ ''یہ بتا اندر کون کون موجود ہے؟''

''ثمیر اور اس کا باپ شاہ میر۔ ایک دو مگڑے بدمعاش، چوکیدار بھی ان کا اپنا ہی آدمی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کی بیوی اور بیٹی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''وہ نہیں ہیں، البتہ دونوں باپ بیٹوں کو میں نے ان کے بارے میں یہ باتیں کرتے سنا تھا کہ ''یہ کام جلدی نمٹا لو اس سے پہلے کہ لیلیٰ اور کاشفہ آجائیں۔''

''ہاں! لیلیٰ صماد اس کی بیوی ہے جو ایک عربک خاتون ہے جبکہ کاشفہ بیٹی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اب کرنا کیا ہے؟ جلدی بتاؤ؟'' کالیا بولا۔

''تم اندر محفوظ پوزیشن میں ہو؟'' میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں! یہاں کچھ زیادہ لوگ نہیں ہیں جو ہیں وہ فی الحال ثمیر اور شاہ میر کے نکلنے والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم اندر چھپے رہو اور محتاط رہنا۔'' میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے ضرور بتانا اور مجھ سے رابطے میں رہنا۔'' میں نے جلدی جلدی اسے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''تم ان کا تعاقب کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں!''

''ٹھیک ہے جگری! میں ادھر ہی بھوت بن کے چھپا رہوں گا۔''

''صرف چھپے نہیں رہنا ہے، اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دونوں باپ بیٹے پر نظر رکھنا ہوگی اور ان کی باتیں بھی سنتے رہو۔''

''بےغم ہوجا جگری! ایسا ہی ہوگا۔ او......'' وہ آخر میں چونکا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے چونک کر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''دونوں موٹے بدمعاش فرحانہ کو لے کر نکل رہے ہیں تم محتاط رہنا جگری! دونوں مسلح ہیں۔''

''بےفکر رہو، یہ بتاؤ، فرحانہ ابھی تک بے ہوش ہے؟''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے رابطہ منقطع کردیا اور کار کو ذرا آگے لے جا کر یوٹرن لیا اور واپس ہوا۔ اسی وقت میں نے شاہ میر کی کوٹھی کے گیٹ سے سفید ہنڈا سٹی کو نکلتے دیکھا۔ اس میں مجھے صرف دو ہی افراد بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر تو وہی شخص تھا جسے میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فرحانہ کی کار کو اندر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

ان کا رخ مین روڈ کی طرف تھا۔ یہ اندازہ قائم کرتے ہی میں نے دانستہ اپنا راستہ بدل لیا تاکہ انہیں تعاقب کا شبہ نہ ہوسکے۔

مین روڈ پر آتے ہی سگنل آگیا اور میں رک گیا۔ تب ہی میں نے بیک ویو مرر میں اسی گاڑی کو دیکھا جو تین گاڑیاں چھوڑ کر میرے پیچھے کھڑی تھی۔

سگنل گرین ہوا اور گاڑیاں تیزی سے پُرشور ہارن دیتی ہوئی آگے بڑھیں۔ میں نے بھی اپنی کار آگے بڑھا لی۔ رفتار میں نے آہستہ ہی رکھی تھی۔ جلد ہی وائٹ ہنڈا مجھے کراس کر کے آگے نکل گئی۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں ان کے پیچھے لگ گیا۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدحام تھا۔ ہنڈا کا ڈرائیور کار کو فاسٹ ٹریک پر لے آیا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ فاسٹ ٹریک پر ٹریفک نسبتاً رواں اور سبک ہوتی ہے۔

مجھ سے آگے دو گاڑیاں اور تھیں اور اس کے بعد مطلوبہ کار۔

کار کے تعاقب کے دوران میرے اندر دھکڑ پکڑ سی مچی ہوئی تھی۔ مجھے ان دونوں باپ بیٹے سے اس قدر جلد فرحانہ کے سلسلے میں یہ انتہائی قدم اٹھانے کی بالکل بھی توقع نہ تھی۔ تاہم اس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ دونوں باپ بیٹے ملے ہوئے تھے جس کا مجھے پہلے ہی ادراک تھا۔ ایک خیال اور میرے ذہن میں کلک ہوا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ فرحانہ یا رانا بشیر کے سامنے ثمیر کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا اور اس لیے انہوں نے جلد ہی یہ خطرناک قدم اٹھالیا ہو۔

کار کا رخ ٹاور کی طرف ہو گیا تھا۔

"سی گوڈیز!" میرے ذہن میں ابھرا۔ تو کیا فرحانہ کو بن رائد کی لانچ میں یرغمال بنا کے رکھا جانے والا تھا؟ یہ سوچتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بندرگاہ کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں غفورے کے باپ کی موت کا دردناک منظر سامنے آگیا۔ اس بوڑھے غریب مزدور سے بھلا میرا کیا رشتہ تھا مگر اس کا دل کتنا بڑا تھا کہ اس نے میری زندگی بچانے کے لیے خود کو دردناک موت کے سپرد کر دیا تھا۔ کس قدر اذیت ناک موت سے دوچار ہوا تھا وہ بوڑھا۔ راکا کے اس پر بلندی سے بھاری بکس گرانے سے اس بوڑھے غریب کی تو ہڈیاں سرمہ بن گئی ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی راکا کے لیے میرے وجود میں سخت نفرت اور غیظ و غضب کی لہر اٹھی تھی۔ اس بوڑھے کا راکا جیسے جلاد صفت انسان سے انتقام لینا میرا مقصد بن گیا تھا۔

میں نے بھی پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ دشمن اگر تاریک راہوں میں اپنی سیاہ کاری میں مصروف عمل تھے تو میں نے بھی انہیں اسی انداز میں جواب دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ یوں میرا ٹارگٹ راکا تھا۔ میں بھی اسے تاریک راہوں کا اسیر بنا کے جہنم واصل کرنا چاہتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ کار بندرگاہ پر رکی تھی اور وہاں سے بیک یارڈ کی طرف مڑ گئی۔ گیٹ پر جانے انہوں نے کیا چکر چلایا تھا کہ انہیں اندر جانے دیا گیا تھا جبکہ میں نے اپنی کار باہر ہی کھڑی کر دی اور اندر داخل ہو گیا۔

فرقان سے میرا ملنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہاں البتہ اس بدنصیب بوڑھے کے بیٹے غفورے سے مجھے ضرور ملنا تھا۔ یوں بھی یہاں آنے کا کوئی جواز تو بنانا تھا۔ اس دردناک واقعے کے بعد وہاں مجھے اکثر مزدور پہچاننے لگے تھے۔ ایک نے مجھے اس کے بارے میں بتا دیا۔ وہ تین نمبر جنک یارڈ میں تھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

بندرگاہ کی فضا خاصی سیلن زدہ ہو رہی تھی۔ میرا رخ "سی گوڈیز" (سمندری شہزادی) کی طرف تھا۔ یہاں بڑے بڑے کنٹینر لگے ہوئے تھے، میں انہی کی آڑ لیتا ہوا مطلوبہ مقام تک پہنچ کر کا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔

بن رائد کا شپ سی گوڈیز جو کچھ دن پہلے جیٹی نمبر نو میں لنگر انداز تھا وہاں دوسری لانچ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک عام سے چھوٹی اور مقامی مسافر لانچ تھی جو لوگوں کو سیر و تفریح کی غرض سے جزیروں کی سیر کروایا کرتی تھی مگر اس وقت وہ بھی خالی تھی۔ اس کے اندر مجھے دو تین ہی خلاصی نظر آ رہے تھے۔

سی گوڈیز کو غائب پا کر میری کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ کیا بن رائد اور راکا جا چکے تھے؟ یا پھر گودی بدل لی تھی۔ دفعتاً ایک خیال پر میں چونکا۔ مجھے ان دونوں افراد کو تلاش کرنا تھا جو میرے خیال کے مطابق فرحانہ کو یرغمال بنا کے یہاں لانے والے تھے لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں پریشان ہو گیا۔ فرحانہ کے لیے میرا تشویش زدہ اور فکرمند ہونا فطری بات تھی۔

بعض حقائق کے آشکارا ہونے کے بعد رانا بشیر اب مجھ سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا اور ایسے نازک وقت میں مجھے اس کے تعاون کی ضرورت بھی تھی جبکہ فرحانہ ثمیر کے عشق میں اندھی تھی اور اس کا خمیازہ وہ بھگتنے والی تھی۔ چنانچہ یہ بات اب یقینی تھی کہ فرحانہ پر ثمیر اور ان دونوں ملعون باپ بیٹوں کی اصلیت بے نقاب ہوتے ہی اس کی محبت نفرت میں بدل سکتی تھی۔ شاہ میر کے خلاف یہ دونوں باپ بیٹی میرے کام آ سکتے تھے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہوتا جب ایسا ہوتا کیونکہ سردست تو وہ خود خطرے میں تھی اور میری نظروں سے اوجھل بھی۔ اس تناظر میں یہ سب سوچتے ہوئے مجھے رانا بشیر اور فرحانہ کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

شام جھکنے لگی تھی اور میں پریشان تھا۔ نہ وہ آدمی نظر آ رہے تھے نہ ہی مطلوبہ لانچ۔ میں اب ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھے ہوئے یہاں سے وہاں ان دونوں افراد کو تلاشتا پھر رہا تھا مگر وہ تو جیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے۔

"سائیں! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟" ایک شناسا سا آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں پلٹا۔ آواز عقب سے ہی آئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ غفورا تھا۔

میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ میری سانس نجانے اس بھاگ دوڑ سے یا پھر جوش کی وجہ سے پھولی ہوئی تھی۔ بہرکیف میں نے اپنی کیفیات پر قابو پایا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس سے ایک نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "کیسے ہو غفور بھائی؟ میں تم سے ہی ملنا چاہتا تھا۔"

"ہاں مجھے ابھی خادم حسین نے بتایا تھا کہ تم مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہو، خیریت تو ہے ناں سائیں؟" اس نے کہا۔ خادم حسین شاید وہی شخص تھا جو آخر میں مجھے ملا تھا اور بتایا کہ غفورا تین نمبر کی گودی میں تھا۔

"تم بتاؤ، تمہارے بابا کے کیس کا کیا بنا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا، میری مستفسرانہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں میرے سوال پر ایک تلخ اور تکلیف دہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"وہی ہوا سائیں! جو ہم جیسے غریبوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

"سائیں! سارا پیسے کا چکر ہے اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں ہم غریب لوگ بھلا کس کھاتے میں ہیں۔ ہم اپنوں کو تو کچھ کہہ نہیں سکتے، غیروں سے تو ہمارا جیسے دم نکلتا ہے۔"

وہ بولتا جا رہا تھا اور اس کا تجربہ اس کے لفظ لفظ سے عیاں ہوتا تھا۔ اس کے لہجے سے ہی نہیں چہرے سے بھی لاچارگی، مایوسی اور کم مائیگی کا احساس نمایاں طور پر ہوتا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو غفور بھائی؟ ذرا کھل کر کہو ناں تاکہ میں تمہاری بات سمجھ سکوں اور یہ اس اماراتی کا شپ کہاں گیا؟"

"سائیں! ہم غریب لوگ تو صاف اور سچی بات کہتے ہیں، پتا نہیں آپ کو کیوں نہیں سمجھ میں آ رہی ہے۔" وہ بدستور اسی طرح دکھی اور مغموم سے لہجے میں بولا۔

"باقی سائیں! وہ جہاز تو آج صبح ہی برتھ نمبر گیارہ پر چلا گیا تھا۔" اس نے آخر میں بتایا تو میں نے جلدی سے کہا۔

"گیارہ نمبر برتھ کدھر ہے؟"

"وہ تو بھٹ آئی لینڈ کے پاس ہے۔"

"میں نے وہاں تک جانا ہے، ابھی اسی وقت۔" میں نے کہا۔ میں اب ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"سائیں! اس کے لیے تو آپ کو کسی لانچ پر بیٹھ کر جانا پڑے گا لیکن اب کیا فائدہ؟ پولیس نے اس جہاز کے دونوں اماراتی باشندوں کی نظربندی ختم کر دی تھی۔" وہ بولا۔

"دیکھو غفورا! مجھے کسی طرح اسی وقت اس جہاز تک پہنچاؤ۔ یہ ایک شریف لڑکی کی عزت اور جان کا معاملہ ہے۔" میری بات پر وہ ذرا چونکا پھر بولا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" کہتے ہوئے وہ جلدی سے ایک طرف کو بڑھا میں نے فوراً اس کی تقلید کی۔ وہ ایک مختصری جیٹی پر پہنچا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"ارے یہ جھومر چاچا کی لانچ کون لے گیا؟"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی چند منٹوں پہلے ہی تو میں نے اس لانچ کو یہاں دیکھا تھا، جب اسی طرف سے آ رہا تھا، وہ تو بند تھی۔ جھومر چاچا بھی اس وقت اپنی لانچ نہیں کھولتا۔ ہم!" یہ کہتے ہوئے وہ کچھ سوچتے ہوئے خودکلامی میں بڑبڑایا۔

"کہیں یہ شکورا اس گشتن مراداں کو سیر کرانے لے گیا ہے۔"

"یہ..... شکورا کون ہے؟ اور مراداں؟" میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے سائیں! یہ شکورا، جھومر چاچا کا ہیلپر ہے، وہی لانچ کو کھولتا اور باندھتا ہے۔ ادھر ہی سوتا ہے۔ مراداں اس کی یار ہے۔" اس نے بتایا اور میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں خیال کلک ہوا کہ کہیں وہی تو ان دونوں کو بھٹ آئی لینڈ کی طرف نہیں لے گیا؟ میں مزید بے چین ہو گیا۔ بولا۔ "غفورا بھائی! جو کرنا ہے جلدی کرو، مم..... مجھے پورا یقین ہے وہ دونوں آدمی اس لڑکی کو اسی لانچ میں لے کر اس اماراتی بدمعاشوں کے شپ تک لے کر گئے ہیں۔"

"سائیں! میں کوشش ہی کر سکتا ہوں۔" غفورے نے کہا اور پھر ایک طرف کو چلا، میں اس کے پیچھے تھا۔

خاصی دیر تک میں اس کے ساتھ دوڑ دھوپ میں لگا رہا لیکن لانچ کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ وہ ہاتھ ملتا رہ گیا اور میں بھی۔

"سائیں! میں نے تو آپ کے سامنے بہت کوشش کر ڈالی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔" تب پھر وہ فوراً ہی کچھ سوچ کر بولا۔

"اب ایک ہی طریقہ ہے سائیں کہ ہم ادھر ہی شکورے کی واپسی کا انتظار کریں۔"

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کے سوا اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ناچار ہم اسی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت کالیا کی کال آ گئی۔ میں سیل فون لگاتا ہوا غفورے سے ذرا فاصلے پر چلا گیا

اور دھڑکتے دل کے ساتھ کالیا کی کال اٹینڈ کی۔

''ابے لے جگری!'' دوسری جانب سے کالیا کی مخصوص آواز ابھری۔ ''یہ اپنا شاہ میر تو دبئی کھسکی جا رہا ہے۔''

''کیا؟'' میرے منہ سے نکلا۔ ''کب؟ کیوں؟''

''کیوں کا تو وہی بتا سکتا ہے اگر میں اس سے پوچھوں تو......'' وہ بذلہ سنجی سے بولا۔ ''لیکن یہ بتا تو ان سسروں کے تعاقب میں کہاں تک پہنچا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''اس بات کو ابھی چھوڑ بعد میں بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے تو وہاں کی صورتِ حال بتا۔ کوئی بات کوئی مشکوک گفتگو؟''

''ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ماں بیٹی گھر پہنچے ہیں۔ شاہ میر کی روانگی کا پہلے سے ہی پروگرام تھا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''دونوں باپ بیٹا یہی باتیں کر رہے تھے کہ وہ اب فرحانہ کو زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بنا سکتے تھے، اسی لیے انہوں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ رانا بشیر سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ مزید اس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے کہ لیکن صماد اور کاشفہ آ گئیں اور شاہ میر روانگی کی تیاری کر رہا ہے۔ اب بول کیا کرنا ہے؟''

میں ہونٹ بھینچے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد بولا۔

''شاہ میر کو ایئر پورٹ چھوڑنے کون جا رہا ہے؟''

''شمیم۔'' کالیا نے جواب دیا۔ ''وہ باپ کو ایئر پورٹ چھوڑ کر واپس گھر لوٹ آئے گا۔''

''کالیا! تم ایک کام کر لوگے؟''

''واپسی میں شمیر پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔'' وہ جغادری میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔

''اکیلے یہ کام آسانی سے کر لوگے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابے لے جگری! یہ کوئی کام نہیں۔ تم بے فکری سے اپنا کام نمٹاؤ میں اپنا نمٹاتا ہوں، میں اس سنپولیے کو ایئر پورٹ سے واپسی پر ہی چھاپ لوں گا اور سیدھا صفورا والے مکان میں لے جاؤں گا، بعد میں تم بھی وہیں آ جانا اور اپنا حساب اس سنپولیے سے چکتا کر لینا۔'' اس نے کہا۔

''ہالو...... سائیں!'' اچانک مجھے غفورا کی آواز سنائی دی۔ ''لانچ آ رہی ہے۔'' اس نے بتایا اور میں چونک پڑا۔

''ٹھیک ہے کالیا! میں فون بند کر رہا ہوں، بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے اپنا کام نمٹانا۔''

''بے غم ہو جا جگری! کالیا کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔''

میں رابطہ منقطع کر کے غفورا کی طرف آیا، تو دیکھا سامنے سے ایک سالخوردہ سی لانچ پھٹ پھٹ کرتی چلی آ رہی تھی۔ اس میں روشنی ہو رہی تھی۔ اندھیرے پانیوں میں لانچ یوں لگ رہی تھی جیسے پانی کی سطح پر قندیل تیر رہی ہو۔ شام خاصی جھک آئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے لانچ کو قریب آتے تکے جا رہا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

''کیا وہی لانچ ہے؟'' میں نے غفورے سے پوچھا۔

''ہاؤ سائیں! یہ چاچا جمعو مرکی ہی لانچ ہے لیکن یہ سسرا شکورا تو اس میں نظر نہیں آ رہا ہے۔'' غفورا نے بتایا اور میں اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔

لانچ قریب آ گئی تھی اور بالآخر چھوٹے سے اس چوبی پلیٹ فارم پر آ کر ٹھہر گئی۔ اس کے اندر سے میں نے فقط ایک ہی آدمی کو اترتے دیکھا۔ جسے دیکھتے ہی میری رگوں میں لہو کی گردش ایک دم تیز تر ہو گئی۔ یہ انہی دونوں میں سے ایک آدمی تھا جو فرحانہ کو اغوا کر کے یہاں تک پہنچے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم دونوں ہی ٹھٹکے۔ ایک درمیانے قد و قامت کا آدمی جو خلاصی یا ڈھک مزدور ہی نظر آتا تھا۔ نمودار ہوا اور لانچ کی رسی کو چوبی پلیٹ فارم کے ایک ستون سے باندھنے لگا۔ اس کی نظر ہم پر پڑی تھی۔ وہ تھوڑا چونکا تھا۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''کیا یہی شکورا ہے، غفورا بھائی؟'' میں نے آخر الذکر آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہے تو یہ شکورا ہی پر یہ سالا کس بندے کو ساتھ لایا ہے اور یہاں سے لے کر کے گیا تھا؟ اس کی رن کہاں گئی؟'' وہ بڑبڑایا۔ میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ وہ آدمی لانچ سے اتر کر ایک نظر ہم پر ڈالتا ہوا ایک جانب کو چل پڑا۔

''غفورا! میں ابھی آتا ہوں لیکن دیکھو، اس شکورے کو ہرگز میرے بارے میں مت بتانا نہ ہی یہ کہ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ سمجھ گئے ناں؟''

''بے فکر رہو صاحب! میں نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ میں تیزی سے پلٹا اور دیوہیکل کنٹینروں کے درمیانے خلاء سے ہوتا ہوا اس آدمی کے قریب جا پہنچا۔ وہ ٹھٹکا۔ تب ہی اسے کچھ شبہ ہوا اور میں نے اس کا ایک ہاتھ جیب کی جانب رینگتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں نے اسی وقت ایک جست لگائی اور اس پر جا پڑا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی کا جواب)

سیف اللہ......ملک وال

یاد کرنے کی ہم نے حد کر دی
بھول جانا تیرا کمال سہی

غضنفر عباس مرزا......اسلام آباد

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

(نوشین عابد لاہور کا جواب)

عبدالحکیم شمر......کراچی

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے

(علی عشرت باغ (اے کے) کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری......کراچی

دے دیا تپتی ہوئی دھوپ کے صحرا کا سفر
میں نے خوشبو کی رفاقت کا سفر مانگا تھا

(نوشین عابد لاہور کا جواب)

بادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس

رخصتِ نالہ تجھے دے کر مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

(نوشین عابد کا جواب)

شبیر شاہ......گدو بیراج کشمور

رکا ہوا ہے عجب دھوپ چھاؤں کا موسم
گزر رہا ہے کوئی دل سے بادلوں کی طرح

(عشنا عباس جہلم کا جواب)

رفیق احمد ناز......ڈی جی خان

سورج ڈھلا تو دل میں عجب کیف چھا گیا
وعدہ شکن نہ آیا اور رات آ گئی

(اظہر الدین کراچی کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری......کراچی

تمنا وہ تمنا ہے جو دل ہی دل میں رہ جائے
جو مر کر بھی نہ ہو پورا اسے ارمان کہتے ہیں

نیلوفر شاہین......اسلام آباد

تیری جذباتیت مرے جذبات
ڈھل گئی دھوپ رہ گئے سائے

(نور عین کوثر دینہ جہلم کا جواب)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل......ملتان

رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کے بکھرا نہیں کرتے

(نازیہ تبسم کا جواب)

امیر حمزہ اشرف......ملتان

ٹوٹ کر گر جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
ان آندھیوں سے کہہ دو اپنی اوقات میں رہیں

(ناعمیہ تحریم کا جواب)

مریم بنت کاشف......حیدرآباد

حیات مختصر کا ہے بس اتنا ہی افسانہ
جلی خود شمع لیکن دوسروں کو روشنی دے دی

(بادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

حیات مرزا......لطیف آباد

منزل کی جستجو تھی نہ رہبر کی تھی تلاش
ہم خاک ہو کے گردِ پسِ کارواں رہے

عبدالجبار رومی......قصور

مست و خرام دور سے جو تم چلے آتے ہیں
محبت کا ہی جام پی کے اپنا دل بہلاتے ہو

(شگفتہ یاسمین کراچی کا جواب)

اختر شاہ عارف......جہلم

اک مدت سے ہے میرے رتجگوں کا مشغلہ
دیکھنا ماہتاب کو پھر تیرا پیکر سوچنا

(لیلیٰ قربان فیصل آباد کا جواب)

اسجد مبارک پوری......کراچی

وہ اچانک جو شہر کی نظر آ گئے
اشک پینا پڑا مسکرانا پڑا

توفیق احمد........جہلم

یوں ترا نام ذہن میں آیا
جس طرح مژدۂ وصال آئے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

زاہت افشال.........مہورہ فتح جنگ

ایسا نہیں ہے کہ سرکار مجھ میں کوئی عیب نہیں ہے
پر سچ کہتا ہوں مجھ میں کوئی فریب نہیں ہے

(انیس الرحمٰن لاہور کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری...........سرگودھا

مانا کہ تمہیں مجھ سے بہت سخت ہے نفرت
پھر یاد میری دل سے بھلا کیوں نہیں دیتے

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..........فورٹ عباس

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

(رفیق احمد نازدی جی خان کا جواب)

محمد محمود...........حیدرآباد

یاد ماضی کے وہ افسانے بھلا ڈالوں گی
تیری تصویر ترے خط کو جلا ڈالوں گی

شفیق احمد سلطان..........ملتان

یہ مچلتے ہوئے جذبے یہ دھڑکتے ہوئے دل
تفرد ایمان کی پہچان نہ جانے کیا ہے

(منشی عزیز ے لندن کا جواب)

عنایت مسیح..........کراچی

یاد رکھیں کہ بھول جائیں ہم
یہ بھی مشکل ہے وہ بھی مشکل ہے

اشرف جہانگیر...........لیہ

یہ ستم ہے ترا یا کرم مجھ کو اس کی کہاں ہے خبر
تو نے اپنا بنا کر مجھے مجھ کو خود سے جدا کر دیا

(ناہید سلطانہ پشاور کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

راستے میں رک کے دم لوں یہ میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

شفق احمد..........فیصل آباد

اللہ رے زندگی کی پریشاں خیالیاں
دل کو حریف زلف پریشاں بنا دیا

ندرت فیضان...........احمد پور

ابرو کا گھنا شہر ہو گیسو کی گلی ہو
تم ایسی ہوا ہو جو گھٹا لے کے چلی ہو

ناصر اشرف .... ملتان

اک تماشا بن گئے تھے بھیڑ میں باہر سے ہم
اس لیے بہتر ہوا خود ہٹ گئے منظر سے ہم

سلیم اللہ..........لاہور

اپنی ناداری و افلاس پہ رو دیتا ہوں
چھیڑ دیتے ہیں وہ جب تاج محل کی باتیں

(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

زیشان حسن..........لیہ

یہ کیا مقام تیری محبت میں آ گیا
آنکھیں ہیں اشک بار غزل کہہ رہا ہوں میں

عباس علی........ میرپور

یہ کھلے بال یہ دزدیدہ نگاہوں کا فسوں
ہوش مستی بھری راتوں کے اڑا دے نہ کہیں

سیما علی.........لاہور

یہ مہکتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی ہوئی آگ
نرم نیندوں کے شبستانوں میں ڈھل جائے گی

(احمد جاوید زی جی خان کا جواب)

مریم بنت کاشف.........حیدرآباد

صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

(سدرہ بانو نا گوری کراچی کا جواب)

منشی محمد عزیز ے..........لندن

یوں بے خودی شوق میں حد سے گزر گئے
ہم بے خبر رہے وہ یہیں سے گزر گئے

عبدالجبار روی..........قصور

یہ امید تھیم کہ وفا ملے ہمیں کبھی
تو سمجھو دوستی ہی وفا ہے سوداگری اور

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 145
28 فروری 2018ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 28 فروری 2018ء تک علمی آزمائش 145 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں/ اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

107

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش ۔ 145

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک سطری سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 31 جنوری 2018ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

18 مئی 1922ء میں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو تاج برطانیہ کی جانب سے 750 ایکڑ زمین ملی تھی۔ لاہور گورنمنٹ کالج سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پنجاب کالج سے پی ایچ ڈی، اردو ادب کے بڑے معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ تنقید میں بڑا نام پیدا کیا۔

علمی آزمائش 143 کا جواب

انتظار حسین کے 1952ء سے لے کر 2004ء تک افسانوں کے 9 مجموعے آئے۔ 1953ء سے لے کر 1995ء تک پانچ ناول شائع ہوئے۔ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ میرٹھ سے 1946ء ایم اے کر کے پاکستان آئے۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام۔

انعام یافتگان

1۔ سحرش بٹ، لاہور　2۔ نعیم الحق، کوئٹہ　3۔ جعفر حسن خان، جہلم

4۔ امیر الاسلام، کراچی　5۔ زریاب، راولپنڈی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے خادم حسین، رضیہ مسعود، عبدالجبار رومی، جلیل احمد جعفری، عبدالحکیم ثمر، وجاہت وکیل عثمان خان، محمد یونس جان، صفیہ افسر، ناعمہ تحریم، وردہ بتول، ارشد علی، اکبر علی رئیسانی، اسرار احمد، نواب خان، خادم حسین، تجسم عرفان قریشی، سلیم کھوکھر، فرحین بشیر، مولا بخش، تنویر حسین، ہارون محمد، عطیہ لورین، نسرین عزیز، پروین بیگم، مہوش علی خان، فیروز رحمانی۔ لاہور سے حنیف ادیب، یاسمین فرحت، قاضی حسین رضوی، نعیم عباس، پنجتن نقوی، علی نواز، اصغر علی اصغر، صابر

خان، نوید احسن، اقبال اصغر، مصباح الرضا، عبدالخالق، احمد علی بٹ، نواز کبیر، سلمان احمد، تاثیر احسن، فدا محمد، ذیشان خان، قدیر علی پاشا، نازش سلطان۔ ملتان سے عنبرین چشتی، محمد سرفراز مغل، عرفان احمد شاہ، محمد معین چشتی، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، نصیر شاہ، وردہ فاطمہ، خالق حسین، نسیم احمد، فوزیہ اختر، فیروز اختر، اکبر علی خان، قصور سے عثمان علی، نزہت جبیں، عنایت اللہ۔ جہلم سے اختر شاہ عارف، نثار احمد۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، احمد توحید، شفیق سیال، نور احمد نور، آفتاب احمد خان، نفیس اللہ خان، صالحہ بانو، ارتضیٰ حسن، نذیر احمد خان۔ حیدرآباد سے محمد یاسین اندوری، طہٰ یاسین، حذیفہ، مریم بنت کاشف، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، کاشف علی کاشف، اکبر علی رند، ابرار مصطفی، خالق حسن، دردانہ حسن، صباحت مرزا، نعمان صدیقی، نوازش علی خان، نیاز عکسی۔ سکھر سے ممتاز حسن، زبیدہ بیگم۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ، ملک محبوب احمد۔ لیہ سے نذیر احمد گجر، اشرف جہانگیر، عباس ڈڈیال، اشرف علی۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، توصیف حسن، نعیم اختر، مسعود اظہر، افتخار حسن، بشیر احمد، ارشاد بانو، محمد ذیشان، خالد عثمانی، ماہ جبین فاطمہ، عزیز الحسن۔ اسلام آباد سے غضنفر عباس مرزا، ارشاد بانو، ماہ جبین فاطمہ، عزیز احمد، نصرت جاوید۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب واسطی، نکہت بانو، اختر عباس، عرفان سلیم واسطی۔ میانوالی سے افتخار حسین شاہ پیلاں، حنیف اسد۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، نثار اسدی، حافظ نعمان اشرفی۔ حافظ آباد سے محمد ابراہیم مستری، لیاقت علی خان۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد جاوید احسن، رفیق احمد ناز، زیب النساء، جاوید احسن۔ کھاتاں سے سلیم کا مریڈ۔ گڈو بیراج سے شبیر شاہ، اسفر خان، یونس خان، محمد حنیف، عبدالجبار۔ مردان سے ام انور، باڑی چم ہوتی۔ بکھر سے شاہ نجمی، اشفاق خان۔ واہ کینٹ سے نثار احمد، ثاقب علی۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ، زریاب اچکزئی، نادر حسن زئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، باقر رضی طوری، حسنین طوری، انور حسن خان، فرحت اللہ، داروغہ خان، شگفتہ حبیب الرحمن۔ ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ میرپور ماتھیلو سے اسرار علی، وسیع الدین احمد نیاز، میرپور اے کے سے نیاز بٹ، سلیم مغل، مسرت نیازی، نصیر احمد، کلیم الدین، عاجز احمد، وسیع اللہ، اشفاق خان، تلہ گنگ سے عباس علی۔ بدین سے احمد رفیق۔ جنوبی کے پی کے سے محمد بخش۔ ٹکی شاہ مردان سے شاہ مراد۔ میانوالی سے احسن جاوید، نذیر محمد، ڈیرہ غازی خان سے ضمیم احمد، نثار علی انصر عباسی۔ ڈی آئی خان سے اشرف علی سلطان۔ جونیاں سے دانش بیگ۔ جھنگ سے اشرف علی خان۔ چنیوٹ سے قاضی احمد علی، زاہد علی، باقر رضا، نثار رضا، محمد تقی زیدی۔ ملتان سے محمد بلال اقبال، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زمدان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعید وجلال، فاضل خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ماسٹر عبدالعزیز (سمندری)۔ جھنگ سے عطا المصطفیٰ۔ گوجرانوالہ سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صنم بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، نسیم الزماں، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے خارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہٰ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس جسی۔ کھاتاں سے سلیم کا مریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چھچھ بروزئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، ماتک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شاہ وقار، منہاس زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، بہرام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شاہ نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ ...... جمال شاہ، فراست خان، نوید نعیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، زرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے محمد انور (باڑی چیم)۔ چھچھ بروزئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ ممالک غیر سے زاہد بشیر فاروقی (جاپان) احمد انصاری (جرمنی) نصیر خان ناصری (جدہ سعودیہ) حافظ محمد صدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)۔ انعام ملک (جرمنی)۔ فہد فاروق (ٹوکیو جاپان)

بری عورت

محترم
السلام علیکم
میں نے زندگی میں پہلی بار کہانی لکھی ہے۔ یہ کہانی خود میری ہے اس لیے میں نے اپنا نام نہیں دیا ہے فرضی نام سے کہانی لکھی ہے کیونکہ میں عورت کے بارے میں مردوں کے رویہ کو غلط ٹھہرانا چاہتا ہوں۔

ندیم احمد
(کراچی)

اس وقت ہمارے گھر میں گیس نہیں آئی تھی اور گیس سلنڈر پر گزارا ہو رہا تھا۔ جب وہ ختم ہو جاتا تو خالی سلنڈر دے کر ڈپو سے بھرا ہوا سلنڈر لے آتے جو ہمارے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں بھائی موٹر سائیکل پر یہ سلنڈر لاتے تھے۔ جس روز یہ واقعہ پیش آیا تو میرا بھائی کسی کام سے اسلام آباد گیا ہوا تھا اور گھر میں گیس ختم ہو گئی تھی۔ یہ میری بیوی کی خاص عادت ہے کہ ہمیشہ عین وقت پر کام بتاتی ہے۔ گیارہ بجے کا وقت تھا اور اڑوس پڑوس کے سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر یا اسکول کالج گئے ہوئے تھے۔ اس لیے میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بیوی کو ساتھ لے جاؤں۔ درمیان میں سلنڈر رکھوں اور وہ اسے پکڑ کر پیچھے بیٹھ جائے۔ جاتے ہوئے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہوا البتہ واپسی میں دکان دار نے سلنڈر رکھنے میں ہماری مدد کی اور میں خراماں خراماں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ابھی ہم گھر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھے کہ اچانک ہی بغلی سڑک کے موڑ پر ایک بچہ سامنے آ گیا۔ اسے بچانے کی کوشش میں پوری قوت سے بریک لگائے تو توازن بگڑ گیا اور ہم دونوں میاں بیوی سلنڈر سمیت سڑک پر گر گئے۔ بیوی ایک طرف جا کر گری، سلنڈر لڑھکتا ہوا دور چلا گیا اور میں بیچ سڑک پر چت لیٹا ہوا تھا۔ وہ تو خیریت گزری کہ میرے پیچھے آنے والی سوزوکی پک اپ نے مجھے سڑک پر گرتا ہوا دیکھ کر فوراً ہی بریک لگا دیے ورنہ وہ مجھے کچل دیتی۔ اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی رک گئیں۔ فوراً ہی مجمع اکٹھا ہو گیا۔ لوگوں نے کھینچ تان کر مجھے اور فوزیہ کو سڑک سے اٹھایا۔ اب بھانت بھانت کی بولیاں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ کوئی پوچھ رہا تھا زیادہ چوٹ تو نہیں آئی، کوئی اسپتال لے جانے کی پیشکش کر رہا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

میں نے دو قدم چل کر دیکھا، ساری ہڈیاں سلامت تھیں۔ گویا فریکچر نہیں ہوا تھا البتہ بائیں کندھے میں درد ہو رہا تھا جسے میں نے زیادہ اہمیت نہیں دی اور بیوی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بالکل صحیح سلامت تھی۔ انہی لوگوں میں میرے محلے کا ایک لڑکا ارشد بھی تھا جو اسی وقت کالج سے واپسی میں بس سے اترا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل گھر پہنچا دے اور ہمارے لیے کسی ٹیکسی کا بندوبست کر دے۔ اس طرح ہم سلنڈر سمیت گھر پہنچ گئے۔

گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد میرے کندھے میں تکلیف بڑھ گئی۔ میں نے کندھے پر سے قمیص ہٹا کر آئینہ میں دیکھا تو وہ جگہ مجھے کچھ سوجی ہوئی محسوس ہوئی تو مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں فریکچر نہ ہو گیا ہو۔ بیوی نے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا اور میں وقت ضائع کیے بغیر اسے دکھانے چلا گیا۔ ان دنوں میں ایک نیم سرکاری خودمختار ادارے میں



ملازمت کر رہا تھا جہاں مفت میڈیکل کی سہولت تھی۔ ڈاکٹر نے کندھے کا سرسری معائنہ کیا اور مجھے اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس پر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی۔ اصولاً تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پہلے میرا ایکسرے کرواتا اور اس کی رپورٹ دیکھنے کے بعد اسپتال بھیجتا۔ یہی بات میں نے بھی اس سے کہی۔

''ڈاکٹر صاحب! کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ پہلے ایکسرے کروالیا جائے۔''

دراصل میں اسپتال میں داخل ہونے سے گھبرا رہا تھا کیونکہ بچے چھوٹے تھے اور میری بیوی انہیں گھر میں چھوڑ کر میرے ساتھ اسپتال میں نہیں رہ سکتی تھی اور دوسرے ان کا اسکول سے بھی ناغہ ہوتا لیکن ڈاکٹر نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور بولا۔ ''میں آپ کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ بار بار کے چکر لگانے سے بچ جائیں گے کیونکہ کندھے کی سوجن بتا رہی ہے کہ آپ کو بالآخر اسپتال تو جانا ہی ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس میں دیر کرنا ٹھیک نہیں۔''

میں نے ڈاکٹر سے مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ کچھ ڈاکٹرز کا کمیشن طے ہوتا ہے اور وہ بات بات پر مریضوں کو اسپتال بھیج دیتے ہیں۔ میں نے اس سے ایڈمیشن لیٹر لیا اور وہیں سے اسپتال چلا گیا۔ وہ تو جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ استقبالیہ والوں نے جھٹ پٹ میری فائل بنائی اور مجھے ایک پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ اس وقت موبائل فون کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے میں نے استقبالیہ کاؤنٹر سے ہی فون کر کے فوزیہ کو اسپتال میں داخل ہونے کے بارے میں بتا دیا اور کہا کہ وہ شام کو بچوں کو لے کر اسپتال آ جائے۔

شام کو فوزیہ بچوں کو لے کر آئی تو خاصی پریشان اور گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس وقت تک میرا ایکسرے ہو چکا تھا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ڈرپ لگا دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نرس میرے سرہانے پین کلر اور وٹامن بی کی گولیاں رکھ کر چلی گئی۔ غالباً اس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ میرا علاج شروع ہو چکا ہے اور اسپتال کا میٹر چل پڑا ہے۔ میں نے نرس سے پوچھا کہ کیا یہی گولیاں کھلانے کے لیے مجھے داخل کیا گیا ہے۔ وہ شکل سے ہی تنک چڑھی اور آدم بےزار لگ رہی تھی۔ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''صبر سے کام لیں۔ سات بجے سرجن صاحب آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو پلاستر چڑھتا ہے یا آپریشن کرنا پڑے گا۔''

آپریشن کا نام سنتے ہی میری بیوی رونے لگی اور منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''آپریشن کیوں ہوگا۔ خدانخواستہ کوئی خطرناک بات تو نہیں؟''

نرس کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کیا پتا۔ میں نے تو ڈاکٹر سے جو سنا وہ بتا دیا۔ صحیح پوزیشن تو سرجن صاحب کے آنے پر ہی معلوم ہوگی۔''

میں نے فوزیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو۔ دیکھو سرجن صاحب کیا کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے آپریشن کے لیے کہا تب بھی میں پہلے کسی دوسرے سرجن سے مشورہ کروں گا۔''

نرس منہ بناتی ہوئی چلی گئی تو میں نے فوزیہ سے کہا کہ وہ بھی بچوں کو لے کر گھر چلی جائے۔ وہ بلاوجہ ہی اس ماحول میں پریشان ہو رہے تھے اور پھر انہیں ہوم ورک بھی کرنا ہوگا۔ فوزیہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اسے کئی فکریں ستا رہی تھیں۔ پہلی تو یہی کہ اگر اس کی غیر موجودگی میں سرجن نے آپریشن کر دیا تو کیا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ رات کو میرے پاس کون رہے گا۔ میرے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھا کر گھر بھیجا اور کہا کہ سرجن سے جو بھی بات ہوگی وہ میں فون پر اسے بتا دوں گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے تو وہ پڑوس میں رہنے والے ارشد کے ہاتھ بھی بھیج سکتی ہے۔ صرف ایک دن کی بات تھی۔ اگلے روز تو بھائی کو اسلام آباد سے واپس آجانا تھا۔

سرجن صاحب آٹھ بجے تشریف لائے اور انہوں نے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ فی الحال وہ آپریشن نہیں کر رہے۔ البتہ کندھے پر پلاسٹر چڑھانا ہوگا۔ امید ہے کہ اس کے بعد آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ان کی بات سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرا خیال تھا کہ پلاستر کرنے کے بعد اسی روز یا زیادہ سے زیادہ صبح تک مجھے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ میں گھر فون کرنے ہی والا تھا کہ دو وارڈ بوائے وہیل چیئر لے کر آگئے اور مجھے آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ مجھے ایک ٹیبل پر بٹھا دیا گیا اور سرجن صاحب اپنے ایک معاون کے ہمراہ اپنی کارروائی میں مصروف ہوگئے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد میں روم میں واپس آیا تو ارشد اور فوزیہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ بچوں کے پاس پڑوسن کو چھوڑ کر آئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اسے گھر بھیج دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ دیر بچوں سے دور رہے اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ صبح ناشتا یا دوپہر کا کھانا لے کر نہ آئے۔ میں اسپتال کی کینٹین سے منگوا لوں گا۔

دس بجے کے قریب ایک دوسری نرس آئی۔ اس وقت میں غنودگی میں تھا۔ اس نے آہستہ سے میرا شانہ ہلایا اور بولی ''انجکشن لگے گا۔''

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ دوپہر والی نرس سے مختلف انتہائی پُرکشش عورت تھی۔ ہلکا سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، رسیلے ہونٹ اور بھرا بھرا جسم۔ اس نے مسکرا کر میری نبض دیکھی اور بولی۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

اس کی دلکش مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ میں محویت کے عالم میں اسے دیکھنے لگا، وہ تھوڑا سا جھینپتے ہوئے بولی۔ ''اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کی طبیعت پوچھی ہے۔''

''آپ جیسی تیماردار ہو تو طبیعت ٹھیک ہونے میں کیا دیر لگتی ہے۔'' میں نے شوخی سے کہا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا تھا۔

''اوہ! اگر یہ بات ہے تو میں آپ کے پاس ہی بیٹھ جاتی ہوں۔ باقی مریض جائیں بھاڑ میں۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اس کے گداز جسم کا لمس محسوس کر کے میری حالت غیر ہونے لگی۔ میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ پر یہ خصوصی عنایت کیوں ہو رہی ہے؟''

''کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بلڈ پریشر ناپنے کا آلہ نکالتے ہوئے بولی۔ ''ہم سب مریضوں سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں، یہ ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔''

یہ کہہ کر وہ آگے کو جھکی اور میرا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ وہ میرے اتنے قریب آگئی تھی کہ میں اس کی سانسوں کی تپش محسوس کر سکتا تھا۔ وہ صریحاً غلط بیانی کر رہی تھی۔ میں نے کسی نرس کو مریض کے اتنے قریب ہوتے نہیں دیکھا تھا بلکہ زیادہ تر نرسیں تو بڑی رکھائی سے پیش آتی ہیں اور سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ اس لیے مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مجھے یہ خوش فہمی ہونے لگی کہ وہ مجھ سے خصوصی برتاؤ کر رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، وہ مجھے بعد میں سمجھ میں آئی۔

بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد اس نے ٹرے میں سے ایک انجکشن نکالا اور اسے سرنج میں ڈالنے لگی۔ اسے دیکھ کر میں نے برا سا منہ بنایا کیونکہ مجھے انجکشن لگوانے سے ہمیشہ الجھن ہوتی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ''گھبرائیں نہیں، بالکل بھی تکلیف نہیں ہوگی۔''

یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے میرے بازو کو سہلانا شروع کر دیا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کی انگلیوں کے لمس سے مجھے بے حد سکون مل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی میرا بازو سہلاتی رہے۔ پھر مجھے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ روئی کے پھاہا سے وہ جگہ سہلانا شروع کر دی، پھر وہ میری جانب جھکی جیسے میری پیشانی کو بوسہ دینا چاہ رہی ہو، پھر اچانک پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''اب آپ آرام کریں۔ میں ایک گھنٹا بعد دوبارہ آؤں گی۔''

یہ کہہ کر اس نے پیار سے میرے گال پر تھپکی دی اور اپنا سامان اٹھا کر لہراتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے کسی ویرانے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اس نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا تھا لیکن میری تو نیند ہی غائب ہوگئی تھی۔ لوگ اس حالت میں کروٹیں بدلتے ہیں لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ الٹے ہاتھ پر پلستر ہونے کی وجہ سے میں صرف دائیں جانب ہی کروٹ لے سکتا تھا۔

وہ ایک گھنٹے بعد آنے کا کہہ گئی تھی لیکن میں نے پانچ منٹ بعد ہی اس کا انتظار شروع کر دیا۔ دراصل میں لڑکپن سے ہی عاشق مزاج واقع ہوا ہوں۔ ہر خوب صورت لڑکی اور جوان عورت کو دیکھ کر پگھل جاتا ہوں۔ اب تو مجھے ٹھیک طرح سے یاد بھی نہیں کہ میں نے زندگی میں یک طرفہ طور پر کتنے عشق کیے۔ ان میں کزنز، پڑوسنیں، سسرالی رشتے دار خواتین، کلاس فیلوز اور دفتر میں ساتھ کام کرنے والی خواتین سب ہی شامل ہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بری نیت سے نہیں دیکھا۔ بس یہی خواہش رہی کہ اس سے دوستی کروں۔ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں، پیار بھری میٹھی میٹھی باتیں کروں، تحفے تحائف کا تبادلہ ہو لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بنیادی طور پر شریف آدمی ہوں اس لیے اکیلے رات میں بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کا ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بقول میرے ایک دوست کے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو چائے کہیں بھی پئیں لیکن کھانا گھر آکر ہی کھاتے ہیں۔

وہ ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی تھی لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے آتے ہی بجلی گرائی اور میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا حال ہے میرے مریض کا؟''

اس کے انداز میں جو اپنائیت تھی اسے دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور حسبِ عادت نثر میں غلط شعر پڑھ دیا۔

انہیں دیکھ کر جو آجاتی ہے چہرے پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

''واہ جی واہ۔'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''آپ تو اچھے بھلے شاعر بھی ہیں۔''

''یہ میرا نہیں، غالب کا شعر ہے۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''کسی کا بھی ہو۔''

وہ شوخی سے بولی۔ اس کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ تھی۔ ''اس وقت تو آپ نے ہی پڑھا ہے۔ پھر وہ میری نبض دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بخار تو نہیں ہے۔''

''اگر ہوگا بھی تو تمہیں دیکھ کر بھاگ گیا۔''

''کیوں.... کیا میری شکل اتنی خوفناک ہے۔'' وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

جی چاہا کہہ دوں کہ تم تو آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہو لیکن فی الوقت اتنی بے تکلفی مناسب نہیں تھی۔ ویسے بھی مجھے اپنے مرتبہ اور منصب کا خیال رکھنا تھا۔ میں سترہ گریڈ کا افسر اور وہ ایک معمولی نرس۔ ہماری سماجی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا کہ جلدی میں کوئی فضول بات کہہ کر اپنی ہی نظروں سے گر جاؤں۔

اس نے ابھی تک میری کلائی پکڑ رکھی تھی پھر اس نے آگے کی طرف جھک کر اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ وہ کچھ اس طرح مجھ پر جھکی ہوئی تھی جیسے میرے ساتھ کسی فلم کا رومانی منظر عکس بند کروا رہی ہو۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آگیا اور وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔ آپ بھی آرام کریں۔''

میں نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دباتے ہوئے بولا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے، کچھ دیر تو بیٹھو۔''

وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئی اور کھلکھلا کر بولی۔

''اس وقت میٹرن راؤنڈ پر ہے۔ اسے یہ پسند نہیں کہ ہم کسی مریض کے پاس زیادہ دیر تک رکیں۔''

اس نے اپنا سامان اٹھایا اور میرے کان کے قریب جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ ”بارہ کے بعد آؤں گی۔“

اس کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ اس نے جس انداز میں میری حوصلہ افزائی کی اس سے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی ورنہ مجھے اسی وقت جھڑک دیتی یا اپنی جگہ کسی دوسری نرس کو بھیج دیتی لیکن وہ تو بارہ بجے آنے کا کہہ گئی تھی گویا وہ اس کی عادی تھی اور مریضوں سے دل لگی کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اپنی پیش قدمی وہیں روک دیتا اور جب وہ آتی تو سرسری انداز میں دو چار باتیں کرکے اسے ٹال دیتا لیکن میں اپنی فطری کی نظرت سے مجبور تھا۔ اس لیے ایسا نہ کرسکا۔

وہ بارہ کی بجائے ایک بجے آئی۔ شاید میری آتش شوق کو بھڑکانا مقصود تھا۔ اس بار اس کا روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ وہ تیمارداری کے لیے نہیں بلکہ میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کے لیے آئی ہو۔ ویسے تو وہ نرس کے لباس میں ہی تھی لیکن اس کے انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے ہلکا ہلکا میک اپ کیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے ہونٹوں پر تازہ تازہ لپ اسٹک لگائی ہوئی ہے۔ دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آگیا تھا اور اس کے بدن سے پرفیوم کی ہلکی ہلکی مہک آرہی تھی۔

اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کردیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چاہ رہی تھی۔ اس نے بڑے معصومانہ انداز میں خود ہی دروازہ بند کرنے کا جواز پیش کردیا۔ وہ حسب معمول میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ویسے تو ڈاکٹر سمیت سارا عملہ سوچکا ہے لیکن میٹرن کی نیند بہت کچی ہے۔ وہ کسی وقت بھی اس طرف آسکتی ہے۔“

”پھر تو تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بند دروازہ دیکھ کر کوئی بھی شک میں پڑسکتا ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر کوئی آگیا تو میں سنبھال لوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ میرے اوپر جھک گئی اور بولی۔ ”اگر میرا بس چلے تو رات بھر آپ کے پاس بیٹھی رہوں۔“

”کیا تم سب مریضوں کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہو؟“ میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

”توبہ کریں جی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں تو کسی کو بھی منہ نہیں لگاتی، بس اپنی ڈیوٹی پوری کرتی ہوں۔“

”پھر مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ آپ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے۔“ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ”خاص طور پر آپ کی یہ شربتی آنکھیں۔ کسی کو بھی دیوانہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔“

میں اپنی تعریف سن کر حیران رہ گیا۔ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس سے کوئی عورت متاثر ہوسکتی۔ عام سی شکل صورت، درمیانہ قد۔ البتہ میں اپنے لباس اور گیٹ اپ پر خاص توجہ دیتا تھا۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر سے باہر نکلتا۔ بال سلیقے سے سنورے ہوتے اور پالش کیے ہوئے جوتے۔ شادی بیاہ کی محفلوں میں بہت کم جاتا اور لوگوں سے گفتگو میں محتاط رہتا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت میرے ہاتھ میں کوئی کتاب یا ڈائجسٹ ہوتا۔ کبھی کبھی میری بیوی بھی اس عادت سے چڑ جاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فارغ وقت میں اس سے باتیں کروں یا بچوں کو کہیں گھمانے لے جاؤں جس کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی۔

میں جانتا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنارہی ہے لیکن میں خود بھی اس کی قربت سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ کسی مرد کے لیے اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک خوب صورت اور پرکشش عورت تنہائی میں قریب بیٹھی اپنی اداؤں اور میٹھی میٹھی باتوں سے اس کا دل بہلارہی ہو۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہے۔ اس لیے میں نے بات کو آگے بڑھانے کی خاطر پوچھا۔ ”تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”آپ نے پوچھا ہی کب؟“ وہ شوخ لہجہ میں بولی۔

”تو اب بتادو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ میری جانب کھسکتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام مریم ہے۔“

”کہاں رہتی ہو؟“

”کھوکھراپار میں۔“

میں اس کی ازدواجی حیثیت جاننا چاہ رہا تھا اس لیے گھما پھرا کر پوچھا۔ ”گھر میں اور کون کون ہے؟“

”میرا شوہر اور بیٹی۔“

”اوہ!“ میں نے ایک طویل سانس لی پھر پوچھا۔ ”تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے؟“

اس نے میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیا ساری باتیں آج ہی پوچھ لیں گے، کچھ کل کے لیے بھی چھوڑ دیں۔“

مجھے لگا کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی۔ شاید وہ نکھٹو یا بے روزگار ہے یا پھر کسی ایسے پیشے سے وابستہ ہے جس کے بارے میں اسے بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد مجھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوہو، باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ دو بج گئے۔ اب میں چلتی ہوں کہیں بچی نہ اٹھ جائے۔“

”کیا تم بچی کو ساتھ لے کر آئی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ چھ ماہ کی بچی کو کس کے پاس چھوڑ کر آؤں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی جسے میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لمحہ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی لیکن میں اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ یقیناً اس کے مالی حالات اچھے نہیں تھے ورنہ وہ بچی کو کسی ڈے کیئر سینٹر میں بھی چھوڑ سکتی تھی۔

”اسپتال والوں کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”انہیں کیا اعتراض ہوگا۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری کرتی ہوں اور ویسے بھی وہ پوری رات سوئی رہتی ہے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگا کر اسے دیکھ لیتی ہوں۔“

اس نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی کیا قصہ لے بیٹھی۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور مجھے ہی حل کرنا ہے۔ اب آپ آرام کریں، صبح ملاقات ہوگی۔“

وہ جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں۔“

”جی بولیں۔“

میں نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیے اور کہا ”صبح کسی وارڈ بوائے سے کہہ کر میرے لیے ناشتا منگوادینا۔“

”نو پرابلم۔ یہ پیسے اپنے پاس رکھیں۔ صبح جب کینٹین والا لڑکا ناشتا لے کر آئے تو اسے دے دیجیے۔“ اس نے

عہد اکبری میں میاں تان سین جن کا اصل نام عطا حسین خاں تھا، انہوں نے مسلم کلاسیکی موسیقی کو بام عروج تک پہنچایا۔ سید عابد علی عابد فرماتے ہیں: ”میاں تان سین نے کلاسیکی سنگیت کو نیا رنگ، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ انہوں نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کیے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب ان کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی لیکن جو راگ تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رکھے گا وہ درباری ہے جسے سن کر بقول اکبر اعظم دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے والے ولولے بیدار ہوتے تھے۔“

مرسلہ: تسنیم بٹ۔ لاہور

اگر آپ اپنی یادداشت بہتر بنانا چاہتے ہیں تو چاکلیٹ کھانا شروع کردیں۔ L'Aquila یونیورسٹی کی ایک تحقیق میں بتایا گیا کہ کوکا (چاکلیٹ کا بنیادی جز) کھانا معمول بنالیا طویل المعیاد یادداشت کو بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ تحقیق کے مطابق چاکلیٹ میں موجود فیوونوئیڈز یا فلیونولز ذہنی صحت کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اس تحقیق کے دوران صحت مند افراد کے ساتھ ساتھ الزائمر یا ڈیمینشیا کے شکار افراد کا بھی جائزہ لیا گیا اور انہیں کوکا سے بھرپور مشروبات کا استعمال آٹھ ہفتے تک کرایا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ اس سے ذہنی صحت خصوصاً یادداشت میں بہتری آتی ہے جبکہ بلڈ پریشر اور انسولین لیول بھی بہتر ہوتے ہیں۔ تحقیق میں مزید بتایا گیا کہ چاکلیٹ کھانا یا مشروب کی شکل میں اسے استعمال کرنا دماغ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس سے دماغ کی جانب دوران خون بڑھتا ہے جس کے دماغی صحت پر فوری اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ محققین کا کہنا تھا کہ چاکلیٹ کھانے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوری طور پر اسمارٹ ہوجائیں گے کیونکہ بازار میں دستیاب عام چاکلیٹ بار میں مناسب مقدار میں فلیونوئیڈز موجود نہیں ہوتے مگر کوکا ضرور فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ یہ تحقیق طبی جریدے فرنٹیئر ان نیوٹریشن جرنل میں شائع ہوئی۔

مرسلہ: وارث علی۔ ملتان

مجھے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کتنی محتاط اور سمجھ دار ہے۔

اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے ختم ہوتی تھی اس لیے وہ سات بجے ہی ناشتا لے کر آگئی۔ اس نے کینٹین والے لڑکے سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے بعد خالی برتن اور پیسے لے جائے۔ میں اسی کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آکر رکی اور بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آپ منہ ہاتھ دھولیں۔ میں اتنی دیر میں ایک راؤنڈ لے کر آتی ہوں۔ پھر میں آپ کو ناشتا کرواؤں گی۔''

اس کی اس ادا پر تو میں سو جان سے فدا ہوگیا۔ اتنے پیار سے میری بیوی نے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ اس میں کچھ قصور میرا بھی تھا۔ میرے نرم رویے نے اسے حاکیت پسند بنا دیا تھا اور وہ مجھ سے عام انداز میں بات کرتی تو یوں لگتا جیسے حکم دے رہی ہو۔

بہرحال اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ مجھے چپل پہنائے اور واش روم تک لے گئی۔ وعدے کے مطابق وہ دس منٹ بعد ہی آگئی۔ اس نے میرے لیے چائے بنائی۔ توس پر مارجرین لگائی۔ ابلے ہوئے انڈے کو چھیل کر دو حصوں میں تقسیم کیا اور بولی۔ ''شروع ہوجائیں۔ میرے پاس صرف بیس منٹ ہیں پھر مجھے دن والی نرس کو چارج دینا ہے۔''

''تم میرا ساتھ نہیں دوگی۔''

''نہیں۔ میں گھر جا کر ناشتا کرتی ہوں۔''

''تمہیں میرے ساتھ شریک ہونا ہوگا۔ مجھے اکیلے ناشتا کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

میں صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ ساری عمر میں نے اکیلے ہی ناشتا کیا۔ صبح کے وقت بیوی کو بچوں سے ہی اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ مجھ پر توجہ دیتی۔

وہ میرے برابر میں بیٹھ گئی اور ہاتھ سے مجھے ناشتا کرانے لگی۔ میں نے بھی زبردستی ایک سلائس اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے بڑے نازنخروں اور ادائیں دکھانے کے بعد منہ میں رکھ لیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی فلم کا رومانی سین چل رہا ہو۔ وہ بالکل کسی نئی نویلی محبوبہ کی طرح مجھے اپنی اداؤں سے گھائل کر رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اٹھی اور بولی۔ ''چلتی ہوں۔ رات کو ملاقات ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے کہ شام تک مجھے ڈسچارج کر دیا جائے۔''

''ابھی آپ کہیں نہیں جارہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''آپ سرجن شبیر کے مہمان ہیں۔ وہ اتنی جلدی آپ کو ڈسچارج نہیں کریں گے۔''

میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے۔ کچھ دن اور تمہاری قربت میں گزارنے کا موقع مل جائے گا۔

ایک ہی رات میں وہ پوری طرح میرے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ اس وقت میں ''کہتے ہیں عشق جسے خلل ہے دماغ کا'' کی مکمل تفسیر بنا ہوا تھا۔ اس کی من موہنی صورت، دلکش اداؤں اور مسحور کن قربت نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا تھا اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس سے ملنے کی کیا صورت ہوگی۔ میں صبح سے شام تک دفتر میں سر کھپاتا اور وہ نائٹ ڈیوٹی کرتی تھی۔ اس لیے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی یا ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع میسر آتا۔ پھر یہ کہ اس میل جول سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ دونوں ہی شادی شدہ تھے۔ میں تین بچوں کا باپ اور وہ ایک شیر خوار بچی کی ماں تھی اور ہر اعتبار سے یہ تعلق ناجائز تھا۔ اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر کوئی مجھے اس کے ہمراہ دیکھ لیتا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا اور اگر میری بیوی کو اس کی بھنک پڑ جاتی تو وہ مجھے کچا ہی چبا جاتی لیکن اس وقت میری عقل بالکل ماؤف ہوچکی تھی اور میں کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

دوپہر کو فوزیہ کھانا لے کر آگئی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے ناشتے کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اسپتال کی کینٹین سے منگوالیا تھا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔ میں نے اسے منع کر دیا کہ وہ آئندہ کھانا لے کر نہ آئے۔ میں یہیں سے منگوالوں گا۔ ایک دو دن کی بات ہے اس کے بعد تو یہ لوگ مجھے ڈسچارج کر ہی دیں گے۔

اس روز سرجن صاحب نہیں آئے۔ میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے اپنے ڈسچارج ہونے کے بارے میں پوچھا تو وہ انتہائی روکھے انداز میں بولا۔ ''میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو سرجن صاحب ہی بتائیں گے۔''

''اور سرجن صاحب کب آئیں گے؟''

''معلوم نہیں۔ وہ آن کال ہوتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ہی آتے ہیں۔''

''اگر ایک مہینا تک ان کی ضرورت نہ ہوئی تو وہ نہیں آئیں گے اور میں اسی طرح بے یار و مددگار یہاں پڑا

رہوں گا۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ان کے کیسز آتے ہی رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کل ہی آجائیں۔'' پھر وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو پریشانی کیا ہے؟ اسپتال کا بل تو کمپنی ادا کرے گی۔ آپ کو کیا فکر ہے؟''

''مجھے بل کی نہیں اپنے گھر کی فکر ہے۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''گھر میں کوئی دوسرا مرد نہیں ہے اور بچے بہت چھوٹے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک دن اور گزار لیں، کل سرجن صاحب آئیں تو ان سے چھٹی کی بات کرلیں۔''

اب میں پوری بات سمجھ گیا تھا۔ اصولاً تو انہیں پلاسٹر کے بعد ہی ڈسچارج کر دینا چاہیے تھا لیکن پھر بل کیسے بنتا۔ اس لیے انہوں نے علاج کے بہانے مجھے روک رکھا تھا۔ جہاں مجھے دن میں تین مرتبہ دو مختلف رنگوں کی گولیاں دی جاتیں اور بلڈ پریشر چیک کیا جاتا۔ یہ علاج تو گھر پر بھی ہوسکتا تھا۔

شام کو وہ نرس مریم ٹھیک آٹھ بجے آگئی۔ اس نے دروازہ پر ہلکی سی دستک دی اور اندر آگئی۔ اس کے آنے سے پندرہ منٹ پہلے میں اپنی بیوی کو گھر بھیج چکا تھا حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن شاید میرے دل میں چور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہو کیونکہ مریم بہت خوبصورت تھی اور اگر وہ میری بیوی کے سامنے ایسی ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی جو وہ گزشتہ شب کر رہی تھی تو فوزیہ یقیناً شک میں مبتلا ہوجاتی۔

مریم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''میں راؤنڈ پر جارہی ہوں۔ آپ کے پاس سب سے آخر میں آؤں گی تاکہ زیادہ دیر تک بیٹھ سکوں۔''

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میں تو شام سے ہی اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس نے راؤنڈ پر جانے کا بہانہ کر کے مجھے مزید انتظار میں مبتلا کر دیا۔ شاید اس طرح وہ میرے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ تھا اور وہ مجھے انتظار کی لذت سے آشنا کر کے اپنے دام کھرے کرنا چاہ رہی تھی۔

ایک گھنٹا بھی کسی نہ کسی طرح گزر گیا۔ وہ لچکتی مٹکتی آئی۔ اس کے ہمراہ ڈاکٹر بھی تھا۔ میں کوئی بیمار تو تھا نہیں جو اسے کوئی تشویش ہوتی۔ اس نے رسماً میرا حال پوچھا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مریم نے دروازہ بند کیا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج انجکشن نہیں لگے گا۔ صرف بلڈ پریشر چیک کروں گی۔ آپ نے دوا کھالی؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی نہیں کھائی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ میرا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے بولی۔ ''جب تک سرجن صاحب آپ کو نہ دیکھ لیں۔''

میں ان خوشگوار لمحات کو بحث میں ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش ہوگیا۔ وہ اپنا سامان سمیٹتے ہوئے بولی۔

''اب میں جاؤں؟''

''اتنی جلدی!'' میں نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔''

''پھر آؤں گی۔'' اس نے میرے بال سہلاتے ہوئے کہا۔ اس وقت کام کا رش ہے۔ میٹرن بھی راؤنڈ پر ہے۔ اس نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔''

میں نے بادل نخواستہ اسے جانے کی اجازت دی اور خود آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

اب مجھے بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر میرے پاس آتی۔ میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس بری طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی کہ اس کے علاوہ میرا دھیان کسی اور جانب نہیں گیا۔ میں نے اس دوران ایک دفعہ بھی بچوں کو یاد نہیں کیا اور نہ ہی بھائی کا خیال آیا کہ نہ جانے اس کے انٹرویو کا کیا بنا۔ میں نے کئی بار اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسپتال سے جانے کے بعد ویسے ہی اس سے ملنے کا امکان تقریباً ختم ہوجائے گا پھر میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ دل اور دماغ میں ایک کشمکش ہو رہی تھی۔ بالآخر جیت دل کی ہوئی، دماغ ہار گیا۔

وہ گزشتہ شب کی طرح ایک بجے آئی۔ اس بار بھی اس نے اپنے آپ کو ایک نئے سرے سے سنوارا تھا۔ وہی ہلکا ہلکا میک اپ، ہونٹوں پر لگی تازہ تازہ لپ اسٹک، کھلے ہوئے بال اور دوپٹا سر کے بجائے شانوں پر۔ اس نے دروازہ بند کیا اور میرے پاس بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بڑے لاڈ

سے بولی۔ ”سر آپ کا عہدہ کیا ہے؟“
میں اس کی جانب سے کسی رومانی حرکت کی توقع کر رہا تھا۔ اس بے تکے سوال پر چونک گیا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”بس یوں سمجھ لو کہ چھوٹا سا افسر ہوں۔“
وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ چھوٹے افسر ہوتے تو پرائیویٹ روم کبھی نہ ملتا۔“
”تمہیں میرے رینک سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی؟“ میں نے اس نے گال کو ہلکے سے چھوتے ہوئے کہا۔
”اس لیے کہ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“ وہ بڑی ادا سے بولی۔
”کیسا کام؟“
”بات دراصل یہ ہے کہ میرا شوہر ان دنوں بے کار ہے۔ گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آگیا ہے۔ بڑی تنگی ہو رہی ہے۔ اگر آپ اسے اپنے محکمے میں ملازمت دلوا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“
”تمہارا شوہر کام کیا کرتا ہے؟“
”وہ رکشا چلاتا تھا۔ ایکسیڈنٹ ہوگیا تو مالک نے رکشا چھین لیا۔ اب وہ بے روزگار ہے۔ کوشش کے باوجود اب تک اسے کوئی کام نہیں مل سکا۔“
”دیکھو بھئی، ہمارے ادارے میں رکشا ڈرائیور کی تو کوئی آسامی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ کیا کام کرسکتا ہے؟“
”جی اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ میں اسے کل بلا لیتی ہوں۔ آپ خود اس سے بات کرلیں۔“
”ٹھیک ہے۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی درخواست اور دو فوٹو ساتھ لیتا آئے اور اگر اس کے پاس تعلیم یا تجربہ کا کوئی سرٹیفکیٹ ہو تو وہ بھی درخواست کے ساتھ لگا دے۔ دیکھو میں کسی سے بات کرتا ہوں۔“
”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“ وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“
”اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“
اس نے اچانک ہی اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”اوہو! دو بج گئے۔ کہیں بچی نہ اٹھ گئی ہو۔ بہت دیر سے سو رہی ہے۔ اب میں چلتی ہوں، صبح ملاقات ہوگی۔ آپ کے لیے ناشتا لیتی آؤں گی۔“
یہ ملاقات بھی ادھوری رہی بلکہ میری تشنگی کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ مجھے بھی اس آنکھ مچولی میں لطف آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کے شوہر کو ملازمت مل گئی تو میرا راستہ صاف ہو جائے گا اور میں بلا جھجکے اس کے گھر جاسکوں گا۔ اس وقت بھی میری عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ مجھے اس کا موقع ہی کب ملے گا۔

دوسرے روز وہ ٹھیک سات بجے میرے لیے ناشتا لے کر آگئی۔ پہلے روز کی طرح وہ مجھے سہارا دے کر واش روم تک لے گئی۔ میں نے دانت برش کیے، منہ ہاتھ دھویا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس دوران اس نے خوب لگاوٹ کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مجھے ناشتا کروا رہی تھی اور بار بار کوئی ایسی حرکت کرتی جس سے اس کے جسم کا کوئی حصہ مجھ سے مس ہو جاتا۔ وہ اس وقت بالکل ایک روایتی محبوبہ کا کردار ادا کر رہی تھی۔
میں نے اس روز فوزیہ کو اسپتال آنے سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے جب کینٹین والا لڑکا ناشتے کے خالی برتن اور پیسے لینے آیا تو میں نے اس سے دوپہر کا کھانا لانے کے لیے کہہ دیا۔ شام کو سرجن صاحب مجھے دیکھنے آئے تو میں نے ان سے گھر جانے کی بات کہی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے کہ مجھے کم از کم دس روز اسپتال میں رہنا ہوگا۔
”لیکن کیوں؟“ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں میرا کوئی خاص علاج نہیں ہو رہا، یہ گولیاں تو میں گھر میں بھی کھا سکتا ہوں۔“
”گھر اور اسپتال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گھر میں اسپتال جیسی نگہداشت نہیں ہو سکتی، میں آپ کو اس حالت میں ڈسچارج کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“
”میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔“
”ٹھیک ہے۔ اگر آپ بضد ہیں تو شوق سے گھر جائیں۔“ سرجن نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔
”کل صبح آپ کا ایکسرے لیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ گھر جاسکتے ہیں۔ دسویں روز آکر چیک اپ کروالیں۔“
شام کو فوزیہ میرے بھائی کے ساتھ مجھے دیکھنے آئی۔ میں نے اسے اپنے ڈسچارج ہونے کے بارے میں بتایا تو

اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ لوگ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے۔ آٹھ بجے مریم اپنے شوہر کے ساتھ آگئی۔ اس کا نام رب نواز تھا۔ مریم نے اسے میرے پاس بٹھایا اور خود راؤنڈ پر چلی گئی۔ میں اس شخص کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مریم کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مریم سے دگنی عمر کا تھا اوپر سے اس نے بڑا عجیب و غریب حلیہ بنا رکھا تھا۔ میلے کپڑے، مدقوق چہرہ، کھچڑی بال، بڑھا ہوا شیو اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ کثرت تمباکو نوشی سے اس کی انگلیاں زرد ہوگئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی اور نشہ بھی کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر واقعی مجھے مریم پر ترس آنے لگا۔
”درخواست لائے ہو؟“ میں نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
”جی ہاں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے درخواست دیکھی جو اس نے ہاتھ سے لکھنے کے بجائے کہیں سے ٹائپ کروائی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اسے درخواست لکھنا نہیں آتی یا پھر اس کی ہینڈ رائٹنگ خراب ہے۔ درخواست کے ساتھ دو تصویریں تو تھیں لیکن اس کے ہمراہ کوئی سرٹیفکیٹ منسلک نہیں تھا۔ اس کے کوائف پڑھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا اور اس نے رکشا چلانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا تھا۔
میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس نہ کوئی ہنر ہے اور نہ ہی کسی کام کا تجربہ۔ میں تمہیں کہاں لگواؤں؟“
”کہیں بھی لگوا دیں۔ میں ہر طرح کا کام کرنے کو تیار ہوں۔“
”رکشا کے علاوہ کوئی گاڑی چلائی ہے؟“
”جی ہاں۔ کار اور سوزوکی پک اپ چلا سکتا ہوں۔“
”ٹھیک ہے پھر میں تمہارے لیے ڈرائیور کی جگہ دیکھتا ہوں لیکن بہت زیادہ اُمید مت رکھنا کیونکہ ہمارے یہاں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ اسٹاف ہے۔“
”کوئی بات نہیں۔ آپ کوشش کرکے دیکھ لیں۔ قسمت میں ہوگا تو نوکری بھی مل جائے گی۔“
مجھے یوں لگا جیسے اسے ملازمت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور مریم اسے زبردستی میرے پاس لائی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اپنا راؤنڈ مکمل کرکے آگئی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”بات ہوگئی، آپ نے اپنی تسلی کرلی؟“
”ہاں۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔
پھر وہ اپنے شوہر سے بولی۔ ”تم نے صاحب کو سب ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے نا۔ کوئی بات چھپائی تو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ انہیں دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔“
”ہاں، ہاں، بتا دیا ہے سب کچھ۔ کوئی بات نہیں چھپائی۔“ وہ کچھ چڑتے ہوئے بولا۔
”اب میں جاؤں؟“
”ہاں۔“ مریم نے جواب دیا۔
اس کے جانے کے بعد میں نے مریم سے پوچھا۔ ”یہ تم نے کس بانگڑو سے شادی کرلی۔ اس کا اور تمہارا کوئی جوڑ

ارسطو

(ارسطو 384-322 قبل مسیح) تھریس کے ایک شہر استاجرہ میں پیدا ہوا اور کلکس میں فوت ہوا۔ اس کا باپ نکومیکس، اسکندر اعظم کے دادا امنطاس کا جو مقدونیا کی ریاست کا ایک طاقت ور حکمران تھا، دوست اور درباری طبیب تھا۔ ارسطو کی پرورش جب ادویات اور امراض کے تذکروں میں ہوئی تو اس کا رجحان طبع کا علوم طبیعی کی طرف ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ 367 ق م میں اتھنیا میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کے عہد شباب کی کئی ایک کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق اس نے اپنی تمام آبائی جائداد جوانی کی سرمستیوں میں برباد کر ڈالی اور جب قلاش ہو کر بھوکوں مرنے لگا تو فوج میں بھرتی ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر اپنے آبائی شہر استاجرہ میں لوٹ آیا اور طبابت کرنے لگا۔ تیس برس کی عمر میں اسے علم و حکمت سیکھنے کا شوق ہوا اور وہ افلاطون کے حلقہ تلمذ میں شریک ہونے کے لیے ایتھنز چلا گیا۔ اس سے زیادہ مستند روایت کی رو سے اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی تھی۔ اس کے شباب کی سرمستیوں کا اس روایت میں بھی ذکر ملتا ہے، اس نے افلاطون سے ایک روایت کے مطابق آٹھ اور دوسری روایت کی رو سے بیس برس تعلیم حاصل کی۔

مرسلہ: زریا خان، شیخوپورہ

نہیں۔“

”بس جی، یہی لکھا تھا قسمت میں۔“ وہ کچھ اداس ہوتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے ایک دم ہی بات بدل دی اور بولی۔ ”سنا ہے کہ آپ کل گھر جا رہے ہیں؟“

”ہاں۔ تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد تم سے کس طرح رابطہ ہوگا۔ اگر تمہارے شوہر کے کام کے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی تو تمہیں کیسے اطلاع دی جائے گی؟“

”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔“ وہ چہکتے ہوئے بولی۔ ”میں صبح آپ کو اپنے برابر والوں کا نمبر دوں گی۔ وہ مجھے بلا دیں گے اور اگر میں گھر پر نہیں ہوئی تو آپ کا پیغام مجھ تک پہنچ جائے گا۔“

اسے یوں چہکتے دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے جانے کی خبر سن کر اداس ہو جائے گی لیکن میں نے اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نہیں دیکھی بلکہ وہ پہلے دو دنوں کی نسبت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اس کے شوہر کی درخواست لے کر رکھ لی تھی اور اس کے بایوڈیٹا میں کوئی مین میخ نہیں نکالی۔ یہ گویا اس امر کی جانب اشارہ تھا کہ مجھے اس کے شوہر کی مدد کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس روز وہ میرے پاس نہیں بیٹھی اور نہ ہی اس نے پہلے دو دنوں کی طرح میٹھی میٹھی باتیں کیں بلکہ فوراً ہی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ البتہ جاتے وقت اس نے اتنا ضرور کہا۔ ”آج مصروفیت بہت زیادہ ہے اس لیے فی الحال نہیں رک سکتی، البتہ رات کو آؤں گی۔“

میری عادت ہے کہ بہت جلدی بدگمان ہو جاتا ہوں۔ مریم کا بدلا ہوا رویہ دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ وہ صرف اپنے شوہر کی ملازمت کے لیے مجھ سے قربت کا ڈھونگ رچا رہی تھی اور جیسے ہی اسے یہ امید ہوئی کہ اس کا کام ہو جائے گا، اس نے مجھ سے فاصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی طوطا چشم نکلے گی۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ رات کو نہ آئی یا اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی تو میں بھی اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔

میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ وعدے کے مطابق ایک بجے آ گئی۔ اسی طرح بنی سنوری تر و تازہ۔ وہ اپنے معمول کے مطابق میرے پاس بستر پر بیٹھ گئی اور میری نبض دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب تو آپ بالکل نارمل ہیں۔“

”میں بیمار ہی کب ہوا تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ تو اسپتال والوں نے مجھے زبردستی روک رکھا تھا اپنا بل بنانے کے لیے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو ان کا کاروبار کیسے چلے۔“

”آج بھی اگر میں ضد نہ کرتا تو یہ لوگ دس دن سے پہلے مجھے ڈسچارج نہ کرتے۔ خیر اب تو میں کل چلا ہی جاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم سے ملاقات کس طرح ہوگی؟“

”آپ جانتے ہیں کہ ہمارا تعلق اسپتال تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد کون کسی سے ملتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے مریم۔ میں یہاں سے جانے کے بعد بھی تم سے ملتا رہوں گا۔“

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ آہستہ سے بولی۔ ”کیا یہ بہت ضروری ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے گریبان سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر کسی دائی کا نمبر اور نام لکھا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ ”یہ میرے پڑوس کا نمبر ہے۔ آپ مجھے سہ پہر میں فون کریں۔ اس وقت میرا شوہر گھر پر نہیں ہوتا۔“

میں نے خوش ہو کر وہ کارڈ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ”آج میری بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں، صبح آؤں گی۔“

دوسرے دن وہ ناشتا لے کر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا۔ میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال گئی لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مجھ سے اس کا رونا دیکھا نہیں گیا۔ میں نے داہنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور بولا۔ ”سچ سچ بتاؤ کیوں رو رہی ہو؟ کیا پریشانی ہے؟“

”کچھ نہیں۔ آپ ناشتا کریں۔ یہ تو روز کا رونا ہے۔“

میں نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں بھی ناشتا نہیں کروں گا۔“

میرے بے حد اصرار پر اس نے بتایا کہ گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے اور اس کے پاس بچی کے دودھ کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اور تنخواہ ملنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ اس کی بات سن کر میرا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ میں نے فوراً

اپنے پرس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال تم یہ رکھو، بعد میں ضرورت پڑی تو اور دے دوں گا۔“

”نہیں۔“ وہ انکار کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بخشش نہیں لیتی۔“

”یہ بخشش نہیں، مدد ہے۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو قرض سمجھ کر رکھ لو۔“

”آپ اصرار کر رہے ہیں تو لے لیتی ہوں۔“ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہ مجھ پر قرض ہے، بہت جلد لوٹا دوں گی۔“

اس نے شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”رب نواز کی نوکری ہو جائے تو میری پریشانی کچھ کم ہو سکتی ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔ میں دفتر جاتے ہی پہلا کام یہی کروں گا۔“

ڈاکٹر نے مجھے دس دن آرام کے لیے کہا تھا لیکن مجھ پر رب نواز کی نوکری کی دھن سوار تھی لہٰذا ڈسچارج ہونے کے دوسرے روز ہی دفتر چلا گیا۔ میں نے ایڈمن آفیسر کو رب نواز کی درخواست دی اور تاکید کی کہ یہ کام جلد از جلد ہونا چاہیے۔ اس وقت ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں تھی لیکن انہوں نے تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے رب نواز کو عارضی ملازم کے طور پر رکھ لیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی کوئی جگہ نکلی تو اسے مستقل کر دیا جائے گا۔

میں نے اسی روز شام کو مریم کے دیئے ہوئے نمبر پر فون کیا اور کہا کہ وہ صبح رب نواز کو دفتر بھیج دے تاکہ وہ ایڈمن آفیسر سے اپنا لیٹر وصول کر کے ڈیوٹی جوائن کر لے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے تعلقات سے کام لے کر اس کا لائسنس بنوایا اور اس نے کام شروع کر دیا لیکن چند روز بعد ہی اس کی شکایتیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ عموماً دیر سے کام پر آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا۔ اس کے علاوہ وہ اکثر چھٹی بھی کر لیتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے ایک ماہ بعد ہی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ مجھے مریم کی پریشانی کا اندازہ تھا اس لیے میں نے اسے فون کر کے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس نے مجھے دوسرے دن چار بجے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

میں نے دفتر سے تین بجے چھٹی کی۔ بازار سے پھل، مٹھائی، بسکٹ اور کھانے پینے کا دوسرا سامان خریدا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان تھا جس کے در و دیوار سے غربت ٹپک رہی تھی۔ اس نے گھر کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اس لباس میں وہ پہلے سے زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف دو پرانی کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے لیے چائے بنائی اور میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟ یہ سامان تو میری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہاری قسمت میں یہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں اس لیے تم تک پہنچ گئیں۔“

”پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کسی پر بوجھ بنوں۔“

وہ چائے بنانے کے لیے جھکی تو میری نظر اس کے کندھے پر گئی۔ وہاں سے قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنی نگاہیں وہاں سے ہٹائیں۔ جلدی جلدی چائے ختم کی اور بولا۔ ”چائے پی کر میرے ساتھ بازار چلو۔“

”کیوں؟“

”سوال جواب بعد میں کرنا۔ پہلے میں نے جو کہا ہے وہ کرو۔“

اس نے بچی کو پڑوس میں چھوڑا اور میرے ساتھ چل دی۔ میں نے اسے چار عدد سوٹ، دو جوڑے جوتے، میک اپ کا سامان اور گھر کے استعمال کے لیے تھوڑی سی کراکری دلوائی۔ ہم سامان سے لدے پھندے گھر پہنچے تو اس کا ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے اجازت چاہی تو وہ بولی۔ ”آج میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکی لیکن میرے گھر کے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ آپ جب چاہیں مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں۔“

”تمہارے شوہر کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”وہ کیا کہے گا، بے غیرت۔“

اس کے ان الفاظ سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب میرا راستہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر دوپہر سے رات گئے گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس کا سارا وقت محلے کے اوباش لوگوں کے ساتھ کیرم اور ڈبو کھیلنے میں گزرتا۔ اگر کبھی جیب میں کچھ پیسے ہوتے تو جوئے کی بازی بھی لگا لیتا۔

میرے لیے آئے دن دفتر سے چھٹی کرنا مشکل تھا لہٰذا میں نے اپنا ٹرانسفر ایک ایسے سیکشن میں کروا لیا جہاں آکٹ

ڈور ڈیوٹی تھی۔ اب میں ہر تیسرے چوتھے روز دفتر کے کام کا بہانہ کرکے مریم کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی، چائے پلاتی اور پھر اسے ایک دم ہی کوئی کام یاد آجاتا اور وہ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے نکل جاتی۔

اب اس کا حجاب کھل چکا تھا اور وہ فرمائشیں کرکے اپنی پسند کی چیزیں خرید لیتی۔ ہم کبھی کبھی میٹنی شو دیکھنے چلے جاتے، دوران فلم کوئی رومانی منظر آجاتا تو میں بھی جذبات سے بے قابو ہوکر کوئی گستاخی کر بیٹھتا لیکن اس نے کبھی میری کسی حرکت کا برا نہیں منایا۔

میں دل کھول کر اس پر پیسے لٹا رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرا بجٹ جواب دے گیا اور تنخواہ میں آدھا مہینا پورا کرنا بھی مشکل ہوگیا۔ میرے پاس آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا جس سے فالتو اخراجات پورے ہوتے۔ چنانچہ میں نے اس کے پاس جانا کم کردیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اس پر جو سرمایہ کاری کی ہے وہ بمعہ سود وصول کرکے یہ کھاتہ بند کردوں۔ ویسے بھی اس کے ساتھ گھومنے پھرنے میں خطرہ تھا۔ شہر میں میرے کئی جاننے والے تھے۔ اگر کوئی مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیتا تو بڑی بدنامی ہوتی۔

ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی اور موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ اس وقت وہ نہا کر نکلی تھی اور گیلے بالوں سے پانی ٹپک کر اس کے جسم کو بھگو رہا تھا۔ اس نے سفید لون کا کرتہ اور گلابی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس کا بھیگا بدن دیکھ کر میرے جذبات بے قابو ہوگئے اور جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا اور وہ میرے سینے سے آن لگی۔ اس نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ’’یہ آپ کیا کررہے ہیں؟‘‘

مجھے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں آن گرے گی۔ میں بری طرح گڑبڑا گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

’’میں تو آپ کو شریف انسان سمجھتی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح ایسی گری ہوئی حرکت کرسکتے ہیں۔ میں پہلے دن سے ہی آپ کی چھوٹی موٹی حرکتیں برداشت کررہی تھی کیونکہ اس میں میری غرض شامل تھی۔ مجھے اپنے شوہر کو ملازمت پر رکھوانا تھا۔ اس لیے آپ کی ناز برداری کرتی رہی۔ پھر جب آپ نے مجھے پہلی بار پیسے دیے تو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں قبول کرلیا کیونکہ میں اپنی بچی کو بھوک سے تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی ماں یاد آئی، وہ بھی نرس تھی اور اس نے مجھے ہمیشہ یہی تربیت دی کہ مریضوں اور خاص کر مردوں کا خیال رکھوگی تو وہ ہمیشہ تمہیں بھاری بخشش دیں گے اور اگر وہ تمہیں ساتھ چلنے کے لیے کہیں تو انکار نہ کرنا۔ اس طرح وہ تمہاری ساری ضرورتیں پوری کرتے رہیں گے اور تمہیں کبھی تنگی نہیں ہوگی۔‘‘

’’مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی اور نہ ہی اپنے شوہر سے بے وفائی کرسکتی تھی۔ اس لیے میں نے کبھی کسی مریض کو منہ نہیں لگایا اور نہ ہی اس سے کوئی بخشش لی۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ میرے شوہر کو ملازمت دلائی لیکن وہ بدنصیب اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ پھر جب آپ خبر گیری کرنے سامان سے لدے پھندے میرے گھر آئے اور مجھے ساتھ لے جاکر شاپنگ کروائی تو مجھ پر لالچ غالب آگیا اور میں اپنی ماں کے پڑھائے ہوئے سبق پر عمل کرنے لگی۔ رب نواز نے بھی کبھی نہیں پوچھا کہ گھر میں یہ چیزیں کہاں سے آرہی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر بے غیرتی کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنا ہوا تھا۔ شاید اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں مردوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبیں خالی کرتی رہوں۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’جب آپ مجھے شاپنگ کرواتے تو مجھے بڑی شرم آتی۔ کئی بار سوچا کہ آپ کو منع کردوں لیکن مجبوری میری زبان روک لیتی۔ میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ آپ میری ہمدردی میں یہ سب کچھ کررہے ہیں لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ بھی دوسرے مردوں سے مختلف نہیں۔ آپ کی نیت میں شروع سے ہی فتور تھا۔ آپ نے میرے التفات کو آوارگی سمجھا اور خراج وصول کرنے آگئے۔ کاش آپ سمجھ سکتے کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ میں نے کبھی پیسوں کی خاطر اپنے جسم کا سودا نہیں کیا۔ خدا گواہ ہے کہ شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ خدا کی قسم۔ میں بری عورت نہیں ہوں صاحب۔ میں بری عورت نہیں ہوں۔‘‘

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ نہیں بلکہ میں برا آدمی ہوں۔

گناہ

محترم عذرا رسول
السلام علیکم
سرگزشت کا مطالعہ میرے لیے ٹانک ہے۔ اس میں لگنے والی ہر تحریر اپنے آپ میں منفرد ہوتی ہے۔ کافی عرصے تک سوچنے کے بعد یہ سچ بیانی لکھی ہے۔ یہ ان کے لیے ہے جو بچوں کی تعداد سے گھبرا کر گناہ کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ یہ بھول رہے ہیں کہ ہمیں ان کاموں سے دور رہنا چاہیے جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔

وردہ خان
(کراچی)





میں اپنی ایک جان پہچان والی خاتون کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔

وہ ڈاکٹر ایک سائیکراٹسٹ تھی۔ میں جس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان کے سر پر کچھ دنوں پہلے چوٹ لگی تھی۔ جس سے ان کی یادداشت پر اثر پڑا تھا۔ کسی نیورو کو دکھانے سے پہلے یہ مناسب سمجھا گیا تھا کہ انہیں کسی سائیکراٹسٹ کے پاس لے جایا جائے۔

میں ڈاکٹر کے ویٹنگ روم میں ان خاتون کو لے کر بیٹھ

گئی۔ اردگرد کی کرسیوں پر اور بھی مریض بیٹھے تھے۔ ایک بات بتا دوں یہ کوئی پاگل خانہ نہ تھا بلکہ ایک کلینک تھا۔ ذہنی مریض آتے، مشورے لیتے اور چلے جاتے اسی لیے یہاں کا ماحول بہت پُرسکون تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں کوئی شور نہیں۔ ایک غنودگی کی سی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ اعصاب کو پُرسکون کرنے کے لیے ہلکی ہلکی موسیقی بھی ہوا کرتی۔

اسی ماحول میں میری ملاقات صباحت سے ہوئی۔ ایک دلکش عورت۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس پینتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ چہرے کے نقوش بہت پیارے تھے۔

قد بھی بہت مناسب تھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد بھی آیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ پرویز نام تھا اس کا۔ ایک مہذب انسان جو خود بھی چالیس پینتالیس سے زیادہ نہیں ہوگا۔

دونوں کی ڈریسنگ بہت معقول تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ دونوں کسی اچھے بیک گراؤنڈ کے ہیں۔ پرویز دھیمے لہجے میں اس سے کچھ کہہ رہا تھا جبکہ صباحت کبھی مسکرا دیتی تھی اور کبھی کسی خیال میں گم ہو جاتی۔ نہ جانے کیا پرابلم تھی۔ (یہ کہانی بعد میں مجھ پر واضح ہوئی تھی)

میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس عورت سے تعارف حاصل کروں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ میں ایک کہانی کار ہوں۔ اس قسم کے کردار مجھے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ یوں ہی نہیں آئی ہوگی۔ اس کے ساتھ کوئی کہانی ضرور ہو گی۔

کچھ دیر بعد صباحت نے پرویز سے کہا کہ اسے پیاس لگی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس اس وقت منرل واٹر کی بوتل موجود تھی جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہوں۔ یہ اچھا چانس تھا۔ میں نے فوراً صباحت کو پیشکش کر دی۔ صباحت نے اجازت طلب نگاہوں سے پرویز کی طرف دیکھا۔ پرویز نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں۔ جب یہ پانی دے رہی ہیں تو لے لو۔“

صباحت نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد پانی کی بوتل لے لی۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ ”میرا نام وردہ ہے۔ میں آنٹی کو لے کر آئی ہوں۔“ میں نے ان خاتون کی طرف اشارہ کیا جو میرے ساتھ تھیں۔

”کیا ہوا ہے ان کو؟“ پرویز نے پوچھا۔

”کچھ دنوں پہلے ان کے سر پر چوٹ لگی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”ان کی یادداشت غائب ہو گئی ہے۔“

”اوہ“ پرویز نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ ایک المیہ ہوتا ہے کہ انسان اپنوں کے درمیان ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔“

”اگر برا نہ مانیں تو کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کیوں آئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میری بیگم ہیں۔“ پرویز نے بتایا۔ ”میں ان کو لے کر آیا ہوں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ یہ گناہ گار ہیں۔ کیا گناہ کیا ہے یہ نہیں بتاتیں۔ ہر وقت ڈپریشن میں رہتی ہیں۔ روتی رہتی ہیں۔ ہم نے اپنے طور پر یہ وہم دور کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن کچھ نہیں ہوا تو مجبور ہو کر یہاں لائے۔“

اس دوران صباحت بالکل لاتعلق سی بیٹھی رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

مجھے اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ بے چارہ اپنی بیوی کی طرف سے کتنا پریشان تھا۔ کچھ دیر بعد پرویز کسی کام سے اٹھ کر کلینک سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں صباحت کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ ”آج تو گرمی بھی بہت زیادہ ہے۔“

صباحت نے میری طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

”ہاں۔ گرمی تو ہے۔ اسی لیے مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”میں یہاں ان کو دکھانے آئی ہوں۔“ میں نے آنٹی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا یہ آپ کی کوئی رشتے دار ہیں؟“ صباحت نے پوچھا۔

”نہیں ویسے تو ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”جان پہچان ہے اور ڈاکٹر صاحب سے میری جان پہچان ہے اسی لیے یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔“

”چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔“ صباحت نے کہا۔ ”یہ جو میرے شوہر ہیں نا انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ میں بہت چپ چپ رہنے لگی ہوں۔ اسی لیے مجھے یہاں لے لائے ہیں۔“

میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس نے صباحت بتایا پھر میں نے اپنا نام بتایا۔ اس کے شوہر کا نام دریافت کیا۔

اس دوران پرویز بھی واپس آ گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھ کر کہ میں صباحت سے گھل مل کر باتیں کر رہی ہوں اور صباحت بھی مجھ سے باتوں میں لگی ہوئی ہے۔ بہت خوش ہوا۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا۔ ”بہن آپ کا بہت بہت شکریہ۔ بہت دنوں کے بعد صباحت کو کسی سے باتیں کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں ورنہ اس نے تو چپ ہی سادھ رکھی تھی۔ اگر زحمت نہ ہو تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ ہمارے یہاں آ جایا کریں۔“

مجھے تو خود صباحت سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ اس کی جو صورت حال تھی اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے یقیناً اپنے سینے میں کوئی بھید چھپا رکھا تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ صباحت نے کہا۔ ”ہاں۔ بہن آ جایا کریں۔ میرا دل بہل جائے گا۔“

اس کے شوہر پرویز نے فوری طور پر اپنے گھر کا نمبر اور ایڈریس لکھ کر دے دیا۔ بہت آسان پتا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں ان کے گھر آؤں گی۔ کچھ دیر بعد ہمارا نمبر آ گیا۔ میں آنٹی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

دو دن گزر گئے۔ فون کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ایک دن میں نے صباحت کو فون کر ہی لیا۔ میری آواز سن کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ ”ارے میں تو سمجھی تھی کہ تم بھول گئی ہو۔“ اس نے بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کہا۔

میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا تھا۔ ”جب تم سے وعدہ کر لیا تھا تو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔“

”تو پھر کب آ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”اگر تم کہو تو میں ابھی پہنچ جاؤں؟“

”ارے نیکی اور پوچھ پوچھ۔ آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

وہ بالکل نارمل ہو کر باتیں کر رہی تھی۔ کہیں بھی ایسا احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ شدید قسم کی ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد اس کے گھر پہنچ گئی۔ ایک منزلہ کاٹیج نما گھر تھا، خوبصورت سا۔ آگے ایک لان تھا۔ جس میں بہت سلیقے سے پھول لگائے گئے تھے۔ صباحت مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”وردہ۔“ اس نے کہا۔ ”نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ پہلی ہی نظر میں اچھے لگنے لگتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان سے دوستی کی جائے۔ تم کو دیکھ کر بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔“

اس وقت ہم لان ہی میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ ”بہت خوبصورت پھول ہیں۔“ میں نے تعریف کی۔

”ہاں۔ یہ میرا شوق ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”چلو اندر چلتے ہیں۔“

وہ مجھے گھر کے اندر لے آئی۔ اس وقت ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو کچھ دنوں پہلے بالکل خاموش سی بیٹھی تھی۔ ڈرائنگ روم بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔

ایک ملازمہ دکھائی دی جس کو اس نے چائے کے لیے کہہ دیا۔ ملازمہ کچن میں چلی گئی۔

اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ان آنٹی کا کیا حال ہے جن کو تم لے کر گئی تھیں؟“

”ابھی تو پہلا سیشن ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”کئی بار جانا ہوگا یہ ایک پرانا کیس ہے۔ اتنی جلدی حل نہیں ہوگا۔“

”ویسے تمہارا مشغلہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

جب میں نے بتایا کہ میں کہانیاں لکھتی ہوں اور کالم بھی لکھتی ہوں تو وہ بہت پُرجوش سی ہو گئی۔

اس دوران ایک بچہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر سات یا چھ برس کی ہوگی۔ بہت پیارا سا تھا لیکن دیکھنے ہی میں ابنارمل لگ رہا تھا۔ اس نے صباحت کا دامن تھام کر کچھ کہنا شروع کیا۔ وہ جو بھی کہہ رہا تھا وہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صباحت نے ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ چائے کی ٹرے لے کر آ ہی رہی تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ صباحت نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سفیان کو اندر کمرے میں لے جاؤ اور تم بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔“

ملازمہ اس ضد کرتے بچے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اس وقت صباحت کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے۔ میں نے اس بچے کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے خود ہی بتا دیا۔

”سفیان میرا بیٹا ہے۔ پہلی اولاد۔“

”اوہ“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”شاید یہ۔“ مجھ سے کچھ اور نہیں کہا گیا۔

”ہاں۔ یہ ابنارمل ہے۔“ اس نے بتایا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بے پناہ دکھ تھا اور یہ ظاہر تھا کہ جس کی پہلی اولاد ایسی ہو۔ اس ماں کا ایسا ہی حال ہونا چاہیے۔ وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے اس کے بچے کے بارے میں معلومات حاصل کرتی۔ اسی لیے چائے پی کر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے واپس آ گئی لیکن خلش رہی تھی۔ شاید یہی وجہ صباحت کے ڈپریشن کی ہو سکتی تھی۔

دو تین دنوں کے بعد صباحت کا فون آ گیا۔ وہ مجھے بلا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وردہ، کیا تم میرے پاس آ سکتی ہو؟ مجھے تم سے ایک کام ہے۔“

حالانکہ اس دن مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا اس کے باوجود میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھ سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں خود بھی اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”بتاؤ۔ کیا ہوا؟“ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ ”اس طرح کیوں رو رہی ہو؟“

"وردہ، میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے کہا۔" ورنہ پاگل ہو جاؤں گی۔ مر جاؤں گی میں۔ کوئی تو ہو جس کو میں اپنی کہانی سنا سکوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ میں سب سن لوں گی۔" میں نے کہا۔ "پہلے تم خود کو سنبھال لو۔ اس طرح رونے سے کیا مسئلہ حل ہو جائے گا؟"

"یہ اطمینان تو ہوگا نا کہ میں نے کسی کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کیا تھا۔"

مجھے اس وقت اس کے شوہر کی وہ بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ صباحت خود کو گناہ گار سمجھتی ہے اور کیا گناہ ہے۔ اس کا راز ابھی تک کسی کو نہیں معلوم تھا اور اب وہ میرے سامنے اپنے گناہ کے بارے میں بتانے جا رہی تھی۔

"اچھا چلو بتاؤ۔ کیا گناہ کیا ہے تم نے؟" میں نے پوچھا۔" ویسے یہ بتا دوں کہ گناہ چاہے جیسا بھی ہو۔ اگر سچے دل سے توبہ کر لی جائے تو خدا معاف کر دیتا ہے۔"

"لیکن یہ ایسا گناہ ہے جسے شاید کوئی بھی معاف نہ کرے۔ نہ تو خدا اور نہ ہی میرا بچہ۔"

"تمہارا بچہ؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں سمجھی۔ تم نے اس معصوم کے ساتھ کون سا گناہ کر دیا ہے؟"

"تم اس کی حالت دیکھ رہی ہو؟"

"ظاہر ہے۔ اس کی یہ حالت تو سامنے ہے" میں نے کہا۔" لیکن یہ تو خدا کی مرضی ہے۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ سوچتی رہی ' پھر اس نے اپنے سر کو اس طرح جھٹکا دیا جیسے کوئی فیصلہ کر رہی ہو پھر آہستہ سے بولی۔" وردہ، سفیان کی یہ حالت میری وجہ سے ہے۔ میں نے ہی اسے اس حال کو پہنچایا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ تم کیسے اس بچے کو ایسا کر سکتی ہو؟"

"ہاں وردہ۔ میں نے ہی کیا ہے۔ اور یہی وہ گناہ ہے جس کا احساس مجھے پریشان رکھتا ہے۔ میں نفسیاتی مریض بن گئی ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ یہ میں نے ڈاکٹر کو بھی نہیں بتایا لیکن کب تک۔ کب تک اس بوجھ کو اپنے سینے پر رکھوں۔ اسی لیے تمہیں بتا رہی ہوں۔ کاش تم ہی کوئی ایسا طریقہ بتا سکو کہ میں اس عظیم گناہ کے احساس سے چھٹکارا پا سکوں۔"

☆......☆

پرویز سے شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے شاید کوئی گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

میں نے پرویز کی ظاہری حالت اور رہن سہن دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ شاید وہ کوئی دولت مند انسان ہے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ پرویز سے میری ملاقات ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ پہلی نگاہ میں مجھے اچھا لگا تھا۔ وہ ایک ہینڈسم انسان ہے۔ لباس کے معاملے میں بھی اس کا ذوق بہت بلند ہے۔ اس تقریب میں اس نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے سرخ و سفید رنگ پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ اچھا لگا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ کسی بڑی فرم میں کسی اچھے عہدے پر ہے۔

اتفاق سے ان دنوں میرے گھر میں میری شادی کے حوالے سے ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میرے لیے رشتہ تلاش کیا جا رہا تھا۔

اس موقع پر پرویز جیسے آدمی کا دکھائی دے جانا ایک اچھا شگون تھا پھر یہ ہوا کہ پرویز بھی میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اور تقریب کے خاتمے تک ہمارے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی تھی۔

اس کے بعد ہم ملتے رہے۔ وہ جب بھی ملتا۔ اس کے جسم پر اچھا سا سوٹ ہوتا۔ وہ دیکھنے ہی سے پیسے والا معلوم ہوتا تھا اور آج بھی ویسا ہی ہے۔ بہر حال اس نے ہمارے گھر رشتہ بھیج دیا اور پرویز سے میری شادی ہو گئی۔ میں اس کہانی کے بہت سے واقعات سے گریز کرتی جا رہی ہوں۔ جیسے شادی کے بہت دنوں تک ہماری خوشیاں۔ ہمارا ہنی مون۔ ہماری خوشیوں بھری زندگی وغیرہ۔

صباحت خاموش ہو گئی۔ اس کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی کہانی کے تانے بانے بننے میں ذہنی طور پر مصروف ہو۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور دھیرے سے بولی۔" بہر حال کچھ دنوں کے بعد یہ خمار اتر گیا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

مطلب یہ کہ مجھے پتا چل گیا کہ صرف دکھاوا ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ زندگی ڈھنگ سے گزار سکے۔ ایک بڑی فرم میں کام تو کرتا ہے لیکن وہاں اس کی پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر اسے دولت مند کہا جا سکے۔ میں نے جب اس سے بات کی تو اس نے کہا۔" صباحت۔ میں نے تم سے کبھی نہیں کہا ہوگا کہ میں کوئی لکھ پتی انسان ہوں یا میں اس فرم کا جنرل منیجر ہوں۔ رہا میری ظاہری شخصیت۔ تو یہ کسی کو دھوکا دینے کے لیے تو نہیں ہے نا اور اب تم میری بیوی

ہو۔ تمہیں یہ تو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرے پاس صرف تین سوٹ ہیں لیکن میں بہت طریقے اور قرینے سے استعمال کرتا ہوں۔ تم نے میری احتیاط دیکھ لی ہوگی۔ تم یقین کرو۔ میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے اور نہ زندگی بھر دے سکتا ہوں۔ ہاں میں اپنے اور تمہارے مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دعا کرو سب ٹھیک ہو جائے۔"

اس کے بعد میں نے کچھ نہیں کہا لیکن میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ خواب چکنا چور ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ اسی عالم میں پتا چلا کہ میں پریگننٹ ہو چکی ہوں۔ میرے وجود میں ایک اور وجود پرورش پا رہا ہے۔ ان حالات میں مجھے بچہ نہیں چاہیے تھا۔ کیا کرتی ایسے بچے کو جو ناداری کے ماحول میں جنم لے۔ میرے برعکس پرویز بہت خوش تھا۔ بہت خوش۔ اس کی خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے بھی خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن میرا تو دل ہی بجھا ہوا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"پرویز۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اس سلسلے کو کچھ برسوں کے بعد کیا جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر ہماری اولاد کچھ برسوں کے بعد ہو تو کیا حرج ہے؟" میں نے اپنے دل کی بات کر دی۔

"نہیں صباحت۔ ناشکری مت کرو۔ خدا ہمیں اولاد سے نوازنا چاہتا ہے تو اسے قبول کر لو۔ اسی میں بھلائی ہے۔ ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اولاد کو ترس رہے ہوں گے اور ہمیں تو ایک سال بعد ہی خوش خبری سننے کو مل رہی ہے۔ یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تم نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ پیدا ہونے والا ہر بچہ اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا استقبال کرو۔ خوش رہو۔ خدا نے چاہا تو اس کے آنے کے بعد ہمارے حالات اور بہتر ہو جائیں گے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا شوہر ایک سلجھا ہوا انسان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔" اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ بس ایک میں ہی ہوں جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اور اب روتی رہتی ہوں۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ تم خود اپنے بچے کی گناہ گار کس طرح ہو؟" میں نے پوچھا۔

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے کسی بچے وغیرہ کی خواہش نہیں تھی بلکہ یہ خبر سن کر میری جان نکل گئی تھی۔ میں یہ چاہتی تھی کہ بچہ نہ ہو۔ میں اس آنے والے کا استقبال کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تم یہ کہو کہ میں کیسی عورت تھی جس کو بچے کی خواہش نہیں تھی کیوں کہ کسی اولاد کا ہونا کسی بھی عورت کی تکمیل ہوا کرتا ہے لیکن کچھ بدقسمت میری طرح بھی ہوتی ہیں۔ اسی دوران میری ایک جاننے والی میرے پاس آ گئی۔ وہ بہت دنوں بعد ملنے آئی تھی۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ اس کے دو بچے ضائع ہو چکے تھے۔ جبکہ ان سے پہلے کے چار بچے زندہ تھے۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے۔ چونکہ بہت دنوں کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اسی لیے میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"شاہدہ۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری دوسری اولاد بھی ضائع ہو گئی۔"

"ہاں یار۔ دوسری بھی گئی۔"

"یہ تو بہت دکھ کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے چھوڑ۔ کس بات کا دکھ۔" اس نے کہا۔" تو چونکہ میری پرانی دوست ہے اسی لیے تجھے یہ راز بتا رہی ہوں

حضرت بابا فرید کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر، فرید الدین مسعود، شکر گنج، گنج شکر اور صرف فرید..... گنج شکر اور شکر گنج کے معانی ایک ہیں۔ اوّل الذکر لقب کا مطلب ہے شکر کا خزانہ اور موخر الذکر کو مختصر کر کے اردو کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ان القابات کے علاوہ آپ کو شیخ العالم اور قطب اکبر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ 14 اپریل 1179ء کو کھوتوال (یا کوٹھوال) میں پیدا ہوئے جو ملتان کے نزدیک 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک غیر معروف سا گاؤں یا قصبہ تھا اور 17 اکتوبر 1265ء کو 86 برس کی عمر میں پاک پتن میں وفات پائی۔ والد کا نام جمال الدین سلیمان تھا اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی مریم بی بی تھا (بعض تذکروں میں قرسوم بی بی بھی لکھا ہوا ہے) جو شیخ وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی تھیں۔ ابتدائی تعلیم ملتان میں پائی جو اس زمانے میں اس علاقے میں علوم متداولہ کا مرکز تھا۔ وہیں ان کی ملاقات حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی انہوں نے آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا:" اس بچے کا ستارہ اوج پر ہے اور مستقبل میں اللہ کریم اس سے دین اسلام کی تبلیغ و توسیع کا کام لے گا۔"

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی

کہ میں نے جان بوجھ کر دونوں کو ضائع کروایا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تو اور کیا کرتی۔ چار چار پہلے والے نہیں سنبھل رہے تھے۔ اب یہ دو اور آجاتے۔ میری طرف دیکھ۔ میں کیسی سلم ہوا کرتی تھی۔ ان کم بختوں نے پیدا ہو کر میرا سارا حسن بگاڑ کر رکھ دیا۔ ایک تو یہ وجہ تھی۔ دوسری وجہ غربت تھی۔ تجھ کو کیا بتاؤں۔ میرے شوہر کی انکم اتنی نہیں ہے کہ وہ اتنے بچوں کی پرورش کر سکیں اسی لیے میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ میں ابارشن کرا دوں گی۔"

"اور تمہارے شوہر؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ان کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ کیوں کہ وہ وہی پرانے نظریات پر قائم ہیں کہ بچہ اپنی قسمت لے کر آتا ہے۔ اس قسم کے خیالات۔ حالانکہ محنت کرتے کرتے ان کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کا وہی فلسفہ تھا۔"

"تو پھر تو نے کیا کیا؟" میں اس کی کہانی میں دلچسپی لے رہی تھی کیوں کہ اس نے وہی ذکر چھیڑ دیا تھا جس کے لیے میں پریشان ہو رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس نے انتہائی گرم دوائیں استعمال کیں۔ اس نے اپنے شوہر کو بے خبر رکھا تھا ورنہ وہ ایک آفت کھڑی کر دیتا اور ان دواؤں کا اثر یہ ہوا کہ اس کا بچہ ضائع ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر بہت اداس تھا۔ جبکہ وہ خود مطمئن تھی۔ کیوں کہ جو کچھ ہوا اس کی مرضی سے ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس بار شوہر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اب اولاد کا رسک نہ لیا جائے ورنہ اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب وہی چار بچے ہیں۔ جن کی پرورش ہو رہی ہے۔

"یار یہ بتا کہ تو نے کیا دوائیں استعمال کی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں۔ تجھے کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یار اصل بات یہ ہے کہ میں بھی چھٹکارا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہے؟ یہ تیری پہلی اولاد ہو گی۔ اس کو دنیا میں آنے دے۔ اس کے بعد دیکھ لینا۔"

"نہیں یار۔ مجھے ابھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔

وہ تو نہیں مان رہی تھی لیکن میں نے اسے قائل کر ہی لیا۔ اس نے چند گرم دوائیں بتا دیں۔ ان میں دیسی ٹوٹکے تھے اور اس کے بعد میں نے وہ دوائیں استعمال کرنی شروع کر دیں۔ میں نے پرویز کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کیوں کہ میں جانتی تھی کہ ایک آفت ہو جائے گی۔ اس نے نہ جانے کیسے کیسے پروگرام بنا رکھے تھے۔ یہ کرنا ہے۔ وہ کرنا ہے۔ وہ بہت زیادہ excited تھا۔

مجھے خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں الٹا ایسا نہ ہو جائے کہ مرا مقصد بھی حل نہ ہو اور صحت بھی برباد ہو جائے۔ آخر ہوا بھی یہی۔ مقصد حل نہیں ہوا۔ سفیان کو اس دنیا میں آنا تھا وہ آ کر رہا۔ لیکن کس حال میں۔ یہ تمہارے سامنے ہے۔ وہ رونے لگی تھی۔ "میں گناہ رہوں اس کی گناہ گار ہوں۔"

"لیکن تم کس طرح گناہ گار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ ان گرم دواؤں نے اس کے ذہن کو متاثر کر دیا۔ برباد کر دیا۔ یہ صرف میرا نہیں بلکہ ڈاکٹرز بھی کا خیال ہے۔ اس بچے کی معذوری کسی غلط چیز کے استعمال کی وجہ سے ہے۔"

"اوہ خدا۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ یعنی تمہارا اپنا تمہاری حرکتوں کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟"

"ہاں، میری وجہ سے۔ میں اس کی مجرم ہوں۔ میں نے ایسا گناہ کیا ہے جس کی جو بھی سزا ہو وہ بہت کم ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو جیتے جی مار دیا ہے۔ ایک اپنی ضد کی وجہ سے۔ میں نے خدا کی بھی نافرمانی کی ہے اور اپنے شوہر کی بھی۔ میں بہت بڑی گناہ گار ہوں۔ بہت ذلیل ہوں۔" وہ رو رہی تھی لیکن اب مجھے اس سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ قاتل تھی۔ اس نے اپنے ہی بیٹے کو جیتے جی مار دیا تھا۔ کیا زندگی تھی بے چارے کی۔ عمر بھر کے لیے معذور ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف ایک خدشے کی وجہ سے کہ نہ جانے اس کی پرورش ہو سکے گی یا نہیں؟

میں اس کے بعد صباحت سے پھر نہیں ملی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس کے فون آتے رہے لیکن میں نے ریسیو نہیں کیا۔

میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہی ہوں کہ خدا کے لیے اگر کوئی ایسا ویسا خیال دل میں آ بھی رہا ہو تو اس کو جھٹک دیں۔ پالنے والا کوئی اور ہے۔ ہم تو صرف ایک ذریعہ بنتے ہیں اور اگر بہت ضروری ہو تو کسی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر یہ سب نا کریں۔ خدا کے لیے ورنہ۔



پسند کی شادی

مکرمی معراج رسول
السلام علیکم
انسان کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات ہوتے ہیں جن کو کہانی کا اندازہ دیا جاسکتا ہے۔ میں نے بھی اپنے رفیقِ خاص پر گزرے واقعات کو ایک دلچسپ کہانی کا رخ دے دیا ہے۔

عاطر شاہین
(ملتان)

دروازے پر دستک ہوئی تو کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ایک فائل کا مطالعہ کرتے چوہدری سرور ایڈووکیٹ نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور بولے۔ "آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور چوہدری سرور ایڈووکیٹ کا منشی غلام محمد اندر داخل ہوا۔ اس نے سلام کرنے کے بعد مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "چوہدری صاحب۔ ایک لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

چوہدری سرور ایڈووکیٹ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کون ہیں اور وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟"

"انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا، صرف آپ سے ملنے کی بات کی ہے۔" منشی غلام محمد نے کہا۔ "مجھے وہ پریمی جوڑا لگتا

ہے، کورٹ میرج کرنا چاہتے ہوں گے۔“

چوہدری سرور نے فائل بند کر کے سائیڈ پر پڑی ٹوکری میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دو۔“

منشی غلام محمد چلا گیا اور پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھے۔ لڑکے کی عمر بائیس سے تیئس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قد اور دبلا پتلا سا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں اور اس نے آسمانی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں ایک بڑا سا سفید رنگ کا رومال تھا جس سے شاید وہ اپنا چہرہ ڈھانپ کر وہاں آیا تھا۔ لڑکی کم عمر تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے کالے رنگ کی بڑی سی ایک چادر سے خود کو سر سے پاؤں تک ڈھانپا ہوا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اپنے چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا مگر اب اس نے نقاب اتار دیا تھا۔ لڑکی کی رنگت سانولی تھی۔ وہ جاذب نظر دکھائی دیتی تھی۔ دونوں ہی وضع قطع سے دیہاتی دکھائی دے رہے تھے۔ منشی غلام محمد ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

”بیٹھو۔“ چوہدری سرور نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر چوہدری سرور ان سے گویا ہوا۔ ”تم دونوں کون ہو اور مجھ سے کس سلسلے میں ملنے آئے ہو؟“

”چوہدری صاحب۔ میرا نام جمال ہے اور یہ رضیہ ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اسی لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہماری کورٹ میرج کرا دیں۔“ لڑکے نے جواب دیتے ہوئے کہا تو چوہدری سرور نے لڑکی کی طرف دیکھا۔

”کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟“

”جی۔“ رضیہ نے مختصراً کہا۔

”تم دونوں کہاں کے رہنے والے ہو۔“

”جی ہم بہاولپور کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”تم دونوں ایک دوسرے کے کیا لگتے ہو؟“

”ہم دونوں ایک دوسرے کے کچھ نہیں لگتے۔“ جمال بولا۔ ”بس ہم ایک ہی گاؤں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

”اگر تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو تم نے رضیہ کو گھر سے بھگانے کی بجائے اپنا رشتہ رضیہ کے گھر کیوں نہیں بھیجا؟“

چوہدری سرور نے کھوجتی نظروں سے جمال کے چہرے پر ابھرے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے رضیہ کے گھر رشتہ بھیجا تھا۔“ جمال نے جواب دیا۔ ”لیکن رضیہ کے گھر والوں نے انکار کر دیا۔“

”رضیہ، تمہارے گھر والوں نے کیوں انکار کیا تھا؟“ چوہدری سرور، رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”دراصل میرا بھائی اس رشتے پر راضی نہیں تھا۔“ رضیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ میرے ماموں کی بیٹی شہناز کو پسند کرتا ہے اور اسی سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر میرے ماموں زاد بشیر نے ایک شرط رکھ دی کہ وہ تبھی میری شادی اس سے کر دی جائے تو وہ شہناز کی شادی اس سے کرنے کے لیے تیار ہے۔ میرا بھائی راضی ہو گیا لیکن میں راضی نہیں ہوئی۔ بشیر کی عمر چالیس سال ہے اور میں اسے پسند بھی نہیں کرتی۔ میرے بھائی اکرم نے بشیر کو ہاں کر دی۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے انکار کر دیا جس پر اکرم نے مجھ پر بے تحاشا تشدد کیا۔ خود کو مار سے بچانے کے لیے میں نے ہاں کر دی اور پھر موقع ملتے ہی میں جمال کے ساتھ گھر سے بھاگ کر ملتان آ گئی۔“

”ہونہہ۔“ چوہدری سرور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کی کورٹ میرج کرا دیتا ہوں لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارا یہ اقدام تم دونوں کو مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے۔“

”ہم ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ جمال نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ”ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہیں تو مرتے دم تک نبھائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ چوہدری سرور نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ”میں نکاح کا بندوبست کرتا ہوں..... اور ہاں، میری فیس دس ہزار ہے میں اس سے کم نہیں لیتا۔“

جمال اور رضیہ نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر انہوں نے ہامی بھر لی۔ چوہدری سرور انہیں انتظار کرنے کا کہتا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

جمال اور رضیہ نے چوہدری سرور ایڈووکیٹ کی وساطت سے کورٹ میرج کر لی تھی اور لاہور چلے گئے تھے۔ رضیہ کے بھائی اکرم نے بہن کو ورغلانے اور بھگانے کے الزام میں تھانے میں پرچہ کرا دیا تھا اور پولیس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی جمال اور رضیہ کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اسے جمال اور رضیہ کی

خفیہ محبت کا پتا نہیں تھا۔ پولیس نے جمال کے والد اور بڑے بھائی کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی اور ہر اس جگہ چھاپہ مارا تھا جن کی جمال کے والد اور بھائی نے نشاندہی کی تھی لیکن پولیس کو ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اکرم تو غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ سارے گاؤں میں اس کی الگ بدنامی ہوئی تھی۔ جس جس کو پتا چلا تھا کہ اس کی بہن رضیہ جمال کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو اس نے اکرم کو طعنے مارے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے ماموں نے بھی اسے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے اکرم نے انتہائی خطرناک فیصلہ کر لیا تھا اور جب اس نے اپنے فیصلے سے گھر والوں کو آگاہ کیا تو سب لرز کر رہ گئے۔

”دیکھ اکرم۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تمہاری بہن ہے۔“ اکرم کو اس کے باپ نے خطرناک فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ابا۔ میں اپنے فیصلے پر عمل کروں گا بس مجھے یہ پتا چل جائے کہ وہ دونوں کہاں چھپے ہوئے ہیں پھر دیکھنا میں ان دونوں کے ساتھ کرتا کیا ہوں۔“ اکرم غضبناک انداز میں بولا۔

”نہ بیٹا ایسا نہ کرنا۔“ اکرم کی ماں بھی لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ”رضیہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔“

”اس نے گاؤں میں مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ اکرم بولا۔ ”سارے گاؤں والے مجھ پر تھوتھو کر رہے ہیں۔“

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ اس کے باپ نے کہا۔ ”جب وہ بشیر سے شادی کے لیے راضی نہیں تھی تو نے کیوں ضد کی۔ بشیر اور رضیہ کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اسے بھی پورا حق ہے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔“

”کتنا فرق ہے ابا۔ یہی کوئی بیس بائیس سال۔“

”تو تمہاری نظر میں یہ تھوڑا فرق ہے؟“ اکرم کی ماں کے لہجے میں طنز تھا۔

”اماں، تم تو چپ ہی رہو۔ یہ سب تمہاری ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ اگر تو اس کے کان نہ بھرتی تو وہ کبھی گھر سے نہ بھاگتی۔“ اکرم نے غصیلے لہجے میں کہا اور پھر وہ کوئی اور بات کیے بغیر گھر سے نکل گیا۔ وہ سیدھا تھانے پہنچا۔

”تھانیدار صاحب۔ ان دونوں کا کچھ پتا چلا؟“

تھانیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں، صرف اتنا پتا چلا ہے کہ دو روز قبل انہوں نے کچہری جا کر کورٹ میرج کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ کہاں گئے ہیں یا کہاں چھپے ہوئے ہیں کچھ پتا نہیں چل رہا مگر ہم جلد ہی انہیں تلاش کر کے عدالت میں پیش کر دیں گے اور عدالت جو فیصلہ کرے گی ہم اسی پر عمل درآمد کریں گے۔“

نئی تحقیق میں خواتین کے لیے انتہائی پریشان کن بات سامنے آئی ہے کہ کاسمیٹکس کا استعمال کینسر سمیت دیگر جلدی امراض کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔ نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن کی تحقیق کے مطابق 2015 سے 2016 تک میک اپ کے سامان پر شکایات کی تعداد دگنی ہوگئی ہے جس میں بالوں کے استعمال کی اشیا کی شکایات سب سے زیادہ نوٹ کی گئی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس نقصان دہ سامان کا استعمال کسی خطرے سے خالی نہیں

اکرم تھانے سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ تھانیدار نے جب اسے یہ بتایا تھا کہ جمال اور رضیہ نے کورٹ میرج کر لی ہے تو غصے سے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں ہلکی سی آواز پڑی تو وہ رک گیا۔ درختوں کے جھنڈ میں کوئی موجود تھا جو ہلکی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اکرم کا تجسس بڑھ گیا اور دبے قدموں سے چلتا ہوا درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر وہ جھاڑیوں میں دبک کر سامنے دیکھنے لگا تو وہاں ایک لڑکا موجود تھا جو سیل فون پر دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اکرم اس لڑکے کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ جمال کا دوست اقبال تھا۔ اکرم اس کی باتیں سننے لگا۔

”میں تمہیں ایک ایک پل کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔ تم پریشان نہ ہو۔“ پھر اس نے دوسری طرف سے کوئی بات سنی اور جواب میں بولا۔ ”خدا حافظ۔“

اکرم کا چہرہ غصے کی شدت سے بگڑ چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اقبال، جمال سے بات کر رہا ہے۔ اقبال سیل فون جیب میں رکھ کر اٹھا ہی تھا کہ اپنے سر پر کھڑے اکرم کو دیکھ کر اس کی رنگت فق ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔

”جمال کہاں چھپا ہے؟“ اکرم نے اسے گردن سے دبوچتے ہوئے کہا تو اقبال کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی اور وہ خرخرانے لگا۔ ”بتاؤ ورنہ گلا دبا دوں گا۔“

''م۔م۔ مجھے نہیں پتا۔'' اقبال خوف سے ہکلایا۔
''جھوٹ مت بولو۔ ابھی میں نے تمہاری بات اپنے کانوں سے سنی ہے۔ بتاتے ہو یا میں تمہارا گلا دبا کر تمہیں موت کے منہ میں پہنچا دوں۔'' اکرم نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اقبال کی گھگھی بندھ گئی اور حلق سے نکلنے والی خرخراہٹیں اور تیز ہو گئیں۔ ''بتاؤ، جمال کہاں چھپا ہے؟ میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔''
دم گھٹنے سے اقبال کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ اگر اکرم نے اس کی گردن نہ چھوڑی تو وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہو جائے گا۔
''بتاؤ۔ کہاں چھپا ہے جمال؟''
''ب۔ ب۔ بتاتا ہوں۔ م۔ م۔ میرا دم گھٹ.....''
اقبال نے رک رک کر بولتے ہوئے کہا تو اکرم نے اس کی گردن پر دباؤ کم کر دیا تو اقبال اسے بتانے لگا۔ ''وہ ملتان میں ہیں۔''
''ملتان میں۔'' اکرم ٹھٹکا۔ ''ملتان میں کہاں موجود ہیں؟''
''یہ اس نے نہیں بتایا۔'' اقبال بولا۔ ''اس نے صرف یہی بتایا ہے کہ وہ کورٹ میرج کرنے کے بعد لاہور چلے گئے تھے لیکن انہیں معلوم ہوا کہ تم نے اس پر رضیہ کو اغوا کرنے کا مقدمہ کروا دیا ہے اسی لیے ضمانت کرانے وہ ملتان آ گئے ہیں۔''
اکرم نے اس سے مزید چند سوالات کیے پھر وہ اسے دھمکی دے کر کہ اگر اس نے جمال کو یہ بتایا کہ اکرم کو ان کی ملتان موجودگی کا علم ہو چکا ہے تو اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا پھر اسے وہیں چھوڑ کر جھاڑیوں سے نکل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی مزید گہری ہو گئی تھی۔

☆......☆

رضیہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جمال کمرے میں ٹہلنے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر تشویش کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ نکاح کرنے کے بعد جمال اور رضیہ لاہور چلے گئے تھے۔ لاہور میں جمال کا ایک دوست رہتا تھا اس نے وہیں قیام کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ لاہور میں کرائے کا مکان لے کر رہائش رکھے گا اور وہیں کسی فیکٹری میں ملازمت کرے گا مگر اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس کے دوست اقبال نے ہی اسے فون کر کے بتا دیا تھا کہ رضیہ کے بھائی اکرم نے اس پر رضیہ کو بہلا پھسلا کر اغوا کرنے کا مقدمہ کرا دیا تھا۔ جمال نے مقدمہ کی بابت چوہدری سردار ایڈووکیٹ کو فون کر دیا تھا۔ چوہدری سردار ایڈووکیٹ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ فوری طور پر ملتان پہنچ کر قبل از گرفتاری ضمانت کروا لیں اور رضیہ اس کے حق میں بیان دے دے گی تو اس پر مقدمہ ختم ہو جائے گا چنانچہ جمال، رضیہ کو لے کر اگلے روز ملتان آ گیا تھا۔ ملتان میں بھی اس کے کئی دوست تھے ان میں سے ایک کو محسن نے...... اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ یہ گھر کافی عرصہ سے خالی پڑا تھا اور کرائے کے لیے خالی تھا۔ چوہدری سردار ایڈووکیٹ نے انہیں اگلے روز اس کے چیمبر میں پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔
''اب کیا ہو گا جمال۔'' رضیہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔
''کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ضمانت کراتے ہی ہم واپس لاہور چلے جائیں گے۔'' جمال نے رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''
جمال نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''میرا بھائی اکرم بہت ظالم اور سفاک انسان ہے۔'' رضیہ نے کہا۔ ''وہ غصے سے پاگل ہو گیا ہو گا۔''
''وہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔'' جمال دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا اور پھر اس نے رضیہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''ہم نے ایک ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہے۔ مریں گے تو اکٹھے اور جئیں گے بھی اکٹھے۔''
اسی لمحے جمال کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے رضیہ کے ہاتھ چھوڑ کر اپنی قمیص کی جیب سے سیل فون نکال کر دیکھا تو اقبال کی کال آ رہی تھی۔
''اقبال فون کر رہا ہے۔'' جمال نے کہا اور پھر فون سننے لگا۔ ''ہیلو۔''
دوسری طرف سے اقبال نے جو کچھ اسے بتایا تو جمال کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پریشانی کا عنصر ابھرا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ رضیہ یک ٹک اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ چند باتیں کرنے کے بعد جمال نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔
''کیا کہہ رہا تھا اقبال؟'' رضیہ نے پوچھا۔
''اکرم نے اس پر تشدد کر کے ہمارے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔'' جمال نے کہا تو رضیہ کے چہرے پر خوف کے

ناثرات ابھر آئے۔
''وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔'' رضیہ بولی۔
''پریشان ہو کر خود کو ہلکان مت کرو رضیہ۔'' اس بار جمال کے لہجے میں غصہ تھا۔ 'اگر تمہیں ڈر تھا تو تم نے مجھے گھر سے بھاگ کر شادی کرنے پر کیوں اکسایا تھا۔''
''ایسا تو نہ کہو۔'' رضیہ تڑپ اٹھی۔ وہ جمال کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔
''تم مجھے حوصلہ دینے کی بجائے بار بار مایوسی کی باتیں کر رہی ہو۔ صرف تمہاری زندگی خطرے میں نہیں، میں بھی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہوں۔'' جمال نے کہا۔ ''میں تمہیں یہی سمجھا رہا ہوں کہ اکرم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم نے قانونی اور شرعی راستہ اختیار کیا ہے، کوئی گناہ نہیں کیا۔''
اتنا کہہ کر جمال نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ رضیہ اٹھ کر اس کے سامنے فرش پر بیٹھی اور اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف موڑتی ہوئی بولی۔ ''اب ناراض تو نہ ہو۔ اچھا اب ایسا نہیں کہوں گی۔''
جمال چند لمحے محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔
''رضیہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم میری بیوی ہو اس لیے تمہاری حفاظت میں اپنی جان سے بھی زیادہ کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
رضیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

اگلے روز جمال اور رضیہ عدالت کا وقت شروع ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہی کچہری پہنچ گئے تھے۔ رضیہ نے خود کو کالے رنگ کی چادر میں چھپایا ہوا تھا جبکہ جمال نے اپنے سر پر رومال لیا ہوا تھا جس سے اس کا پہچانا جانا مشکل تھا۔ چوہدری سرور ایڈووکیٹ تو ابھی تک اپنے چیمبر میں نہیں آئے تھے لیکن ان کا منشی آٹھ بجے ہی آ گیا تھا اور اس نے ان دونوں کو چوہدری سرور ایڈووکیٹ کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک چوہدری سرور ایڈووکیٹ اپنے آفس میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ضروری کاغذات پہلے ہی تیار کر لیے تھے اس لیے جیسے ہی عدالت کا وقت شروع ہوا تو چوہدری سرور فائل لیے اٹھائے گئے۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ انہوں نے جمال اور رضیہ کو بتایا کہ انہوں نے ان کی طرف سے درخواست ضمانت دائر کر دی ہے۔ پھر وہ انہیں لیے عدالت میں پہنچ گئے۔ رضیہ نے عدالت میں اپنے شوہر جمال کے حق میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ جمال اسے گھر سے بھگا کر نہیں لایا بلکہ اس نے اپنی مرضی سے جمال سے شادی کی ہے اس لئے اس کے بھائی اکرم نے جمال پر اسے اغوا کرنے کا جھوٹا مقدمہ کرایا ہے۔
عدالت نے مقدمہ خارج کرتے ہوئے ان کی ضمانت منظور کرتے ہوئے رضیہ کو شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔
جمال اور رضیہ چوہدری سرور ایڈووکیٹ کے ساتھ عدالت سے نکل کر چیمبر کی طرف بڑھ گئے۔ جمال اور رضیہ بے خبر تھے کہ اکرم اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ چوہدری سرور ایڈووکیٹ کے چیمبر سے کچھ فاصلے پر گھات لگائے کھڑا تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہ چیمبر کے قریب پہنچے تو اکرم اور اس کے ساتھیوں نے جمال اور رضیہ پر فائرنگ شروع کر دی۔ اکرم، رضیہ اور چوہدری سرور نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن تینوں ہی گولیوں کی زد میں آ گئے۔ تین گولیاں جمال کو، دو گولیاں رضیہ کو اور ایک گولی چوہدری سرور ایڈووکیٹ کو لگی۔ جمال اور رضیہ تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ چوہدری سرور ایڈووکیٹ زخمی ہو گئے۔ کچہری میں گولیوں کی آوازوں سے بھگدڑ مچ گئی۔ اکرم اور اس کے ساتھیوں نے کچہری سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پولیس نے اکرم اور اس کے دو ساتھیوں کو پکڑ لیا اکرم کے دو ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
جب اکرم اور رضیہ کی لاشیں ان کے گھروں میں پہنچیں تو دونوں گھروں میں کہرام مچ گیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ اگر جمال اور رضیہ نے محبت کی شادی کر ہی لی تھی تو انہیں مارنے کا کیا فائدہ تھا لیکن یہ بات ان لوگوں کو کون سمجھاتا کہ جب جھوٹی انا اور جھوٹا مان آڑے آ جاتا ہے تو انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس پر خون سوار ہو جاتا ہے اور وہ پھر انتہائی اقدام اٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ یہی کچھ اکرم نے کیا تھا۔ جھوٹی آن اور جھوٹی انا کے سامنے وہ بھی ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اس نے انتہائی اقدام اٹھا لیا تھا۔
اکرم اور اس کے دونوں ساتھیوں کو عدالت کی طرف سے عمر قید کی سزا ہوئی جبکہ اس کے دو ساتھی اشتہاری قرار دیے گئے تھے۔ یوں محبت کی داستان پروان چڑھنے سے قبل ہی سسکتی اور تڑپتی ہوئی دم توڑ گئی تھی۔



دیالی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
ایک سچ بیانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی میرے دوست واجد کی ہے۔ وہ اب بھی اس رات کو یاد کرتا ہے تو سہم اٹھتا ہے۔ جذبات کی ایک ہلکی سی لہر نے اسے خطروں کے گرداب میں دھکیل دیا تھا۔ گو کہ یہ سچ بیانی عقل کی کسوٹی پر پرکھی نہیں جاسکے گی پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ یہ سرگزشت کے صفحات پر جگہ بنائے۔ اُمید ہے قارئین اس سچ بیانی کو پسند کریں گے۔
سید سخاوت
(امریکا)

1972ء کا دسمبر آزاد کشمیر میں داخل ہوا اپنے ساتھ وہ سرد برف باری بھی لے آیا تھا۔ عموماً وہاں برف باری مہینے کے آخر میں یا جنوری کے شروع میں ہوتی ہے لیکن اب کی بار شروع میں ہی اوپر پہاڑوں پر برف باری ہو سرد ہوائیں تھیں اور نیچے سرد ہواؤں کے ساتھ بادلوں کے ٹکڑے تھے جس کی وجہ سے پوری وادی دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس موسم کے آتے ہی پورے علاقے میں جیسے زندگی کی رفتار سست پڑ گئی کیونکہ سردی کو وادی نے مقید کر لیا تھا۔

دسمبر اپنا آدھا سفر طے کر کے رینگتا ہوا اپنے انجام کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایک ویگن مسافروں سے بھری مظفر آباد سے راولا کوٹ کی جانب جا رہی تھی۔ تمام مسافر خاموش بیٹھے موسم کے خطرناک تیور دیکھ رہے تھے۔ کوہالہ تک سڑک ٹھیک تھی اور اس سے آگے یہ انتہائی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اسی وجہ سے ہچکولوں کے ساتھ اس کی رفتار انتہائی کم تھی۔ بارش، دھند اور شدید سردی نے سب کو ادھ موا کیا ہوا تھا۔

واجد علی، ڈرائیور کے پیچھے اپنی سیٹ پر سر ٹکائے کھڑکی کے پار بادلوں، دھند، پہاڑوں اور دریائے نیلم کو دیکھتا ہوا اپنے خاندان اور گھر کو یاد کر رہا تھا۔ وہ اس بار پورے چھ ماہ بعد گھر جا رہا تھا، جہاں اس کی ماں، بھائی، بیوی اور چھ سالہ بیٹی اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ یہ تواتر سے اپنی بیوی کو خط لکھتا تھا اور وہ اسے باقاعدگی سے جواب دیتی تھی۔ وہ اس کے خط کو بڑی محبت سے بار بار پڑھتا اور پھر سوچوں میں ڈوب کر مسکراتا، اس نے اپنے آنے کی خبر خط میں لکھ کر بھیج دی تھی مگر اس کا یہ خدشہ بجا تھا کہ اتنے خراب موسم میں خط اس کے گاؤں تک بروقت نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ ہمیشہ سے یہاں ہوتا آیا تھا کہ ادھر موسم خراب ہوا اور ادھر پوری وادی کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

وہ درمیانے قد کا مضبوط اور کڑیل جوان تھا۔ وہ فوج میں سپاہی بھرتی ہوا اور ترقی پاتے پاتے لانس نائیک کے عہدے پر آ پہنچا تھا۔ ان دنوں اس کی پوسٹنگ مظفر آباد آرمی کیمپ میں تھی۔ وہ سال میں دو یا تین بار اپنے گھر چھٹی لے کر جاتا تھا لیکن اس بار گزرے چھ ماہ کا عرصہ اسے بہت طویل لگ رہا تھا۔

انسان جتنے بھی لمبے سفر پر ہو اور اداس بھی ہو یا اسے فرصت ہو تو اس کا دل اڑ کر اپنے گھر کی جانب چلا جاتا ہے اور دل خود بخود انجانی خوشیوں سے گھر جاتا ہے۔ اس کو بھی جب چھٹی ملتی یا وقت ملتا وہ چاہتا کہ آج کے آج اپنے گھر پہنچ کر وہ راحت و اطمینان حاصل کر لے جو اسے کہیں اور نہیں مل سکتا۔ وہ راولا کوٹ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں بنجوسہ کا رہنے والا تھا، وہیں پیدا ہوا، پلا بڑھا ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر راولا کوٹ چلا آیا۔ اسکول کے بعد کالج گیا۔ علاقے کے اور نوجوانوں کی طرح اسے بھی آرمی میں بھرتی ہونے کا شوق تھا۔ سو وہ بھی آرمی میں چلا گیا۔ وہاں کے سخت ترین ایام گزار کر جب وہ چھٹیاں گزارنے گھر آتا تو فوجی زندگی کی سختیاں ہوا ہو جاتیں۔ اس بار بھی وہ خود کو ابھی سے تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

راستے میں بارش تھی، دھند تھی۔ ویگن آہستہ آہستہ خطرناک موڑ کاٹتے چلی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جس رفتار سے ویگن چل رہی ہے یہ عشاء کی نماز تک راولا کوٹ پہنچے گی۔ بنجوسہ گاؤں اوپر پہاڑ کے دامن میں تھا۔ وہاں تک کوئی سواری نہیں جاتی، دن میں ویگنیں درمیان میں واقع بنجوسہ جھیل تک جاتی تھیں جہاں ایک خوب صورت ریسٹ ہاؤس بلند پہاڑوں اور اونچے درختوں کے بیچ واقع تھا۔ جھیل سے گاؤں ایک گھنٹے کی پیدل مسافت پر تھا۔ موسم کی خرابی اور رات کے اندھیرے کی وجہ سے اب صرف جیپ ہی اسے جھیل تک لے جا سکتی تھی اور آگے کا جنگل اسے پیدل عبور کرنا تھا۔ گویا بیوی بیٹی سے آج ملنے کا خواب پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

دسمبر کے مہینے میں پہاڑ سے وہ نیچے گاؤں میں آ جاتے تھے مگر اس بار واجد کو چھٹی دیر سے ملی تھی۔ بھائی نے خط سے بتا دیا تھا کہ وہ انتظار میں ہے تاکہ دونوں مل کر سامان نیچے گاؤں والے گھر میں شفٹ کر سکیں۔ برف باری وقت سے پہلے شروع ہو گئی اور گھر والے ایک طرح سے اوپر پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں کے تمام گھر خالی ہو چکے تھے۔ پہاڑ کے اوپر کی چراگاہیں برف باری سے ڈھک چکی تھیں۔ موسم کی کرختگی بڑھتی جا رہی تھی اور ان کا پہاڑ پر رہنا اب بہت مشکل ہو گیا تھا۔

گاؤں کا گھر ان دنوں خالی پڑا تھا مگر ضرورت کا سارا سامان اس میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جلانے کی لکڑی، رضائیاں، تکیے، چارپائیاں، آٹا اور برتن کے علاوہ دوسرا ضروری سامان اور پانی اس میں موجود تھا۔ گھر کے تمام افراد کے پاس تالے کی چابی ہوتی جو گھر پر لگا تھا۔

واجد کو اپنے گھر سے بہت پیار تھا جو گاؤں سے ذرا دور تھا جنگل کنارے بنا تھا جس میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ گھر کا خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی، وہ جہاں بھی رہتا ہر رات اپنے گھر کو تصور میں ضرور لاتا... کیونکہ گھر یاد آتے ہی اس کے ذہن میں جملہ گونج اٹھتا کہ ہمارے گھر میں کتنا سکون ہے۔ کتنا اطمینان ہے۔

وہ چھوٹا تھا تو ساتھ کے جنگل میں مٹرگشتی کرتا۔ پرندوں کا غلیل سے شکار کرتا، چیڑ اور سفیدے کے درختوں

پر چڑھتا۔ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ کر وہ اردگرد دیکھتا تو دور دور تک کے پھیلے درختوں کی چوٹیوں کے وہ روبرو ہوتا۔ پرندوں کے گھونسلوں میں انڈے گنتا۔ اس طرح اکیلے جنگل میں گھومنے پر ہمیشہ اسے والد مرحوم کی ڈانٹ پڑتی تھی اور تب اس کی ماں اسے اپنی گود میں بھر لیتی۔

اس کا گھر تین سمتوں سے گھنے اور بلند درختوں میں گھرا تھا۔ سفیدے اور چیڑ کے درخت اس کے گھر کے سائبان تھے۔ سردیوں کی برف باری میں وہ سفید لباس اوڑھ لیتے۔ ہوائیں چلتیں تو برف کے گالے فضا میں اڑتے پھرتے اور وہ ان سے اپنی جھولی بھرنے کی کوشش کرتا جو اس کی جھولی میں گرتے ہی پانی پانی ہو جاتے تھے۔

گرمیوں میں جنگل سے معطر ہوائیں اترتیں اور اسے نہال کر دیتیں۔ بہار آتی تو جنگلی پھولوں اور خودرو بوٹیوں کی خوشبو چار سو پھیل جاتی۔ سورج کی کرنیں زمین پر ٹہنیوں اور پتوں کی مختلف شبیہیں بنا کر اترتیں تو وہ ان عکسوں، شبیہوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتا۔ انہیں ڈھونڈتا اور پھر اپنی کاپی پر انہیں اتار دیتا۔ ٹھنڈی اور خنک ہوائیں مست ہو کر اسے ڈھونڈا کرتیں اور وہ ان ہواؤں کو خوب انجوائے کرتا۔ اس کے گاؤں کا گھر واقعی بہت پیارا تھا۔

اوپر پہاڑ والے گھر تک کا راستہ جنگل سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے میں اسے با آسانی طے کر لیتا۔ پہاڑ پر چڑھنا پھر اترنا اسے بہت پسند تھا۔ اس کے لیے ایک کھیل تھا۔ وہ یہ سب سوچ کر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

جمعہ کی نماز پڑھ کر وہ مظفر آباد سے روانہ ہوا تھا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ شام تک اپنے گھر پہنچ جائے مگر بارش، دھند اور آگے محسوس ہوتی برف باری اس کی خواہش کے آگے کھڑی نظر آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ آگے راولا کوٹ سے گاؤں تک کا راستہ ایک دلدل میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔ وہ ایک تربیت یافتہ سپاہی بھی تھا اس لیے چڑھائی طے کرنا کوئی اتنا مشکل نہ تھا۔ وہ اگر آنکھیں بند کر کے بھی ان راستوں پر چلتا چلا جاتا تو بھی گاؤں پہنچ جاتا۔ وہ پہاڑوں کا باسی تھا اور پہاڑوں کا مزاج اس سے زیادہ کون جانتا تھا۔

موسم ابتر سے ابتر ہوتا جا رہا تھا۔ سارے راستے اور مناظر کو بارش نے ڈھانپ دیا تھا۔ پوری وادی دور دور تک دھواں دھواں نظر آ رہی تھی۔ ان کی ویگن دیر کوٹ اور پھر غازی آباد سے نکل کر پانی والا زیارت تک سست رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ عصر کی نماز کے لیے وہ غازی آباد میں رکے تھے۔ شام کے اژدھا نے پورے علاقے کو نگل لیا تھا۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ شام کی نماز ہم زیارت جا کر پڑھیں گے۔ ویگن آرجہ سے ہوتی ہوئی زیارت پانی والا پہنچنے والی تھی۔ وہاں پیر سید جنات شاہ کا مزار تھا۔ پورا علاقہ ان کا عقیدت مند تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آج اسی بہانے مزار پر حاضری بھی دے دے گا۔

وہ پانی والا زیارت میں داخل ہوئے تو شام اتر چکی تھی اور رات کی سیاہی میں بدل گئی تھی۔ پورے علاقے کو بلند و بالا پہاڑوں نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ پانی والا گاؤں کے بازار سے گزرے تو آدھی دکانیں کھلی تھیں مگر لوگ بارش کے باعث بہت کم نظر آ رہے تھے۔ بازار ختم ہونے سے پہلے ویگن ایک چائے خانے کے سامنے رکی۔ ساتھ ہی مسجد تھی۔ مسافروں نے مل کر وہاں شام کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد چائے خانے کے گرم اور دھواں بھرے ماحول میں بیٹھ کر کوئلوں کے اوپر بنی گرم چائے کے پہلے گھونٹ نے اس کی ساری تھکاوٹ اور کسلمندی جذب کر لی۔ دھواں اڑاتی چائے نے اس کے تنے اعصاب ڈھیلے کر دیے۔ اس کے رگ و پے میں ایک سکون دوڑتا چلا گیا۔

چائے ختم کرنے کے بعد..... اٹھا اور فاتحہ پڑھنے زیارت کی جانب چلا۔

بازار کے اختتام پر بائیں طرف کچھ سیڑھیاں زیارت کی جانب اتر رہی تھیں۔ مقبرے کے گرد پختہ صحن تھا اور صحن کے گرد متعدد بلند و بالا درخت جو زیارت کو گھیرے ہوئے تھے۔

بارش تھم چکی تھی اور وہ سیڑھیوں کے اوپر جیکٹ اور گرم ٹوپی اوڑھے کھڑا مقبرے کو عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ مزار کے درختوں کے اوپر پانیوں سے لدے بادل چھائے تھے۔ تیز جھونکوں سے درختوں کی بے برگ ٹہنیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ پانی کے قطرے درختوں کی شاخوں سے ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔ وہ سید جنات شاہ کے مزار کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

وہ قبر مبارک کے سرہانے اکیلا ہاتھ اٹھائے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ دوسرے عقیدت مند نماز پڑھنے کے بعد فاتحہ دے کر چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ مزار پر عقیدت بھرے ماحول میں دعا پڑھتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کو محسوس کیا۔ دعا ختم کرنے کے بعد وہ گھوما تو وہاں چادر سے چہرہ ڈھانپے ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا تھا۔ چادر

سے اس کے سر کے کچھ بے ترتیب سفید بال اور برق گراتی آنکھیں نظر آرہی تھیں جن میں اضطراب اور تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ واجد نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا تو محسوس کیا کہ اگر وہ پتھر کو بھی جما کر اپنی نظروں سے دیکھے تو اسے بھی پاش پاش کردے۔

اس نے گہرے لہجے میں واجد سے اس کا نام پوچھا۔ واجد نے اپنا نام بتایا تو دوبارہ اس نے پوچھا۔ ”کہاں جارہے ہو؟“

ایک اجنبی کی یہ بے تکلفی اسے پسند نہ آئی۔ اسے پہلا خیال یہ آیا کہ یہ کوئی مزار پر بھیک مانگنے والا ہے۔ جواب دینے کی بجائے اس نے جیب سے بٹوہ نکالا اور پانچ روپے نکال کر اس کی جانب بڑھائے اور بولا۔ ”یہ رکھ لو اور میرے لیے دعا کرنا۔“

اس شخص نے نوٹ کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔ ”آگے موسم بہت خراب ہے۔ راستے برف سے ڈھک چکے ہیں۔ رات مزار پر ٹھہر کر صبح چلے جانا۔“

واجد کو اپنے معاملات میں اس کی دخل اندازی پسند نہ آئی مگر اس نے اپنے لہجے میں کرختگی آنے نہ دی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میری فکر نہ کرو۔ میں ان علاقوں میں پل کر جوان ہوا ہوں۔“ پھر اس کے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”میں آرام سے چلا جاؤں گا۔ تم بھی جا کر آرام کرو اور یہ پیسے رکھ لو۔“

اس شخص نے جیسے واجد کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ گمبھیر لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”تو پھر ایسا کر، آس پاس کچھ غریب غربا رہتے ہیں۔ ان کو رات کا کھانا کھلا کر اپنے سر کا صدقہ اتارتے جاؤ۔“

واجد نے یہ سن کر اپنا یقین پختہ کرلیا کہ یہ واقعی کوئی چالباز ہے جو اسے خوف دلا کر کچھ زیادہ رقم بٹورنا چاہتا ہے۔ اسی دوران ویگن کے ڈرائیور نے مسافروں کو بلانے کے لیے ہارن بجائے۔ واجد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کی جانب دیکھے بغیر مزار سے باہر آیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا سڑک پر آکھڑا ہوا۔ ہوا میں تندی در آئی تھی اور مزار کے گرد پھیلے درخت کے پتے بے تحاشا شور کررہے تھے کہ جیسے ماتم کررہے ہوں۔ واجد نے مڑ کر نیچے مزار کی جانب دیکھا تو وہ شخص مزار سے نکل کر اس کی جانب تشویش اور ہمدردی بھری نظروں سے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھے جارہا تھا۔ ہوا سے اس کی چادر پھڑپھڑا رہی تھی۔

ویگن روانہ ہوئی تو راستہ اور زیادہ مشکل ہوگیا۔ ویگن کی لائٹس تھوڑے فاصلے کے بعد معدوم ہوجاتی تھیں۔ اندھیرا نگل جاتا تھا۔ دھند، پہاڑ، بادل اور تاریکی آپس میں مدغم ہوگئے تھے۔ سڑک کی خرابی اور مہیب اندھیرے کے باعث سفر آہستگی سے کٹ رہا تھا۔ انجن کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تھکی تھکی نظروں سے مسافر اردگرد دیکھنے کی کوشش کررہے تھے مگر نظریں کہیں اندھیرے میں کھو جاتی تھیں۔ خاموشی نے سناٹے کی ہیبت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ ایک عجیب سی پُراسراریت فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سب نے موت کی چاپ سن لی ہو۔

ویگن دھیرے دھیرے بڑھتی ہوئی جب راولا کوٹ پہنچی تو رات کے نو بج چکے تھے۔

راولا کوٹ نے بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ شہر نے ویرانی کی گود میں سر ڈال دیا تھا۔ سڑک پر نہ آدم نہ آدم زاد کا پتا تھا ہر جانب برف کی چادر بچھی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں ٹھٹھرا رہی تھیں۔ لوگ گھروں میں محصور ہوکر رہ گئے تھے۔

وہ ویگن سے اترا۔ اپنا بیک پیک پیٹھ پر لٹکایا اور پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ آیا کہ کیوں نہ رات راولا کوٹ میں بسر کروں اور صبح ہوتے ہی بنجوسہ گاؤں کا سفر کروں مگر بیوی اور بیٹی کی محبت نے اسے سفر جاری رکھنے پر مجبور کردیا۔ سفر میں جتنا بھی کوئی گھر کے قریب پہنچتا جاتا ہے، اس کی تھکاوٹ ختم ہوتی جاتی ہے۔ وہ پہاڑ تک تو نہیں مگر بنجوسہ گاؤں تک تو پہنچ سکتا تھا۔ وہاں اس کا گھر تھا اس گھر میں رات بتا کر صبح ایک گھنٹے سے پہلے اپنے پیاروں کے پاس پہنچ سکتا تھا۔

اڈے پر ایک تکہ شاپ کھلی تھی۔ ساتھ والا کھوکھا بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ تکہ شاپ کی جانب چل پڑا۔ برف باری اور پھر بارش نے سڑک پر کیچڑ کی تہہ بچھا رکھی تھی۔ اپنے مضبوط فوجی بوٹوں کی وجہ سے وہ آرام سے چلتا ہوا تکہ شاپ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ تکے والا چادر میں لپٹا اونگھ رہا تھا۔ واجد نے تکوں اور روٹیوں کا آرڈر دیا تو اس میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اس نے فروٹ والے سے کچھ پھل بھی خریدے۔ پھر سوچا جب تک آرڈر تیار ہوتا ہے وہ عشاء کی نماز ادا کرلے۔

وہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو دو مضبوط شاپروں میں آرڈر تیار تھا۔ اور فروٹ کا ایک بڑا شاپر بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے ادائیگی کی اور وہ اس جانب چل پڑا جہاں کچھ جیپیں

کھڑی تھیں۔ آخری ویگن نکل چکی تھی۔ اب صرف جیپ مل سکتی تھی اس کے ذریعہ وہ بنجوسہ جھیل تک جاسکتا تھا۔

ایک جیپ کا ڈرائیور ماجد کی جان پہچان کا تھا۔ واجد نے اس سے ہاتھ ملایا اور مظفر آباد سے اپنے سفر کی داستان مختصر کرکے سنائی کہا کہ وہ اوپر پہاڑ پر اپنے گھر ابھی جانا چاہتا ہے۔ ڈرائیور نے پہاڑ کی بلندی کو نظروں میں جانچا اور پھر اسے برف کی سفید چادر اوڑھے دیکھا تو بولا کہ رات یہیں راولا کوٹ میں رک جاؤ۔ اس وقت اوپر جانا خطرناک ہے۔ واجد اس کی بات سن کر ہنسا اور بولا کہ ایک فوجی کو خطروں سے ڈراتے ہو۔ میں ابھی گھر پہنچنا چاہتا ہوں اگر نہ گیا تو بے چینی بڑھتی جائے گی۔

واجد کا عزم دیکھ کر ڈرائیور خاموش ہورہا۔ ڈرائیور بنجوسہ جھیل تک جانے سے بھی کترا رہا تھا مگر جس طرح ہر پاکستانی اپنی فوج کو احترام دیتا ہے۔ وہ ڈرائیور بھی دیتا تھا اور ساتھ ہی وہ اس کی جان پہچان والا بھی تھا۔ معمولی سی گفتگو کے بعد انہوں نے کرایہ طے کیا۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر آبیٹھا اور ساتھ والی سیٹ واجد نے سنبھال لی۔ اپنا بیگ واجد نے جیپ کے پیچھے رکھا تینوں شاپر اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے جیپ کا ہینڈل مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے زور سے بسم اللہ... پڑھی اور پھر آہستہ آہستہ بنجوسہ گاؤں کے راستے پر چل پڑا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے مگر ایسا لگتا تھا کہ رات آدھی سے زائد گزر چکی ہے۔ آسمان اور زمین دھند اور بادلوں سے ڈھکے تھے۔ برف باری رک چکی تھی مگر فضا میں برف کے ذرات کبھی کبھار تیز ہواؤں کے باعث اڑتے نظر آتے تھے۔

جیپ آہستہ آہستہ چلتی موڑ کاٹتی بنجوسہ گاؤں جانے والی سڑک پر آئی اور پھر برف اور مٹی سے بنے کیچڑ پر اپنا پورا زور لگاتی ہوئی چڑھنے لگی۔ جیپ کی روشنی کی علاوہ چاروں جانب گھپ اندھیرا تھا۔ کشمیر میں ایک خاص قسم کی مٹی پائی جاتی ہے جسے کس مٹی کہتے ہیں۔ یہ مٹی تھوڑی سے بھی بارش پڑے تو کیچڑ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ پہلے بارش اور پھر برف باری نے راستے کو دلدل بنا دیا تھا۔ اردگرد سفیدے اور چیڑ کے درخت تھے جو برف سے ڈھک چکے تھے۔ ڈراؤنے کے چھوٹے درخت بھی تھے جو ہواؤں کی سرسراہٹوں کو مہمیز کررہے تھے۔

جیپ کی آواز کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ایک دل دہلا دینے والا سناٹا تھا۔ شوخ ہوائیں ہر تھوڑی دیر بعد اوپر سے اترتیں اور سیٹیاں بجاتی گزر جاتیں۔ وہ اپنے ہمراہ درختوں کی ٹہنیوں سے اٹکی برف کو بھی اڑاتی پھرتیں۔ جیپ کی لائٹس جہاں جہاں پڑتی وہاں کی برف زیادہ روشن ہوجاتیں۔

ایک جگہ جیپ کیچڑ اور برف میں ایسی دھنسی کہ آگے چلنے سے انکار کردیا۔ انجن کئی بار غرایا مگر جیپ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ یہاں جیپ کا پھنس جانا ان دونوں کی موت کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ رات کے تیسرے پہر درجہ حرارت اور زیادہ گر جاتا ہے اور جیپ ان کے لیے برف خانہ بن سکتی تھی۔

ڈرائیور نے واجد سے کہا۔ ”نیچے اتر کر دھکا لگانا پڑے گا۔“

جب وہ جیپ سے نیچے اترا تو اس کے پاؤں گھٹنوں تک برف میں دھنس گئے۔ یخ بستہ ہوائیں ہڈیوں کا گودا بھی منجمد کررہی تھیں۔ ڈرائیور نے اسپیڈ بڑھائی تو پچھلا بائیں جانب کا ٹائر اس تیزی سے گھوما کہ واجد کے کپڑے کیچڑ اور برف سے لت پت ہوگئے۔ اس نے جیپ کو اپنی پوری طاقت سے دھکا لگایا مگر ٹائر کے نیچے کی طرف اب برف میں تبدیل ہوچکی تھی اور وہ اسی پر گھوم رہا تھا۔ اس نے پھر کدال اور ہاتھوں سے ٹائر کے نیچے سے برف کو نکالنا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں وہ اس کڑاکے کی سردی میں بھی پسینا پسینا ہوگیا۔ اب اس کے دل میں خیال آرہا تھا کہ راولا کوٹ میں رات نہ گزار کر اس نے حماقت کی ہے۔ بنجوسہ جھیل زیادہ دور نہ تھی اور اس لیے وہ ڈرائیور سے یہ بھی نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ واپس راولا کوٹ جانا چاہتا ہے۔ یہ کہنا اس کے لیے ایک ہتک تھی۔ ذرا سی اور محنت سے ٹائر کی گرفت زمین پر ذرا مضبوط ہوئی اور وہ جھٹکے سے غرا کر آگے بڑھی۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کدال کو جیپ کے پیچھے رکھ کر اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔

وہ بنجوسہ جھیل تک پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ وہ جیپ سے اترا تو دیکھا کہ جھیل کے ساتھ ریسٹ ہاؤس مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اردگرد کے بلند پہاڑوں نے جھیل کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ جہاں جیپ رکی وہاں چند دکانیں بند پڑی تھیں۔ کھڑے درخت تیز ہوا سے جھوم رہے تھے اور ان کی برف زمین پر گر رہی تھی۔ تاریکی

نے پورے علاقے کو ڈھانپ دیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ کبھی آباد رہا ہوگا مگر اب بھوتوں کا مسکن ہے۔

ڈرائیور نیچے اترا۔ اردگرد دیکھ کر بولا۔ ”اوپر پہاڑ پر صبح چلے جانا۔ بنجوسہ پہنچنے والے ہیں وہاں اپنے گھر میں رات گزار لینا۔ گاؤں سے آگے چڑھائی پر اس وقت چڑھنا عقل مندی نہ ہوگی۔“ اس نے جیپ کے پچھلے حصے سے ایک مضبوط ڈنڈا نکال کر واجد کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹارچ تو تمہارے پاس ہوگی۔ یہ ڈنڈا بھی رکھ لو۔ اس وقت جنگلی جانور بھی سڑک کے قریب آجاتے ہیں۔“

واجد نے اپنے بیک پیک سے ٹارچ نکالی۔ بیگ کو پیٹھ پر لٹکایا۔ ڈنڈے کے ساتھ تینوں شاپر مضبوطی سے باندھے اور اسے بائیں کندھے پر رکھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ڈھانپ چکا تھا۔ دائیں ہاتھ میں ٹارچ پکڑ لی۔

ڈرائیور نے اسے خدا حافظ کہا اور جیپ موڑ کر واپس چلا گیا۔ واجد اس جیپ کی بیک لائٹس پر نظریں رکھے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ آگے موڑ مڑ کر گم ہوگئی تو اس نے مڑ کر ریسٹ ہاؤس کی جانب دیکھا اور تادیر اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس اندھیرے میں انجان مخلوق کا مسکن معلوم ہو رہا تھا.... سنسناتی ہوائیں اس سے ٹکرا رہی تھیں۔ اگر اسے تھوڑی سی بھی یہ اُمید ہوتی کہ ریسٹ ہاؤس میں کوئی چوکیدار ہوگا تو وہ اوپر گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر کے رات وہیں ٹھہر جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ سردیوں میں اس کا سارا عملہ اور چوکیدار نیچے راولاکوٹ چلے جاتے ہیں۔

اس نے اللہ کا نام لیا اور ٹارچ کی روشنی سامنے ڈالی اور قدم بڑھا دیے۔ سامنے جھیل کے بند کا پل تھا۔ وہ بھی برف سے ڈھکا تھا۔ اس نے لکڑی کا وہ پل پار کیا اور بنجوسہ گاؤں والے راستے پر نپے تلے قدم سے چل پڑا۔

اس کے قدم برف میں دھنستے تھے۔ بیگ اور شاپرز کے وزن سے برف میں چلتے ہوئے چڑھائی چڑھنا دشوار تھا پھر اردگرد کے ماحول نے اپنی ایک دہشت بھی قائم کر دی تھی۔ دلیر سے دلیر انسان بھی رات کے اس پہر بدن کو کاٹتی سردی اور مہیب اندھیرے میں اپنی ہمت ہار دیتا ہے۔ ایک جگہ وہ لڑکھڑا کر ڈگمگایا اور ٹارچ برف پر گر گئی۔ اسی لمحے ہواؤں نے رفتار پکڑی اور برف اڑائیں، سنسناتی ہوائیں اس کے آس پاس سے گزریں تو وہ پہلی بار سہم گیا۔

اس نے اپنے آپ کو کوسا کہ کیوں اس موسم میں یہ خطرہ مول لے بیٹھا ہے۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ گاؤں کی جانب بنا رکے بڑھتا جائے۔ واپسی کے راستے بند ہو چکے تھے۔

وہ قدم قدم چلتا رہا۔ وہ پورا کا پورا برف سے ڈھک چکا تھا۔ اس نے ٹارچ کو دوسرے ہاتھ کی بغل میں دبایا اور لباس پر سے برف ہٹانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں ڈنڈے سے بندھے شاپروں کا بوجھ اب اس کے لیے اذیت ناک ہو چکا تھا۔ اس نے مڑ کر جنگل کی جانب دیکھا تو درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے زور سے لرز رہی تھیں۔ بلند درختوں کی جگہ اسے کوئی غیر مرئی مخلوق کھڑی نظر آئی۔ اس نے ڈر کر ذہن سے جھٹکنا چاہا مگر مکمل طور پر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بار بار اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اس کا لباس برف اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ اب قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ سردی کا احساس متواتر چلنے سے زائل ہو چکا تھا۔ اسے ایک خوف نے جکڑ رکھا تھا کہ رات کو اس اندھیرے میں جب انسان سوتے ہیں تو جنگلوں بیابانوں میں اَن دیکھی مخلوق جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ سوچ کر دہل رہا تھا کہ درختوں پر بسیرا کرنے والی مخلوق اسے اوپر سے دیکھ رہی ہوں گی۔ ہر درخت اسے بلاؤں کا مسکن لگ رہا تھا۔ اسے بچپن میں مولوی صاحب کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دلیر وہ ہوتا ہے جو اپنے خوف پر قابو پا لیتا ہے جو جتنا خوف کو بھگا سکتا ہے وہ اتنا ہی بہادر ہوتا ہے۔ واجد بزدل نہ تھا مگر اب خوف اس کو اپنے قابو میں کرتا جا رہا تھا۔

وہ ہمت جمع کر کے چلتا رہا۔ دل ہی دل میں قرآن پاک کی ان ساری سورتوں کا ورد کرتا جا رہا تھا جو اسے یاد تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کھوئی ہوئی زندگی واپس آنے لگی جب اس نے دور، جنگل سے ذرا ہٹ کر اپنے گاؤں کے اندھیرے میں ڈوبے مکانات دیکھے۔

ان کی طرح بہت سے گھروں کے مکین ابھی اوپر پہاڑ پر تھے جو نیچے گاؤں میں تھے وہ لوگ روشنی کے لیے لالٹین استعمال کرتے تھے اگر کسی گھر میں لالٹین جل بھی رہی تھی تو اس کی روشنی اتنی نہ تھی کہ اس گھپ اندھیرے کو نگل سکے۔ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ اس نے رات اپنے اس گھر میں بسر کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اب اس کے لیے بہت مشکل تھا کہ اتنا ہی سفر آگے اوپر پہاڑ پر کر سکے۔

ہواؤں میں تندی آگئی اور ساتھ ہی برف بھی گرنے لگی۔ ٹارچ کی بیٹری وہ راستے میں تبدیل کر چکا تھا اور وہ دوبارہ دم توڑ رہی تھی۔

اس نے دور سے اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ ہواؤں کا زور گھر کے گرد بلند درختوں کو زمین بوس کرنے کے درپے تھا۔ ہوائیں ان سے الجھی ہوئی تھیں۔ وہ برف میں دھنستا ہوا اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اسے تحفظ کا احساس ہوا۔ گھر ہر ایک کے لیے ایک پناہ گاہ ہوتا ہے۔ باہر کے جتنے بھی طوفان ہوں، گھر کے اندر آ کر تھم جاتے ہیں۔ وہ سکون اور طمانیت کے لمحوں میں تھا۔ وہ کچا گھر تھا مگر اس کے لیے ایک محفوظ قلعہ تھا۔

گھر کے سامنے ایک کھلی جگہ تھی جس کے دائیں جانب بیٹھک کا دروازہ تھا۔ اس کھلی جگہ کو وہ لوگ صحن کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ اس صحن کی سامنے والی دیوار پر دروازہ سیدھا ایک کمرے میں کھلتا تھا۔ یہ گھر کا مرکزی دروازہ بھی تھا جو باہر آنے جانے کے لیے استعمال ہوتا۔ جب مکین اوپر پہاڑ والے گھر گرمیوں میں چلے جاتے تو اس دروازے پر تالا پڑ جاتا۔ پہاڑ والے گھر سے راولاکوٹ آمدورفت کے دوران اس گھر کو بھی وقتاً فوقتاً استعمال میں لایا جاتا تھا۔

واجد نے لکڑی کا ڈنڈا دیوار سے ٹکایا اور جیکٹ کی جیب سے تالے کی چابی نکالی۔ جب ٹارچ کی روشنی تالے پر ڈالی تو دروازے کی کنڈی کھلی ہوئی تھی اور تالا غائب تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چکرا گیا۔ سوچنے لگا کہ آیا گھر میں کوئی ہے یا یہ تالا گاؤں کے لڑکوں نے کھولا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس گھر کو کبھی کبھار گاؤں کے لڑکے تاش کھیلنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس نے زمین پر ٹارچ کی روشنی پھینکی تو تالا نیچے پڑا تھا۔ وہ تالا اٹھائے اس کشمکش میں کھڑا رہا کہ کیا اس تالے کو کھولا گیا ہے یا اسے توڑا گیا ہے۔ اس نے تالے کے ہینڈل اور اس کے اندر دیکھا تو اسے معلوم ہو گیا کہ اسے جھٹکے سے توڑا گیا ہے۔ گاؤں میں چوری چکاری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس نے تالے پر دیکھا تو کوئی ضرب بھی نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سے تھکا ہوا تھا اس نے دماغ کو اس سوچ سے آزاد کیا۔ پاس ہتھیار تو کوئی نہ تھا مگر اپنے آپ پر یہ بھروسا تھا کہ دو تین پر تو وہ اکیلا ہی حاوی ہے۔ اس نے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا تو اس کے دونوں پٹ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔

دروازہ سیدھا ایک کمرے میں کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی مدھم ہوتی روشنی میں اس نے آس پاس دیکھا تو کسی کو وہاں نہ پایا۔ اس کمرے میں ایک جانب چارپائیاں رکھی تھیں۔ دو خالی گھی کے کنستروں میں پانی بھرا تھا۔ اس کمرے میں ایک دروازہ سیدھے رخ پر اسٹور میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ غسل خانے کا تھا۔ الٹے ہاتھ پر ایک دروازہ دوسرے صحن میں کھلتا تھا جہاں گھر کی عورتیں روٹی ہانڈی کرتی تھیں۔ اس صحن میں دائیں جانب ایک کمرا تھا جہاں مال مویشی باندھے جاتے تھے۔ اس کمرے کا ایک بڑا دروازہ مال مویشیوں کی آمدورفت کے لیے باہر بھی کھلتا تھا۔

جس کمرے میں وہ کھڑا تھا۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جو بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ سونے کا کمرا تھا۔ وہی ان کا باورچی خانہ بھی تھا بلکہ سارا کنبہ شام کے بعد وہیں موجود ہوتا اور ضرورت کا سارا سامان اس بڑے کمرے میں رکھا ہوتا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھا اور اس کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ اندر کی جانب کھول دیے۔ ٹارچ کی روشنی اندر پہنچی تو اسے سامنے آتش دان نظر آیا جس میں سے ایک پائپ زمین سے چھت کے باہر تک دھواں نکالنے کے لیے تھا۔ کچھ سوکھی لکڑیاں پڑی تھیں۔ آتش دان کے گرد چٹائیاں بچھی تھیں۔ الٹے ہاتھ پر اس نے ٹارچ کی نہایت ہی مدھم ہوتی روشنی ڈالی تو وہاں تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ دائیں جانب ایک چارپائی پر اوپر تلے رضائیاں رکھی تھیں جو چھت تک جا پہنچی تھیں۔ کونے میں لوہے کے ٹرنک تھے۔ اس نے ٹرنک کے تالے چیک کیے وہ سالم تھے۔ اس نے چارپائیوں کے نیچے لائٹ پھینکی تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ اسے خلش بھی کہ تالا تو زمین پر پڑا تھا اور اندر بھی سب چیزیں اپنی جگہ موجود ہیں تو پھر اس تالے کو توڑنے والے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

اس نے اپنے خیالات جھٹکے اور چھوٹے کمرے میں آ کر اپنی جیکٹ اتاری، پھر اپنے جوتے اتارے۔ بیگ سے ایک شلوار قمیص کا جوڑا نکال کر اپنے کیچڑ بھرے لباس سے نجات حاصل کی۔ ٹین کے کنستروں میں سے لوٹے میں پانی بھر کر غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھوئے، بڑے کمرے میں آیا اور لالٹین ڈھونڈی سامنے اور بائیں جانب والی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر نیچے لکڑی کے شیلف بنے تھے۔ جہاں برتن اور دوسرا ضرورت کا سامان رکھا تھا وہیں اس کو لالٹین پڑی ملی اور ساتھ ماچس بھی تھی۔ اس نے لالٹین

کو جلایا تو کمرے میں ہر جانب زردی روشنی پھیل گئی۔

ڈنڈے سے شاپر نکال کر اس نے بائیں ہاتھ پڑی چارپائی پر رکھے اور پھر دوسری چارپائی پر ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ ٹائم دیکھا تو رات کے تین بجے تھے۔

کچھ دیر ستانے کے بعد اسے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔ اس نے بستر پر پڑی ایک گرم چادر سے اپنے آپ کو لپیٹ لیا تھا۔ کمرے میں سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ خشک اپلے بھی ایک بوری میں پڑے تھے۔ کمرے کو گرم رکھنے کے لیے اس نے سوچا کہ آتش دان میں آگ جلالی جائے۔ وہ چلتا ہوا آتش دان کے قریب آیا۔ لکڑیاں اکٹھی کیں، آتش دان کی راکھ کو کریدا اور جگہ کو صاف کیا۔ لکڑیاں اوپر نیچے رکھیں اور کچھ ردی کاغذ اور اپلے بھی لکڑیوں کے نیچے رکھے۔ انہیں آگ دکھانے کے لیے اس نے ماچس کی تیلی نکالی ہی تھی کہ اسے دائیں جانب کونے سے کسی کی سسکاری سنائی دی وہ اچھل پڑا۔

اس نے آواز کی سمت دیکھا تو دو گول اور چمکتی ہوئی آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی اس کونے کی تاریکی تک بمشکل پہنچ رہی تھی مگر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں کوئی جانور نہیں بلکہ انسانی ہیولا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ زبان گنگ تھی اور جسم کے سارے پٹھے اکڑ چکے تھے۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ چند لمحے وہ اس جانب دیکھتا رہا پھر اس نے ہمت جمع کی اور بمشکل اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ ”تم کون ہو؟“

اپنی زبان کی کپکپاہٹ اسے صاف طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس نے جانچ لیا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے جو چادر میں لپٹی بیٹھی ہے۔ صرف چہرہ اسے نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے اسی دوران اسے جانچ لیا تھا۔ وہ بیس بائیس سال کی ایک نہایت خوب صورت لڑکی تھی۔ آنکھیں چمکدار، رنگ تانبے کی طرح اور اس کی ناک پتلی تھی۔ ہونٹ ایسے کہ جس طرح مصور نے اسے تراشا ہو۔ اس نے سرخ رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ اور ماتھے پر سیاہ بالوں کی ایک لٹ کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آیا تھا۔ وہ اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے رکوع میں ہو۔ وہ ڈری اور سہمی سی لگ رہی تھی۔ واجد کا خوف اسے اور اس کے تاثرات دیکھ کر قدرے کم ہوا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال ہی یہ آیا کہ یہ راستہ بھٹکی ہوئی ہے مگر اسے حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر سے اس کی موجودگی کیوں نہ محسوس کر سکا۔ اس نے اب قدرے بلند آواز میں لڑکی سے پوچھا۔ ”کون ہو تم اور اندر کیسے آئی ہو؟“

وہ دوبارہ سوال سن کر اور زیادہ سمٹ گئی مگر اس کی نظریں واجد پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل خاموش تھی۔ اب واجد نے اپنے لہجے میں قدرے سختی پیدا کی اور کڑک کر پوچھا۔ ”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“

واجد کو اپنے سخت لہجے پر پشیمانی بھی ہو رہی تھی۔ ایک لڑکی سے کرخت لہجے میں پوچھنا اسے خود برا لگ رہا تھا۔ لڑکی کی خاموشی اور گھبراہٹ سے وہ اپنے خوف پر مکمل قابو پا چکا تھا۔

واجد نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اگر تم کچھ بولو گی نہیں تو تمہیں کھینچ کر نیچے اتار لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا مگر اسی دوران لڑکی کی کھنکتی ہوئی مترنم آواز آئی۔ ”تمہیں تمہارے پیاروں کا واسطہ، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔“

وہ وہیں رک گیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے میں نہیں آتا مگر تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“

وہ بولی۔ ”میں کھڑابٹ کی رہنے والی ہوں۔“ اس کی آواز اتنی خوب صورت تھی کہ واجد کو محسوس ہوا کہ پہاڑ پر کوئی بانسری کی مدھر دھن بج رہی ہو۔

واجد جانتا تھا کہ کھڑابٹ یہاں سے کچھ دور ایک پہاڑی گاؤں ہے۔ وہ اسے خود ہی بولنے کا موقع دے رہا تھا مگر وہ خاموش تھی۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔ ”یہاں تمہیں کون چھوڑ گیا؟“

وہ لڑکی دھیمے دھیمے بول رہی تھی۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس کے حسین لبوں سے الفاظ کسی مترنم ندی کی طرح بہنے لگے۔ ”وہ میری شادی زبردستی کر رہے تھے۔ میری محبت کسی اور کے لیے تھی۔ جس کے لیے گھر سے بھاگی، وہ بھی کہیں غائب ہو گیا۔ میں گھر سے سارا زیور بھی اٹھا لائی پھر بھی وہ مجھے دغا دے گیا۔“ اس کی آنکھوں سے موتی جھڑ کر گالوں پر بہنے لگے۔ اس کے بے پناہ حسن میں حزن تھا۔ اس نے اپنے مرمریں ہاتھ اپنی چادر سے باہر نکالے تو دونوں ہاتھوں میں قیمتی زیور تھے۔ واجد اس کے خوب صورت ہاتھ، لمبی مخروطی انگلیاں اور ان ہاتھوں کے زیورات دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔ اس نے زیورات دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ یہ بہت قیمتی ہیں۔ زیورات سے بڑھ کر لڑکی کا حسن اسے دیوانا کر رہا تھا۔ اتنی حسین و جمیل شکل شاید ہی اس نے پہلے دیکھی ہو۔ وہ اسے آسمان سے اتری کوئی مخلوق لگ رہی تھی جو اس برفانی رات میں اسے کسی انعام کی صورت ملی تھی۔

واجد نے نام پوچھا تو اس نے لیلیٰ بتایا۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنا دلکش نام ہے اور اس پر جچ رہا ہے۔ اس کی آواز میں اب خوف نہ تھا۔ وہ مرد بن گیا تھا جو اپنے ذہن میں کئی رنگین کہانیاں بُن رہا تھا۔ اس کے لہجے میں پیار، نرمی اور اپنائیت آ گئی تھی وہ بولا۔ ”تم نیچے اتر آؤ۔ اوپر تم سے بات کرنی مشکل ہو رہی ہے۔ میں اس دوران آتش دان جلاتا ہوں۔“

وہ اٹھا اور آتش دان کی طرف بڑھا۔ تبھی اس نے مدھر آواز میں کہا۔ ”آتش دان مت جلاؤ۔ مجھے گرمی لگ رہی ہے۔“ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ چادر کی اوٹ سے جھانکتا چہرہ پورے کمرے میں دمک رہا تھا۔ کمرے میں ابھی تک ٹھنڈ تھی مگر لڑکی سے کوئی تپش نکل رہی تھی جو واجد کو بے خود کیے جا رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بے خود ہوا جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا اور کھانا نکالنے کے لیے اٹھ گیا۔

اس نے شاپر سے تکے اور نان نکالے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ یہ کھا لو۔ پھر آرام سے باتیں کریں گے۔“

لیلیٰ بولی۔ ”میں تکے نہیں کھاؤں گی۔ اگر پھل ہیں تو وہ کھا لوں گی۔“

اس نے پھلوں کا شاپر کھولا۔ وہ مالٹے، انار اور سیب لایا تھا۔ ایک پلیٹ میں پھل ڈالے۔ انہیں صاف کیا اور اس کے ہمراہ چارپائی پر آ بیٹھا۔ وہ اسے پھل دے رہا تھا جسے وہ رغبت سے کھا رہی تھی۔ واجد سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب سے بھوکی ہے جو پھل اتنی جلدی ختم کر لیے۔ وہ تو اس پر سب کچھ لٹانے پر تلا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی جب کہ وہ فطرتاً ایسا نہ تھا۔

وہ پھل کھا چکی تھی۔ واجد نے تکے نان کے ساتھ کھائے۔ پانی پی کر وہ اس کے ساتھ والی چارپائی پر آ بیٹھا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت انگڑائی لینے لگی تھی۔ وہ اسے بھروسا دلا رہا تھا کہ تم کو کسی چیز کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ تم اب میری ذمہ داری ہو۔ میں فوجی سپاہی ہوں اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کیپ کمانڈر سے بھی مدد لے سکتا ہوں۔ وہ اس کی باتوں پر سر ہلاتی رہی۔

واجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر ایک تبدیلی سی آ رہی ہے۔ کسی خاص مقصد کے لیے اسے اکسا رہی ہے۔ واجد نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ تھامتے ہی اس کے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ نرم اور ملائم ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ نہیں چھڑوائے۔ واجد اسے اس کی رضامندی سمجھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیلیٰ کے گلابی گالوں کو چھوا تو وہ شرما گئی۔

” وہ خود بھی وجیہہ انسان تھا۔ لیلیٰ کو رام کرنے میں اس کی خود اعتمادی اس کے کام آ رہی تھی۔ لڑکی خاموش تھی۔ واجد نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ بولی لالٹین کی روشنی کم کر دو۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔“

وہ یہ سن کر سحر زدہ ہو گیا۔ وہ چارپائی سے اتر آیا اور لو کو دھیما کر دیا۔ وہ حواس کھو چکا تھا۔ شیطان نے اپنا غلبہ پا لیا تھا۔ نیم اندھیرے میں شیطانی کھیل شروع ہوا۔ وہ اسے اپنانے کے وعدے کر رہا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی کہ اپنا سب کچھ تمہارے سپرد کر دیا ہے تو اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ میری زندگی میں ایک ہی مرد آیا ہے اور وہ تم ہو۔ مرتے دم تک تمہارا پیچھا کروں گی۔ وہ مدہوش ہو کر کہہ رہا تھا کہ میں مر کر بھی تم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے اور مرد اپنے وعدے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ وہ کافی دیر باتیں کرتے رہے اس نے رضائی اور تکیے اوپر سے اتار لیے تھے۔ سفر کی تھکاوٹ بھی غالب آ گئی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر نیند کی وادی میں چلا گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے کی درزوں سے دن کی روشنی شعاعوں کی صورت اندر آ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا چھٹ چکا تھا اور باہر بادلوں کی جگہ سورج چمک رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو لیلیٰ دوسری چارپائی پر بیٹھی اسے معنی خیز انداز سے دیکھ رہی تھی۔ واجد نے پوچھا کہ تم کب بیدار ہوئی۔

اس نے جواب دیا۔ ”میں سوئی کب تھی۔ تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”مجھے اٹھا دیتی۔“

اس نے جواب دیا۔ ”محبوب کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔“

وہ جھوم اٹھا۔ اب وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ گھر پر بیوی، ماں اور بیٹی انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ اپنے ذہن میں مستقبل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ سوچا کہ لیلیٰ کو فی الحال یہیں رکھوں گا۔ ایک دو دن میں سامان شفٹ ہونے سے

پہلے اس کا کہیں نہ کہیں انتظام کرلوں گا۔ اس نے لیلیٰ کی جانب دیکھا تو وہ اسے اپنی نظروں میں متواتر رکھے ہوئے تھی۔ نگاہوں میں چمک تھی اور بھی بہت کچھ تھا جسے وہ کوئی معنی نہ دے سکا۔ شاید اس کی اپنائیت کا جادو تھا جو واجد کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو اسے گھائل کررہا تھا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔

وہ اٹھا اور غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر واپس کمرے میں آیا۔ وہ اسی حالت میں بیٹھی تھی جیسے اسے چھوڑ گیا تھا۔ واجد نے اس سے کہا کہ تم بھی منہ ہاتھ دھولو۔

وہ بولی۔ ''میں ابھی چلتی ہوں۔ شام کو پھر آؤں گی اور تم کو بھی آنا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

وہ بولا۔ ''تم کہاں جارہی ہو؟ ادھر ہی رکو۔ رات کو میں واپس آنے کی کوشش کروں گا۔''

واجد دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا جہاں وہ رات سویا تھا۔ لیلیٰ میں پہلی بار حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے پاؤں چادر سے نکالے اور زمین پر رکھے۔ واجد کی نظریں اس کے پاؤں پر پڑیں تو اس کے منہ سے ایک چیخ سی برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ گھبرا ہوا ایک خوف نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا اور ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی لیلیٰ کے پاؤں الٹے تھے۔ وہ مکمل پیری تھی۔ چڑیل تھی۔

واجد کا دماغ سن ہوگیا تھا۔ زبان گنگ اور حواس پر شدید خوف طاری ہوگیا تھا۔ وہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں شدید طنز تھا۔ واجد کے سارے حواس خمسہ جواب دے چکے تھے۔ وہ بدحواسی میں ننگے پاؤں دروازے کی جانب دوڑا مگر راستے ہی میں لیلیٰ نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور وہ ڈگمگاتا ہوا چارپائی پر آگرا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر اسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے لگا تو لیلیٰ نے پانی سے بھرا جگ اس کے منہ پر الٹ دیا۔ پانی پڑتے ہی وہ چیخنے لگا۔ رات جس کی آواز مدھر بانسری جیسی تھی... اب وہ ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی۔ واجد کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ رات وہ کیا کر بیٹھا۔ جو ہوا تھا وہ اب اسے پلٹ نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں دس فیصد آپ کرتے ہیں اور باقی نوّے فیصد اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ وہ گڑگڑاتا ہوا معافیاں مانگتا ہوا دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ وہ مسلسل آہ وزاریاں کررہا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''تم جس روپ میں بھی چاہو گے اسی میں ڈھل کر آؤں گی۔ ایک مرد جو ہماری زندگی میں آتا ہے جس طرح تم رات کو آئے تھے پھر ہم اس سے کبھی دور نہیں ہوسکتے۔'' وہ واجد کی جانب بڑھی ایسے کہ ہوا کی دوش پر۔ ''اب تم یا تو میرے بن کر رہو گے یا پھر کسی کے بھی نہیں بلکہ دردناک موت کا مزہ چکھو گے۔''

واجد کا بدن کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ذرا سا سر اٹھاتا تو اسے دو سفید پاؤں الٹی سمت مڑے ہوئے ملتے۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ جسے وہ حسین پری سمجھ رہا تھا وہ ایک مکمل پیری ہے۔ وہ بول رہی تھی۔ ''میں جارہی ہوں۔ رات کو دوبارہ آؤں گی اگر تم نہ آئے تو بہت برا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ہاتھوں مارے جاؤ۔ یاد رکھو آج رات دوبارہ ملوں گی۔ کہیں بھی اور اگر اپنے کمرے میں آگ جلائی تو بیٹی کی لاش ملے گی۔'' کہتے ہوئے اپنی جگہ سے غائب ہوگئی۔

وہ کب چلی گئی، کہاں چلی گئی اور کیسے گئی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ اسی حالت میں پڑا روتا رہا، گھٹ گھٹ کر رو رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہوگیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو بہت سارا وقت گزر چکا تھا۔ خوف اور وحشت نے اسے بخار میں مبتلا کردیا تھا۔ اب وہ اس کمرے میں ایک پل بھی رکنے پر تیار نہ تھا۔ جہاں ایک چڑیل اس سے قریب ہوئی تھی۔ یہ سب اسے کوئی بھیانک خواب لگ رہا تھا۔ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ وہ خطرناک راستے سے بچ کر بھی ایک پنجرے میں آپھنسا تھا۔ وہ اگر اس کے ساتھ رات کو پیار کی پینگیں نہ بھی بڑھاتا تب بھی اس سے بچ نہ پاتا۔

وہ تیزی سے اٹھا۔ جیکٹ اوڑھی، بوٹ پہنے اور گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر اوپر پہاڑ پر اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ راستے برف باری سے ڈھک گئے تھے۔ اس کے قدم گھٹنوں تک برف میں دھنس رہے تھے پھر بھی وہ جیسے تیسے اوپر چڑھتا رہا۔ اسے خبر بھی نہ تھی کہ وہ کب روانہ ہوا اور کب اپنے گھر کے سامنے پہاڑ پر پہنچا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اسے یہ سفر کرتے ہوئے سال گزر گئے۔ وہ کسی کمزور شاخ کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اوپر پہنچا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو ماں سامنے کمرے میں چولہا جلائے بیٹھی تھی۔ بیٹے کو اچانک اس حالت میں دیکھا تو بت

بن گئی۔ حیرت اور صدمے سے پہلے تو کچھ لمحے بیٹھی رہی اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کی جانب ننگے پاؤں دیوانا وار بڑھی اور بڑھ کر اسے تھام لیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ روتی پیٹتی اسے سہارا دے کر کمرے تک لائی۔ اسے چارپائی پر لٹایا۔ تکیہ اس کے سرہانے رکھا۔ اس پر رضائی اوڑھائی۔

ماں بیٹے سے رو رو کر پوچھ رہی تھی۔ ''یہ تیرا حال کس نے کیا۔ کیا ہوا میرے بچے۔''

اتنے میں اس کا دوست شوکت آپہنچا۔ واجد گرتا پڑتا جب گاؤں کی جانب آرہا تھا تو کسی نے اس کے دوست شوکت کو خبر کردی تھی۔

شوکت نے اس کی حالت دیکھی تو وہ بھی گھبرا گیا۔ اس نے ماں سے پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ ماں روتی ہوئی بولی۔ ''میں تو بیٹھی روٹیاں بنارہی تھی کہ یہ گرتا پڑتا گھر میں داخل ہوا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ یہ تو بول بھی نہیں پارہا تھا۔ میں نے پانی پلایا اور یہ بے ہوش ہوگیا۔''

شوکت نے پوچھا۔ ''اس کی بیوی اور بیٹی کہاں ہیں۔''

ماں نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔ ''وہ بے چاری پچھلے چند دن سے برے برے خواب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹی کو لے کر ماں کے پاس چلی جاؤ۔ ذرا ذہن بدل جائے گا۔''

شوکت حیران تھا کہ واجد تو آنے سے پہلے خط لکھا کرتا ہے، اس بار اس نے کیوں نہیں لکھا۔ اس نے ماں سے پوچھا تو وہ بے ہوش بیٹے کا سر دباتے ہوئے بولی۔ ''خط آیا ہوتا تو وہ کیوں کہیں جاتی، وہ تو اس کی راہ تکتی رہتی ہے۔''

ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ آگ کی طرح جل رہا تھا۔ وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ ایک ڈبے سے چند جڑی بوٹیاں نکال کر اس کے لیے قہوہ تیار کیا، شوکت اپنے دوست کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ماں اور شوکت نے مل کر اس کے حلق میں قہوہ انڈیلا۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے اپنی آنکھیں کھولتا۔ اپنی ماں کو تادیر دیکھتا اور پھر آنکھیں موندھ لیتا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور صحن میں لگے صنوبر کے درختوں پر بے شمار کوّے آکر کائیں کائیں کررہے تھے۔

واجد کے بھائی کو اطلاع ملی تو وہ بھی دوڑا چلا آیا۔ ماں نے اسے احوال بتایا تو وہ شوکت سے کہنے لگا کہ تم نیچے بنجوسہ گاؤں جاکر فوری طور پر کمپاؤنڈر کو لے آؤ۔ کمپاؤنڈر علاقے کا واحد معالج تھا۔ شوکت فوری طور گھر سے نکلا۔ اسے آج سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ایک دیوانگی اور اداسی اس گھر پر چھائی ہوئی تھی۔ لاتعداد کوّوں کی آوازوں نے گھر پر نحوست ڈال رکھی تھی۔

واجد کو ہوش آیا تو ماں لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تک رہا تھا۔ ماں نے پوچھا۔ ''یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ کس ظالم نے تیری یہ حالت بنائی ہے؟''

جواب میں وہ صرف چھت کی جانب دیکھتا رہا۔ ماں رونے لگی۔ بھائی کہنے لگا مجھے تم صرف نام بتاؤ وہ کون تھے؟ تمہارا بیگ بھی ساتھ نہیں ہے۔ اس علاقے میں چور ڈاکو تو کبھی نہ تھے۔ لگتا ہے کوئی باہر سے آیا ہے۔

واجد سخت مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ جو رات کو ہوا تھا وہ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی عزت کا بھی پاس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سب کو کیا بتائے کہ ان کی تسلی ہو۔ ماں اور بھائی اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں بہت سے سوال تھے۔ مکمل پیری کا خوف علیحدہ تھا۔ اسے جھرجھری آجاتی جب بھی یہ سوچتا کہ وہ اس کے کتنے قریب تھی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ لاتعداد چیونٹیاں اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔ ٹانگیں بے جان تھیں۔ شام قریب آرہی تھی اور اس کی دہشت اسے بے جان کیے ہوئے تھی۔ اسے چڑیل کے الفاظ یاد آرہے تھے کہ اگر تم رات کو نہ آئے تو میں آجاؤں گی آگ کمرے میں نہ جلانا ورنہ تمہاری بیٹی کی لاش تمہیں ملے گی۔ اس کے الفاظ یاد آئے تو بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔

شام کے بعد شوکت کمپاؤنڈر کو لیے پہنچا۔ اس نے تفصیل سے اس کا معائنہ کیا اور بڑی دانش مندی سے بولا۔ ''سردی کا بخار ہے۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھو۔ یخنی پلاؤ اور اسے آرام کی ضرورت ہے۔'' اس نے بخار کی گولیاں دیں۔ ساتھ میں اور بھی دوائیں دے کر رخصت ہوگیا۔

لوگوں کے گھر اوپر نیچے پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے تھے۔ رات کا کالا ناگ روشنی کو نگل چکا تھا۔ جنگل کے گیدڑ وقت سے پہلے چلّانے لگے تھے۔ گھروں کے کتے لگاتار بھونکے جارہے تھے۔ پورا علاقہ برف سے ڈھکا تھا۔ ٹھنڈ نے ہر چیز کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ فضا سوگوار تھی اور لگتا

تھا کہ علاقے میں کوئی میت ہوگئی ہو یا کوئی موذی وبا نے علاقے میں خوف پھیلا رکھا ہو۔

خوف کی کیفیت بھی بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ بھلے وہ موت کا ہو یا کسی مافوق الفطرت مخلوق کا، کسی ڈراؤنے نتائج کا یا دولت کے چھن جانے کا۔ یہ خوف انسان پر صرف حاوی نہیں ہوتا بلکہ سارے ماحول کو، زمین اور آسمان کو بھی اپنے ساتھ کس کر باندھ دیتا ہے۔ خوف وہ بت ہے جو کسی مضبوط پتھر کا بنا ہوتا ہے اور اسے توڑنا ہمت کا کام ہے۔ خوف انسان کو سسک سسک کر مارتا ہے جس نے بھی خوف کا بت توڑ دیا وہ آزاد فضاؤں کا پنچھی بن گیا۔ اگر خوف کے ساتھ احساسِ گناہ بھی ہو تو پہلے اس کا ازالہ کیا جاتا ہے مگر واجد کے پاس تو کچھ نہ تھا جس سے وہ کفارہ ادا کرسکتا۔ ایک لمحہ پوری زندگی کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ واجد جو کل ایک خطرناک سفر طے کر کے بجوسہ گاؤں پہنچا تھا۔ آج اپنے گھر کی چارپائی پر پڑا دہشت اور خوف سے بلبلا رہا تھا۔ یہ وہ بیماری تھی جس کا علاج شاید کسی کے پاس نہ تھا۔

وہ چارپائی پر رضائی اوڑھے لیٹا تھا اور اس ٹھنڈ میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ کمرے میں صرف لالٹین جل رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں سوئے گا جہاں اس کی بیوی اور بیٹی سوتی تھی۔ اس کو ماں نے بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی ماں کے گھر گئی ہے۔ وہ مطمئن ہوگیا کہ بیوی کی موجودگی میں وہ کس طرح اکیلے کمرے میں سوتا اور پل پل موت کا، چڑیل کا انتظار کر رہا ہوتا۔

وہ اس کمرے میں اکیلا تھا۔ دروازے کی کنڈی اس نے لگا دی تھی۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی ماحول کو اور ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ گیدڑوں اور کتوں کے رونے کی آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ شاید انہوں نے بھی کسی بلا کی چاپ سن لی تھی۔

اس کی نظریں مسلسل کمرے کے دروازے کی جانب لگی تھیں۔ کبھی زور کے جھکڑ چلنے لگے۔ باہر برف باری شروع ہوگئی تھی۔ ہواؤں کے زور سے دروازہ ہلتا تو بھی وہ دہل جاتا تھا۔ فضا میں ماتم کرتی سرد ہوائیں تھیں۔ رات کے بارہ بجے ہوں گے اور وہ لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ چھلل پیری ابھی تک نہ آئی تھی۔ وہ انتظار بھی کس کا کر رہا تھا۔ اس چڑیل کا جو اس کی موت کے درپے تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ حلق سوکھ گیا اور جسم پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی الفاظ بھی نہ نکل رہے تھے۔ وہ ڈر سے خاموش رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے ماں کی آواز سنائی دی۔ ماں اس سے پوچھ رہی تھی۔ ”بیٹا! تم سوئے نہیں؟“

”ٹھیک تو ہوں ماں۔“

ماں کی آواز ہمیشہ ڈھارس دیتی ہے۔ واجد کو بھی حوصلہ ملا اور بولا۔ ”ماں بس سونے والا ہوں، تم بھی سو جاؤ۔“

وہ دو بجے رات تک جاگتا رہا۔ ہر آواز پر اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ ہر کھٹکے پر اٹھ بیٹھتا۔ آہستہ آہستہ اس کے نہ آنے کا اطمینان اسے ہونے لگا۔ جیسے جیسے خوف کم ہوتا گیا ویسے ویسے آنکھیں بوجھل ہوتی گئیں۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

اسی رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ جنگل میں بھاگا جا رہا ہے۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی ہیں اور دہشت میں گھرا ہے۔ کچھ نامانوس چہرے اپنے منہ ڈھانپے اور ہاتھوں میں تلواریں لیے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر رہا ہے۔ اردگرد بلند و بالا درخت جن کی شاخیں برف سے ڈھکی ہیں اور اس کے دوڑتے قدم زمین پر پڑی برف میں دھنس رہے ہیں۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا اور یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ ان منہ ڈھانپے چہروں کے ساتھ ساتھ اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ ہانپ رہا ہے۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی ہیں۔ وہ اس کے قریب سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ وہ بے بس ہو کر گرنے والا ہے اور پھر وہ برف میں اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ اس کا پیچھا کرتی آوازیں نزدیک آچکی ہوتی تھیں۔ ایک شور تھا جو اس کے عقب میں تھم گیا تھا۔ وہ خوف کے مارے اپنا سر اٹھاتا ہے تو سامنے الٹے پیروں والی لڑکی مسکرا رہی ہوتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں زہر ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہوتی ہیں اس کی آنکھوں میں خوف ہے۔ اس کا چہرہ دمک رہا ہوتا ہے اس کے چہرے کے ہر نقش میں موت ہے۔ واجد کے منہ سے دبی دبی چیخ برآمد ہوتی ہے اور اسی لمحے وہ بیدار ہو جاتا ہے۔

اس کا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا اور سانس ایسے چل رہی تھی کہ جیسے وہ میلوں بھاگتا رہا ہے۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لالٹین کی روشنی کمرے کے ماحول کو پُراسرار بنا رہی تھی۔ اسی وقت وہ کسی بلی کی طرح دبے پاؤں چل کر اس

کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب اس میں چیخنے، رونے اور گڑگڑانے کی ہمت بھی باقی نہیں تھی جس طاقت پر اسے ناز تھا، وہ سب کھو چکا تھا۔ وہ اس سے کہتی ہے۔ ”تم کیا سمجھتے تھے کہ میں نہیں آؤں گی؟ تم اگر زمین کی تہہ میں بھی ہوتے تو وہاں سے بھی تمہیں نکال لاؤں گی۔ یہ بند دروازے میری راہ نہیں روک سکتے۔“ وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ واجد کی نگاہیں جھکی تھیں۔ وہ اس کی جانب دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔

باہر گیدڑوں اور کتوں کا شور اس کے آتے ہی تھم چکا تھا۔ ایک مکمل سکوت چاروں طرف چھایا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وقت تھم گیا ہو۔ فضاویں منجمد ہوگئی ہوں اور دھڑکنیں رک گئی ہوں۔ وہ اس سے ملتجیانہ لہجے میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ ”کیا میری معافی کسی طرح ہو سکتی ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ میری بیٹی ہے، بیوی ہے، مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اس کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل پڑے۔

وہ لڑکی مسکراتی رہی۔ اسے روتے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ”ترس اور رحم ہم میں کبھی نہیں ہوتا۔ ہم نے یہ الفاظ نہ ہی سنے ہیں اور میں تو تمہیں پوری کی پوری آئی ہوں۔“ اس کے لہجے میں زہر تھا، کرختگی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اسے کسی طرح سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اس حسین چہرے کے پیچھے ایک چڑیل کھڑی ہے، ایک ظالم اور جابر لڑکی جس کو کسی پر بھی ترس نہیں آسکتا۔

اس نے لالٹین کی لو مدھم کی اور اپنا مکروہ کھیل شروع کر دیا۔ اسے اب گھن آرہی تھی۔ خوف سے بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔ فجر کی اذان کہیں دور سے فضاؤں میں گونجی تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ کب اور کیسے یہاں سے گئی۔

دوسرے دن بھی رات کو یہی ہوا۔ اس کی حالت بگڑتی جارہی تھی۔ بخار جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اب اس کے جسم کو جھٹکے لگتے رہتے تھے۔ اس کی بیوی کو خبر پہنچائی گئی تو وہ نصیبوں کی ماری روتی پیٹتی اگلے دن بیٹی کو لے کر آ پہنچی۔ بیٹی کو دیکھ کر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ بہت دیر اسے سینے سے چمٹائے لیٹا رہا۔ بیوی الگ روتی جارہی تھی۔ شوکت اور اس کا بھائی اسے رونے کی وجہ پوچھتے تو وہ اور رونے لگتا۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو دم کے لیے بلایا گیا۔ انہوں نے پڑھ کر پھونکا۔ وقتی افاقہ ہوا اور ان کے جاتے ہی پھر سے وہی حالت ہوگئی۔

بھائی اور دوست بھی پریشان تھے۔ دونوں ایک ساتھ کمرے میں آئے۔ دروازہ بند کیا پھر بھائی اس سے بولا۔ ”میں نیچے گاؤں میں گیا تھا۔ گھر کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ تمہارا بیگ بھی وہیں تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ تم نے رات وہیں گزاری تھی۔ وہاں فروٹ کے چھلکے بھی پڑے تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جب گھر میں آئے تم بھلے چنگے تھے پھر رات میں کیا ہوا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب تم ہی بتا سکتے ہو تاکہ ہم اس کا توڑ کرسکیں۔“

اس کا دوست شوکت کہنے لگا۔ ”مجھے تو کسی جن بھوت کی کارروائی لگتی ہے۔ ہمارے علاقے میں بہت پہنچے ہوئے لوگ موجود ہیں جو شیطانی مخلوق کو قابو میں لانے کے طریقے جانتے ہیں تم ہمیں کچھ بتاؤ گے تبھی تو... ہم کچھ کرسکتے ہیں۔“

وہ انکار کرتا رہا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے بس سردی کا بخار چڑھ آیا ہے۔ ان دونوں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور آخر کار وہ بتانے پر راضی ہوگیا۔

وہ دونوں سن رہے تھے اور یہ بول رہا تھا۔ دونوں بے یقینی اور حیرت سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔ انہیں اس واقعے پر یقین کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ بھائی اور دوست کو واجد کی شخصیت کا معلوم تھا کہ وہ جھوٹ، دروغ گوئی اور بناوٹ سے بہت دور ہے۔ ان دونوں کے پاس صرف دو اندازے رہ گئے تھے کہ یا تو اس کا دماغ الٹ گیا ہے اور یا یہ سچ بول رہا ہے واجد سب سنا کر خاموش ہوا تو وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

بہت دیر وہ تینوں خاموش رہے۔ واجد اپنی کتھا سنا کر چارپائی پر سیدھا لیٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جن میں آنسو بھرے تھے۔ اس کا چہرہ تین دن میں کملا کر رہ گیا تھا۔ وہ شکل سے سالوں کا مریض لگ رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں بیٹھے رہے۔ اگر یہ سب سچ تھا تو وہ جانتے تھے کہ اس کی جان کو شدید خطرہ ہے۔ اس قسم کے واقعات ان علاقوں میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ شوکت کو معلوم تھا کہ چند عرصہ بیشتر اس سے ملتا جلتا واقعہ کسی دوسرے گاؤں میں

ہوا تھا جہاں ایک نوجوان کو گردن کی ہڈی توڑ کر قتل کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کا کمرا اندر سے بند تھا اور اس کی لاش چارپائی پر سیدھی پڑی تھی۔

کچھ دیر بعد شوکت اٹھا اور اس کے بھائی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے وہ صحن میں کھڑے تھے۔ صحن کے درخت پر لگتا تھا کہ گاؤں کے سارے کوؤں نے قبضہ کرلیا ہو۔ ان کی کائیں کائیں کے شور سے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے بھائی نے پہلے بھی کئی بار ان کوؤں کو بھگایا تھا مگر وہ دوبارہ شور مچانے آبیٹھتے تھے۔

شوکت نے اس کے بھائی کو کہا کہ وہ اپنی ماں کو ساری کہانی بتا دے۔ اس کے خیال میں ماں اور بیوی کو باخبر رکھنا ضروری تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس ہو سکتا ہے اس کے توڑ کا کوئی حل بھی موجود ہو۔ وہ صحن ہی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اس کی ماں کمرے سے باہر آگئی۔ آتے ہی وہ بولیں۔ ”میری بات مان لو کہ یہ جنوں کی کارستانی ہے۔ میرا گبرو جوان تین دن میں آدھا رہ گیا ہے۔ وہ کون سی مصیبت ماری بیماری ہے کہ تین دن پہلے لگی اور اسے چاٹ گئی۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ شوکت نے کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر اپنے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ وہ اس کی ماں کے سامنے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس کی ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے کی زبانی پوری کہانی سنی تو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر سر پیٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ وہی موئی چڑیل ہے جس کے قصے میں بچپن میں سنتی تھی۔ وہ تو غائب ہوگئی تھی۔ ہماری بری قسمت کہ اب دوبارہ ہمارے ہی گلے پڑ گئی ہے۔“

واجد کی بیوی ہکا بکا بیٹھی یہ سب سنتی رہی۔ اب وہ جیسے کسی سکتے میں تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنی ساس کا چہرہ دیکھتی تھی۔

ماں کا خیال فوری طور پر کھائی گلہ گاؤں میں بزرگ خاتون دیالی کی طرف گیا۔ وہ کہنے لگی۔ ”دیالی کے علاوہ کوئی چارہ گر نہیں۔“

اسی سالہ دیالی پورے علاقے میں اپنے علم، فراست اور پرہیزگاری کی بدولت ایک بہت متبرک اور باعزت ہستی تھیں۔ لوگ اس کا نام اور ذکر اب بھی بہت عزت و احترام سے کرتے ہیں۔ سر کے بال دودھ کی طرح سفید تھے اور سفید دوپٹا اوڑھتی تھیں۔ وہ اپنے علم و عمل سے کالے جادو کا توڑ اور ماورائی قوتوں کو اپنے قابو میں کرتی تھیں۔ دور دور سے لوگ اپنے مسائل اور ضرورتیں لے کر اس کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ اس کی ماں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا کہ ابھی کے ابھی دیالی کے پاس جانا ہو گا اور میں بھی تمہارے ہمراہ چلوں گی۔ وہ اٹھی اور اپنی چادر اوڑھ کر بہو سے کہنے لگی کہ تم واجد کا خیال رکھنا۔ اس سے کسی بات کا ذکر نہ کرنا بلکہ اس کے ساتھ زیادہ پیار و محبت سے پیش آنا۔

چھوٹے بیٹے نے کہا کہ شوکت کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ اس طرح وہ تینوں گاؤں سے باہر نکلے اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ کھائی گلہ وہ پہنچے تو... دوپہر ہو چکی تھی۔ دیالی کا گھر کون نہیں جانتا تھا۔ بچے سے بھی پتا کرتے تو وہ دور پہاڑ کے دامن میں ایک کچے گھر کی جانب اشارہ کر دیتا۔ جہاں بادل جھکے تھے اور سرد ہوائیں اوپر سے اتر رہی تھیں۔ وہ پہاڑی راستوں پر چلتے ہوئے وہاں جا پہنچے۔

دیالی کے آستانے پر نہ کوئی نشان تھا اور نہ کوئی جھنڈا لہراتا تھا۔ کچی چار دیواری بہت سے درختوں سے گھری تھی۔ ہوا سے ٹہنیاں ہل رہی تھیں۔ شوکت محسوس کر رہا تھا کہ ان ہواؤں میں تندی اور وحشت کے بجائے ایک سکون ہے۔ عقیدت مند سر جھکائے لکڑی کے بوسیدہ دروازے سے اندر جاتے اور واپس نکلنے والے چہرے پر اطمینان ہوتا۔ ایک ٹھہری ہوئی کیفیت تھی جو ان سب کے اضطراب میں کمی لے آئی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئے اور دونوں مردانہ حصے میں جا کر اور لوگوں کے ساتھ زمین پر بچھی دری پر بیٹھ گئے۔ واجد کی ماں زنانہ حصے میں جا کر بیٹھ گئی۔ سب خاموش بیٹھے تھے۔ کوئی دوسرے سے سرگوشی بھی نہ کرتا تھا۔ کمرے کے اندر حدت تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد انہیں بلوا لیا گیا۔ ماں اور وہ دونوں ایک اور دروازے سے نیم تاریک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک چبوترہ تھا جس پر عمر رسیدہ مائی بیٹھی تھی۔ چہرے پر جھریاں اور سر پر سفید چادر تھی۔ بیچ میں ایک آتش دان تھا اور لوہے کا ایک ایک پائپ وہاں سے ہوتا چھت کے پار جا رہا تھا۔ لکڑیاں جل رہی تھیں۔ چبوترے کے سامنے زمین پر دریاں بچھی تھیں۔ وہ تینوں دیالی کے

سامنے جا بیٹھے۔ جلتی لکڑیوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے مؤدب بیٹھے تھے اور دیالی آنکھیں نیم وا کیے زیر لب کچھ پڑھ رہی تھی۔

وہ بیٹھ گئے تو دیالی کے منہ سے سرسراہٹ برآمد ہوئی۔ آواز نہ تھی بلکہ جیسے کوئی لہریں فضا میں تیرتی ان تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اپنی مشکل مختصر الفاظ میں مجھے بتاؤ۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں دبدبہ تھا۔ اس کی آواز میں ایسی کوئی بات تھی کہ وہ سب زیادہ باادب ہو گئے تھے۔

واجد کے بھائی نے اپنا گلا صاف کرنے کے بعد مختصر طور پر شروع سے آخر تک کی کہانی دیالی کے گوش گزار کی۔ وہ آنکھیں بند کیے اور سر جھکائے بیٹھی توجہ سے اس کی بات سنتی رہی۔ اس میں ہلکی سی جنبش بھی نہ تھی۔ بھائی کی آواز کے علاوہ گہرا سکوت تھا جیسے وہ اپنے رب سے باتیں کر رہا ہو۔ واقعہ تمام ہوا اور پھر مہیب خاموشی چھا گئی۔ وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ دیالی زیر لب کچھ پڑھے جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

پھر دیالی نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے کی سلوٹیں بڑھ گئی تھیں۔ وہ بھانپ گئی تھی۔ پریشانی کی لہریں اس کے چہرے پر تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو جیسے دو شعلے بھڑک رہے ہوں۔ جیسے دو ہیرے رکھے ہوں اور شعاعیں منعکس ہو کر ان تک پہنچ رہی ہوں۔ آنکھوں میں گہری تشویش اور بے انتہا چمک تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ کہیں سوچوں میں گم خلاؤں میں تکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ”یہ بدبخت پھر آگئی۔ سالوں پہلے اسے علاقے سے چلتا کیا تھا۔ اس کا دوبارہ آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

وہ پھر کہیں سوچوں میں کھو گئی۔ اپنے ساتھ رکھے مٹی کے ایک برتن سے کچھ جڑی بوٹیاں نکالیں اور انہیں آگ کے شعلوں پر پھینک دیا۔ شعلے ایک لحظے کو کئی فٹ بلند ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے آتے گئے۔

وہ آہستگی سے بولی۔ ”اس نے اپنا وعدہ توڑا ہے۔ وہ بہت زیادہ طاقت ور تھی۔ اسے قابو میں دوبارہ لانا ایک مشکل کام ہے۔“ وہ واجد کی ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”تمہارے بیٹے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔“

یہ سن کر ماں نے اپنی چیخ منہ پر ہاتھ رکھ کر دبالی مگر اسے دیکھ کر ہر ایک محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے اندر بے پناہ شور برپا ہے۔

دیالی پھر سب سے مخاطب ہوئی۔ ”اللہ نے کالے جادو اور شیاطین کے بارے میں ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنی شیطانی عمل اور اپنی بے پناہ قوت سے انسانوں کو ضرر پہنچاتے رہتے ہیں۔ کئی لوگ ان کے وجود سے انکاری ہوتے ہیں تو وہ اللہ کے فرمان کو جھٹلا رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی بیمار پڑتا ہے تو ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اسی طرح عقل مند جب کسی آسیبی سائے کا یا کسی جادو کا شکار ہو تو صاحب علم و عمل کے پاس آتا ہے۔ اس چڑیل نے دراصل مجھے للکارا ہے۔ سالوں پہلے میں نے اسے ذلیل و رسوا کر کے علاقے سے باہر پھینک دیا تھا۔ وہ اب سمجھتی ہے کہ دیالی بوڑھی ہوگئی ہے، کمزور ہوگئی ہے اسی لیے وہ دوبارہ یہاں آدھمکی۔ اس نے ایک شکار کے ذریعہ مجھ تک پیغام پہنچایا ہے۔ میں گو کہ بہت بوڑھی اور کمزور ہوگئی ہوں پر میرا علم کمزور نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کہ وہ کون سی نئی طاقت کے ساتھ وارد ہوئی ہے، مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ اس جنگ میں کسی ایک کی جان جانا ضروری ہے۔ تمہارے بیٹے کی یا میری اس نامراد کی۔“ پھر دیالی نے اوپر کی جانب آنکھیں اٹھائیں اور کہا۔ ”یا اللہ سچائی کو فتح دے اور شیطانی طاقتوں سے اپنے انسانوں کو بچا۔“

اس نے پھر اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں ان سب پر ڈالیں اور سنے تلے لفظوں میں کہا۔ ”میری بات کو دھیان سے سنو۔ تم لوگ اب جاؤ اور کسی سے کچھ مت کہنا۔ نہ تو مغلوب لڑکے کو ابھی کچھ بتانا ہے اور نہ کسی اور کو۔ وہ آج رات کو بھی آئے گی۔ نہ تم اس کو روک سکتے ہو اور نہ اس وقت میں۔ رات کو میں اپنے علم سے پتا لگاتی ہوں کہ اس کا مقصد کیا ہے، وہ کیوں آئی ہے۔ کل صبح تم لوگ سواری کا انتظام کر کے مجھے لینے آجانا۔ میں وہاں آکر آپ لوگوں کو کچھ بتا سکوں گی۔“

اس وقت دیالی کا چہرہ دستا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ شاید اس خبر نے اسے دھچکا پہنچایا تھا کہ شکست خوردہ چھلل پیری دوبارہ لوٹ آئی ہے، جیسے ہی دیالی نے بات ختم کی۔

واجد کی ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔ ”میرا بیٹا ٹھیک تو ہو جائے گا۔“

دیالی کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔ وہ بولی۔ ”ناامیدی کفر ہے۔ اب کی بار اس کم بخت نے میرے

بڑھاپے کو ڈھال بنایا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہارے گی یا میں جیتوں گی۔" پھر اس نے ان سب کو اٹھ کر جانے کا کہا اور بولی۔ "یا اللہ میں بہت کمزور ہوں۔ تو کمزوروں کا رب ہے۔ اپنے معاملات تیرے سپرد کرتی ہوں۔ مرنے سے پہلے میری عزت رکھ لے۔"

وہ تینوں واپس اپنے گھر کو چلے آئے۔ راستے بھر وہ خاموش تھے کیونکہ دیالی نے انہیں صاف اُمید بھی نہیں دلوائی تھی۔ وہ بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت کا شکار ہو چکے تھے اور اُمید کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

وہ گھر پہنچے تو شام اتر رہی تھی۔ لاتعداد کوؤں نے کل کی طرح آج بھی درخت پر قبضہ کر رکھا تھا اور ان کی کرخت آوازیں دلوں کو چیر رہی تھیں۔

سب کے دل مضمحل تھے۔ ماحول اداس تھا اور فضا ویران دکھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ زمین و آسمان پر یاسیت چھائی ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو واجد بخار سے تپ رہا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں اس کا خون نچڑ گیا تھا۔ زرد اور کملایا ہوا چہرہ، لاغر بدن اور آنکھوں میں خوف۔

رات واجد کی بیوی اور بیٹی ماں کے پاس سوئی تھیں۔ واجد کمرے میں اکیلا تھا اس نے کمرے کے دروازے کی کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اسے لگاتا یا نہ لگاتا ہر حالت میں بے سود تھا کیونکہ اس نے تو چھپکلی بن کر بھی کمرے میں داخل ہو جانا تھا۔ باہر سرد ہواؤں کے تھپیڑے چکرا رہے تھے۔ بار بار دروازے کے پٹ کھول دیتے تھے۔ گھاٹیوں سے گیدڑوں کے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں اور کتے بے تحاشا بھونکے جا رہے تھے۔ فضا میں ایک نامعلوم سا خوف تھا جو سب کے دل و دماغ میں بیٹھ چکا تھا۔

وہ رات کے تیسرے پہر پھر نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے دہشت تھی۔ اس کا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ واجد نے اس سے کہا۔ "مجھ پر رحم کرو کہ ایک ہی بار میری جان لے لو۔ میں اب اس اذیت میں نہیں رہ سکتا۔" وہ رو پڑا تھا۔

چڑیل کے تیور خراب تھے۔ وہ غصے میں بولی۔ "یہ دیالی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ وہ اور وقت تھا جب اس نے مجھے زیر کیا تھا۔ اب میں اسے فنا کر کے دم لوں گی۔" پھر وہ واجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم تو چارہ تھے۔ میرا اصل شکار تو دیالی ہے۔ میں نے اس سے پرانا حساب چکانا ہے۔ اس نے مجھے دھوکے سے جکڑ لیا تھا اب میں اس کی اوقات بتاؤں گی۔ میں ہر رات تمہارے پاس آؤں گی۔ دیالی کو چیلنج کرتی ہوں کہ اگر روک سکتی ہے تو مجھے روک لے۔"

اس نے پھر واجد کے ساتھ گھناؤنا کھیل شروع کیا۔ وہ اب اسے اپنے دانتوں اور ناخنوں سے نوچ بھی رہی تھی۔ جاتے جاتے وہ بولی۔ "دیالی آئے تو اسے یہ زخم دکھا دینا اور اس سے بولنا کہ اگر تمہیں نیست و نابود نہ کیا تو میرا نام بھی......" پھر وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا اور کوے پرواز کرتے اس درخت پر آبیٹھے۔ پھر وہی شور اور پھر وہی نحوست گھر کے در و دیوار پر ناچنے لگی۔

واجد کے بھائی اور شوکت نے اپنے کچھ دوستوں کو تیار کیا اور کھائی گلہ گاؤں میں دیالی کو لینے چلے گئے۔ انہوں نے ایک ڈولی کا انتظام کیا تھا تاکہ اسے آرام سے لاسکیں۔

دوپہر کے وقت وہ واپس آئے۔ دیالی ان کے ہمراہ تھی۔ حالانکہ وہ کہیں آتی جاتی نہ تھی۔ سوالی اس کے پاس چل کر جاتے تھے۔ دیالی کی بنجوسہ میں آمد یہ ظاہر کرتی کہ اب کی بار معاملہ بہت گھمبیر ہے۔ یہ دیالی کی جنگ تھی کیونکہ چڑیل نے دیالی کو براہ راست للکارا تھا۔ وہ دیالی کے علاقے میں دوبارہ گھس آئی تھی۔ یہ علم والوں کی باتیں تھیں اور وہی جانتے تھے کہ کس معاملے کی کڑیاں کہاں ملتی ہیں۔ یہ صاحب نظر لوگوں کے معاملات تھے۔ وہی جانتے تھے کہ کس مسئلے کو کس سطح پر لے جا کر سلجھانا ہے۔

دیالی گھر کے سامنے پہنچی اور بولی۔ "مجھے یہیں اتار دو۔"

ڈولی کو زمین پر رکھا گیا اور اسے عزت و احترام سے اتارا گیا۔ وہ ڈولی سے باہر آگئی۔ گھر کو دیکھا اور تادیر اسے تکتی رہی۔ پھر نظریں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور بولی۔ "یا اللہ! میری مدد کر میرا علم کچھ نہیں جب تک تیری نصرت میرے ساتھ نہ ہو۔ اب کی بار بہت مشکل منزل آپڑی ہے تیری مدد مانگتی ہوں۔"

وہ گھر میں داخل ہوئی تو درختوں پر شور کرتے کوے ایکدم چپ ہو گئے۔ ایسے کہ سب کو ایک ساتھ سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ اشارہ تھا کہ دیالی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔

اسے واجد کے کمرے کی جانب لے جایا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے سب کو پیچھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے دہلیز کے پار قدم رکھا تو واجد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ

پھٹی پھٹی نظروں سے دیالی کو دیکھ رہا تھا۔

دیالی تادیر واجد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ خاموش تھی مگر زیر لب کچھ پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی چارپائی کے گرد تین چکر کاٹے اور اپنا پڑھنا جاری رکھا پھر وہ کمرے کے ہر کونے میں گئی اور کچھ دیر پڑھتی رہی اور بعد میں پھونک دیا۔ اس نے اشارہ کیا اور اپنے لیے کرسی منگوائی پھر کرسی پر بیٹھ کر تادیر کچھ پڑھتی رہی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا چہرہ سرخ سے سرخ ہوتا گیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس پر لرزہ طاری ہو رہا تھا اور پھر وہ اچانک تھم گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے پھر کمرے میں چاروں جانب پھونکا تو واجد کو ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں کچھ شیشے کی دیواریں تھیں جو چٹاخ سے ٹوٹ گئی ہوں۔ ایک تناؤ چھایا تھا جو پھونکنے سے نرم گداز ماحول میں بدل گیا ہو۔ اس نے اپنی ایک پوٹلی سے چار لوہے کی میخیں نکالیں۔ ان پر دم کیا اور واجد کے بھائی سے بولی۔ "انہیں کمرے کے چاروں کونوں میں گاڑ دو۔"

کچی دیواریں تھیں، ہاتھ کے دباؤ سے ہی وہ دیوار میں پیوست ہو گئیں پھر اس نے پوٹلی سے دھاگا نکالا اور اس کے بھائی سے کہا کہ اسے ایک کیل سے دوسری تک باندھتے جاؤ۔ یہ عمل پورا ہوا اور پھر اس نے کمرے کی دیواروں پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرے پھر ایک تعویذ نکالا اور واجد کی ماں سے کہا کہ اسے پانی کے مٹکے میں ڈال دو، سب گھر والے اس مٹکے کا پانی پئیں۔

یہ سب کر کے وہ گھر کے چھوٹے سے صحن میں آگئی۔ اپنی دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی آسمان کی جانب اٹھائی اور کچھ پڑھنے لگی۔ تقریباً دس منٹ وہ کچھ پڑھتی رہی پھر سب گھر والوں کو سامنے کھڑا کیا اور باری باری سب پر پھونکا۔ پھر بولی۔ "وہ بدبخت اب اس کمرے میں داخل نہیں ہو سکے گی مگر وہ آسانی سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ چار پانچ دن میں صوابی سے یوسف یہاں آئے گا۔ اسے پیغام مل چکا ہے۔ ان دنوں وہ کسی ضروری کام میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ یا تو اپنی جان دے دے گا یا پھر اس کی جان لے جائے گا۔ وہ میرا شاگرد ہے اور شیاطین کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے۔ گھر والے اطمینان سے رہیں۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ باقی سب کا اللہ محافظ ہے۔" یہ کہہ کر وہ زور زور سے کلمہ پڑھتی گھر سے باہر چلی گئی۔

رات آئی اور ساتھ ہی خوف و اطمینان دونوں کیفیتیں لے آئی۔ خوف چڑیل کے آنے کا اور اطمینان دیالی کے دم درود کا جو وہ آج کر کے گئی تھی۔ کمرے میں لالٹین روشن تھی۔ مدھم سی لرزتی زرد روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ آسمان صاف تھا اور ٹھٹھرتا ہوا چاند وہیں کہیں اٹکا ہوا تھا۔ نہ ہوا چل رہی تھی اور نہ ہی درختوں کی ٹہنیوں میں کوئی سرسراہٹ تھی۔ یہ سکوت کسی انجانے خطرے سے گھر کے مکینوں کو ڈرا رہا تھا۔ رات اپنے تیسرے پہر میں داخل ہوئی اور پھر اچانک گیدڑ کے چلّانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں چاروں جانب سے آنا شروع ہو گئیں پھر ایک دلخراش چیخ صحن میں بلند ہوئی چیخ اتنی بلند تھی کہ گھر کے مکینوں کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ واجد چارپائی پر پریشان بیٹھا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی ماں، بیوی اور بھائی سامنے فرش پر سہمے سے بیٹھے تھے۔ دیالی ان سے کہہ گئی تھی کہ وہ تم لوگوں کو ڈرا سکتی ہے مگر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ واجد کسی بھی حالت میں اپنے کمرے سے باہر قدم نہ رکھے۔ دیالی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ حلقہ صرف واجد کے گرد دے سکتی ہے کیونکہ چڑیل کا شکار صرف وہی ہے۔

گھر کی چھت ٹین کی تھی اور اس کی ساخت مخروطی تھی۔ کچھ دیر بعد چھت پر پتھر برسنا شروع ہو گئے۔ ٹین کی چھت سے پتھر ٹکراتے تو ایک شور اٹھتا واجد کی بیٹی اٹھ گئی تھی۔ پتھر مسلسل برس رہے تھے اس شور سے اس کی بیٹی رونے لگی۔ واجد اپنی چارپائی پر بے بس سا لیٹا تھا۔ بچی کے رونے کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس نے بیٹی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا پھر پتھر برسنا بند ہو گئے۔ ہوا رک گئی اور سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر تک سکوت چھایا رہا اور پھر کسی کی سسکیوں کی آواز صحن سے آنے لگی۔ رونے کی آواز کبھی مدھم ہو جاتی اور کبھی بڑھ جاتی۔ پھر اتنی بڑھی کہ انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑیں۔ رونا ایسا تھا کہ جیسے بلائیں ماتم کر رہی ہوں۔ سب آیۃ الکرسی اور درود شریف پڑھ رہے تھے۔ یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ کبھی پتھر برستے کبھی رونا شروع ہو جاتا اور کبھی صحن میں تیز ہوا چلنے لگی۔ جب فجر کی اذان مسجد سے آئی تو سب کچھ تھم گیا۔ انہیں ایسا لگا کہ ایک ہیولا سا صحن سے اٹھا اور آسمان کی جانب اڑ گیا ہو۔ کچھ دیر وہ دہشت کے

عالم میں بیٹھے رہے مگر باہر مکمل خاموشی تھی۔ نماز پڑھنے کے بعد کہیں وہ جا کر سوئے۔

اگلے دن وہ سہمے ہوئے اٹھے۔ صحن میں پتھر بکھرے پڑے تھے۔ انہوں نے مل کر انہیں سمیٹا اور اس کا بھائی انہیں باہر پھینک آیا۔ وہ واجد کے کمرے تک تو نہ پہنچ سکی تھی مگر رات بھر اس نے باہر اودھم مچائے رکھا تھا۔

دن چڑھا اور سورج نے اپنا چہرہ دکھا دیا۔ اس کی دھوپ میں تمازت تھی۔ ایک حدت تھی جس کی سب گھر والوں کو ضرورت تھی۔ چند چارپائیاں صحن میں بچھا کر بیٹھے تھے۔ آج سفیدے کے درخت پر کوے نہیں تھے اس لیے صحن میں سکون تھا۔ سب کے چہرے رات والے واقعے سے اترے ہوئے تھے۔ واجد کی ماں اور بیوی کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی اپنی بیٹی کو چارپائی پر لٹائے اس کے سرہانے اداس بیٹھی تھی۔ ماں نے باورچی خانے میں ہانڈی چولہے پر چڑھائی ہوئی تھی کہ اچانک باورچی خانے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ واجد کا بھائی بھاگ کر اندر پہنچا تو دیکھا کہ ہانڈی نیچے فرش پر پڑی ہے۔ سارا سالن اور گوشت بکھرا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے ماں اور بھابی کھڑی سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

رات آئی پھر وہی ہنگامہ شروع ہوگیا جو پچھلی رات ہوا تھا۔ پتھر برسنے لگے، کبھی رونا اور کبھی آہ و زاری۔ پھر گھر کے برتن اڑ اڑ کر ٹکراتے۔ کبھی گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آتیں۔ کبھی بکری کے منمنانے کی اور کبھی دروازہ پیٹنے لگتا کہ جیسے کوئی اسے زور زور سے بجا رہا ہو۔ یہ سلسلہ فجر کی اذان تک جاری رہا۔ اذان بلند ہوئی تو سکوت چھا گیا۔

صبح سورج نکلا تو وہ کمرے سے باہر نکلے کہ پتھر چن کر باہر پھینکیں۔ دیکھا تو صحن کی تمام دیواروں پر تازہ خون کے چھینٹے ہیں اور لکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔ وہ سب خوف اور دہشت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

تیسری رات سکون سے گزری۔ ذرا سی بھی آہٹ نہ ہوئی اور نہ کوئی ہوا کا جھونکا صحن سے گزرا۔ وہ شب بھر انتظار میں بیٹھے رہے مگر کوئی دستک سنائی نہ دی۔ وہ حیران بھی تھے اور مطمئن بھی کہ آج وہ چڑیل ان پر نازل نہ ہوئی تھی۔ وہ رات سکون سے سوئے۔

وہ دوپہر میں دھوپ سینک رہے تھے۔ واجد شب بھر کے انتظار کے بعد کمرے میں سویا تھا۔ بھائی باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ بیٹی دوسری چارپائی پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ اسکول سے سردیوں کی چھٹیاں ہونے کی وجہ سے وہ گھر پر رہتی تھی۔ ماں نے باورچی خانے کی بجائے صحن میں چولہا بنا کر ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ اس دن باورچی خانے میں ہنڈیا ٹوٹنے کے واقعے کے بعد وہ وہاں کم جاتے تھے۔ ساس چارپائی سے اٹھی اور کمرے کی جانب جاتے ہوئے بہو سے بولی کہ تم ہنڈیا دیکھ لو، میں کمرے سے میلے کپڑے نکالتی ہوں۔ آج دھوپ ہے تو کپڑے دھو لیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے لیے باہر آئی۔ بہو پیٹھ کیے ہنڈیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے بہو سے کہا۔ ”کپڑے بہت جمع ہوگئے ہیں انہیں دھونا شروع کرتے ہیں تاکہ شام سے پہلے سوکھ جائیں۔“

بہو بولی۔ ”رات کو چین کی نیند بھی نہ سو سکوں اور گھر کے کام ہیں کہ ختم ہونے کو نہیں آتے۔“

بہو کا لہجہ اور الفاظ سن کر ساس بھڑک اٹھی اور بولی۔ ”تو ہے ہی بدذات۔ گھر میں مصیبت پڑی ہے اور تجھے اپنے آرام کی پڑی ہے۔“

بہو نے جواب دیا۔ ”مصیبت تو تمہارا بیٹا لایا ہے۔ اس چڑیل کو بھی نہیں بخشا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں اپنا منہ کالا کرتا رہا اور سزا ہم ماں بیٹی کو ملی ہے۔ اچھا ہے اسی کے ساتھ کہیں بھاگ جائے تاکہ میری تو جان چھوٹے۔“

یہ سن کر ساس کا پارہ ایک دم چڑھا اور وہ لپک کر اس کے پاس پہنچی۔ اس کے پیچھے جا کر اسے کندھے سے پکڑا اور اپنی طرف گھمایا تو ساس کی چیخ نکل گئی۔ بھیانک چہرہ، لمبے دانت، خونخوار آنکھیں دیکھ کر وہ پیچھے کی جانب بھاگی۔ وہ وہی چڑیل تھی۔ بہو کا روپ بدل کر بیٹھی تھی۔ ساس کی چیخ سن کر واجد کی بیوی غسل خانے سے باہر آئی۔ چڑیل کو دیکھا تو وہ بھی زور زور سے چیخنے لگی۔ واجد بستر سے اٹھ کر کمرے کے دروازے تک آیا اور جب چڑیل کو اصل روپ میں دیکھا تو وہیں دہلیز پر رک گیا۔ اب باہر ماں اور بیوی دونوں چلا رہی تھیں اور چڑیل قہقہے لگاتی دیوار پر چڑھی اور پار کود گئی۔

وہ چلی گئی مگر ان کا چلانا نہ رکا۔ خوف سے دونوں کانپ رہی تھیں۔ چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ وہ دونوں روئے چلی جا رہی تھیں۔ واجد کی بیوی بھاگ کر اپنی بیٹی کو اٹھا لی۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ واجد نے ماں سے کہا۔ ”دروازے پر جا کر دیکھو، کون آیا ہے؟“

ماں سسکیاں لیتی اور کانپتی ہوئی اٹھی۔ دروازے پر جا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

باہر سے آواز آئی۔ ”میں زاہد یوسف ہوں۔“

ماں نے سر پر چادر درست کی اور لپک کر دروازہ کھولنے بڑھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے وہ کھڑا تھا۔ عمر کوئی پینتالیس برس کے قریب ہوگی۔ داڑھی کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ سر پر ٹوپی، کاندھے پر چادر اور ایک بیگ لٹکائے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر دھوپ والے سیاہ چشمے اور قد درمیانہ تھا۔ اس کا چہرہ کسی انجانی روشنی سے دمک رہا تھا اور اس کی جانب نظر اٹھتی تو ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی مگر اس کے سرخ و سپید چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔

ماں راہ سے ہٹی سلام کیا اور زاہد یوسف سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ واجد کی خوف زدہ بیوی نے سلام کیا اور اس نے بغیر اس جانب دیکھے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ نپے تلے قدم اٹھاتا وہ صحن کے وسط میں آیا اور وہیں رک گیا۔ اپنے باوقار اور پُررعب چہرے کو گھما کر گھر کی در و دیوار کو دیکھا۔ اتنے میں واجد دہلیز پر آیا اور اس سے ہاتھ ملانے کے لیے قدم بڑھائے۔ یوسف نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا۔ ”وہیں ٹھہر جاؤ۔ استانی صاحبہ کے حکم سے روگردانی نہ میں کرسکتا ہوں اور نہ ہی کوئی اور......“ اس کی آواز میں دبدبہ تھا۔ کوئی ایسی بات تھی کہ سب بت بنے کھڑے تھے۔

وہ کمرے میں داخل ہوا اور چاروں طرف پھر کر اس کا جائزہ لیا۔ بے تاثر اور سپاٹ چہرے کے ساتھ بڑے غور سے دیواروں اور چھت کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں واجد کا بھائی اور شوکت بھی آگئے۔ انہوں نے سلام کیا تو اس نے باآواز بلند جواب دیا.. پھر اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ زیر لب پڑھ رہا تھا ہلتے لب سے پھسلتی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کمرے میں بہت سے پتنگے اڑ رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے وہ واجد کے روبرو آیا۔ اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر کے پیچھے لے گیا اور اچانک اس کے بالوں کو جکڑ لیا۔ اس نے اپنا سیاہ چشمہ نہیں اتارا تھا۔ وہ واجد کے چہرے پر نظریں گاڑے بے حرکت کھڑا رہا۔ وہ جب سے آیا تھا، اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا کہ آگے والا جان سکے کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔

اس نے واجد کے چہرے پر پھونک ماری اور بال چھوڑ دیے۔ چلتا ہوا واپس صحن میں آیا۔ واجد کا بھائی اور شوکت دونوں بھی صحن میں چلے آئے۔ دونوں کی حالت ایسی تھی کہ جیسے انہیں کسی نے اپنے سحر میں باندھ دیا ہو۔ وہ ان دونوں سے بولا۔ ”رات میں تمہارے پیچھے والے گھر میں اکیلے گزاروں گا۔ میں چلتا ہوں اور تم لوگ چار روٹیاں اور پانی کا انتظام کردو گے۔“ پھر وہ مڑ کر واجد کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”کل رات تم بھی اسی گھر میں ٹھہرو گے۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ ہوگا۔“ اس نے ایک لمحاتی توقف کے بعد واجد سے کہا۔ ”شام سے پہلے تم وہاں پہنچ جانا اور اگر سفید کرتا شلوار ہو تو وہ پہن کر آنا۔“ اس نے گھر سے باہر نکلنے سے پہلے اس کے بھائی سے کہا۔ ”کل بھی شام کو چار روٹیاں اور پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں پرسوں واپس چلا جاؤں گا۔ اگر زندہ رہا تو۔“

وہ گھر سے باہر نکلا تو سب لوگوں نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔ ایک سحر تھا، کوئی طلسم تھا جو اس کے جاتے ہی ٹوٹ گیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

اللہ نے زاہد یوسف میں کوئی ایسی قوت اور کشش رکھی تھی کہ وہ خود تو چلا گیا تھا مگر گھر والے ابھی تک خاموش اور سراسیمہ تھے کہ جیسے چڑیل اب بھی یہیں موجود ہو۔

واجد کا بھائی اور شوکت روٹیاں بنوا کر پیچھے بنجوسہ گاؤں میں پہنچے زاہد یوسف پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہی سیاہ چشمہ لگائے وہ گھر کے ارد گرد درختوں کو جانچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً چھ انچ لمبا لوہے کا ٹکڑا تھا۔ وہ کچھ پڑھ کر ہر درخت کے تنے پر اس لوہے کے ٹکڑے سے نشان لگا دیتا۔ جیسے ہی نشان لگتا تو اس درخت کے پرندے فر سے اڑ جاتے۔ وہ نشان ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ایک مربع بنا کر اس میں لکیریں کھینچ دیتا تھا۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھا اور اس نے ان دونوں کی جانب ایک لحظے کو بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بات کی تھی۔

درختوں سے فارغ ہوا تو گھر کے پیچھے جنگل کی طرف گیا۔ جنگل کے کنارے پر گھر کے متوازی ایک لمبی لائن اسی لوہے کے ٹکڑے سے کھینچی۔ پھر لائن کے سروں پر کاٹنے کے نشانات لگائے۔ وہ اس دوران کچھ پڑھتا بھی رہا تھا۔ نشانات لگانے کے بعد وہ جنگل کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کھول کر رخ جنگل کی جانب کیا۔ کچھ پڑھا... تو قریب سے دور تک کے درختوں کے پرندے شور مچاتے اپنے ٹھکانے بدلنے کے لیے پرواز کر گئے۔

وہ جنگل سے واپس آیا۔ گھر کے چاروں جانب اسی

لوہے کے ٹکڑے سے ایک انچ کے قریب گہری کھدائی کی۔ اس مٹی کو ایک ڈھیر کی صورت جمع کیا اور اس پر کھڑے ہو کر اس طرح کچھ پڑھتا رہا جیسے لوگ قبروں پر پڑھتے ہیں۔ وہ پندرہ منٹ تک پڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے پڑھائی ختم کی تو مٹی اس طرح سے سرخ ہو چکی تھی کہ جیسے اس میں خون ملایا ہوا ہو۔ واجد کا بھائی اور شوکت کھڑے حیرت سے یہ سب دیکھ رہے تھے مگر زاہد یوسف کا چہرہ پہلے کی طرح ہر قسم کے تاثرات سے پاک تھا۔ اس کی پڑھائی سے وہ دونوں ناقابل یقین قسم کے واقعات دیکھ رہے تھے اور زاہد یوسف کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کوئی عام سا کام کر رہا ہو۔ نہ اسے پذیرائی چاہیے تھی اور نہ ہی کوئی مداخلت۔

اس نے وہ مٹی چاروں جانب اس کھدی ہوئی لائن میں بچھا دی۔ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا، سوائے مرکزی دروازے کے۔ مرکزی دروازے پر نہ اس نے کھدائی کی تھی اور نہ ہی مٹی بچھائی تھی۔

فارغ ہوا تو ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے ان دونوں کو بلایا اور اپنے بھاری لہجے میں کہا۔ ”آدھا کنستر مٹی کے تیل کا لے آؤ۔“ اور اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولے۔

”چار روٹیاں اور پانی لائے ہو؟“

شوکت نے فوراً روٹیوں والا لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور پینے کے لیے پانی وہ باہر سے بھر کر لائے تھے۔

واجد کا بھائی مٹی کا تیل لینے چلا گیا۔ شوکت اس کے پاس رکا رہا کہ کوئی کام نہ پڑ جائے۔ دوپہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے وضو کیا۔ روکھی روٹی پانی کے ساتھ کھائی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر نماز پڑھی۔ نماز پر کھڑے ہونے سے پہلے اس نے شوکت سے کہا۔ ”اس لڑکے سے جا کر بولو کہ ایک لالٹین اور ایک ماچس کی ڈبیا بھی لیتا آئے۔“

وہ مٹی کا تیل لے آئے۔ ساتھ میں لالٹین اور ماچس کی دو ڈبیاں بھی۔ زاہد یوسف نے درخت سے ایک موٹی شاخ توڑی۔ اس پر بستر کی چادر لپیٹ کر ایک مشعل تیار کر لی اور اسے مٹی کے تیل میں ڈبو دیا۔

واجد کے بھائی نے اس سے بڑے ادب سے پوچھا۔ ”مولوی صاحب! کوئی اور حکم ہو تو بتا دیں۔“ وہ پہلی بار ہلکا سا مسکرایا اور جواب دیا۔ ”یہ زندگی اور موت کی جنگ ہو گی۔ اب بات اس سے آگے بڑھ چکی ہے کہ اسے باندھ کر کہیں دور بہت دور پھینک آئیں۔ اس نے استانی جی سے کیا ہوا وعدہ توڑا ہے اور ساتھ ہی اس کو للکارا بھی ہے۔ اب یا تو وہ چڑیل جان سے جائے گی اور یا پھر استانی جی کا دبدبہ۔ استانی جی کے لیے میری ایک جان تو کیا اگر سو جانیں بھی ہوتیں تو انہیں بھی قربان کر دیتا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے سیاہ چشمہ اتارا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا تو وہ ایک ایک قدم پیچھے ہو گئے۔ دو دہکتے انگارے تھے جو آنکھوں کی جگہ پیوست تھے اس کی نظریں اٹھیں اور دو شعاعیں ان کی جانب لپکیں اور ان دونوں کے بدن سن ہو کر رہ گئے۔ اس نے دوبارہ چشمہ لگا لیا۔ اس نے ان کو ایک تعویذ دیا کہ واجد کو یہاں لاتے وقت اسے پانی میں گھول کر پلا دینا۔

ان دونوں کو واپس بھیج کر یہ تاکید کی کہ کل صبح چار روٹیاں لانی ہیں اور شام سے پہلے واجد کو ہر حالت میں یہاں لانا ہے۔ وہ دونوں واپس گاؤں کی طرف آ گئے۔

ان دونوں کے بجوسہ پہنچتے پہنچتے آسمان دھندلا ہوتا گیا۔ آثار تھے کہ شام تک برف باری شروع ہو جائے گی۔ ہوا تھمی تھی اور پورے پہاڑ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

پہاڑ پر شام اترتے دیر نہیں لگی۔ ادھر اندھیرا اترا اور ساتھ میں برف گرنا شروع ہو گئی۔ برف کے گالے آہستہ آہستہ زمین پر پڑنا شروع ہوئے اور مکین گھروں میں دبک گئے۔

برف باری نے رات کی چادر کو اور سیاہ کر دیا تھا۔ ایک دہشت ہر جانب چھائی تھی۔ گاؤں میں تو لوگ جلدی سو جاتے ہیں مگر ان کے لیے رات ایک دہشت لے کر آئی تھی۔ واجد کی بیوی نے اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ چمٹا کر سلایا ہوا تھا۔

ماں نے عشاء کی نماز ادا کی اور چارپائی پر رضائی اوڑھ کر لیٹ گئی۔ رات کے تیسرے پہر وہی ہنگامہ شروع ہو گیا۔ برف کے ساتھ ساتھ پتھر بھی چھت پر گرنے لگے۔ تیز ہوا صحن میں چل رہی تھی، آہ و بکا شروع ہو گئی، چیخنا چلانا شروع ہوا جو بہت دیر جاری رہا پھر دونوں کمروں کے دروازے پیٹنا شروع ہو گئے۔ سب دم سادھے خوف سے سہم کر بیٹھے تھے۔ ماں اور واجد کی بیوی با آواز بلند قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگیں۔ تلاوت کی آواز سے شاید چڑیل کو تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ زور سے چیخنا شروع کر دیتی۔ اس کے رونے اور چیخنے سے گھر تک لرز رہا تھا۔ واجد کا خوف جاتا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس زندگی سے

موت ہی بہتر ہے۔ جو موت کی تمنا کرنے لگے تو وہ بے خوف ہوجاتا ہے۔ کل رات اس کے لیے زیادہ بھاری تھی۔ اگر زاہد یوسف شکست کھاتا تو اس کی موت یقینی تھی۔ وہ مرنا چاہتا تھا۔ بلے اس کمرے میں مرے یا بنجوسہ گاؤں کے گھر والے کمرے میں۔ وہ بھیانک چڑیل باہر برفانی رات میں ہوا کے ساتھ ساتھ صحن کے اندر پھرتی رہی۔ چار پائیاں توڑ ڈالیں۔ برتن توڑ دیے۔

پھر ماں کے کمرے کے دروازے پر ہواؤں نے دستک دینا شروع کردیا۔ ہوا آہستہ آہستہ بپھر رہی تھی۔ تیز سے تیز تر ہوا کا دباؤ بڑھا تو کمرے کا دروازہ چوکھٹ سے اکھڑا اور دھڑام سے اندر جا گرا۔ شکر تھا کہ گھر والوں کی چار پائیاں دور تھیں۔ کھلے دروازے سے ہوا اندر داخل ہوئی اور بگولے کی طرح کمرے میں گھومنے لگی۔ وہ سب چلّا رہے تھے۔ اللہ کے واسطے دے رہے تھے۔ ہوا کے تھپیڑوں ... سے ان کی رضائیاں تک بے قابو ہورہی تھیں واجد کی بیٹی نیند سے جاگ اٹھی اور وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔ بیٹی کی رونے کی آواز سن کر واجد اپنے کمرے میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ہوا ذرا دیر کو تھم جاتی اور دوبارہ پھر سے چلنے لگتی۔ کمرے کا سامان تتر بتر ہو رہا تھا۔ یہ قیامت فجر کی اذان تک قائم رہی۔ اذان کی آواز آئی تو ہوا شوریدہ ہوئی باہر نکلی اور آسمان کی جانب اڑ گئی۔ باہر برف پڑ رہی تھی صحن برف کی چادر میں سفید ہو رہا تھا اور ہوا نے اس کو چھوا بھی نہ تھا۔

صبح تک وہ سردی میں بیٹھے کپکپاتے رہے۔ وہ واجد کے کمرے میں بھی نہ جاسکتے تھے کیونکہ دیالی کا حکم تھا کہ وہ رات کو اکیلا کمرے میں سوئے گا۔ برف باری صبح تک رک چکی تھی اور پورا پہاڑ سفیدی کی تہہ لیے خاموش تھا۔

شوکت صبح ہی صبح پہنچ گیا تھا۔ ماں نے روتے ہوئے کمرے میں چولہا بنایا۔ روٹیاں بنائیں اور وہ دونوں روٹیاں لے کر نیچے گاؤں کی جانب چلے۔ وہاں زاہد یوسف کمرے میں مصلے پر بیٹھا تھا۔ لگتا تھا کہ رات بھر وہ عبادت کرتا رہا تھا۔ انہوں نے اسے روٹیاں دیں اور شام سے پہلے آنے کا کہہ کر واپس چلے آئے۔

سردیوں کے دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ ظہر کی نماز واجد اور اس کے بھائی نے گھر میں پڑھی۔ دھند آسمان تک چھائی تھی۔ اس کے بھائی نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ برف گرنا شروع ہو۔ ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

ماں نے زاہد یوسف کا تعویذ واجد کو گھول کر پلایا پھر اس کے سامنے کھانا رکھا جو اس سے دو لقمے بھی نہیں کھایا گیا۔ اس کے بھائی نے بھی تھوڑا بہت کھایا۔ شوکت ترکھان پکڑ کر ماں کے کمرے کا دروازہ ٹھیک کروا چکا تھا۔ واجد کی بیوی کچھ نہ کچھ پڑھ کر خاوند پر پھونکتی جاتی تھی۔ وہ لاغر ہو چکا تھا۔ کندھے ڈھلک گئے تھے۔ اپنی جس طاقت اور ہمت پر وہ نازاں رہتا تھا وہ چند دنوں میں فنا ہو چکی تھی۔

وہ گھر سے چلے اور شام سے پہلے بنجوسہ گاؤں میں اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ گھر کو دیکھ کر واجد اور سراسیمہ ہوگیا۔ اس پر وحشت چھانے لگی۔ اسے وہی برفانی رات یاد آگئی جس میں اس سے ایسا کام ہوگیا تھا، ایک ایسی انہونی ہوئی تھی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک چڑیل خوب صورت لڑکی کے روپ میں اس سے آٹکرائی پھر اس پر عذابوں اور حسابوں کا سلسلہ شروع ہوا جو چند دن نہیں بلکہ سالوں پر محیط لگتا تھا۔

زاہد یوسف کمرے کی چار پائی پر لیٹا تھا۔ ایک سپاٹ چہرے کے ساتھ جس پر نہ کوئی شکن اور نہ کوئی تاثر اور نہ کوئی تشویش۔ اس کے لیے شاید یہ کوئی آئے دن کا کھیل تھا جو وہ اپنی انگلیوں پر کھیلتا تھا۔

اس نے واجد کو دیکھا تو لیٹے لیٹے اس سے بولا۔

”اسی چار پائی پر بیٹھو جہاں اس رات سوئے تھے۔“

واجد شرمندہ سا کونے والی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شوکت اور واجد کے بھائی کو کہا کہ بیٹھک میں سے ایک چار پائی کے علاوہ سارا سامان کہیں دوسری جگہ رکھ دو۔ وہ سر ہلاتے باہر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ فارغ ہوکر آئے۔ زاہد یوسف اٹھ کھڑا ہوا۔ واجد کو کمرے میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود ان دونوں کے ہمراہ مرکزی دروازے سے باہر نکل آیا۔ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جو مٹیالے بادلوں سے بھرا تھا۔ برف گرنے کو تھی۔ ہوا ساکن اور درخت خاموش تھے۔ ایک مکمل سکوت چار سو پھیلا تھا۔ پوری فضا کسی کے قبضے میں جکڑی نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جنگ کا طبل بجے گا اور پھر گھمسان کا رن شروع ہوگا۔

جائزہ لے کر اس نے دونوں کو کہا۔ ”تم دونوں گھر سے دو دو سو گز دور رہو گے۔ قریب آنے کی کوشش نہ کرنا۔ اچھا ہے کہ یہ گھر آبادی سے ہٹ کر ہے ورنہ آس پاس کے گھر مجھے خالی کروانے پڑتے۔“ اس کے چہرے پر اطمینان

تھا۔ وہ ان کو تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ بھی سنو یا کچھ بھی دیکھو یا محسوس کرو، اس گھر کے قریب نہ آنا اور جب فجر کا ٹائم ہو جائے تو بلا جھجک چلے آنا۔ اگر ہم دونوں مردہ پڑے ہوں تو ہماری لاشیں اٹھا کر دیالی کے پاس لے جانا۔“ وہ خاموش ہوا اور ان دونوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر میں برف باری شروع ہوگئی۔ واجد ٹھٹھرا ہوا چار پائی پر بیٹھا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے کبھی زاہد یوسف کو تکتا اور کبھی کمرے کی چھت کو۔ زاہد یوسف نے اس کی چار پائی کے ساتھ کونے میں اوپر تلے رکھے ٹرنک دیکھے اور واجد سے بولا۔ ”تم اس کمرے میں رہو گے اور اسی چار پائی پر بیٹھو گے۔ میں بیٹھک میں ہوں گا۔ وہ آئے تو مجھے خبر ہو جائے گی۔ تم نے چار پائی سے نیچے نہیں اترنا ہے۔“ کچھ لمحے اس نے توقف کیا اور پھر اس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔ ”جب میں کمرے میں داخل ہوں تو اس کی توجہ میری جانب ہو جائے گی اور اسی دوران تم فوراً ان ٹرنکوں کے پیچھے چھپ جانا۔ وہ آئے گی تو اسے بیٹھک میں میری موجودگی کا پتا نہیں چلے گا اور جتنی بھی اس کی چیخ و پکار ہو، تم نے منہ سے آواز تک نہیں نکالنی۔“

یہ سب ہدایات دینے کے بعد اس نے جائے نماز بچھائی اور شام کے فرض ادا کرنے لگا۔ نماز کے بعد اس نے اپنے چشمے اتار دیے اور دو چراغ جلنے لگے۔

وقت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ لمحے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ انجانے خطرے سے واجد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ عشاء کی نماز کے لیے زاہد یوسف نے تیاری شروع کی تو ساتھ واجد بھی آ کھڑا ہوا۔ نماز کے بعد زاہد یوسف نے مختصر سی دعا کی اور آمین کہتے ہوئے دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

زاہد یوسف کمرے سے نکلتے ہوئے واجد سے بولا۔ میں بیٹھک میں کچھ دیر آرام کر رہا ہوں۔ دروازے کے پٹ بھیڑ دینا مگر کنڈی نہیں لگانی ہے۔ چڑیل کے آنے سے پہلے میں اس کی بو سونگھ لوں گا۔ تم اس کو باتوں میں لگانا.... جب تک کہ میں کمرے میں داخل نہیں ہو جاتا۔

وہ چلا گیا۔ کمرے میں لالٹین کی ہلکی سی روشنی پھیلی تھی۔ مکمل خاموشی طاری تھی۔ نہ کوئی کھٹکا تھا اور نہ کوئی آواز۔ وقت تھم گیا تھا۔ سب کو اس کا انتظار تھا۔ لگتا تھا کہ باہر کے درخت، ہوائیں، زمین اور آسمان سب اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ سب دم سادھے ہوئے تھے۔ صرف جو چیز حرکت میں تھی وہ برف کے گالے تھے جو آہستگی سے زمین بوس ہو رہے تھے۔

رات کے دو بجے تھے۔ زاہد یوسف غنودگی کے عالم میں بیٹھک کے اندر چار پائی پر لیٹا تھا کہ اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ لیٹا رہا۔ اس نے فضا میں کوئی جنبش محسوس کرلی تھی۔ کوئی جھونکا تھا جو گھر کے اردگرد چکر کاٹ رہا تھا۔ ایک سرسراہٹ تھی جو گھر کے چاروں جانب دوڑتی پھرتی تھی۔ اس ہوا میں پھر تندی بھر آئی اور وہ دیواروں سے سر پٹخنے لگی۔ زاہد یوسف کے بنائے ہوئے حلقے نے شاید اس کے راستے مسدود کردیے تھے۔ اس کے جال میں وہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچتا رہا تھا اور وہ گھر کا مرکزی دروازہ تھا جسے زاہد یوسف نے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہتی تھی کیونکہ پھر واپسی کا وہی راستہ اسے استعمال کرنا پڑتا، جسے زاہد یوسف اس پر گھاؤ لگانے یا ملیامیٹ کرنے کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ یہ باتیں یا تو چڑیل جانتی تھی یا زاہد یوسف۔ یہ انجان دنیا کے اصول تھے جسے وہ جان سکتے ہیں جن کا وہاں آنا جانا لگا رہتا ہے۔

وہ کہیں اور سے داخل ہونے میں ناکام ہوئی تو ہوا کا ایک ٹھنڈا تیز جھونکا تیزی سے اندر گھسا۔ زاہد یوسف چار پائی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے پشاوری چپل کے تسمے چڑھائے اور کھڑا ہوگیا۔ یہ لمس تھا جسے صرف زاہد یوسف جیسا شخص محسوس کرسکتا تھا۔

واجد کو تب معلوم ہوا جب وہ اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بھیانک تھے اور مسکراہٹ تھی۔ یہ وہ نہ تھی جو اسے پہلی رات ملی تھی۔ یہ وہ تھی جو اسے کبھی نہ ملی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ واجد کی نظر اس کے چہرے سے نیچے گئی تو بمشکل اپنی چیخ کو دبا سکا۔ وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ کوئلے جیسا کالا جسم، لمبی اور پتلی کالی گردن، کلائیوں تک بازو چھوٹے اور ہاتھ بازو سے بھی بڑے اور لمبے تھے۔ ناخن بڑے بڑے جو آگے سے نوکدار بن گئے تھے۔ پتلے بدصورت پاؤں پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے نقوش اور زیادہ بھیانک ہو گئے۔ بھنویں کمان کی طرح تن گئیں اور ناک لٹک کر منہ کے نیچے آ گئی۔ دانت لمبے اور ٹھوڑی کے نیچے تک لمبے ہو گئے۔ کبوتر کے انڈے جتنی گول آنکھیں

دہکتی تھیں۔ بال بکھرے تھے اور کمر تک جھول رہے تھے۔ اس بھیانک چہرے پر وحشت تھی پھر وہ جیسے مسکرائی تو چہرہ اور زیادہ بھیانک ہوگیا۔ اسے دیکھ کر واجد کا سر چکرانے لگا۔ آنکھیں پھیل گئیں اور زبان خشک ہوگئی۔ وہ خونخوار لہجے میں بولی۔ ''دھوکے باز، تم بھی اوروں کی طرح بے وفا نکلے۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ مجھے اس کی خبر نہ ہوگی۔ وہ چالاک دیالی کا بزدل چیلا۔ پہلے میں اس سے نمٹوں گی تاکہ تو میرا یہ روپ بھی دیکھ لے اور پھر تجھے تو میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھاؤں گی۔'' اس کے بعد اس نے کرخت قہقہہ لگایا جسے سن کر واجد بے ہوش ہوگیا۔

وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ چڑیل نے معلوم نہیں کیا اس کے ساتھ کیا کہ وہ جاگ گیا۔ ادھر اُدھر دیکھا اور جب چڑیل کو دیکھا تو پھر سے لرزنے لگا۔ اس سے وہ کہہ رہی تھی۔ ''دیالی کا بزدل چیلا سمجھتا ہے کہ میں اس کی موجودگی کو بھانپ نہیں سکوں گی۔ کم ظرف ہے دیالی اور اس کا چیلا۔ وہ تمہیں چارہ بنا کر یہاں لایا ہے۔ تیرے سامنے اس کا حشر کروں گی اور پھر تمہارا۔'' وہ بول کیا رہی تھی کہ جیسے دسیوں کوے مل کر کرخت آواز نکالتے ہیں۔ اس کے منہ کی جانب وہ دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک غلاظت اور گندگی کا ڈھیر تھا۔ اس کی بدبو پورے کمرے میں پھیلی تھی۔ وہ زمین پر نہ تھی بلکہ فضا میں معلق تھی۔

وہ قہقہے لگا رہی تھی۔ واجد کا دل اس کرخت آواز سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ متواتر کہے جا رہی تھی۔ ''کہاں ہے تو بزدل چوہے، دیالی کے مکار چیلے۔ آج تیری اور دیالی کی موت میرے ہاتھوں ایسی بھیانک ہوگی کہ پورے علاقے میں پھر کوئی سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔''

وہ دروازے کی جانب گھومی تو دروازے کے پیچھے زاہد یوسف کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ واجد نے اسے دیکھا تو سرعت سے ٹرنکوں کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ وہ آڑ میں ہوکر انہیں دیکھ بھی سکتا تھا۔ واجد کا خوف وہ نہ تھا جو پہلے دن تھا۔ وہ اس کے ساتھ وقت گزار چکا تھا اس لیے قدرے نڈر ہوگیا تھا۔ یہ سب دیکھنے کا حوصلہ رکھتا تھا ورنہ پہلی بار اسے کوئی دیکھ لیتا تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔

زاہد یوسف دروازے کے بیچ میں کھڑا ہاتھ سینے پر باندھے بغیر پلکیں جھپکائے شدید نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی۔ چڑیل نے اسے دیکھا اور اپنے پاؤں زمین پر لگا دیے۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ واجد ٹرنکوں کے پیچھے سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ زاہد یوسف کی بہادری اور بے خوفی کا قائل ہوگیا تھا۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔

زاہد یوسف نے چڑیل سے کہا۔ ''بہت برا کیا ہے تو نے واپس آکر۔ دیالی نے مجھے تیرے بارے میں پہلے ہی سے سب بتا دیا تھا۔'' اس کے لہجے میں ایک قہر تھا کہ واجد کا دل بھی کانپ گیا۔ زاہد یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس سے پہلے میں تیری تلاش میں آتا، اچھا کیا تو نے جو خود موت کے منہ میں چلی آئی۔ تو نے دیالی کو دیا ہوا وعدہ توڑا ہے اور سزا کی حق دار ہے جو تمہیں مل کر رہے گی۔''

چڑیل غرانے لگی۔ بولی۔ ''میرے ہاتھوں پچاس سال پہلے علاقے کا ایک کسان مارا گیا تھا۔ دیالی کو میں نے کئی وضاحتیں دیں کہ یہ سب غلطی سے ہوا ہے مگر اس نے مجھے معاف نہ کیا۔ میں اس سے بات کرنے گئی تھی اور اس نے اپنے مؤکلوں سے مجھے دھوکے میں باندھ دیا تاکہ مجھے کہیں دور دراز کے علاقے میں چھوڑ آئے۔ مجھے اپنے عمل سے سالوں وہیں قید رکھا۔ پھر کسی نے میری مدد کی اور مجھے قید سے نجات دلوائی۔ میں بھٹکتی رہی۔ میرا سینہ اب بھی دیالی کی نفرت سے جل رہا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہوگی مگر اس نے اپنے اردگرد حصار باندھ رکھے ہیں تجھے مار کر میں وہ حصار توڑ ڈالوں گی پھر اس خبیث بڑھیا کی موت میرے ہاتھوں ہوگی۔''

زاہد یوسف دہاڑا۔ ''اپنی زبان کو لگام دے۔ اس کا نام تمیز سے لے۔ وہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی۔ تجھ کو انسانوں میں آنے کی اجازت کیا ملی کہ تو انہیں ستانے لگی۔ اس علاقے میں خاص کر اور کہیں بھی تمہاری وجہ سے یا تمہارے جیسے شیطانوں کی وجہ سے انسانوں کو نقصان پہنچے، یہ دیالی کو گوارا نہیں۔ وہ کبھی اسے برداشت نہیں کرسکتی۔ تو نے دیالی کو ایک بار پھر بھڑکا دیا ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ ضعیف ہوچکی ہے؟ تجھے تو اندازہ ہی نہیں کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور ہوگئی ہے۔ میں اور میرے جیسے کئی اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے اپنے سر کٹانے کو تیار ہیں۔ تو نے دیالی کے گھر پر دھاوا بولا تھا۔ وہ دیالی جس کی آنکھ کے ایک اشارے سے تیرے جیسے تباہ و برباد ہوجاتے ہیں۔''

چڑیل نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ پھر بولی۔ ''اپنے جیسے کئی اور بھی لے آ پھر میرا مقابلہ کر۔''

وہ بولا۔ ''تجھے ختم کرنے میں مجھے ذرا برابر بھی دیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد مجھے دیالی کے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔''

زاہد چند قدم آگے بڑھا۔ وہ اب لگاتار کچھ پڑھ رہا تھا۔ چڑیل نے زمین چھوڑی اور دوبارہ کمرے کے خلا میں تیرنے لگی۔ وہ پینترے بدل رہی تھی اور زاہد یوسف اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ وہ اب زور زور سے کچھ پڑھنے لگا۔ یہ بپھری اور اڑتی ہوئی اس کے اوپر گئی اور بائیں ہاتھ سے اسے گردن کے نیچے ضرب لگائی۔ زاہد یوسف نے بچنے کی کوشش کی مگر اس نے اتنی تیزی سے ہاتھ گھمایا کہ وہ اڑتا ہوا بائیں جانب دیوار پر لگ کر زمین پر آگرا۔ وہ ابھی بمشکل اٹھا ہی تھا کہ چڑیل نے دائیں لات پیٹھ پر ماری تو وہ اڑتا ہوا چھت کے قریب اسی دیوار پر جا لگا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ کسی کٹے درخت کی مانند زمین پر آرہا۔ چڑیل کے قہقہے کمرے کو لرزا رہے تھے۔ وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے زور زور سے اپنی پڑھائی کرتا جا رہا تھا۔ چڑیل کی بھیانک ہنسی تھمتی نہ تھی۔ وہ اسے کہہ رہی تھی۔ ''اپنی آستانی کو بلا۔ وہ اس وقت خود چلے میں بیٹھ گئی ہے اور تجھے موت کے منہ میں ڈال دیا ہے۔''

وہ ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ایک لمبی چیخ کے ساتھ اس کی دائیں ٹانگ پکڑ کر اسے گھما دیا اور دیوار پر دے مارا۔ واجد سمجھا کہ اب کے وہ نہیں اٹھ سکے گا۔ واجد کا خوف عود کر آیا۔ جس کو وہ نجات دہندہ سمجھ رہا تھا وہ خود لہولہان ہو رہا تھا۔ خون اس کے سر سے نکل کر اس کے چہرے پر دھاریوں کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس کی گردن اور قمیص کا کالر بھی خون سے رنگین ہوچکا ہے۔ وہ پھر دیوار سے ٹکرا کر ایک چارپائی پر آگرا۔ اس کا چہرہ خون رخون تھا اور اس نے اپنا ورد جاری رکھا ہوا تھا۔ وہ چارپائی پر پڑا رہا۔ چڑیل اس کے اوپر خلا میں معلق تھی۔ وہ طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''ابھی تو تیرے بنائے ہوئے حصے نے میری آدھی طاقت لے لی ہے پھر بھی میں تمہیں اگر اپنی دو انگلیوں کے بیچ میں دباؤں تو تمہارا قیمہ بن جائے۔'' وہ اڑتی ہوئی گئی اور سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں خوفناک ہاتھ اپنے بالوں میں دے کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگی۔ واجد ٹرنکوں کے پیچھے چھپا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسے اپنی یقینی موت صاف نظر آرہی تھی۔ وہ چارپائی پر گرے ہوئے زاہد یوسف سے کہنے لگی۔ ''میرا اگلا وار آخری ہوگا۔ تیری لاش اٹھانے سے پہلے دیالی اپنے انجام تک پہنچ چکی ہوگی۔''

وہ بمشکل اٹھا۔ اس سے اپنا سر بھی نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم کی بیشتر ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ سر پر شدید ضرب لگنے سے خون متواتر بہے چلا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے چارپائی سے نیچے اترا۔ اس کی داڑھی بھی خون آلود تھی۔ ورد اس کا جاری تھا۔ خون آلود چہرے پر سرخ چمکتی آنکھیں جیسے شعلے برسا رہی ہوں۔ اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ ادھر چڑیل پر ہذیانی کیفیت طاری ہوچکی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر اور زیادہ خوفناک ہوگئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ خلا میں بلند ہوکر غرانے لگی۔ اس کے دہانے سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کی کریہہ شکل کو دیکھ کر ٹرنک کے پیچھے دبکے واجد نے اپنی آنکھوں اور کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

زاہد یوسف کھڑا ہوگیا تھا مگر لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ شعلے برساتی آنکھوں سے چڑیل کو دیکھ رہا تھا۔ اپنی آستین سے آنکھوں کے سامنے آیا خون صاف کیا۔ چڑیل اس کی جانب لپکتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ ''یہ میرا آخری وار ہے یاد کرلے چالاک اور مکار دیالی کو۔'' اس نے ضرب لگانے کے لیے اپنی دائیں ٹانگ بجلی کی مانند گھمائی اور اسی لمحے چشم زدن میں زاہد یوسف نے اس کے دائیں پاؤں کو جکڑ کر اسے گھمایا اور دروازے کے اوپر دیوار پر اسے دے مارا۔ اس کی ایک لمبی چیخ بلند ہوئی اور وہ ٹکرا کر زمین پر آگری۔ وہ ننگی گالیاں دیتے ہوئے اٹھی لیکن زاہد یوسف سرعت سے اس کے قریب پہنچا اور پوری قوت سے ہاتھ کو الٹا گھما کر اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ چیخ مارتی ہوئی لکڑی کے شیلف سے جا ٹکرائی۔ شیلف پر رکھے برتن آپس میں بجتے ہوئے نیچے آگرے۔ زاہد یوسف زور زور سے ورد کرتا آگے بڑھا اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سر کے اوپر بلند کیا اور پوری طاقت سے اسے سامنے والی دیوار پر پٹخ دیا۔ ایک بھیانک اور خوفناک چیخ بلند ہوئی وہ لمحے بھر کے لیے دیوار سے لگ کر نیچے زمین پر آگری۔ وہ چلا رہی تھی اس کی کراہیں بلند ہو رہی تھیں، پورا کمرا اس کے چلانے سے گونج رہا تھا۔ زاہد یوسف پھر اس کی جانب لپکا اور داہنے ہاتھ سے اس کی پتلی اور کالی گردن جکڑ لی پھر اسے گھسیٹتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ زاہد کا چہرہ خوفناک ہوچکا تھا۔ یہ وہ زاہد یوسف نہ تھا

جو واجد کو عشاء کی نماز پڑھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں غصہ تھا اس نے چڑیل کو گردن سے پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اٹھایا اور بھرپور قوت سے اللہ اکبر کہتا ہوا اسے آتش دان کے قریب زمین پر پٹخ دیا۔ ایک دلخراش چیخ چڑیل کے حلق سے برآمد ہوئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ زاہد یوسف بجلی کی سی تیزی سے لپکا اور ٹین کے کنستر سے مشعل نکال کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر اس نے جیکٹ کی جیب سے لائٹر نکالا۔ ہلکے سے شعلے سے وہ مشعل بھڑک اٹھی۔ اب اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل بلند تھی اور داہنے ہاتھ میں لوہے کا وہی چوکور ٹکڑا۔

زاہد یوسف کے خون آلود چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور شدید نفرت سے وہ چڑیل کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں سے بلند تھے۔ مشعل جل رہی تھی اور سرخ روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ چڑیل آتش دان کے قریب کراہ رہی تھی۔ آگ دیکھ کر اسے اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ زاہد یوسف اس سے کہنے لگا۔ ”اب بتا، دیالی کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی۔ دیکھ مجھے۔ دیالی کے ایک حقیر مرید کو۔ جواب تیری موت بنا کھڑا ہے۔“ زاہد کے تیور اور لہجہ بہت زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں چڑیل سے کہنے لگا۔ ”تیرے انجام سے تیرے جیسی شیطانی قوتیں دیالی کے علاقے سے میلوں دور رہیں گی۔“

وہ چنگھاڑتی رہی، چیختی رہی اور پھر رونے لگی۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں کہ جیسے اسے زندہ ذبح کیا جا رہا ہو۔ وہ روتے ہوئے زاہد یوسف سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ التجا کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”مجھے جانے دو، میں وعدہ کرتی ہوں کہ دوبارہ اِدھر کا رخ بھی نہیں کروں گی۔ تمہیں دیالی کی قسم، تمہیں تمہارے رب کی قسم، مجھے جانے دو۔“

زاہد یوسف کہنے لگا۔ ”اب وقت گزر گیا ہے۔ وہ دیالی جو اپنے آستانے سے سالوں نہیں نکلی مگر تمہاری شرارتوں کی وجہ سے اس عمر میں میلوں کا سفر کر کے دوسرے گاؤں گئی۔ تم نے ایک شریف اور بے ضرر گھرانے کے علاوہ دیالی کو بھی تکلیف پہنچائی ہے۔ دیالی نے تمہاری موت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں اس سے تمہاری موت کا پروانہ لے کر آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے لوہے کے ٹکڑے پر کچھ پڑھ کر پھونکا پھر اس نے چڑیل کے آگے اوپر سے نیچے فضا میں لکیر کھینچی تو وہ اتنی زور سے چیخی کہ پورا کمرا کانپ گیا۔ واجد اپنی جگہ پر سب دیکھ رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ اب گھائل ہو رہی تھی۔ اس کا غلیظ جسم لوہے کے ٹکڑے کی حرکت سے جگہ جگہ سے پھٹتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بال نوچ رہی تھی۔ چنگھاڑ رہی تھی۔ زاہد یوسف نے ایک بار پھر فضا میں لکیر کھینچی تو اس کے جسم کے بدبودار لوتھڑے نیچے گرنے لگے۔ وہ ٹکڑوں میں بٹ رہی تھی۔ سسکیاں لے رہی تھی۔ آہ وزاری کر رہی تھی۔ زاہد یوسف کے چہرے پر رحم کا ذرا سا بھی تاثر نہیں تھا۔ اس نے باآواز بلند اللہ اکبر کہا اور مشعل اس پر پھینکی تو اس کے بالوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ اس کی کریہہ چیخیں جیسے کمرے کی چھت کو پھاڑ کر آسمان کی جانب اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ زاہد یوسف نے مٹی کے تیل کا کنستر دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اپنے سر سے بلند کر کے آہستہ آہستہ اس پر انڈیل دیا۔ آگ نے آناً فاناً چڑیل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حیرت انگیز طور پر آگ چڑیل کے علاوہ نہ کسی اور چیز کو چھو رہی تھی اور نہ زاہد یوسف کی جانب لپکتی تھی۔ آگ کے شعلے بلند تھے، چڑیل کی دلخراش چیخیں کمرے کی در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ وہ انگارہ بن رہی تھی۔ ایک دہکتا ہوا انگارہ۔ اس کی سسکیوں کی آوازیں بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔ زاہد یوسف اپنے پاؤں پھیلائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تن کر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے کلام پاک کی آیتیں جاری تھیں۔ چڑیل آہستہ آہستہ جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ وہ لگاتار پڑھتا جا رہا تھا پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ واپس آیا تو وہ راکھ آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہوئی اور اڑتی ہوئی ایک جھونکے کی طرح باہر نکل گئی اور کمرے کا فرش بالکل صاف ہو گیا۔ ایک روشنی گھر کے اوپر مشرق سے مغرب کی جانب پھیلتی جا رہی تھی۔ اسی لمحے بنجوسہ گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز گونجی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔

واجد بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے ہوش آیا تو وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ شوکت اور اس کا بھائی واجد کے چہرے پر پانی پھینک رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ کمرے میں زاہد یوسف نہیں تھا۔ بیٹھک میں بھی نہیں تھا۔ بھائی نے بتایا کہ جب ہم یہاں پہنچے تو تم چارپائی پر بے ہوش پڑے تھے۔ زاہد یوسف یہاں نہیں تھا۔ شاید وہ کہیں چلا گیا دیالی کے کسی اور کام کو نمٹانے!

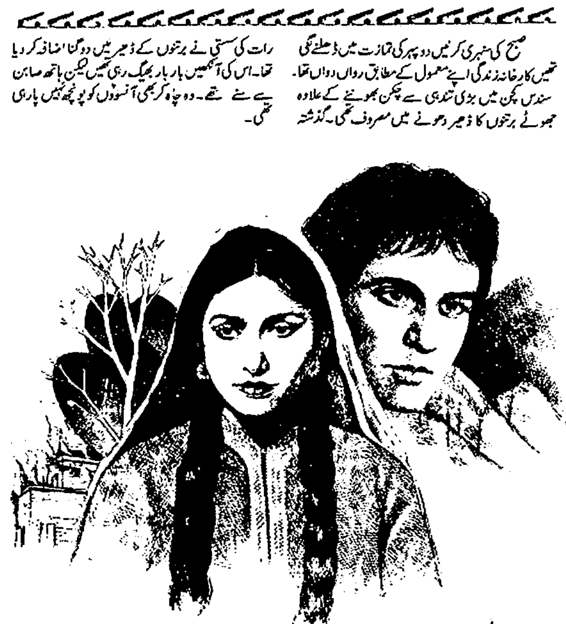


ندامت

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ سچ بیانی سندس اور سجاد کی ہے لیکن بغور دیکھیں تو یہ گھر گھر کی کہانی بن رہی ہے۔ ہم بچے بچیوں کو موبائل دے کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ اس کا صحیح استعمال کریں گے جب کہ یہ ہماری خوش فہمی ہے۔ اس موبائل نے کیسے سندس کی زندگی میں زہر گھولا آپ بھی ملاحظہ کریں۔

فتخار حسین اعوان
(مظفرآباد، آزاد کشمیر)

صبح کی سنہری کرنیں دوپہر کی تمازت میں ڈھلنے لگی تھیں کارخانہ زندگی اپنے معمول کے مطابق رواں دواں تھا۔ سندس کچن میں بڑی تندہی سے چکن بھوننے کے علاوہ جھوٹے برتنوں کا ڈھیر دھونے میں مصروف تھی۔ گذشتہ رات کی سستی نے برتنوں کے ڈھیر میں دوگنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں لیکن ہاتھ صابن سے سنے تھے۔ وہ چاہ کر بھی آنسوؤں کو پونچھ نہیں پا رہی تھی۔



اس کا ذہن بوجھل تھا۔ صبح صبح شوہر کے ساتھ جھڑپ ہو گئی تھی۔ وقت پہ نہ اٹھنے کے باعث کام میں تاخیر ہو گئی۔ بس میاں جی کا مزاج برہم ہو گیا۔ وہ بکتا جھکتا دفتر چلا گیا اور سندس اس کے تلخ الفاظ کی بازگشت میں گھری ہلکان ہوتی رہی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو کچن میں چلی آئی۔ ابھی وہ کاموں سے نمٹ بھی نہ پائی تھی کہ فون کی مترنم گھنٹی نے اسے سوچوں کے جنگل سے باہر کھینچ لیا۔ وہ ہاتھ دھو کر کمرے میں پہنچی تھی کہ فون خاموش ہو گیا مسڈ کال نوٹیفکیشن میں جگمگاتے نام پر نظر پڑتے ہی اس کے ہاتھ متوقع ذلت سے ایک بار پھر لرز گئے۔

کچھ سیکنڈز بعد فون پھر گنگنانے لگا لیکن اسے یہ گھنٹی صور اسرافیل سے کم نہ تھی پھر بھی اس نے دل کڑا کر کے سبز بٹن دبایا اور کان سے لگا لیا۔ حسب توقع اس کا شوہر گرجا۔

"کہاں مری ہوئی تھیں تم! گھنٹے سے فون کر رہا ہوں ہوش ہوتا ہے یا نہیں تمہیں؟"

"میں کچن میں تھی سجاد۔ کھانا بنا رہی تھی۔" وہ مری مری آواز میں بولی۔

"تو فون کچن میں پاس رکھ لیتیں کم عقل عورت! پتا نہیں دھیان کدھر رہتا ہے تمہارا؟ اور کھانے کی بھی خوب کہی تم نے، نمک مرچ کے اس ملغوبے کو کھانے کا نام دے کر رزق کی توہین نہ کیا کرو جاہل عورت!"

وہ خاموشی سے اس ذلت کو اپنے اندر اتارتی رہی۔ بولنے کی مجاز تو اس صورت میں ہوتی جب شوہر کچھ غلط کہہ رہا ہوتا۔

"اب کچھ پھوٹو گی منہ سے یا میں ہی بکتا رہوں۔"

"جی...... وہ......" اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ سجاد کو مزید طیش دلا گئی۔ "بس کرو! میں نے یہ کہنا تھا کہ شام میں میرا دوست اپنی اہلیہ کے ساتھ آنا چاہتا ہے گھر۔ کچھ بنا لینا ڈھنگ سے۔ ہر بار سر نیچا کرواتی ہو تم۔" جھنجلا کر کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

آنسو اب پلکوں کی حدود سے مکمل بغاوت کر چکے تھے۔ ڈھیلے قدموں سے کچن میں گئی تو چکن کو جلا دیکھ کر اس کا دل چاہا اپنا سر پھوڑ لے۔ چولہے کی آنچ دھیمی کرنا وہ بھول گئی تھی۔

ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں معمول تھیں۔ زندگی کا ازدواجی موڑ اس کے لیے بڑا سخت امتحان ثابت ہو رہا تھا۔

"میری یہ آزمائشیں جانے کب ختم ہوں گی؟" اس نے تھکی ہوئی نظر موبائل فون کی اسکرین پر ڈالی۔

"ازدواجی زندگی تو ہمیشہ ہی ایک امتحان ہوا کرتی ہے لیکن تمہیں اس امتحانی نصاب کی تیاری کی فرصت ہی کہاں تھی؟ کمرۂ امتحان میں تو ہر اناڑی انجان بن جایا کرتا ہے اب یہ گلے شکوے کیوں؟" موبائل کی اسکرین میں نظر آتی اپنی ہی شبیہ نے اسے ایک آئینہ دکھایا اس آئینے میں ماضی کے کئی عکس واضح تر نظر آنے لگے تھے۔

☆......☆

وہ اپنے بستر پر نیم دراز مووی دیکھ رہی تھی جب اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ اسکرین پر اس کے کزن پلس منگیتر سجاد کا نام دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ اس نے بیتابی سے میسج کھولا۔

"سندس!" اس یک حرفی پیغام میں چھپی بیتابی سے وہ بخوبی واقف تھی لہٰذا فوری جواب دیا۔

"جی سجو!"

"کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ خاص نہیں" سندس نے شرارت سے جواب دیا۔

"پھر بھی۔"

"آپ کو میسج کر رہی ہوں۔"

"وہ تو ابھی کر رہی ہو ناں۔ پہلے کیا کر رہی تھیں؟"

"بستر میں لیٹی ہوں۔ آج بہت ٹھنڈ ہے ناں۔"

"ہمم۔ ٹھنڈ تو واقعی بہت ہے۔ کیا پہنا ہے آج؟"

"کپڑے۔" سندس کو اسے تنگ کرنے میں خوب مزہ آتا تھا۔

"کس کلر کے؟" سجاد نے ایک رومانوی اسمائل بھیجی۔

"وہی جو آپ کو بہت پسند ہے... بلیک...." اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔

اور ساتھ ہی اپنی تازہ ترین سیلفی بھیج دی۔ سجاد خوشی سے گویا پھڑک ہی اٹھا اور جذبات سے چور لہجے میں ایک آڈیو میسج بھیجا۔

"جیسے ہیرا نکل رہا ہو کوئلے کی کان سے..... واہ بھئی! تمہاری ذہانت کا بھی جواب نہیں۔ دل خوش کر دیا۔"

سندس کے جواب ٹائپ کرنے سے پہلے ہی اسے اپنی ماں جی کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔

"سندس!! او سندس کی بچی! کب سے آوازیں دے رہی ہوں تمہیں۔"

اس کے ناز و انداز یکدم اڑنچھو ہو گئے۔ موبائل سائڈ پہ رکھ کر وہ باہر گئی تو ماں جی کا پارہ ہائی ہو چکا تھا۔

"ہر وقت موبائل میں گھسی رہتی ہو۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ کبھی گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لے لیا کرو۔ میں اکیلی جان کب تک مشین بنی رہوں۔"

انہوں نے اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔ وہ دل مسوس کر ان کے احکامات کی بجا آوری میں مشغول ہو گئی لیکن دھیان مکمل طور پہ موبائل اور سجاد کی طرف تھا۔

سندس تین بھائیوں کے بعد پیدا ہونے والی اکلوتی بیٹی تھی۔ خوبصورت بے پناہ تھی مگر ذمہ داری کے ہجوں سے ناآشنا تھی۔ گھر کے کاموں سے کوسوں دور بھاگتی تھی۔ میٹرک کرتے ہی اس کے ماموں کے بیٹے سے منگنی اور منگیتر کے رومانوی مزاج نے اسے مزید بے پروا بنا دیا تھا۔ اس کی ذومعنی باتیں، بے تابیاں اسے بہت بھاتی تھیں۔ تین سال کا عرصہ انہیں بہت قریب لے آیا تھا لیکن زندگی میں اعتدالیت سے وہ بے نیاز تھی۔ ماں کے ڈر سے وہ مارے باندھے کام کر لیتی تھی اور پھر موبائل اور سجاد کی گفتگو میں کھو جاتی۔ انہی خیالوں میں گم سبزی کاٹ رہی تھی کہ ہاتھ کٹ گیا۔ ماں کی صلواتیں سنتے ہوئے اسے اطمینان کا احساس ہوا کہ اب گھر کے کام سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اندر جاتے ہی اس نے سجاد کو اس "سانحہ عظیم" کا پیغام بھیجا۔ جوابی ردعمل اسے توقع سے زیادہ خوشگوار حیرت دے گیا۔

"زیادہ درد تو نہیں۔ مت سوچا کرو تم میرے بارے میں اتنا اور کوئی ضرورت نہیں تمہیں گھر کے کام میں خود کو کھپانے کی۔ مجھے بیوی چاہیے نوکرانی نہیں۔"

سندس یہ جواب پڑھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔

ان کی ٹیلیفونک گفتگو یونہی چلتی رہی۔ سجاد کو نوکری ملی تو اس کے گھر والوں نے فوری شادی کی تاریخ پکی کر دی۔ نوکری کی مصروفیت نے اسے تھوڑا الجھا رکھا تھا۔ سندس کو لگتا تھا کہ اب ان کی بات چیت میں پہلے جیسی رنگینی نہیں رہی تاہم اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے وہ دل بہلا لیتی تھی۔

شادی کی رسوم میں بھی ان کے پیغامات کا سلسلہ چلتا رہا۔ کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس، پرفیوم ہر چھوٹی سے چھوٹی بات وہ ایک دوسرے سے شیئر کر چکے تھے۔ شادی کی ہر رسم کی تصویر سندس نے اسے پہلے ہی بھیج دی لیکن سجاد کا وہ دل دھڑکا دینے والا لہجہ اور فدا ہو جانے والی نظریں جانے کہاں کھو گئی تھیں۔ شادی کے بعد اولین دن تو قربت کی سرشاری میں

وہ گیت جو لکھے گئے مغل اعظم کے لیے
شامل ہوئے دوسری فلموں میں

پس پردہ فلمی باتیں قارئین سے شیئر کرنا ذکی کانپوری کی خاص خوبی تھی۔ انہوں نے ایک اہم واقعے کا ذکر یوں کیا ہے کہ 1953ء میں "مغل اعظم" کے گیت لکھنے کے لیے ہدایت کار کے آصف نے نغمہ نگار تنویر نقوی کو پاکستان سے بمبئی بلوایا۔ تنویر نقوی نے فلم "انمول گھڑی" میں جو گیت لکھے تھے کے آصف اس سے بہت متاثر تھے۔ تنویر نقوی بمبئی پہنچے تو کے آصف نے ان سے کہا۔ مجھے اپنی فلم "مغل اعظم" کے لیے انمول گھڑی جیسے مقبول گیت چاہئیں اور انہیں اپنے موسیقار نوشاد کے سپرد کر دیا۔ نوشاد صاحب نے تنویر نقوی سے کہا۔ مجھے مشہور شاعر عرش انصاری کی غزل کی طرح غزل چاہیے جس کا مطلع ہے

کہو تم تو روداد الفت سناؤں
تمہی کو تمہاری شکایت سناؤں

تنویر نقوی نے نوشاد صاحب کے حکم پر شعر لکھا۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہیں شکوے کیا کیا بتاؤں

اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے تنویر نقوی نے پوری غزل لکھ کر نوشاد صاحب کے حوالے کر دی۔ اس غزل کے علاوہ تین اور گیت بھی تحریر کیے۔

1۔ گزرا ہوا زمانا آتا نہیں دوبارہ
2۔ مجھ پر الزام بے وفائی ہے
3۔ آسماں والے بتا۔ کیا ہے میں نے کیا خطا

ایک روز جانے کس بات پر تنویر نقوی اور کے آصف میں ان بن ہو گئی اور تنویر نقوی نے کہہ دیا۔ میں "مغل اعظم" کے گیت نہیں لکھوں گا اور واپس لاہور آ گئے۔ آنے سے پہلے پہلا اور تیسرا گیت فلم "شیریں فرہاد" کے پروڈیوسر کو فروخت کر دیے جب کہ دوسرا گیت اے آر کاردار کو دے دیا جسے انہوں نے اپنی فلم "یاسمین" میں شامل کیا۔ اس گیت کی دھن سی رام چندر نے بنائی تھی جب کہ "شیریں فرہاد" کے موسیقار ایس مہندر تھے۔ پہلا گیت

گزرا ہوا زمانا آتا نہیں دوبارہ

اس قدر ہٹ ہوا کہ اس کے موسیقار نے پورے برصغیر میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ "یاسمین" میں استعمال ہونے والا گیت بھی دوسرے نمبر پر رہا یہ تینوں گیت لتا نے گائے تھے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں

پاکستان میں فلم "انارکلی" میں انور کمال پاشا نے شامل کیا جس کی دھن ماسٹر عنایت حسین نے بنائی تھی۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا اور انہی پر پکچرائز ہوا۔ ذکی کانپوری کہتے ہیں اگر تنویر نقوی کے آصف سے ناراض نہ ہوتے تو یہ گیت "مغل اعظم" میں شامل ہوتے۔

پر لگا کر گزر گئے لیکن سجاد کے جس مخصوص رویے کی وہ عادی تھی، وہ اب مفقود نظر آنے لگا تھا۔

شادی کے بعد ایک ماہ کا عرصہ انہیں سالوں پہ محیط نظر آنے لگا تھا۔ خاموشیوں کا ایک عجب سلسلہ پروان چڑھنے لگا تھا۔ دونوں کئی بار گھومنے کے لیے جاتے لیکن خاموشی اور ایک نامعلوم کھنچاؤ ان کے ہمراہی ہوتے تھے۔ وہ کوئی بھی بات کرتی تو سجاد کا ایک ہی جوب ہوتا۔

''کتنی بار بتانا ہے یہ قصہ؟ جانتا ہوں میں پہلے سے۔'' خود سجاد کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس کی گفتگو کی پٹاری الفاظ کے خزانے سے خالی ہو چکی ہے۔

دعوتوں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی گھر کی ذمہ داری اس پہ آن پڑی۔ اس کے سسرال میں ماموں اور ممانی کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا لیکن انتظامی صلاحیتوں سے عاری ہونے کی بنا پر وہ اس چھوٹے سے چمن کو سنوارنے سے بھی قاصر تھی۔ ساس کے بھرپور تعاون کے باوجود کھانے میں بد سلیقگی اور دیگر معاملات میں اناڑی پن سجاد کو اس سے مزید دور کرتا جا رہا تھا۔ اس کی شیریں زبان اور دعوے اپنی موت آپ ہی مر چکے تھے۔ سندس اب محض منگیتر نہ رہی تھی۔ وہ ''بیوی'' تھی جس کا اوّلین فرض گھریلو معاملات میں نظم و ضبط تھا۔ مگر دوسری طرف سندس اس نئے امتحان میں مکمل ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

☆.....☆

سجاد کے والدین عمرہ کی ادائیگی کے سلسلے میں حجاز مقدس کے سفر کی تیاریوں میں مگن تھے۔ ساس کی روانگی اسے مزید بوکھلا رہی تھی۔ اس کی غلطیاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ سجاد تنگ آ کر کہتا ''خدا جانے! مجھ سے کون سے ایسے گناہ سرزد ہوئے ہیں جس کی مجھے تمہاری صورت میں سزا مل رہی ہے۔''

اس دن گھر میں میلاد منعقد کیا گیا تھا۔ سجاد نے دفتر سے چھٹی کر رکھی تھی نعتوں کے اختتام پر درس کا انتظام بھی تھا محلے کے مولانا صاحب کی بیوی دھیمے لہجے میں سامعین سے مخاطب ہوئیں۔

''اللہ عزوجل تعالیٰ نے اس کائنات کو ایک خاص ترتیب اور نظم و ضبط سے پیدا کیا ہے۔ اس کائنات کی ہر تخلیق ایک خاص نظام سے چلتی ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ سورج کبھی چاند کے مدار میں نہیں آتا اور چاند کبھی سورج کی حدود تجاوز نہیں کرتا۔ انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات کے عہدے پر فائز ہے یعنی اس کا رتبہ، مقام و فرائض دیگر تخلیقات کی نسبت حدود کی پابندی کا زیادہ متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حدود کی خلاف ورزی کے پار بے سکونی، بے ترتیبی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم حدود سے مکمل واقف ہی نہیں۔ چھوٹے چھوٹے کئی معاملات ایسے ہیں جن میں بے اعتدالی سے ہماری زندگیاں اپنی رعنائیاں کھو بیٹھتی ہیں۔ مرد اور عورت بشری زندگی کا آغاز ہیں اور ان کی جانب سے معمولی لغزش بھی ان کی عائلی زندگی بے ترتیب کر دیتی ہے۔ ایک عمومی معاشرتی رویہ کے تحت رشتہ طے ہوتے ہی دونوں فریقین ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہوتے ہوئے بھی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ گویا اللہ کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ انہیں علم بھی نہیں ہوتا اور ان کی آئندہ زندگی اس گناہ کی سزا تلے دب جاتی ہے۔ یہ رشتہ اپنی کشش کھونے لگتا ہے اور انجام جھگڑوں اور ایک دوسرے سے بیزاری کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہم شیطانی خیالات کے زیر اثر شادی سے پہلے ان زنا نما رابطوں کی جتنی بھی تاویلیں دے لیں مگر رحمانی دنیا کے اصول و ضوابط اٹل ہیں۔ غلط ہمیشہ غلط ہے جس کی سزا اس دنیا میں رہ کر ضرور ملتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ عورت کے معنی چھپی ہوئی ہے اور ہر وہ شے جو چھپی ہوئی ہو خاص کشش کا باعث ہے، جہاں وہ کھل کر سامنے آئی اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ جو لوگ وقت سے پہلے سامنے آ جاتے ہیں، بھلے ہی نامہ و پیام کے ذریعے ہی وہ اپنی کشش کھو دیتے ہیں۔ خدارا، یہ رضائی میں چھپ کر سلام و پیام پر نظر رکھیں ورنہ بچوں کی زندگی تباہی کے قریب پہنچ جائے گی۔

مولانا صاحب کی بیوی اور بھی بہت کچھ کہتی رہیں لیکن اندر بیٹھی سندس اور کمرے سے باہر موجود سجاد کے بدن سن ہو چکے تھے۔ آج انہیں ہر سوال، گلے اور شکوے کا جواب مل چکا تھا۔ سجاد ہمیشہ اسے ہر غلطی کا ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی انا کو تسکین دیتا رہا تھا لیکن اللہ کی حدود کی پامالی میں وہ خود بھی برابر کا شریک رہا تھا۔ نفس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر بڑے دعوے کرتا رہا مگر ناکام رہا۔ اسی لمحہ اس کے اندر کی گونجتی یہ آواز محسوس ہوئی۔

''اور بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن جو توبہ کر لے تو وہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔'' سجاد کی آنکھوں سے ندامت کے اشک رواں ہو گئے۔

سبق

محترم مدیر

السلام علیکم

یہ سچ بیانی میں نے حیدر علی کے واقعات جمع کر کے لکھی ہے۔ حیدر علی نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی جسے میں بیان کر رہا ہوں۔ جوابانہ ایک انگریز مار کی بیٹی ہے پھر بھی اس نے ایسا کرارا جواب دیا جو نہ صرف حیدر علی بلکہ ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

غلام رضا جعفری

(کراچی)

وہ ہنستی مسکراتی جو میرے قریب آئی تو اس کے جواں جسم کی مہک میرے دماغ پر چھانے لگی۔ جو میں نے اس سے قبل کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ساحل سمندر کی تیز ہوا سے اس کی لمبی لمبی سیاہ زلفیں لہراتی ہوئی میرے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی زلفیں نہیں، کوئی ناگن ہو جو مجھے ڈسنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ اپنے کھلکھلاتے چہرے کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ خوشی سے سرشار ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سمندر کے دوسرے کنارے کو

چھوتے ہوئے سورج کی طرف دوڑ پڑے۔ سمندر کی تیز بل کھاتی ہوئی لہروں نے ہمارے جسموں کو بھگو دیا تھا۔ ہم دونوں الگ ہو گئے پانی کا ریلا مجھے پیچھے دھکیل گیا تھا مگر جب وہ غوطہ لگا کر...... سمندر کی مچلتی ہوئی لہروں کو چیرتی ہوئی اوپر کو ابھری تو ایسا لگا کہ جیسے کوئی جل پری ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے قریب آئی تو میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس مرمریں مورت کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور پھر اسی وقت مجھے ایسا جھٹکا لگا کہ میں خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ جولی میرے سامنے بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔

''اس طرح کیوں گھور رہی ہو؟'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرے میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ میرے دل میں اداسی چھا گئی تھی۔ ایسا پتا نہیں کیوں ہو گیا تھا۔ جب میں یہاں پہنچا تھا تو دل بہت خوش تھا اور چہرہ کھل سا گیا تھا۔ پھر یہ اچانک...... پتا نہیں کیا بات تھی۔

''کہاں کھو جاتے ہو تم؟ اتنی دیر سے پکار رہی ہوں۔ تم ہو کہ سنتے ہی نہیں۔ لگتا ہے کسی اور کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کون ہے وہ جو تمہیں مجھ سے چھین رہی ہے۔ جو تمہارے خیالات پر، تمہاری سوچوں پر چھا گئی ہے۔'' اس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا اور پھر بات اتنی لمبی کہ بس...... وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسے سن کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ میری توجہ کی اتنی طالب ہے۔ اس کے جواب...... پر میں اسے کچھ دیر بت بنا دیکھتا رہا اور کوئی بات کرنے کی بجائے مسکرا دیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح خاموش خاموش بت بنی موٹی موٹی آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتی رہی۔

''کافی دیر سے گم صم ہو...... کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' اس نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر پھر سوال کر دیا جب کہ یہی بات تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کسی مجسمے کی طرح پتھرا سی کیوں گئی ہے۔

''ہاں...... ہوئی ہے بات......'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' اس نے فوراً پوچھا اور سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمائے میرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

''وہی...... جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ وہ اب بھی حیرت زدہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

''وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ وہ میری بات کو سمجھ نہیں پائی تھی اور میں کھل کر بات کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

''ہاں...... وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اس کی بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ جو تم نے کر دیا ہے۔'' میں نے بات کو خوامخواہ طول دیا۔

''مگر ایسا کیا ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کیا کر دیا ہے ایسا جس سے تم اس طرح پریشان ہو گئے ہو۔'' اس نے جھنجلا کر کہا۔ بظاہر تو اس نے اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کی تھی اور دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے انداز پر مجھے ہنسی تو آئی مگر میں نے کمال ضبط سے کام لیا۔

''جادو......'' میں نے کہا۔

''کیا! جادو......!'' وہ میری بات پر اچھل سی گئی تھی۔

''مگر کس پر؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھ پر اور کس پر۔ جو تم نے کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جادو...... میں نے...... اور تم پر؟'' اس نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کا اس طرح کھلکھلانا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اسے کھلکھلاتے دیکھ کر میں بھی ہنس پڑا۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ جی چاہا کہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں لیکن اس موقع پر میں نے ایسا کرنے سے اجتناب کیا۔

''ہاں جولی! تمہارے حسن و شباب نے مجھے تمہارا اسیر کر دیا ہے۔ ہر وقت ہر جگہ میں تمہارے ہی خیالات میں گم رہتا ہوں۔ دل میں تم، دماغ میں تم، سانسوں میں تم، سوچوں میں تم اور نگاہوں میں بھی تم ہی تم۔ یہ سب تمہارا جادو نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ میری کیفیت تو ایک بوتل کے جن کی سی ہو گئی ہے۔ سچ ہی کہا ہے کسی شاعر نے

اس طرح سے پھنسا جیسے بوتل کا جن
تیرے جادو کا کوئی اتارا نہیں

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ کوئی سپنا ہو یا ٹی وی ڈرامے کا رومانوی سین۔ مجھے اس حقیقت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ حقیقت بھی مجھے افسانوں جیسی ہی لگ رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی میں ایسے حسین لمحات بھی آئیں گے۔ مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ قدرت نے اس ناممکن کو ممکن کیسے بنا دیا۔ میں کافی دیر تک

یقین اور غیر یقینی کے عالم میں تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے مجھے چھوا تو میں چونک گیا۔

''کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں...... تم جاگ رہے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن، افسانوں اور فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ آخر میں بے چارہ ہیرو......''

میری اس بات پر وہ بہت زور سے ہنسی تھی۔ اس نے سمندری ریت مٹھی میں بھر کر میری طرف اچھال دی جس سے میرے کپڑے بھر گئے تھے لیکن اس کی یہ حرکت مجھے بہت اچھی لگی۔

''یہ کوئی افسانہ یا فلم نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ افسانوں اور فلموں کے ہیرو تو تھوڑی دیر کے ہوتے ہیں جب تک افسانہ پڑھا جائے، یا جب تک فلم دیکھی جائے لیکن تم تو اصلی...... ہیرو ہو۔ میری زندگی کے حقیقی ہیرو۔'' اس نے کہا۔ وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ ماحول مزید غم ناک ہو جائے میں نے موضوع بدلا۔

''تمہاری قسم جولی! جی چاہتا ہے کہ تم اسی طرح ہر وقت میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں اسی طرح خوش دیکھتا رہوں۔''

''میں بھی تو یہی چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ اپنی آنکھوں کی نمی کو میری شرٹ کے دامن سے صاف کرنے لگی۔ یہ بات بھی میرے لیے حیرت والی تھی۔

''مگر......'' میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ وہ میرے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''مگر کیا؟'' اس نے اس طرح ایک دم بے قراری سے پوچھا کہ جیسے اس کے دل میں بھی ہول اٹھ رہا ہو۔

''مگر اب...... دل میں ڈر ابھرنے لگا ہے جولی۔''

''کس بات کا ڈر جانو؟'' وہ جلدی سے بول پڑی۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مجھ سے......''

''بے وفائی نہ کر دوں۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ اور میں جواباً اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ مسکرانے لگی اور پھر مسکراتے مسکراتے اونچی آواز میں بولی۔

''اگر تم نے بے وفائی کی تو......''

''نہیں نہیں...... خدا نہ کرے کہ میں تم سے بے وفائی کروں......'' اس نے میری بات بھی پوری نہ ہونے دی اور جلدی سے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا۔ جیسے میری اس بات سے وہ تڑپ گئی ہو۔ جیسے اس کی روح کانپ گئی ہو۔

''تم خود ہی تو مجھے اپنا دل کہتے ہو مگر اس دل کی دھڑکن تم ہو۔ دھڑکن ہی سے تو دل زندہ رہتا ہے۔ میں بھلا تمہارے بغیر کس طرح زندہ رہ سکتی ہوں۔'' اس نے کہا تو میرے دل کو اطمینان ضرور ہوا مگر دل کی بے یقینی بھی برقرار رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسی کشمکش ہے جو دل اور دماغ کو الجھائے ہوئے ہے۔ محبت اور چاہت کا اثر تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی بچھڑ جانا گویا جان لیوا بات تھی اور ادھر بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحہ بھی اس کے پاس رکنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میرا دل اور دماغ دونوں الگ الگ چل رہے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو مات دینے کے درپے تھے۔

''اس کے باوجود بھی یقین نہیں آتا جولی۔'' میں نے یکدم کہہ دیا تو وہ حیرت زدہ سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کے پاس میری اس بات کا جواب ہی نہ ہو۔

''شادی کے بعد تو یقین آجائے گا ناں۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بغیر میرا کیا حال ہوتا ہے۔ ساری ساری رات جاگ کر گزارتی ہوں۔ تمہارا تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھ سے جدا ہو جانا۔ مجھے عجیب سے کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہوا کی آہٹ پر بھی میں بے اختیار دروازے کی طرف دوڑ پڑتی ہوں کہ شاید تم...... میری تنہائی اور میری بے قراری کو دور کرنے آگئے ہو مگر میں تمہیں نہ پا کر بہت دکھی ہو جاتی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو گئی اور میں خاموش بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''مجھے اس بات پر بہت دکھ ہے کہ تم مجھ پر شک کر رہے ہو مگر میں تم سے کیوں بے وفائی کروں گی۔ تمہارے پاس ہے کیا مجھے دینے کے لیے کہ میں سب کچھ لے کر فرار ہو جاؤں گی۔ تم تو خود پاکستان سے روزی کمانے آئے ہو۔'' اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا بلکہ اب تک وہ جو مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے جاتی تھی اور جو کچھ بھی وہاں کھانا پینا ہوتا تھا اس کا روپوں کا بل بھی وہ خود ہی ادا کرتی تھی۔ مجھے منع کر دیتی تھی۔ اس کی بات میرے دل کو لگی تھی اور میں کچھ

شرمسار ہو گیا تھا۔ پھر کچھ دیر تک ہم دونوں ہی خاموش رہے۔

”میں اپنا تن من تمہارے حوالے کر دینا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے جذبات اپنی دھن دولت سب کچھ تمہارے سپرد کر کے تمہاری لازوال محبت کے سائے میں پُرسکون زندگی گزار دوں۔ سچ بتاؤ تم مجھ سے جدا تو نہیں ہو جاؤ گے ناں؟“ اس نے کرب ناک لہجے میں کہا اور اپنا سر میرے سینے سے لگا لیا۔ وہ باقاعدہ سسکنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ وہ میری محبت میں اس قدر آگے نکل چکی ہے۔ وہ میرے لیے اپنے دل میں ایسے جذبات رکھتی ہے۔ اسے مجھ سے سوائے محبت کے اور کیا غرض ہو سکتی ہے جب کہ یہ انداز محبت تو مشرقی ہے۔ مغرب میں محبت کے معنی اور ہیں۔ اس مغربی لڑکی کے اندر مشرقی روح تھی۔

”نہیں جولی میں تمہارے ساتھ جیوں گا اور تمہارے ساتھ ہی مروں گا۔“ میں نے کہا تو اس کا چہرہ ایک دم خوشی سے کھل گیا۔

”سچ۔“ وہ ایسے خوش ہو گئی کہ جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو کھلونا مل جائے۔

”تمہاری قسم جولی۔“ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنی بانہوں سے حلقہ بنایا۔

نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی ہمیں اس طرح بیٹھے بیٹھے۔ سمندر کی تیز لہریں جب ہم سے ٹکراتیں تو ہم دونوں ایک دم ہی ہوش میں آ جاتے کہ جیسے مردہ جسموں میں روح داخل ہو گئی ہو پھر ہم دونوں اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم کار کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جولی کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جولی نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ میرے بیٹھتے ہی کار اس نے آگے بڑھا دی۔

ہماری ملاقات بڑے عام طریقے سے ہوئی تھی۔ اس وقت میرا دوست منصور بھی میرے ساتھ تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس روز بھی ہم دونوں ریسٹورنٹ سے کھانا کھا کر باہر نکلے اور قریب ہی اسٹاپ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اس وقت ہم دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں گپیں لگانے میں مصروف تھے۔ کافی دیر تک کھڑے کھڑے ہم تھک گئے اور بور بھی ہو گئے تو آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک تیز نیلے رنگ کی خوب صورت کار سڑک کنارے کھڑی نظر آئی۔ جب ہم اس کے نزدیک سے گزرے تو کار میں بیٹھی لڑکی نے ہمیں مخاطب کیا۔ ”ایکسکیوز می!“ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں ہی اس لڑکی کی بات سننے کے لیے آگے بڑھے۔

”جی فرمایئے؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”میری گاڑی بند ہو گئی ہے۔“ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟“

”آپ کی طبیعت تو خراب نہیں ہے؟“ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ تو منصور نے میرے پیر پر پیر مار کر مجھے خبردار کرنے کی کوشش کی مگر میں اس کی بات کو سمجھ کر بھی انجان بن گیا تھا۔

”اچھا تو آپ گاڑی کا کوئی کام کروانا چاہتی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ تو وہ چند لمحے میری صورت کو دیکھتی رہی اور پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب ہے کہ آپ تھوڑا سا دھکا لگا دیں۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ ہم..... آپ کی گاڑی کو دھکا لگائیں؟“

”جی ہاں جناب میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہم میں اتنی طاقت تھوڑی ہے کہ آپ کے گھر تک گاڑی کو دھکا لگاتے ہوئے لے جائیں۔“ میں نے انکاریہ لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔ ذرا سٹپٹائی مگر اس نے اپنی کیفیت کو چھپانے میں کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔

”ارے نہیں بابا آپ گاڑی کو ذرا سا دھکا لگائیں گے تو اسٹارٹ ہو جائے گی۔“ اس نے کہا اس کا انداز دوستی کا سا تھا۔

”اگر ہم دھکا نہ لگائیں تو؟“ منصور نے کہا۔

”تو گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو گی۔“ اس نے کہا اور گاڑی سے باہر اِدھر اُدھر جھانکنے لگی۔ ”کوئی بات نہیں ابھی کوئی نہ کوئی ضرور آ جائے گا۔ وہ آنے والا میری گاڑی کو دھکا لگائے گا اور میری گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی۔ جو دھکا لگائے گا اس کو لفٹ مل جائے گی۔“ اس نے کہا۔

”ہمیں لفٹ وفٹ کی کوئی لالچ نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

”ابھی آپ اپنے گھر جائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ظاہر ہے اپنے ہی گھر جائیں گے۔ کسی اور کے گھر جائیں گے تو.....“ منصور نے کہا اور ادھورا جملہ چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔ آپ میری گاڑی اسٹارٹ کرائیں تو میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ کر دوں گی۔“

”اگر آپ نے راستے میں اتار دیا تو پھر؟“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا ناں آپ کے گھر تک چھوڑ دوں گی۔“ اس نے کہا۔

اس گاڑی کے اسٹارٹ ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ہمیں تو صرف ٹائم پاس کرنا تھا۔ گھر تو ہم نے جانا ہی تھا۔ تھوڑی دیر گاڑی کو دھکا دینے میں کیا حرج ہو گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے منصور کو آنکھ دبا کر اشارہ کیا اور کہا۔

”چلو یار لگاؤ دھکا۔“

ہم دونوں بہت دور تک دھکا لگاتے رہے اور اپنی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم بری طرح تھک گئے تھے اور اس کی گاڑی تھی کہ اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

”بیٹا یہ جان بوجھ کر گاڑی اسٹارٹ نہیں کر رہی۔ مزے لے رہی ہے۔ تمہاری بے وقوفی سے۔“ منصور نے کہا۔

”میری بے وقوفی کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری ضد کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔“ میں نے اس بات کا الزام بھی اسی پر لگا دیا اور پھر اسی وقت کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے والی بات کے مصداق ایک دم ہی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور ہم دونوں ہی لڑکھڑائے ضرور مگر گرتے گرتے بچ گئے۔

”گئی بیٹا۔ تمہیں اُلو بنا گئی۔“ منصور..... ہنسنے لگا اور پھر ہم نے دیکھا گاڑی دور جا کر رک گئی۔

”رک گئی یار۔ گاڑی رک گئی۔“ میں نے نعرہ لگانے کے انداز میں کہا اور ہم دونوں ہی بھاگتے ہوئے گاڑی کے پاس پہنچے۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ہم پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ میں نے اسے جگہ بتا دی جہاں ہم نے جانا تھا۔

”آپ لوگ پاکستانی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ نے درست پہچانا۔“ میں نے داد دیتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔ ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”جولی۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”مجھے حیدر علی کہتے ہیں اور یہ میرا دوست منصور ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔

”بس..... ایک طرف گاڑی روک دو۔“ منصور نے کہا تو جولی نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر گاڑی روک دی۔ گاڑی کے رکتے ہی منصور باہر نکل آیا اور مجھے بھی نہ چاہنے کے باوجود اترنا پڑا۔

”عجب بے وقوف آدمی ہو تم۔“ میں گاڑی سے اترتے ہی منصور پر بگڑ گیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ منصور میری بات کا مقصد سمجھ نہیں سکا تھا۔

”تم نے گاڑی کیوں رکوائی؟“ میں نے جواب دیا۔

”تو کیا سارا دن اس کے ساتھ گھومتے رہتے؟“ منصور نے کہا۔

”سارا دن نہ سہی مگر کچھ دیر ہی اور گپ شپ ہو جاتی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تمہاری اس فضول گپ شپ کی وجہ سے اسٹاپ ایک میل پیچھے رہ گیا ہے۔“

”اچھا!“ اس نے بتایا تو میں چونک پڑا۔

”ہاں اب پیدل جانے میں بڑا مزہ آئے گا تمہیں۔“ اس نے کہا۔

یہ جولی سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں اور منصور ریسٹورنٹ میں چائے پی رہے تھے۔ ہم دونوں تقریباً روز یا کچھ وقفے سے اپنی دکان بند کر کے کچھ وقت گزارنے یہاں آ جاتے تھے۔ چائے پیتے اور گپ شپ کرنے سے کچھ بوریت دور ہو جاتی تھی۔ جب کبھی چند ایک اور دوستوں کا ساتھ ہوتا تو شام کافی دیر تک اسی قہوہ خانے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اس روز بھی چند ایک دوستوں کے مل جانے کی وجہ سے ہم کافی دیر تک یہاں بیٹھے رہے تھے۔ ہم دوستوں کے جانے کے بعد اٹھے ہی تھے کہ جولی نے آ کر سلام کیا اور کہے بغیر ہی میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہو گئی تھی اور ہم دونوں اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے۔ اس دوسری ملاقات میں جولی نے ہمارے ساتھ اسی طرح فری ہو کر گپ شپ کی کہ جیسے ہم بہت پرانے ملنے والے

ہوں۔ وہ بطور خاص مجھے ہی مخاطب کر رہی تھی۔ اس ملاقات کے بعد میں اور جولی اکثر کہیں نہ کہیں ملنے لگے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے لگے۔ پہلی دفعہ وہ خود ہی مجھے اپنے گھر لے گئی تھی اور میرے گھر بھی بن بلائے ہی آ گئی تھی۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور ہم دونوں قریب سے قریب تر ہو گئے۔

☆.....☆

ایک زوردار جھٹکا لگا اور میں ایک دم آگے کی طرف جھکا اور میرا سر کار کی کھڑکی کے ساتھ لگتے لگتے بچا۔ جولی نے ایک دم بریک لگایا کہ گاڑی جہاں تھی وہیں جم کر رہ گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اپنے علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔

”تھینک یو۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا، اس سے مصافحہ کر کے گاڑی سے باہر نکلا اور اپنی بلڈنگ کی طرف چل پڑا۔ جس میں ہم عارضی طور پر رہ رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک اور جگہ رہ رہے تھے جس کا کرایہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ جولی سے قریبی تعلقات کے بعد اس نے اپنی بلڈنگ میں فلیٹ دے دیا تھا اور یہاں ہم پچھلے ایک سال سے رہ رہے تھے یہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام سہولیات موجود تھیں اور پھر کرایہ کی رقم بھی ادا نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ میں ایک خاص انداز میں سیٹیاں بجاتا ہوا دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اپنے فلیٹ تک پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لائٹ جل رہی تھی۔

”ہیں..... لائٹ جل رہی ہے؟“ میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچا اور پھر میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ کیوں کہ اکثر جولی سے ملنے کی جلدی میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر دیتا ہوں۔ چند روز قبل تو میں فلیٹ کے مین گیٹ کو لاک کرنا ہی بھول گیا تھا اور اس رات واپسی بھی کافی دیر سے ہوئی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود تھی۔

صوفے پر میں نے اپنے آپ کو اس طرح گرا دیا کہ جیسے تھک کر چور ہو گیا ہوں۔ حالانکہ میں پچھلے دو دنوں سے مکمل چھٹیاں کر رہا تھا۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی دونوں آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے نہ جانے کتنی ہی تکلیف میں ہوں۔ پھر پتا نہیں کب نیند نے بے خبر کر دیا۔

”ارے..... تم کس وقت آئے؟“ آنکھ کھلی تو منصور کو بیڈ پر موجود پایا۔ اس طرح اچانک اسے دیکھ کر میں چونک پڑا تھا۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ اس نے جواب دیا۔

”زیادہ دیر کے بچے اطلاع نہیں کر سکتے تھے۔ ایئر پورٹ آ جاتا۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”میں نے تمہیں تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے اسی طرح سنجیدگی سے جواب دیا اور بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

”ارے یار اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔“

”جولی جولی جولی..... بھاڑ میں گئی جولی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا تو میں بپھر گیا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ میں نے جھڑک کر کہا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”خاموش ہی تو نہیں رہ سکتا۔“ اس نے کہا۔ اب اس کا لہجہ سرد پڑ گیا تھا۔

”کیوں؟“ میں نے منہ بسور کر کہا۔

”اس لیے کہ تم دن بہ دن عیاشی کی دلدل میں ڈوبتے جا رہے ہو۔ اپنی زندگی کو برباد کر رہے ہو۔“ اس نے لیکچر دینے کے انداز میں کہا۔

”ہونہہ۔“ میں اس کے جواب میں طنزیہ ہنسا۔ وہ خاموش رہا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم جولی کو میرے ساتھ برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تم اپنے خوابوں کی اچھی تعبیر سے محروم ہو تو میرے راستے کا پتھر مت بنو اور تم.....“

میری زبان یہیں رک گئی۔ اس سے آگے میں نے کچھ نہیں کہا اور پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا کیوں کہ دروازے پر ایک مخصوص انداز میں دستک ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا تو جولی اپنے خوب صورت بالوں کو سنوارتی ہوئی اندر آ گئی۔

”یہ شور کیسا ہے؟“ اس نے آتے ہی سوال کر دیا۔ میں نے منصور کی طرف دیکھا۔ وہ میرے اندر کے غصے کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے معاملے کو رفع دفع کرنے کی خاطر خاموشی سے اپنا دھیان کتاب پر مرکوز کر دیا۔

”اوہ..... کچھ نہیں..... شور تو کوئی نہیں ہو رہا۔“ میں نے جولی سے مخاطب ہو کر ہنستے ہوئے کہا اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کہیں میری وجہ سے تو.....“

”نہیں نہیں جولی تم تو میری جان ہو۔“ میں نے اس کا جملہ مکمل نہ ہونے دیا۔

”چلیں؟“ اس نے اپنی موٹی موٹی کاجل سے بھری آنکھوں کو ایک خاص انداز میں گھماتے ہوئے کہا۔

”تو چلو۔“ میں نے ذرا آگے ہو کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا اور پھر ہم دونوں ہنستے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆

وہ مجھے نائٹ کلب لے آئی تھی ایسی مہنگی جگہ میں پہلی بار آیا تھا۔ اس رات جولی کے اصرار پر میں نے وہسکی کے کئی جام خالی کر دیے تھے۔ ڈھیر سارے سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ واپسی رات گئے میں ہوئی۔

صبح دن چڑھے اٹھا تھا۔ اٹھنے کے بعد انگڑائی لی تو مجھے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ درد کی شدت سے سر پھٹ رہا تھا۔ آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے مرچیں جھونک دی ہوں۔ دل خراب ہو رہا تھا۔ متلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی ایک ابکائی آئے گی اور تمام انتڑیاں باہر آن گریں گی اور یہی ابکائی میری زندگی کی آخری ابکائی ہو گی۔ درد کی شدت سے میں نے زوردار آہ بھر کر اپنا بایاں ہاتھ دل پر رکھ لیا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو رہی تھیں۔ تبھی فون بزر چیخ اٹھا۔

فون کی تیز گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو!“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ہیلو جانو کہاں ہو تم؟“ دوسری طرف سے کانوں میں رس گھولتی آواز سنائی دی۔

”بس میں ابھی آیا۔“ میں نے کہا۔

”ایک گھنٹے تک تمہیں میرے پاس موجود ہونا چاہیے۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”میں اس سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو جانو اگر تم نہ آئے تو میرا دم نکل جائے گا۔ میں تمہاری بانہوں میں مرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے سینے سے لگ کر۔“ اس نے کہا اور فون کی لائن کٹ گئی۔ میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

”گھر سے تمہارا خط آیا ہے۔“ غسل خانے سے نکلتے ہی منصور نے اطلاع دی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے خط لیا اور ایک طرف رکھ دیا۔

”خط پڑھ تو سہی۔“ منصور نے کہا۔

”ہونہہ..... کیا لکھا ہے اس خط میں۔ مجھے سب معلوم ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ میری اس حرکت پر منصور کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ مجھے زہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ میرا گلا دبا دیتا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور بے پروائی سے اپنے بال سنوارنے لگا۔

”خط پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حالات سے آگاہی ہو جائے گی۔“ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

”مجھے سارے حالات معلوم ہیں۔ وہی رونا دھونا ہو گا۔ وہی تکلیفیں، وہی بیماریاں غربت، قرض داروں کی تقاریں، فاقے، مجبوریاں اور ضرورتیں۔ ان کے علاوہ اور کیا ہو گا اس خط میں۔ کچھ بھی نہیں۔“ میں نے کسی مقرر کی طرح تقریر کی۔

”یہ سب تو اس وقت بھی تھا جب تم وہاں تھے۔“ منصور نے کہا۔

”ہاں۔ تھا سب کچھ اس وقت بھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن..... اس وقت اتنا قرض نہیں تھا جتنا اب ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو کیا ضرورت تھی اتنا قرض لینے کی۔“ میں نے کہا۔

”ضرورت نہیں تھی؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”نہیں۔“ میں نے اس سے نظریں چرائیں۔

”تم یہ بھول گئے ہو کہ چاچا چاچی نے قرض لے کر ہی اپنا مکان سر کی چھت بیچ کر تمہیں یہاں بھیجا ہے۔“ اس نے کہا۔ میں اس کے جواب میں خاموش رہا۔

”تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ ان حالات کو ختم کرنے کے لیے ہی ہم یہاں آئے ہیں۔“ اس نے میرے یہاں آنے کا مقصد یاد دلایا۔

”ہم نہیں..... صرف تم..... میں تو ان سب چیزوں سے جان چھڑا کر یہاں آیا تھا۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اپنے ماں باپ سے بھی..... بہن سے بھی؟“ اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یار! تمہیں اس قیدی کا بھی خیال نہیں۔“ اس نے

پوچھا۔

''قیدی.....کون قیدی.....؟'' میں اس کی بات پر چونک پڑا۔

''وہ قیدی جو تمہاری منگیتر ہونے کی سزا بھگت رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہونہہ.....منگیتر.....'' میں نے طنزیہ کہا۔ ''کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے اب میرا۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔

''کیا کہا؟ تمہارا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو۔ یہ تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔''

''میں سب جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں.....تمہاری تو تمام رشتہ داریاں جولی سے ہیں۔'' اس نے بھی طنزیہ کہا۔

''ہاں ہاں! جولی سے تمام رشتہ داریاں ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس کے جواب پر میں بھڑک گیا تھا۔ ''میں جولی سے شادی کررہا ہوں۔''

''کیا؟'' میری بات سن کر منصور چیخ اٹھا۔ ''اور.....اور میری بہن.....اس کا کیا ہوگا؟'' اس نے کہا اور میرا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ وہ میرا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے دوٹوک جواب دیا۔

''اس وقت تو تم اور تمہارے ماں باپ نے میری اماں کے پیر پکڑ لیے تھے۔ منت سماجت کی تھی۔ میں تو رضامند بھی نہیں تھا اور آج تم.....''

وہ کہہ رہا تھا اور میں اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جولی کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ وہ میرا بے چینی سے انتظار کررہی ہوگی۔ اتنی دیر میں وہ خود آجاتی اگر میں اس کی گاڑی نہ لایا ہوتا۔ کل رات کافی دیر ہوگئی تھی اس لیے اس نے اپنی گاڑی مجھے دے دی تھی تاکہ مجھے گھر آنے میں پریشانی نہ ہو اور پھر رہ رہ کر مجھے منصور پر غصہ بھی آرہا تھا۔ اس کی اس بے تکی بحث کی وجہ سے میں لیٹ ہوگیا تھا۔

جولی کے گھر میں کافی دیر تک رہا پھر واپس آیا تو منصور موجود نہیں تھا..... پھر اس اگلے دن بھی وہ نہ آیا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی اس لیے میں نے اس کی کمی محسوس ہی نہ کی اور ایک مہینا گزر گیا۔ میں ہر روز اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس دن بھی میں رات دیر تک اس کے گھر میں رہا پھر واپس لوٹ آیا۔ ابھی رات کی کسلمندی اتری بھی نہ تھی کہ جولی کا فون آگیا کہ فوراً پہنچو۔

مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جولی کے گھر کے سامنے پہنچا۔ میں نے جلدی سے گاڑی سے باہر نکل کر کال بیل دبا دی۔

''جی فرمایئے؟'' ملازم نے آکر پوچھا۔

''جولی؟''

''جولی صاحبہ تو انگلینڈ چلی گئیں۔'' اس نے بتایا۔

''انگلینڈ چلی گئی؟'' میں نے اس کے جواب کو حیرت سے دہرایا۔ انہوں نے آپ کے لیے ایک لفافہ دیا تھا۔ ملازم نے کہا اور گھر کے اندر گھس گیا۔ میں دروازے سے اندر داخل ہونے لگا تو ملازم نے مجھے روک دیا اور وہیں انتظار کے لیے کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد لفافہ لے آیا۔

''کون کون گئے ہیں۔ کب واپس ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''واپسی کا تو پتا نہیں ویسے دیر سے آئیں گے.....کیوں کہ.....''

''کیوں کہ کیا؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے پوچھا۔ میرا دل گھبرانے لگا تھا۔

''کیوں کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ مشرقی ممالک بھی جائیں گی۔''

''کیا؟'' ملازم کا جواب سن کر میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

میں نے جولی کا چھوڑا ہوا لفافہ جلدی جلدی لرزتے ہاتھوں سے کھولا۔ میرے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔ گلا خشک ہورہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ لفافے سے کاغذ نکال کر دیکھے تو میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ اس نے دیئے ہوئے فلیٹ جس میں ہم پچھلے ایک سال سے رہ رہے تھے۔ پورے ایک سال کا کرایہ کا پورے سو ڈالر کے حساب سے مطالبہ کیا تھا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے زمین اور آسمان یک دم آپس میں مل گئے ہوں اور میں ان دونوں کے درمیان دب گیا ہوں۔ میں اس ملازم کی شکل دیکھنے لگا۔ میں بوجھل بوجھل قدموں سے گاڑی کی طرف

بڑھا۔ میں نے گاڑی کا دروازہ ابھی کھولا ہی تھا کہ ملازم دوڑتا ہوا آیا۔

یہ گاڑی مت لے جائیں۔ جولی صاحبہ نے منع کیا تھا۔ ویسے بھی یہ گاڑی ہم ملازموں کے لیے ہے۔ اس نے کہا اور گاڑی کی چابی نکال کر اندر چلا گیا اور میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی تھی۔

میری آنکھوں سے خود بخود پانی جاری ہوگیا۔ میری سانس بے ترتیب ہوگئی۔ دل کی دھڑکن اس قدر تیز ہوگئی کہ جیسے دل ابھی سینہ چیر کر باہر آگرے گا۔ قدم من من بھر کے لگ رہے تھے۔ ڈپریشن کی شدت سے سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ جسم تپنے لگ گیا تھا۔ ایک قدم بھی چلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی کافی دور تک چلتا رہا۔ ٹیکسی روکی اور گھر واپس آگیا۔ اس گھر میں جہاں مزید صرف تین چار دن ٹھہرنے کی اجازت ملی تھی ورنہ قانونی کارروائی کرنے کی دھمکی ملی تھی جو کہ جولی ہی کی طرف سے تھی اور صاف ظاہر ہے کہ قانونی چارہ جوئی میں میری ہی ہار ہوتی۔ جرمانہ کے علاوہ کئی ماہ قید ہوتی۔ میں فلیٹ میں آتے ہی بیڈ پر گر پڑا۔ جولی پر مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ اس وقت اگر وہ میرے سامنے ہوتی تو شاید میں اس کا گلا دبانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اتنی بلندی پر لے جاکر گرادے گی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مجھے خبردار بھی کردیا تھا لیکن میں اس کی بات کو سمجھ نہ پایا تھا۔ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے میں نے جب اس کی بل کھائی ہوئی اس زلف گرہ گیر کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا۔ ''تم ایک ایسا مہکتا ہوا گلاب ہو کہ جسے میں اپنے کالر میں اس طرح سجانا چاہتا ہوں کہ دھیمی دھیمی مہک مجھے مسرور کرتی رہے۔''

''تم مردوں کی یہی تو خامی ہے کہ جس خوب صورت چیز کو دیکھا اور اسے حاصل کرنے کی خواہش کردی۔ کسی ناسمجھ معصوم بچے کی طرح جو یہ بھی نہیں جانتا کہ جسے وہ خوب صورت سمجھ کر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ چیز اسے نقصان بھی دے سکتی ہے۔''

''میں ..... اس خوب صورت گلاب کی بات کررہا ہوں۔'' میں نے پہلی بار اس کے رخساروں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کسی قدر دلفریبی سے میرے ہاتھوں کو ہٹادیا تھا۔

''لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ گلاب کے ساتھ خار بھی ہوتے ہیں۔ کہیں گلاب کو حاصل کرنے کی لگن میں یہ خار ہاتھ زخمی نہ کردیں۔'' افسوس مجھے اپنی غفلت پر کہ میں نے اس کی یہ بات نظر انداز کیوں کردی لیکن مجھ پر تو اس کی محبت کا جادو چڑھا ہوا تھا۔ واقعی اس کی بات سچی تھی۔ آج اسی خار گلاب نے مجھے زخمی کردیا ہے۔

لیٹے لیٹے میری نظر میز پر پڑے ہوئے لفافے پر پڑی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ لفافہ اٹھا کر کھولا تو اس میں ایک رقعہ کے علاوہ ڈالرز بھی تھے۔

''یہ کس نے رکھے؟'' میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کچھ دیر تک میں بت بنا ان ڈالرز کو بغور دیکھتا رہا۔ گنے تو وہ پورے چھ ہزار ڈالرز تھے۔ نہ کم نہ زیادہ۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے جلدی جلدی رقعہ کھول کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا۔

''عمران صاحب!''

آخر بار سلام عرض ہے۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ خوابوں کا سورج اور بھی اونچا ہوجائے۔ اتنا اونچا کہ اس سورج کی تپش بھی تمہیں ٹھنڈی محسوس ہو۔ جب یہ پرچا تمہیں ملے گا اس وقت تک میں واپس وطن جاچکا ہوں گا اس لیے اس حقیر دوست کی طرف سے تحفہ حاضر ہے۔ یہ وہ رقم ہے جو تم نے مجھ پر خرچ کیے۔ میں ان کے بارے میں جانتا تو نہیں ہوں مگر پھر بھی چھ ہزار ڈالرز چھوڑ کر جارہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اتنی حقیر رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میرے جانے سے تمہیں کوئی فرق پڑے گا لیکن پھر بھی تمہارے راستے سے ہٹ جانا مناسب سمجھتا ہوں اس لیے کہ تم جولی جیسے خوب صورت گلاب کے ساتھ مجھے خار گلاب نہ سمجھ بیٹھو اور میں اپنی تمام تر غلطیوں کی معذرت کے ساتھ یہ رقعہ چھوڑ کر جارہا ہوں۔

خاکسار

منصور احمد

منصور کا یہ چھوڑا ہوا خط پڑھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا جسم دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہو لیکن اس میں وہ قطعاً بے قصور تھا۔ وہ میرے غلط رویے کی وجہ سے یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوگیا تھا۔ میں عیاشی کے نشے میں بھی بھول گیا تھا کہ میری ہونے والی شریک حیات اس کی بہن ہے اور یہ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ وہ نہ صرف میرا دوست ہے بلکہ کزن بھی ہے۔ اس کا اور میرا خونی رشتہ بھی ہے۔

کاش میں اس کی باتوں کو سمجھ سکتا۔ میرا جسم کپکپانے لگا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا لیکن اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں یہ بے سود تھا۔

گھر سے آیا ہوا خط اٹھایا تو میرے ہاتھوں کی لرزش اور بھی بڑھ گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لفافہ کھولنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے میرے اپنوں کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ ماں، باپ، بہن اور بھائی۔ سب مجھے کتنا مس کرتے ہوں گے۔ ان کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے، مجھے ایسا لگا کہ ہر فرد اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا شکوہ کر رہا ہو۔ جولی کی اس جھوٹی محبت میں اپنے ماں، باپ، بہن اور بھائی کی سچی محبت کو بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بوڑھے اور غریب ماں باپ نے کس طرح میری خواہش کی تکمیل کی جو کہ کبھی پوری نہ ہونے والی تھی۔ انہوں نے میری ملک سے باہر جانے والی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ انہوں نے میری خاطر بے پناہ قرض لے کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ رخصت ہوتے وقت ماں نے مجھے کتنا پیار کیا تھا۔ مجھے سینے سے لگا کر اس نے بے شمار آنسو بہائے تھے۔

''بیٹا! جی تو نہیں چاہتا کہ اپنے وجود کا حصہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ سے الگ کروں لیکن...... اس لیکن کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر ''اپنا خیال رکھنا بیٹا'' کہہ کر رونے لگی اور میں نے آنسو کا ایک قطرہ بہائے بغیر مسکراتے ہوئے جھوٹے دلاسے دے کر ماں کو مطمئن رہنے کی تاکید کی۔ جب ماں سے الگ ہوا تو باپ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔''

''بیٹا! منزل تک پہنچنے کے لیے پرخار رستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ حالات تمہارے سامنے ہیں وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی اس بات میں چھپے مقصد کو سمجھ نہیں پایا تھا اور پھر باپ سے الگ ہوا تو بہن آنکھوں میں جدائی کے آنسو لیے گلے سے لگی۔'

''بھیا! کسی گوری کے چکر میں مت پھنس جانا۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش ضرور کی تھی مگر رو پڑی۔

''پگلی کہیں کی۔'' میں نے ہنستے ہوئے صرف اتنا ہی تو کہا تھا۔ پیار سے اس کے سر پر چپت بھی لگائی تھی اور پھر اس کے بعد بھائی نے سینے سے لگا لیا۔

''ہم سب کو بھولنا مت بھیا۔ سنا ہے لوگ پردیس جا کر گھر والوں کو بھول جاتے ہیں۔'' یہ چھوٹے بھائی کی بڑی نصیحت تھی۔ پتا نہیں کیوں میں اس کے جواب میں خاموش رہا۔ جیسے میرے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔

''یس...... دروازہ کھلا ہے۔''

دروازہ کھلا اور مسٹر جو نے دروازے سے گردن اندر کر کے کہا۔ ''مسٹر عمران! تمہارے پاس صرف دو دن ہیں ورنہ قانونی کارروائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے وارننگ دی اور چلا گیا۔

یہ وہی دوستی اور محبت کے جھوٹے وعدے کرنے والا مسٹر جو تھا۔ جو اکثر میرے ساتھ وہسکی پیتا رہتا تھا اور نہ صرف تفریحی معاملات بلکہ اس کے کئی مسائل حل کرنے میں، میں نے کئی ہزار ڈالرز خرچ کیے تھے۔ یہ جولی کا کزن تھا جو اکثر جولی کے پیغامات لایا اور لے جایا کرتا تھا۔ جولی اور میری قرابت میں اس کا بہت اہم کردار تھا۔ جواب میرا دکھ میرا درد معلوم کرنے کی بجائے مجھے وارننگ دے کر چلا گیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جب کہ میں اپنی پوری زندگی میں کبھی اس طرح نہیں رویا تھا۔

مجھے پریشانی تو ہوئی ہی تھی لیکن اگر منصور کے چھوڑے ہوئے چھ ہزار ڈالرز نہ ہوتے تو میں بہت ہی زیادہ پریشان ہو جاتا۔ کرایہ، بجلی اور گیس کا بل ملا کر مجھ پر اس وقت 27 ہزار ڈالرز لاگو تھے اور یہ ساری رقم ادا کرنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ چھ ہزار ڈالرز منصور نے چھوڑے تھے اور دس ہزار ڈالرز میرے پاس تھے۔ ان کے علاوہ گیارہ ہزار ڈالرز درکار تھے۔ ان کے لیے مجھے بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ رقم زیادہ اور وقت بہت کم تھا۔ قرض ادا کرنے کے علاوہ مجھے مزید اتنی ہی رقم کی ضرورت تھی کہ میں باآسانی اپنے وطن واپس جا سکوں۔ اپنے اس مقصد کے حل کے لیے اپنے بے شمار ملنے جلنے والوں کی منت سماجت کرنا پڑی مگر اس مشکل رات میں سب نے ہی منہ موڑ لیا۔ تو میں نے اپنا ورک شاپ اونے پونے دام پر فروخت کر دیا۔ تب جولی کا مطالبہ پورا کیا۔ ان کی پوری رقم ادا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اگر میں ایسا نہ کرتا تو مجھے تھوڑے نہیں بلکہ کافی عرصہ تک جیل میں سزا کاٹنا پڑتی جو میرے لیے بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوتا۔ میں بھاگنے کی کوشش بھی نہیں

کر سکتا تھا۔ کیوں کہ میرا پاسپورٹ ان لوگوں کے پاس تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ اچھے خاصے بارسوخ لوگ تھے۔ اس لیے وہ مجھ پر کئی قسم کے کیس بنا سکتے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ وہ مجھے میری کسی بھی حرکت پر مجھے غیر ملکی جاسوس نہ قرار دے دیں۔ لہٰذا مجھے ان کے مطالبات پورے کرنا پڑے کیوں کہ میں ان کے آگے بلیک میل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ جولی نے میرے ساتھ سراسر زیادتی کی تھی۔ اس نے مجھ سے بے شمار رقم بٹوری تھی۔ وہ عیاش عورت تھی۔ اس نے مجھے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر لوٹ لیا تھا لیکن پھر وہی حقیقت کہ غلطی تو میری اپنی ہی تھی۔ مجھے اس لٹیری عورت کی جھوٹی محبت، شادی کے وعدے، اپنے کاروبار اور جایداد میں مجھے حصہ دار بنانے کی لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ لالچ کی اس چکاچوند روشنی نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔ اتنے بڑے نقصان کے بعد میں دلبرداشتہ اپنے گھر واپس جانے کو تیار ہو گیا۔

کراچی ایئرپورٹ کی حدود سے گاڑی باہر نکلی تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ سانس اس طرح پھولنے لگی کہ جیسے یورپ سے پاکستان تک کا سفر دوڑ کر طے کیا ہو۔ پسینے کی دھاریں میرے جسم پر بہنے لگی تھیں۔ عقبی شیشے سے جھانکا تو میری آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ درد کی شدت سے سر پھٹ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے سارے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر رونے لگوں۔ اپنے کپڑے پھاڑ دوں، سارے زمانے کو اکٹھا کر لوں اور اپنے ستم زدہ ہونے کا قصہ سناؤں۔ ان کو خبردار کر دوں کہ میری طرح کوئی اپنی آنکھوں پر عیاشی کی چربی نہ چڑھا لے۔ ان کو خبردار کر دوں کہ کبھی بھی شعلوں پر آشیانہ بنانے کی کوشش مت کرنا۔

میرے بال بری طرح بکھر رہے تھے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

ڈرائیور نے حسب عادت عقبی شیشے سے مجھے دیکھا اور اس کی نظریں مجھ پر جمی کی جمی رہ گئیں۔ وہ کچھ دیر تک حیرانگی کے عالم میں مجھے دیکھتا رہا اور پھر اس نے غیر متوقع سوال کر دیا۔

''کس ملک سے آ رہے ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا اور اپنی نظریں سامنے مرکوز کر دیں۔

''امریکا سے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ میرا جواب سن کر اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اس کی حیران آنکھوں سے تجسس چھلک رہا تھا۔

''لگتا تو نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔'' میں نے اپنا درد چھپانے کی کوشش کی مگر پھر بھی آواز بھرا گئی۔

''کتنا عرصہ رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''چار سال۔'' میں نے بتایا۔

''لگتا ہے چار سال میں بھی آپ کو کچھ بنانے کا موقع نہیں ملا۔'' اس نے کہا۔ وہ عقبی شیشے سے مجھے گھور رہا تھا۔

''بنایا تو تھا۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا؟'' اس نے ایسے پوچھا جیسے اسے بھی کوئی غرض ہو۔

''شعلوں پر آشیانہ۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ میری بات کو سمجھ نہیں پایا۔

''بس یہیں روک دو۔'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرے میں نے کہہ دیا۔ اس نے فوراً گاڑی ایک طرف روک دی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ ابھی تک حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

گلی سنسان تھی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ بے خبر سوئے ہوئے لوگ گھروں کے خاموش بند دروازے میرا منہ چڑا رہے ہوں۔ مجھ پر میرے کردار پر قہقہے لگا رہے ہوں۔ جن میں میرا اشکوں سے بنایا ہوا آشیانہ جل رہا ہو۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آ کر میں اپنے گھر کے سامنے رک گیا۔ دروازے پر دستک دینا ہی چاہتا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں نے پلٹ

کر دیکھا منصور کھڑا تھا۔

''تم؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اب کیوں آئے ہو؟ کیا لینے آئے ہو یہاں؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کے ان سوالات پر میری نظریں جھک گئیں۔

''اپنے گھر۔'' میں نے صرف اتنا ہی کہا اور اس کا چہرہ تمتمنے لگا۔

''کون سا گھر؟ وہ گھر... جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا۔ اس گھر کی بات کر رہے ہو جس کی بربادی کے ذمے دار تم خود ہو۔ آج تمہیں اس گھر میں غربت، بیماریاں اور مسائل نظر نہیں آ رہے۔ کیوں آئے ہو ان بھوکے ننگے لوگوں کے گھر میں؟ اس لیے کہ جولی نے تمہیں لوٹنے کے بعد مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا ہے؟''

''پلیز!'' میں نے منصور کی طرف دیکھتے ہوئے سماجت سے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔ میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

اسی وقت ایک صاحب تیز تیز چلتے ہوئے آئے اور ہمارے پاس ٹھہر کر کہنے لگے۔

''اس وقت کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟ آگے پیچھے ہو جائیں۔ ویسے ہی حالات خراب ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازہ کھولا اور وہ اندر چلا گیا۔

''یہ... یہ... یہ تو ہمارا گھر...''

''نہیں اب یہ گھر تمہارا نہیں رہا۔ یہ وہ صاحب ہیں جن سے تمہارے ماں باپ نے تمہیں تمہاری خواہش پر یورپ بھیجنے کے لیے قرض لیا تھا اور اسی قرض میں یہ لوگ تمہاری جگہ کے مالک بن گئے۔'' اس نے بتایا۔

''اور... اور... میرے ماں باپ... بہن بھائی...؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی چاچا چاچی اور بہن ایک دوسرے محلے میں کرایہ کا مکان لے کر رہ رہے ہیں۔ چلو میں وہاں لیے چلتا ہوں۔''

شرمندگی کا بوجھ اٹھائے میں اس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ایک خستہ حال عمارت کے سامنے رکی۔ منصور نے کرایہ ادا کیا اور مجھے ساتھ لے کر اس عمارت کے دروازے پر پہنچا۔ پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ابو کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ایسے جیسے انہیں کوئی گلہ نہ ہو۔ اماں اور بھائی بہنوں کا رویہ بھی ایسا تھا جیسے میں نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی ہو۔ سب لگاوٹ بھرے انداز میں باتیں کر رہے تھے کہ اندر کا دروازہ کھلا اور جو ہستی سامنے آئی اسے دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ گلابی شلوار سوٹ میں ایک پاکستانی دوشیزہ کے روپ میں جولی داخل ہوئی۔ اس نے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر میری طرف دیکھا پھر بولی۔ ''مجھے یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہوگی۔ میرے آنے کی وجہ کیا ہے یہ بتانے سے پہلے ایک اور بات بتا دوں، یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میرے والد پاکستانی تھے۔ یہ انہی کے خون کا اثر ہے کہ میں پاکستانی اور پاکستانی کلچر سے محبت کرتی تھی۔ تم سے اسی لیے قریب ہوئی تھی کہ تم پاکستانی ہو۔ ایک پاکستانی ہو کر بھی جب جب تم مجھ سے بہت زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے میں روک دیتی کیونکہ میری رگوں میں ایک غیور باپ کا خون تھا لیکن جب منصور سے تمہارے حالات معلوم ہوئے تو میں نے تمہیں سبق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میری امی ایک لارڈ فیملی کی تھیں۔ بہت بڑی جایداد کی مالک پھر بھی انہوں نے ابو سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ یہی کچھ میں نے بھی سیکھا۔ ایک اچھے معاشرے میں خود کو ضم کرنے کا خواب ہمیشہ دیکھتی رہی لیکن جب تمہارا اصل چہرہ سامنے آیا تو میں بھڑک اٹھی۔ پہلی سزا امریکا میں بھگت لی اب دوسری سزا سنو، آج یہاں دو نکاح ہوں گے۔ پہلا نکاح منصور تمہاری بہن کا پھر مولوی صاحب ایک دوسرا نکاح پڑھائیں گے۔ میرا اور تمہارے چھوٹے بھائی کا۔ پھر میں اسے لے کر امریکا چلی جاؤں گی تاکہ تمہارے ابو کے سر پر جو قرضے ہیں اتر جائیں۔ اب تم آ گئے ہو تو ایک اور نکاح ہوگا۔ تمہارا اور منصور کی بہن کا۔ اب تم اماں ابا کے ساتھ یہاں رہو گے۔ ان کی خدمت کرو گے ہر ماہ ایک بڑی رقم تمہارا بھائی بھیجا کرے گا تاکہ ایک اچھا سا مکان خریدا جا سکے۔ میری اس تقریر کا آخری جملہ یہ ہے کہ اسلامی گھریلو نظام سے بہتر کوئی اور نظام زندگی نہیں ہے۔ کل میں واپس چلی جاؤں گی لیکن اگلے سال جب آؤں گی تو اردو میں باتیں کرنے لگوں گی تاکہ اماں کی باتیں بہ آسانی سمجھ لوں۔''

فین

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

سب سے پہلے ایک گزارش ہے کہ اس سرگزشت کو میرے اصل نام سے شائع نہ کریں۔ یہ سرگزشت میں نے آپ کے خصوصی نمبر کے لیے ارسال کی ہے۔ یہ ایک جنونی فین کی سرگزشت ہے جو آپ کو بھی پسند آئے گی۔

تہمینہ ہمدانی

(لاہور)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا نام دوں۔

میں ایک تقریب میں تھی کہ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اپنے بارے میں بتا دوں کہ میں سنگر ہوں۔ آج کل کی عام سنگر کی طرح نہیں کہ جن کی آواز کو موسیقی سہارا دیتی ہے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ بغیر ساز کے گا کر دکھاؤ تو ان کی آواز ہی نہیں نکلتی۔

میں بچپن ہی سے گانوں کی شوقین تھی۔ میری آواز کو

میں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ میرے استاد مرحوم نفیس علی خان تھے۔ ایک شریف اور مہذب انسان۔ ان کا تعلق پٹیالہ گھرانے کی گائیکی سے تھا۔ (یہاں یہ بتا دوں کہ موسیقی میں جو گھرانا کہا جاتا ہے اس کا مطلب کوئی گھر کے افراد نہیں ہوتے بلکہ اسکول آف تھاٹ سمجھ لیں)

سن کر خاندان والے میرے والدین سے کہا کرتے۔ ''یہ تم لوگ اس بچی کو کیا سکھا رہے ہو؟ کیا آگے چل کر اسے گلوکارہ بنانا ہے؟''

اس پر میرے والد جواب دیا کرتے۔ ''کیا آپ لوگ یقین کریں گے کہ اس کی آواز بنانے میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے اچھی آواز لے کر پیدا ہوئی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی نعمت ہے۔''

میرے ابو اسی مزاج کے تھے، کھلے ذہن کے۔ انہوں نے ہمیں اچھا برا سمجھا دیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کی نیچر ہی بگڑ جانے والی ہے تو وہ لاکھ تربیت کے باوجود بگڑ ہی جاتا ہے اور جس کی فطرت اس کے برعکس ہو اس کو دنیا کی کوئی طاقت خراب نہیں کر سکتی۔ ہم نے اپنے بچوں کو اچھے برے کی تمیز سکھا دی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا۔ کون سا راستہ غلط ہے اور کون سا صحیح ہے۔

اسی لیے ہم بہن بھائی ہمیشہ ان راستوں پر چلتے رہے جو راستے ہماری تہذیب اور مذہب نے بتائے تھے۔ شو بزنس میں کامیابی کے بعد بھی میں اپنی جگہ مستحکم رہی۔ کوئی مجھ پر الزام نہیں لگا سکتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھا کرتی۔

بڑے بڑے کنسرٹ میں جایا کرتی۔ اپنے باوقار لباس میں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میرے رویے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ لوگ گائیکی سننے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ گانے والی کا جسم اور اس کی ادائیں دیکھنے نہیں آتے۔

بہرحال سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک گڑبڑ ہو گئی۔ اب پتا نہیں یہ گڑبڑ تھی یا کچھ اور تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی ہوں۔

کنسرٹ میں شریک ہوئی۔ پرفارم کے بعد واپس ہال سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف جا رہی تھی کہ ایک بچہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے بچہ ہی کہوں گی، یا لڑکا سمجھ لیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر سولہ سترہ سے زیادہ نہیں تھی۔

ایک پیارا سا لڑکا۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید ٹوپی تھی۔ جالی والی، ویسی ٹوپی جو عام طور پر نماز کے لیے پہنی جاتی ہے۔ میں نے اس کو ایک نظر دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے مجھے آواز دے کر روک لیا۔ ''میری بات سنیں پلیز۔''

اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ میں آگے نہیں جا سکی۔ اس کی آواز سن کر رک گئی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آگیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ایک غریب لڑکا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''او تو تمہیں کچھ پیسے چاہئیں۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں غریب ہوں۔ اسی لیے آپ کے لیے کچھ اور نہیں لا سکا ہوں۔'' اس نے اپنا وہ ہاتھ آگے کر دیا جو اس نے پیچھے کر رکھا تھا۔ اس میں گلاب کا ایک پھول تھا۔ ''یہ لے لیں۔ مجھے خوشی ہو گی۔''

وہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ کسی نے اس انداز سے مجھے ایسا تحفہ نہیں دیا ہو گا اور وہ بھی گلاب کا پھول۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے پھول لے لیا تھا۔

''میرا نام خرم ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔''

''چلو ایک بار اور شکریہ۔'' میں بول کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

وہ اسی جگہ کھڑا میری طرف دیکھتا رہا تھا۔ گھر کی طرف آتے ہوئے بھی اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ گھر آکر جب میں نے گھر والوں کو یہ بتایا تو سب حیران رہ گئے تھے۔

''بے چارہ۔'' میری چھوٹی بہن نے تبصرہ کیا۔ ''ہوتے ہیں۔ اس قسم کے جنونی ہوتے ہیں۔''

''لیکن وہ جنونی نہیں لگ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک نارمل لڑکا تھا۔ نہ جانے اسے کیا سوجھ گئی تھی۔''

''چلو اس نے تحفے میں تمہیں گلاب ہی دیا۔ اگر ہاتھ میں کوئی بم پکڑا دیتا تو کیا کر لیتیں؟''

بات مذاق میں ٹل گئی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ جب کہ میری مصروفیات جاری رہیں۔

ایک دن وہ پھر میرے سامنے آگیا۔ اس بار بھی اس کا لباس وہی تھا۔ میں اس رات ایک پروگرام سے گھر کے لیے نکلی تھی کہ راستے میں کچھ ہی دور جا کر گاڑی نخرے دکھانے لگی۔ ایک دو ہچکیاں لے کر بند ہو گئی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں عام طور پر رات گئے کسی پروگرام میں نہیں رہا کرتی۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اٹھ جاتی ہوں جب کہ دوسروں کو دیکھتی ہوں کہ تین تین بجے تک پروگراموں میں مصروف رہتے ہیں۔

میں اسی شرط کے ساتھ کوئی پروگرام قبول کرتی ہوں کہ بارہ بجے کے بعد نہیں رکوں گی۔ اس رات گیارہ بجے ہی اٹھ گئی تھی۔ سوچا تھا کہ جلدی گھر پہنچ جاؤں گی لیکن گاڑی ہی خراب ہو گئی۔

اب میں بے بسی کی تصویر بنی گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ لوگ گزرتے جا رہے تھے۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ لوگ کسی کی ہمدردی سے بھی کترایا کرتے تھے اگر میں کسی کو مدد کے لیے بلاتی بھی تو نہ جانے کتنی دیر میں آتا۔

اسی دوران کسی فرشتے کی طرح وہی لڑکا میرے پاس آگیا۔ ''السلام علیکم۔''

میں نے اسے فوری طور پر پہچان لیا تھا۔ ''ارے تم یہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''اس شہر میں آپ کا جو بھی فنکشن ہوتا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح پاس یا ٹکٹ لے کر پہنچ جاتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر نہ لے سکوں تو ہال کے باہر کھڑا ہو جاتا ہوں تاکہ آپ کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں آپ کو دیکھ کر واپس گھر جا رہا تھا کہ آپ کی گاڑی کو خراب دیکھ کر آپ کے پاس آگیا۔'' اس نے بڑی معصومیت سے بتا دیا۔

اس وقت اس کا دم بہت غنیمت لگا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے؟''

''ہاں میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟ یہاں کوئی مکینک بھی نہیں ملے گا اور میں کسی مکینک کو جانتی بھی نہیں ہوں۔''

''آپ گھر والوں کو فون کر دیں۔'' اس نے مشورہ دیا۔ ''میں اپنے ایک انکل کو بلاتا ہوں۔ وہ مکینک ہیں۔ دس منٹ میں گاڑی ٹھیک کر دیں گے۔''

اس وقت کچھ ڈر سا لگا تھا۔ نہ جانے اس کا انکل کیسا ہو گا۔ رات کا وقت ہے۔ خدا جانے وہ کس مزاج کا ہو لیکن کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''آپ گھبرائیں نہیں۔'' اس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی۔ ''میرے انکل بہت اچھے مکینک ہیں۔ میرے بلانے پر آجائیں گے۔''

اس وقت اس کی بات مان لینے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے پاس موبائل بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھ ہی سے موبائل لے کر اپنے انکل کو ملانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے انکل سے باتیں کر رہا تھا۔ ''انکل پلیز! آپ تیمور روڈ پر آجائیں۔ آپ کی بہت ضرورت ہے۔ پلیز ہاں میں وہیں کھڑا ہوں اور اپنا سامان بھی لیتے آئیے گا۔ اس کی ضرورت ہو گی۔ کتنی دیر میں آرہے ہیں؟''

اس نے میرا موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ وہ قریب ہی رہتے ہیں۔''

''تم کیا کرتے ہو؟'' میں نے وقت گزاری کے لیے پوچھا۔

''پڑھتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''سیکنڈ ایئر میں۔ مجھے آپ کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے میں آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔''

اس کی باتوں میں بھی سادگی تھی۔ ایک بھولا پن تھا۔ نہ جانے کیسا جذبہ تھا جو اسے اس طرح میرے پاس لایا کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک پرانی سی گاڑی ہمارے پاس آکر رک گئی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر آدمی برآمد ہوا۔ وہ لڑکا اس کو دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ ''انکل! ان کی گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ آپ ذرا دیکھ لیں۔''

اس کے انکل نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر پہچان کر بولا۔ ''تم شاید وہ سنگر ہو نا شہرزاد۔''

''جی ہاں میں وہی ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اپنے گھر جا رہی تھی کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ اس وقت یہ کسی فرشتے کی طرح میری مدد کے لیے پہنچ گئے۔'' میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت تک مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم ہوا تھا۔

''اوئے خرم۔'' اس شخص نے اس لڑکے کو مخاطب کیا۔ ''چلو میری مدد کرو۔''

اس وقت مجھے یاد آیا کہ اس لڑکے کا نام خرم تھا۔ ان دونوں نے مل کر میری گاڑی کچھ دیر میں ٹھیک کر دی۔ گاڑی ٹھیک ہو جانے کے بعد وہ شخص میرے قریب آگیا۔ ''یہ جو خرم ہے نا۔ یہ آدھا پاگل ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ تمہارے لیے پاگل ہے۔ ہر وقت تمہاری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میں اس کا دور کا انکل ہوں لیکن جب بھی میں اس کے گھر جاتا ہوں یہ تمہاری باتیں کر کر کے میرا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اس کو۔ اور یہ اتفاق دیکھو کہ

آج اسے تمہاری مدد کرنے کا موقع بھی مل گیا۔"

"جی ہاں جناب، ورنہ میں تو بری طرح پھنس چکی تھی۔"

خرم بھی اپنے انکل کا سامان اس کی گاڑی میں رکھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ میری باتیں کرتا تھا۔ میرے پروگرام میں شرکت کرتا تھا۔ کیا تھا یہ سب، بہر حال میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے خرم کے انکل کو معاوضہ بھی دینا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہیں جی، ذرا سا تو کام تھا۔"

"کام تو ذرا سا تھا لیکن آپ اپنا کام چھوڑ کر آئے آپ نے وقت دیا، یہ تو بہت ہے نا؟"

"کچھ بھی نہیں ہے۔ اب آپ جائیں رات ہو رہی ہے۔"

میں ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی۔ خرم بہت خوش تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ میرے کسی کام آیا تھا۔ اس کے لیے یہ ایک بڑی بات تھی۔ کچھ بھی ہو۔ وہ میرے کام آیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ میں اسے کوئی اچھا سا تحفہ دے دوں گی۔

میں فنکشن میں جاتی تو تھی لیکن یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ خرم اس بھیڑ میں کہاں ہوگا۔

وہ میرے سامنے بھی نہیں آتا تھا۔ ایک بار میں نے اپنی ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو وہ سیریس ہو گئی۔ "شہرزاد! یہ ایک خطرناک بات ہے۔" اس نے کہا۔ "اس قسم کے لوگ جنونی ہوتے ہیں۔ وہ تمہارے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم اس کو نہیں مل سکتیں تو وہ تم کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"یار کیوں ڈرا رہی ہو مجھے۔" میں نے کہا۔

"ڈرا نہیں رہی۔ خبردار کر رہی ہوں۔" میری دوست نے کہا۔

"تو پھر بتاؤ، کیا کروں؟"

"اس کو سختی سے منع کر دو کہ وہ تمہارا پیچھا نہ کیا کرے۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ وہ پیچھا بھی نہیں کرتا۔ میرا مطلب ہے کہ پیچھا کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں میں ہوتی ہوں وہ اس کے ارد گرد ہی گھومتا ہو لیکن سامنے نہیں آتا۔"

"بہت عجیب سچویشن ہے۔ بہر حال تم اس کی حوصلہ افزائی مت کرو۔ منع کر دو اس کو۔ ورنہ جان کا عذاب ہو جائے گا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ابھی اس کی عمر بھی بہت کم ہے۔"

"ہاں بہت کم عمر ہے۔" میں نے بتایا۔

"یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے۔ اس عمر کے لڑکے خوابوں کے درمیان رہتے ہیں۔ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی کو اپنا آئیڈیل بنا لیتے ہیں۔ اس نے تم کو اپنا آئیڈیل بنا لیا ہے اگر وہ تم کو کچھ نہیں کر سکا تو خود کو برباد کر دے گا۔"

میری دوست نے یہ سب بتا کر مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں نے تو اس کو نہیں بلایا تھا۔ وہ تو خود ہی میرے پیچھے پڑ گیا تھا لیکن اس سے مجھے کوئی نقصان بھی نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو ایک بار میرے کام بھی آیا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بے چارہ اپنے ارادے سے باز آ گیا ہو یا کسی نے اسے سمجھا دیا ہو۔ بہر حال بات کچھ بھی ہو وہ غائب ہی ہو گیا تھا۔

لیکن ایک دن اچانک میرے موبائل پر کسی کا فون آ گیا۔ میں عام طور پر کسی نامعلوم نمبر کو اٹینڈ نہیں کرتی۔ اسی لیے میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بہت دیر بعد پھر اسی نمبر سے فون آیا اس بار میں نے نمبر اٹینڈ کر ہی لیا۔ "ہیلو!" میں نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں، خرم۔" دوسری طرف سے اسی کی آواز آئی۔ "آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔"

"ہاں خرم پہچان لیا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔ "تم کو میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟" میں نے پوچھا۔

"بڑی مشکلوں سے ملا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آپ سے بات کروں۔ نہ جانے آپ کیا سمجھیں۔ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ میرے پاس میرا اپنا موبائل سیٹ نہیں تھا۔ میں نے کچھ پیسے جمع کر رکھے تھے۔ ان سے موبائل خرید کر لایا ہوں اور آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

اس کی سادگی پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ بے چارہ اپنے بارے میں بتا چکا تھا کہ ایک غریب آدمی ہے۔ اب صرف مجھ سے باتیں کرنے کے چکر میں موبائل سیٹ خرید کر لے آیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "خرم تم ایسا کرو مجھ سے ملو۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"آپ سے ملوں؟" اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔

"ہاں مجھ سے ملو۔" میں نے دوبارہ کہا۔ "بلکہ ایسا کرو تم ولیز پر آ جاؤ۔ ولیز تم نے دیکھا ہے نا؟"

"جی ہاں دیکھا تو ہے لیکن باہر سے۔" اس نے کہا۔ "اندر کبھی نہیں گیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم اندر آ جانا۔" میں نے کہا۔ "میں وہیں ملوں گی۔ شام چھ بجے آ جانا۔"

میں نے اس کو اس لیے بلایا تھا کہ میں اس کو سمجھا سکوں۔ اس سے کہوں کہ وہ اپنی تعلیم پر دھیان دے۔ اپنا مستقبل بنائے۔ وہ کن چکروں میں پھنس گیا ہے۔ میرے پیچھے بھاگنے سے کچھ نہیں ملے گا۔

میرے بلانے پر وہ ولیز پہنچ گیا تھا۔ اس شام اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر ٹوپی بھی نہیں تھی۔ ہاتھ میں ایک موبائل بھی تھا۔ جو سستا سا تھا لیکن وہ اسی کو بہت شان سے لایا تھا۔

میں نے اسے بیٹھ جانے کو کہا تو وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ نروس بھی دکھائی دے رہا تھا۔ خود میں نے ہی بات شروع کی۔ "خرم کیسے ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"جی اچھا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ کیا کھاؤ گے؟ یا پیو گے؟"

"نہیں آپ نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ بتائیں کیا کھائیں گی؟ کیا پئیں گی؟"

"اوہو۔" میں ہنس دی۔ "چلو تمہاری آفر ڈیو رہی۔ آج میری طرف سے۔"

میں نے اس کے لیے سینڈوچز اور آئس کریم منگوا دی۔ پھر جب وہ کسی حد تک نارمل ہوا تو میں نے بات شروع کی۔ "دیکھو خرم اگر میں کچھ کہوں تو کیا تم مان لو گے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ بول کر تو دیکھیں۔" اس نے کہا۔

"خرم دیکھو تم بہت اچھے لڑکے ہو۔" میں نے بات شروع کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تم آگے بڑھو۔ خوب ترقی کرو۔ تمہارے سامنے ابھی زندگی باقی ہے۔ کسی سے محبت کرنے کو زندگی باقی ہے۔ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا تو افسوس کرتے رہ جاؤ گے اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں تمہاری دوست ہوں۔ ایک اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو اچھے مشورے دے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی سمجھ رہا ہوں۔" اس نے اپنی گردن جھکا رکھی

تھی۔
''دیکھو تم جو کچھ کر رہے ہو۔ یہ جنون اچھا نہیں ہے۔ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی نقصان پہنچاؤ گے۔''
''خدا نہ کرے کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی نقصان ہو۔'' اس نے کہا۔
''تم جان بوجھ کر کچھ نہیں کرو گے۔'' میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''لیکن تم جانتے ہو نا کہ میرا تعلق کس شعبے سے ہے۔ یہ اخبار اور ٹی وی والے الٹی سیدھی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ کہانی بنانے میں دیر نہیں لگاتے۔ پتا نہیں کیا کیا رپورٹ اڑا دیں۔ تم اتنے دنوں سے میری کھوج میں ہو۔ تم کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرا مزاج بہت الگ ہے۔ میں نے ہمیشہ خود کو بچا کر رکھا ہے۔ اس لیے میرا دامن صاف ہے۔ میں کوئی اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتی۔ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں لیکن تم کو بہت سوچ کر قدم اٹھانا ہے۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو..... تم اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو بلکہ ایسا کرو کہ تم اپنی تعلیم کے اخراجات مجھ سے لے لیا کرو۔ بغیر کسی جھجک کے۔ کیوں کہ میں جان گئی ہوں کہ تم بہت اچھے اور سچے دوست ثابت ہو سکتے ہو۔ تم ہمیشہ مجھے اپنا دوست پاؤ گے۔''
اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں پیسوں کے لیے آپ کے ساتھ ہوں؟''
''ارے نہیں یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔ میں تو ایک دوست کے ناطے کہہ رہی ہوں۔ کیا دوست کا فرض نہیں ہے کہ وہ دوست کی مدد کرے۔''
اس کی انا اچھی لگی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ بہت دیر بعد وہ دھیرے سے بولا۔ ''چلیں ٹھیک ہے لیکن جو میں بولوں گا آپ بس وہی دیں گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''
''اچھا بابا۔'' میں ہنس دی۔ ''چلو تمہاری یہ بات مان لی۔ اب کہو کیا ضرورت ہے؟''
''اتنے پیسے کہ میں ایک اچھا سا جوڑا خرید سکوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اپنے لیے نہیں۔ آپ کے لیے اور یہ بھی ادھار ہوں گے۔''
''یہ کیا بات ہوئی؟''
''ہاں یہ میری خواہش ہے۔ کیا اسے پوری نہیں کریں گی؟''
اس نے اس انداز سے بات کی کہ مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ عجیب لڑکا تھا۔ ''چلو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری خواہش پوری ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ چلتے ہیں یہاں سے مارکیٹ قریب ہی ہے۔''
''تو پھر پانچ ہزار روپے دے دیں۔''
میں نے اپنے بیگ سے دس ہزار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ''یہ لو دس ہزار۔''
''نہیں پانچ ہزار۔'' اس نے کہا۔ ''میں دس ہزار کیسے واپس کر سکوں گا۔ ادھار لے رہا ہوں۔ میری حیثیت ایسی نہیں ہے کہ دس ہزار کی شاپنگ کرا سکوں۔''
میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ کیسا تھا وہ۔ اگر یہ اس کی چاہت تھی تو کیسی چاہت تھی اور اگر یہ اس کی انا تھی تو کیسی انا تھی۔ بہرحال میں نے پانچ ہزار واپس رکھ لیے۔
ہم مارکیٹ پہنچ گئے۔ اس نے ایک دو دکانیں دیکھنے کے بعد ایک دکان سے ایک سوٹ منتخب کر لیا۔ اس کی قیمت ساڑھے چار ہزار تھی۔ اس وقت وہ کسی بچے کی طرح خوش اور پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ اس دنیا اور اسی معاشرے میں ایسے بھی ہوا کرتے ہیں۔
اس نے میرے لیے ایک سوٹ خریدا۔ اور کہنے لگا۔
''اب میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔''
''ضرور کہو۔''
''بس کسی دن مجھے یہ سوٹ پہن کر دکھا دیں۔'' اس نے کہا۔ ''میری خوشی کے لیے۔''
''اچھا بابا۔'' میں ہنس دی۔ ''تم نے اتنی محبت سے سوٹ دلایا ہے کل... اسی ریستوران میں آ جاؤں گی۔''
دوسری شام میں اسی ریستوران میں پہنچ گئی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے وہی سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اس کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔
میں ایک بار پھر وہی کہوں گی کہ آخر کیا ہو رہا تھا یہ سب؟ میں اس کے کیا کام آ سکتی تھی۔ یا وہ میرے لیے کیا ثابت ہو سکتا تھا کچھ پتا نہیں۔ ایک اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھ پانچ ہزار بھی لے آیا تھا۔ جو اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیے تھے۔
''ارے یہ کیا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ وہ پانچ ہزار جو آپ نے کل مجھے دیے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا ایک دوست ہے۔ اس سے لے کر آیا

ہوں بعد میں اس کو واپس کر دوں گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں اس کی بے لوثی پر حیران ہو کر رہ گئی۔

وہ کس طرح کا تھا اور مجھ سے کیا چاہتا تھا؟ اتنی بے غرض محبت بھی میں نے کم ہی دیکھی ہو گی۔ اگر اس کو محبت کا نام دیا جائے تو وہ تو ہر قدم پر حیران کرتا جا رہا تھا۔

میں نے اسے وہ پیسے واپس کرنے چاہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے وہ پیسے نہیں لیے تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک اس کا پتا نہیں چلا۔ معلوم بھی ہوا تو اس وقت جب میں ہوش میں آئی۔

دوسرے ہی دن میرا ایک بھیانک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ خدا کو زندگی بچانی تھی اس لیے بچ گئی۔ ورنہ میری گاڑی کی حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کو چلانے والا زندہ ہو گا۔ موقع پر موجود لوگ مجھے اٹھا کر اسپتال لے آئے تھے۔ وہاں کسی نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اسپتال والوں نے تلاش کر کے میرے گھر والوں کو فون کر دیا۔

اس کے بعد کی کہانی بہت پریشان کرنے والی اور بھاگ دوڑ والی ہے۔

مجھے خون کی فوری ضرورت تھی۔ وہ بھی مل گیا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ ایک نوجوان نے مجھے خون دیا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ اس کا خون میچ کر گیا تھا ورنہ خون کا بندوبست کرنے میں نجانے کتنی دیر لگ جاتی۔ میڈیا کو بھی پتا چل گیا۔ بہت سے لوگ آئے۔ میرے ایکسیڈنٹ کی خبریں نشر کی گئیں۔ مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ وہ خرم ابھی تک میرے پاس نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ ممکن ہے کہ اسے میرے ایکسیڈنٹ کی خبر ہی نہ ملی ہو۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا وہ تو میرے سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔

پھر ایک دن ایک آدمی کسی طرح اجازت لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا وہ مکینک تھا جس نے میری گاڑی ٹھیک کی تھی جس کو خرم نے فون کر کے بلایا تھا۔

اس نے میرے بستر کے پاس آ کر پوچھا۔ "کیسی ہیں آپ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ مجھے خرم کے بارے میں بتائیں وہ کیسا ہے؟"

اس نے جواب دینے کی بجائے اپنی گردن جھکا لی۔

"بتائیں تو سہی خرم کیسا ہے؟"

"بس جی کیا بتاؤں۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ کو خون دینے کے بعد تیسرے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ اپنے اللہ جی کے پاس چلا گیا۔"

"کیا؟ مجھے خون دینے کے بعد؟"

"ہاں جی پوری چار بوتل خون دیا تھا اس نے۔ حالانکہ ڈاکٹرز منع کر رہے تھے لیکن اس کی ضد تھی کہ آپ کے جسم میں اگر خون جائے گا تو اسی کا جائے گا۔"

"او خدایا یہ تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

"ہاں جی کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ فرشتہ کون ہے جو آپ کو خون دے کر گیا ہے۔ بس یہ بات میں جانتا تھا۔"

"اور...... اور وہ مر کیسے گیا؟"

"بس جی کیا بتاؤں، اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ روڈ کراس کرتے ہوئے اسے خود پر قابو نہیں رہا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کی موت تھی جو سامنے سے ایک تیز رفتار ٹرک گزر رہا تھا۔ بس جی وہ اس کو کچلتا ہوا چلا گیا۔" وہ رونے لگا تھا۔

خود میرا یہ حال تھا کہ میں سن ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا انجام ہوا تھا اس کا۔ اس نے کس کے لیے جان دے دی تھی جو اس کی کبھی نہیں ہونے والی تھی۔ یہ محبت تھی تو کیسی محبت تھی۔ اس کو کیا نام دیا جا سکتا تھا۔

وہ مجھے اپنا خون دے کر مر گیا۔

شاید اسی لیے اس کی تخلیق کی گئی تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر کے واپس چلا جائے۔ وہ واپس چلا گیا تھا۔

کیا عمر تھی اس کی کچھ بھی نہیں۔ اوروں کے لیے چاہے اس کی کہانی میں کوئی بات ہو یا نہ ہو لیکن میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ اس نے مجھ پر جو احسان کیا تھا وہ بھی کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

اس نے ثابت کر دیا کہ محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ کوئی اسٹیٹس نہیں ہوتا۔ کوئی مسلک نہیں ہوتا۔ کوئی تقسیم نہیں ہوتی۔ محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ کتنی چھوٹی سی عمر میں محبت کی ایک مثال قائم کر کے مر گیا تھا۔

خدا اس کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ آج بھی جب میں کنسرٹ میں پرفارم کرتی ہوں تو میری نگاہیں اسی کو تلاش کرتی رہتی ہیں۔ ویسے تو وہ پہلے بھی چھپا ہی رہتا تھا۔ اب تو ہمیشہ کے لیے چھپ گیا ہے۔

خدا رحمت کنند این عاشقان پاک طینت را۔



کاش

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہی ہوں جو پُراسرار سی لگے گی لیکن پُراسرار نہیں. اس میں ایک ایسی بیماری کا... تذکرہ ہے جس کے بارے میں لوگ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ جن جنات کا شاخسانہ ہے. اُمید ہے آپ کے قارئین بھی اس سے محظوظ ہوں گے.

نیلما بٹ

(لاہور)

میں نے دستک پر کوئی توجہ نہیں دی۔

وہ نہ صرف دستک دے رہا تھا بلکہ آوازیں بھی دے رہا تھا۔ "نیلما۔ نیلما۔ یہ میں ہوں۔ شجاعت۔ تمہارا شجاعت۔ دروازہ کھولو۔"

میں کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ لیکن جب دستک رکنے میں نہیں آئی تو میں دروازے کے پاس چلی گئی۔ "کون ہے؟" میں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں شجاعت۔" باہر سے آواز آئی۔ "تم میری آواز بھی نہیں پہچان رہیں۔"

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ شجاعت ہی تھا، میرا شوہر، میرا محبوب، میرا سب کچھ۔ اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بال الجھے

ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ گالوں کی ہڈیاں بہت نمایاں ہو رہی تھیں۔ بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ شجاعت ہی تھا۔ میں اسے بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ اسی دوران تیز سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ احساس ہوا کہ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ اس موسم کے لیے ہرگز نہیں تھے۔

میں ایک طرف ہٹ آئی۔ ''آؤ اندر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ اندر آ گیا۔ برسوں کے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بیس برسوں کے بعد۔ ان طویل برسوں میں صرف وہی نہیں بدلا تھا بلکہ میں بھی بدل گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ میرے رنگ و روپ کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ خاندان اور خاندان سے باہر کے نوجوان مجھے اپنانے کی خواہش کرتے تھے۔ دعائیں مانگتے تھے کہ میں ان کے نصیب میں لکھ دی جاؤں۔ پھر میں شجاعت کے حصے میں آ گئی۔

وہ ایک سیلر تھا، ایک بحری جہاز کا کپتان۔ میرے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ کس کو لڑکی دے رہے ہو۔ یہ لوگ بہت بدمعاش ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں گھومتے رہتے ہیں۔ عیاشی ان کی گھٹی میں ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ گھروں میں تو بہت کم ہی رہتے ہیں۔ عام طور پر گھروں سے باہر سمندروں میں ان کی زندگی گزر جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جو قسمت میں ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ شجاعت سے میرا جوڑا لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا ہماری شادی ہو گئی۔ کیا اچھے دن تھے۔ اس زمانے میں شجاعت نے چھ ماہ کی چھٹی لے لی تھی۔ اس نے اپنی کمپنی والوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ فی الحال اپنی نئی بیوی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

ہم نے شادی کے ایک ہفتہ بعد کرائے کا ایک خوبصورت سا مکان لے لیا۔ ایک ہفتہ تک دونوں مل کر اس مکان کو سجاتے رہے۔ فرنیچر سے لے کر سب کچھ۔ جب تھک جاتے تو گاڑی لے کر کہیں سیر کے لیے چلے جاتے۔ پھر رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر واپس آتے۔ کیا اچھی زندگی تھی۔ اس وقت احساس نہیں ہو رہا تھا۔ پہلی بار احساس اس وقت ہوا۔ جب شجاعت کو کمپنی سے کال آ گئی۔ اسے ہر قیمت پر ڈیوٹی پر جانا تھا۔ ویسے بھی اس کی چھٹیاں ختم ہی ہو گئی تھیں۔

وہ چلا گیا۔ میں اس دن بہت روئی تھی۔ امی نے چھوٹی بہن کو میرے پاس بھیج دیا تھا تاکہ میں اکیلی نہ رہ سکوں۔ ندا کا اسکول بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی لیے اس کے آ جانے سے دل بہلتا رہا تھا۔ شجاعت تین مہینوں کے لیے گیا تھا۔ تین مہینوں کے بعد جب واپس آیا تو ایک بار پھر زندگی واپس آ گئی۔

اس کے بعد وہ ایک اور لمبے دورے پر چلا گیا۔ اس کے بعد اس کی واپسی ہی نہیں ہو سکی تھی۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ شپنگ کمپنی والے کہتے تھے کہ جہاز کو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ بحری قزاقوں نے عملے کو یرغمال بنا لیا ہے۔

اخبارات میں خبریں آتی رہیں۔ اس کے بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔ کوئی پتا نہیں چلا۔

پھر جو مجھ پہ گزری ہے۔ اس کی کیا داستان بتائی جائے۔ میں تو بالکل برباد ہو گئی تھی۔ ایک ایک دن میرے لیے عذاب کا تھا۔ میں کہاں کہاں بھٹکتی رہی تھی۔ میرے گھر والوں کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اگر شجاعت واپس نہیں آیا تو پھر میرا کیا ہو گا۔ میں کیا کہلاؤں گی، بیوہ؟ یا شادی شدہ۔ میری سماجی حیثیت کیا ہو گی؟

مذہب اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے شجاعت کو تلاش کرنے میں کیا کیا جتن نہیں کیا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔

کئی سال گزر گئے۔ میں نے شجاعت سے مایوس ہو کر ایک جگہ جاب بھی کر لی۔ کیا زندگی تھی میری۔

انتظار کی کیفیت تھی۔ گھر والے کہا کرتے کہ کب تک اس کی راہ دیکھو گی، شادی کر لو، اگر کہو تو عالموں سے فتویٰ لے لیا جائے۔ فتویٰ بھی لے لیا گیا۔ یہ ایک مسلکی معاملہ تھا۔ کئی ایسے فقہ تھے۔ جن کے یہاں اگر شوہر چار سال تک غائب رہے تو اس کے بعد عورت اپنی عدت مکمل کر کے نکاح کر سکتی ہے۔

لیکن اس کے لیے بھی شرعی عدالت وغیرہ کی اجازت ضروری ہو گی۔

ہم سب نے پوری طرح کوشش کی کہ شجاعت کا سراغ مل جائے۔ شپنگ کمپنی والوں نے بتایا کہ کچھ لوگ مل گئے ہیں۔ جن کو ایک کشتی کے ذریعے ایک جزیرہ میں پناہ مل گئی تھی لیکن ان میں شجاعت شامل نہیں تھا۔

کب تک تنہا زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ بالآخر گھر والوں نے میری شادی ظفر سے کر دی۔

شادی کے بعد ظفر کمال کے آدمی ثابت ہوئے۔

انہوں نے میرے دل سے شجاعت کی یاد بھلا دی۔ اتنی محبت کی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ بہت ہی وسیع دل کے انسان تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر تم شجاعت کو یاد رکھتی ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ عین فطرت ہے۔ جس کے ساتھ ایک وقت گزارا ہو۔ اس کو ایک دم سے اپنے ذہن سے جھٹک دینا آسان نہیں ہوتا۔ میں بھی کبھی کہا کرتی۔ ''ظفر، فرض کرو۔ اگر کسی دن شجاعت چلے آئیں تو تمہارا کیا رویہ ہو گا؟''

''اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔'' ظفر کہا کرتے۔ ''لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے بھی تم سے بہت محبت کی ہے۔''

میں ہنس کر چپ ہو جاتی۔ دن پر دن۔ مہینے پر مہینے گزرتے چلے گئے؟ سال پر سال، پورے چودہ برس۔ پھر بیس سال۔ اتنے ڈھیر سارے دن کم تو نہیں ہوتے۔ جوت ختم ہو جاتی ہے۔ آنکھیں بجھ جاتی ہیں۔ زلفیں سوکھی گھاس کی طرح ہو جاتی ہیں۔ چہرے کی تازگی اور شادابی کہیں گم ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت اگر کوئی اچانک آ جائے تو کیا ہوتا ہے۔ ''یہ تو بتلاؤ کہ ایک عمر کا بچھڑا محبوب...... اتفاقاً اگر مل جائے تو کیا کہتے ہیں؟''

یہی میرے ساتھ ہوا۔ شجاعت کی واپسی میرے لیے قیامت کی واپسی تھی۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر رونے لگی۔ ان کی آمد ایک طوفان تھی۔ اور خدا جانے یہ طوفان کس کس کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جانے آ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے آپ پر قابو پا کر ڈرائنگ روم میں واپس آ گئی۔ شجاعت خاموش بیٹھے تھے، کسی خیال میں گم۔

بہت ممکن تھا کہ جو کچھ مجھ پر گزری تھی۔ اس سے کہیں زیادہ ان پر گزر چکی ہو۔ ان کی حالت بتا رہی تھی کہ انہوں نے بہت برے دن گزارے ہیں۔ زندگی ان کے لیے بہت سخت رہی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ہمارے پاس شاید کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ جب ہم ایک ساتھ بیٹھتے تو میں اپنی باتوں سے ان کا دماغ چاٹ جاتی تھی۔

بہت دیر بعد شجاعت نے کہا۔ ''نیلما۔ کیسی ہو تم؟''

''بس تمہارے سامنے ہوں۔'' میں دھیرے سے بولی۔ ''زندہ ہوں اور کیا چاہیے؟''

''نیلما زندگی کیا سے کیا ہو گئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم اس طرح ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ لیکن......''

''بس شجاعت!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہم نے جو زندگی گزاری ہے اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ جو کچھ ہو چکا وہ اب واپس نہیں آ سکتا۔ میں اب کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ ظفر بہت اچھے ہیں۔ بہت پیار کرنے والے۔ اب تم میری زندگی میں ہلچل مچانے کیوں آ گئے ہو؟''

وہ خاموش رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ میری بات کا کیا جواب دے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''نیلما میرے ساتھ جو گزری ہے۔ وہ میں بتا نہیں سکتا۔''

''اب میں سننا بھی نہیں چاہتی۔ تم آ گئے ہو۔ تم کو دیکھ لیا ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ میں ظفر کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ تم چلے جاؤ یہاں سے۔''

ابھی میں نے کہا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ظفر واپس آ گئے تھے۔ میں اب کیا کہتی۔ یا خدا، میں کس مشکل میں پڑ گئی تھی۔ کاش میں نے شجاعت کے لیے دروازہ کھولا ہی نہ ہوتا۔ یا پھر اسے دروازے سے رخصت کر دیا ہوتا۔ اندر لانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے گھبرا کر شجاعت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کسی مجسمے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اب دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے شجاعت سے کہا ''ظفر واپس آ گئے ہیں۔ میں دروازہ کھولنے جا رہی ہوں۔ تم اس سے کوئی بہانہ بنا دینا یا کچھ اور بتا دینا۔''

تیسری بار بھی گھنٹی بجی۔ میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ظفر کھڑے تھے۔

''خیریت تو ہے جان۔'' ظفر نے کہا۔ ''دروازہ کھولنے میں اتنی دیر لگا دی۔''

وہ اندر آ گئے۔ شجاعت کرسی پر بیٹھا تھا۔ ظفر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ انہوں نے وہ شاپر میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو بھئی تمہاری دوائیں لیتا آیا ہوں۔''

میں بس پاگلوں کی طرح ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ کیا

ہو رہا تھا یہ سب۔ وہ شجاعت کا نوٹس کیوں نہیں لے رہے تھے۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ میں نے شجاعت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ جیسے ظفر کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔

میرا حال کیا تھا۔ یہ میں بتا نہیں سکتی۔

"میں فریش ہونے جا رہا ہوں۔" ظفر نے کہا۔ "تم میرے لیے چائے بنا دو۔"

وہ اٹھ کر چلے گئے اور میں پھٹ پڑی۔ "شجاعت خدا کے لیے آپ چلے جائیں۔ نہ جانے کیوں ظفر خاموش ہیں۔" انجان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کب تک...... چلے جائیں۔

اتنی دیر میں ظفر بھی کسی کام سے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ "ارے بھائی کیا ہوا تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" ظفر نے پوچھا۔

"ظفر...... یہ...... یہ......" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ آ گئے تھے۔ تو میں نے انہیں بٹھا لیا۔"

"کون آ گئے تھے؟ کس کو کہہ رہی ہو۔"

اور اس وقت مجھے ایک شاک سا لگا۔ ظفر کا لہجہ ایسا نہیں تھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں۔ یا اگنور کر رہے ہوں۔ یا کوئی اور بات ہو۔ ان کا لہجہ یہ بتا رہا تھا کہ انہیں واقعی شجاعت دکھائی نہیں دے رہے۔ خدا جانے یہ کیا ماجرا تھا؟

میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔ "ظفر کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیا کرسی پر کوئی نظر نہیں آ رہا ہے؟"

"نیلما۔ میرا خیال ہے کہ تم کو آرام کی ضرورت ہے۔" ظفر نے کہا۔ "کرسی پر کوئی ہو تو نظر آئے؟ کرسی تو خالی ہے۔"

اور اس لمحے پتا چلا کہ ظفر سچ کہہ رہے تھے۔ انہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی نہیں تھا وہاں۔ تو پھر جو کچھ میں نے دیکھا وہ کیا تھا۔ کون میرے سامنے آیا تھا۔ میں نے کس سے باتیں کی تھیں۔ کیا تھا یہ سب۔

میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ ظفر میرے لیے گلاس میں پانی لے کر آ گئے۔ "لو پانی پی لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سکون مل جائے گا۔"

میں پانی پی کر ظفر کی طرف دیکھنے لگی۔ کسی حد تک میری طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ظفر بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔

" ہاں۔ اب بتاؤ۔ کیا دیکھا تھا تم نے کس کو دیکھا تھا ؟

"شجاعت کو۔" میں نے بتایا۔

"شجاعت کو؟" وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔ "کیا کہہ رہی ہو۔ کس شجاعت کی بات کر رہی ہو؟ اپنے سابقہ شوہر کی؟"

"ہاں۔ وہ آئے تھے۔ بہت خستہ حالت تھی ان کی۔ وہ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا تو اندر چلے آئے۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ جب آپ آئے تو اس وقت بھی وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہی نہیں۔"

"نیلما۔ جب میں اندر آیا تو کوئی بھی نہیں تھا۔" ظفر نے کہا۔ "تم جس کرسی کی بات کر رہی ہو۔ اس پر کوئی بھی نہیں تھا۔ بالکل خالی تھی۔"

تو پھر کیا تھا یہ سب؟ کیوں تھا۔ اگر یہ وہم تھا تو وہم اتنا حقیقی بھی ہو سکتا ہے۔ اتنا مضبوط ہو سکتا ہے؟

اس رات ظفر نے زبردستی مجھے سونے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ میں تو ساری رات ہی بیٹھی سوچتی رہتی کہ یہ سب کیا تھا۔ کیا میں پاگل ہو گئی تھی۔ دوسرے دن جب ظفر دفتر جانے لگے تو میں نے انہیں روک دیا۔ "نہیں ظفر آج آپ نہ جائیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"نیلما۔ اگر اسی طرح رہیں تو اپنے آپ کو پریشان کرتی رہو گی۔ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔ چلو آج دفتر نہیں جا رہا۔ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟"

اس دن ہم دن بھر گھر سے باہر رہے۔ شام کے وقت ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا بھی کھایا۔ رات کو ہم واپس آئے تو میری طبیعت بہل چکی تھی۔ اس کے بعد سب نارمل ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک ہفتے کے بعد جب میں شجاعت کو بھول چکی تھی تو پھر وہی سب کچھ ہوا۔ اس بار بھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شجاعت کھڑے تھے۔ ان کا وہی حال تھا۔ جو میں پہلے دیکھ چکی تھی۔

اس بار ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ میں پیچھے ہٹ آئی۔ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر یہ حقیقت تھی تو پھر ایسی حقیقت صرف میرے لیے کیوں تھی۔ شجاعت ظفر کو نظر کیوں نہیں آتے تھے؟

میں نے گھبرا کر دروازہ بند کرنا چاہا تو شجاعت بول پڑے۔ "نیلما کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

وہی آواز؟ وہی لہجہ۔ وہی سب کچھ۔ تو پھر کیا تھا یہ سب؟ ہو سکتا تھا کہ ظفر کسی مصلحت سے کام لے رہے

ہوں۔ اسی لیے انہوں نے یہ ظاہر کیا ہو کہ کوئی بھی سامنے نہیں ہے۔ میں یا تو خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔"

شاید اسی قسم کی کوئی بات ہو گی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "شجاعت۔ یہ بتائیں۔ آپ کا وجود ہے یا کوئی خواب ہے؟"

"کیسی بات کر رہی ہو۔ میں زندہ تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا تم میرے وجود سے انکار کر رہی ہو؟ جانتی ہو۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے کچھ بنایا تو ہو گا۔"

اور اس وقت میں چیخ گئی۔ یا خدا۔ شجاعت بھوکے ہیں۔ کیا حالت ہو گئی ان کی۔ اور میں اپنے گھر میں دنیا بھر کی نعمتوں کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

"آئیں شجاعت۔ اندر آ جائیں۔" میں نے کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پہلے کی طرح اندر آ گئے۔

ان کو جیسے معلوم تھا کہ کس صوفے پر بیٹھنا ہے۔ وہ اسی صوفے پر بیٹھ گئے جس پر پہلے بیٹھے تھے۔

"میں نے آج بھنڈی کا سالن بنایا ہے۔ آپ تو بہت شوق سے کھاتے تھے نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بہت شوق سے اور ہاں۔ اس کے ساتھ چاول بھی بنائے ہوں گے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بس آپ دو منٹ بیٹھیں۔ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔" میں نے کہا۔

میں جب ٹرے لے کر آئی تو شجاعت الماری میں رکھی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ میری آہٹ سن کر میری طرف دیکھا۔ "نیلما۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی تک ان کتابوں کو سمیٹ کر رکھا ہے جو میں پڑھا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ میں انہیں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔" میں نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی۔ "یہ لیں۔ کھائیں۔"

شجاعت کھانے لگے۔ ہر نوالے پر وہ اپنی عادت کے مطابق تعریف کرتے جا رہے تھے۔ "مزہ آ گیا۔ اتنی مدت کے بعد گھر کا کھانا ملا ہے۔ اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں کا۔ اور کیا چاہیے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "شجاعت۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "شاید آپ کو اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ کی تلاش میں کیا کیا جتن نہیں کیا۔"

"اندازہ ہے مجھے۔" شجاعت نے کہا۔ "اسی لیے تو واپس آ گیا ہوں۔"

پتا نہیں کیوں۔ اس دن بہت خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ظفر کا خیال بھی آ رہا تھا۔ لیکن شجاعت کی موجودگی نے ایک عجیب سا حوصلہ دے دیا تھا۔ میں ان سے باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری تھی۔ میں نے کس طرح زندگی گزاری۔ کہاں کہاں جاب کی۔ لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ پھر تنگ آ کر شادی کر لی۔ وہ بھی برسوں کے انتظار کے بعد۔ اور فتویٰ لے کر۔

پھر ظفر میری زندگی میں شامل ہو گئے۔ اب میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا پیار مجھے شجاعت سے ملا تھا۔ وغیرہ۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اور میری باتیں سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی بول بھی لیتے تھے۔

ایک عجیب بات ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کس طرح رہے۔ کہاں رہے۔ ان پر کیا گزری۔ کچھ نہیں بتایا۔ میں نے بھی ان سے زیادہ کرید نہیں کی۔

ظفر جب گھر میں آئے تو شجاعت واپس جا چکے تھے۔ میں نے ان سے کچھ چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ میرے شوہر تھے۔ میں کسی طرح بھی انہیں دھوکے میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے کہا۔ "ظفر۔ شجاعت آج بھی آئے تھے۔"

"اچھا۔" ظفر نے ہنکاری لی اور عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ "کس وقت آئے تھے۔"

"آپ کے جانے کے بعد۔" میں نے بتایا۔ "آج تو کھانا بھی کھا کر گئے ہیں۔ بہت مزے لے لے کر بھنڈی کھائی ہے۔ یہ دیکھیں میز پر برتن بھی پڑے ہوئے ہیں۔"

"نیلما۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کھانا کھا کر گئے ہیں لیکن برتنوں میں تو کھانا رکھا ہوا ہے۔"

میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ برتنوں میں کھانا اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح میں نے ان کے لیے نکال کر دیا تھا۔ تو پھر کیا تھا وہ سب۔ وہ تو میرے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سارے برتن بھرے ہوئے کیوں تھے؟

مجھے چکر سا آنے لگا۔ میں نڈھال ہو کر ایک صوفے پر گر پڑی۔ ظفر نے فوراً مجھے سنبھال لیا۔ "نیلما۔ کیا ہوا ہے تم کو؟ کیا ہے یہ سب؟"

"میں نہیں جانتی کہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرا وہم نہیں ہے۔ وہ ٹھوس

حالت میں سامنے آتے ہیں۔ان سے باتیں ہوتی ہیں۔“

اور میں پاگل ہوتی جارہی ہوں۔ یا تو جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ سچ ہے یا پھر بات کچھ اور ہے۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے چلوں۔“ ظفر نے کہا۔”اگر یہ کسی قسم کا وہم ہے تو نکل جائے گا۔“

سائیکاٹرسٹ نے تفصیلی گفتگو کے بعد بتایا کہ میں مالیخولیا کی مریضہ ہوں۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب، مجھے تو شجاعت سامنے نظر آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔ایسا ہی ہوتا ہے ۔ اسے optical illusion کہا جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کردار سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو۔اور جب یہ کیفیت بڑھ جائے تو... خطرناک بھی ہوجاتی ہے۔“

اس کے بعد یہ ہوا کہ سائیکاٹرسٹ نے کئی سیشن کیے۔

یہ ایک طویل داستان ہے کہ اس مرض کا علاج کس طرح کیا گیا لیکن اس تمام عرصے میں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ ظفر کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔

وہ میری اس انوکھی بیماری سے بہت پریشان تھے۔اس کا اپنے طور پر انہوں نے ایک علاج تلاش کرلیا۔حالانکہ اب شجاعت میرے سامنے نہیں آتے تھے۔اس کے باوجود ظفر یہ چاہتے تھے کہ مجھے مکمل سکون حاصل ہوجائے۔

ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ شجاعت کے گھر لے آئے۔

میرے خدا۔ کتنے برس کے بعد میں اس گھر میں آئی تھی۔ جو کبھی میری سسرال ہوا کرتی تھی۔ نہ جانے ظفر کے ذہن میں کیا تھا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔

شجاعت کی امی بڑے خلوص سے ملیں۔ بہت دیر تک ہم روتے رہے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔

باتوں کے دوران شجاعت کی امی نے کہا۔”بیٹا دو سال ہوئے۔میرے بیٹے کی لاش ملی تھی۔ اس کو تین سال پہلے اغوا کرلیا گیا تھا۔وہ اتنے برسوں تک زندہ تو تھا لیکن مردوں سے بدتر۔اس کے بعد اس کو مار دیا گیا۔ کیوں کہ وہ اب اغوا کرنے والوں کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔“

میں سکتے کے عالم میں یہ سب سن رہی تھی۔

آنٹی یہ بتائیں گی کہ شجاعت کو کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ ظفر نے پوچھا۔

”بیٹا وہ لوگ جنگل میں لکڑیاں کٹواتے تھے۔جن کو اغوا کیا جاتا ان سے وہ لوگ کام بھی لیتے تھے۔ پھر ان کو مار کر وہیں جنگل میں دفن کردیا جاتا۔“

”کس ملک کی بات ہے؟“

”کینیا کی۔ میرا بیٹا کینیا میں تھا۔ جب اس کو بھی اٹھا لیا گیا۔ لیکن وہ پڑھا لکھا تھا۔ اسی لیے اس سے لکڑیاں تو نہیں کٹواتے تھے لیکن لکھا پڑھی کے کام پر لگا دیا تھا۔ میرا بیٹا کئی ...... برسوں تک ان ظالموں کی قید میں رہا ہے۔ پھر جب اس کی صحت جواب دے گئی۔ وہ کسی کام کا نہیں رہا تو اسے بھی مار دیا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ سب گرفتار ہو گئے اور میرے بیٹے کی لاش مل گئی۔ شپنگ کمپنی کے دفتر والوں نے بتا دیا کہ یہ کون ہے اور کہاں کا ہے۔ اس طرح اس کی لاش یہاں لائی گئی۔ ورنہ ہم تو ابھی تک اندھیرے ہی میں رہتے۔“ وہ رونے لگی تھیں۔

خدایا۔ بے چارے شجاعت کے ساتھ یہ سب ہوا تھا۔ کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں انہوں نے۔ اور ہم پتا نہیں کیا کیا سمجھتے رہے تھے۔

”آنٹی۔ ہم ان کی قبر پر جانا چاہتے ہیں۔“ ظفر نے کہا۔

”کیوں نہیں بیٹا۔ چلو میں بھی چل رہی ہوں۔“

میں جیسے ایک خواب کے عالم میں چل رہی تھی۔ شجاعت کی قبر میرے سامنے تھی۔ وہ شجاعت جو کبھی میرے شوہر رہ چکے تھے۔ وہ شجاعت جن سے میں نے محبت کی تھی۔ جن کے ساتھ ارمانوں بھرے خواب دیکھے تھے۔ ان کو کس بے دردی کی موت ملی تھی۔

ظفر اور شجاعت کی امی فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ جبکہ میرے تو ہونٹ خشک تھے۔ کیا کہتی کیا پڑھتی۔

بہر حال ہم واپس آگئے ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ شجاعت میرے سامنے نہیں آئے ۔ میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ میرا وہ optical illusion ختم ہو چکا تھا۔

بعد میں ظفر نے بتایا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ میرے علاج کا حصہ تھا۔

جب دل کو کسی کے نہ ہونے کا یقین آجائے تو پھر قرار مل جاتا ہے۔ قرار تو خیر مجھے بھی مل گیا ہے لیکن ایک خواہش آج بھی ہوتی ہے کہ کاش۔ کاش یہ سب کوئی واہمہ نہیں ہوتا۔

میرے ہاتھ میں موجود ڈائری، میرے ایک بہت اپنے کی آپ بیتی ہے۔ ہاں میرا بہت اپنا، جس نے اپنی زندگی ایک اہم مقصد کی خاطر گزاری۔ اسی لیے میں اس کے شب و روز کا احوال بار بار پڑھتی ہوں۔ پچھلے سترہ برس سے پڑھ رہی ہوں اور آج ایک بار پھر پڑھنے بیٹھی ہوں۔ ڈائری کے پہلے صفحے پر ”میرا کشمیر جل رہا ہے۔“ لکھا نظر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور ورق پلٹ دیا۔

اچانک زور سے بادل گرجے، بجلیاں آسمان پر دور

ظلمتِ شب

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم

برصغیر کے مسلمانوں نے ہندو بنیوں کو مسترد کر کے آزاد وطن کا نعرہ لگایا اور ایک آزاد وطن حاصل کرلیا. شب قدر کو ہمیں پاکستان مل گیا لیکن ریڈ کلف نے جو حد بندی منظور کی وہ ایسی تھی کہ جیسے مسلمانوں سے بدلہ لیا گیا ہو. ایسے بے شمار علاقے جو مسلم اکثریتی تھے اسے چھین لیا. مشرقی پنجاب ہو یا مشرقی بنگال ہر جگہ دغا ہوا. بڑے دھوکے دو ہیں ایک جونا گڑھ اور دوسرا کشمیر. کشمیر جو مسلم اکثریتی علاقہ تھا لیکن اسے ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا گیا. وہاں کے غیور مسلمانوں نے اس ظلم پر احتجاج کیا جو آج تک جاری ہے. ہمارے بہادر کشمیری مسلمان کس طرح طوق غلامی اتار پھینکنے کی کوشش میں ہیں اس کا ہلکا سا عکس حاضر ہے.

اعجاز احمد راحیل

(ساہیوال)



سمت لہراتی چلی گئیں۔ میں نے صفحے سے نظریں ہٹا کر کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان سے چھاجوں پانی گر رہا تھا۔ ہاں کشمیر کا آسمان رونے لگا ہے۔ میں دوبارہ ڈائری کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب پہلی بار پڑھی تھی۔ تب بھی ایسا ہی موسم تھا۔ آسمان رو رہا تھا اور میں بھی رو رہی تھی۔ میرے ہاتھ ورق پلٹ رہے تھے اور، چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ آسمان کشمیر کی زمین پر لگے لہو کے نشان دھو رہا تھا مٹا رہا تھا۔

پہلے ہی صفحے پر اس نے تعارف لکھا تھا۔ ''میرا نام جنید ہے۔ ہمارا کنبہ چار افراد پر مشتمل ہے۔ ابو، امی اور ہم دو بھائی۔ ابو جان کی سرینگر میں کپڑے کی دکان تھی۔ وہ سارا دن اپنی دکان پر مصروف رہتے اور شام کو واپس گھر آتے۔ ابو بتایا کرتے تھے کہ میں سارا دن صحن میں کھیلتا رہتا۔ جب میں چھوٹا تھا مجھے جہاز بہت اچھے لگتے تھے۔ جب بھی میں جہاز کی آواز سنتا، کھیلنا چھوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا۔ جب تک نظر آتا رہتا، میری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت کشمیر میں ظلم و بربریت کا بازار اتنا گرم نہیں ہوا تھا۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس خوبصورت وادی کے لوگ جہازوں کی آواز سن کر خوفزدہ ہونے لگے۔ جن میں، میں بھی شامل تھا۔ جہاز کی آواز مجھے بہت خوفناک لگتی تھی۔ کیونکہ بندوق بردار لوگ جہاز سے بھی ہم پر گولیاں برساتے تھے۔ انہوں نے پوری وادی کو مقتل بنانے کی ٹھان لی تھی۔ میرے ابو کی دکان کو بھی آگ لگا دی گئی۔ جس کی وجہ سے ہم کنگال ہو گئے۔ شاید اسی وجہ سے ابو نے مجھے اور وحید بھائی کو گاؤں بھیج دیا تھا اور خود مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے تھے لیکن کچھ ہی دنوں بعد گاؤں واپس آ گئے کیونکہ دشمن کی چلائی ہوئی گولی نے ایک پیر کو ناکارہ کر دیا تھا۔

ہمارا گاؤں پہاڑوں میں گھرا ایک خوبصورت گاؤں ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر دریا بہتا ہے۔ دوسری طرف ایک پختہ سڑک ہے جو کہ سرینگر سے یہاں آتی ہے۔ یہاں سے لداخ اور کارگل کی طرف جاتی ہے۔ یہ خوبصورت وادی قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ ٹھنڈے شفاف پانی کے چشمے، بل کھاتی ندیاں، جھرنے، فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں، جو کہ برف کی چادر اوڑھے چپ چاپ کھڑی یہاں ہونے والے مظالم کی چشم دید گواہ ہیں۔ وادی میں حد نگاہ لہلہاتے کھیت اور سبزہ زار ہیں درختوں پر چہچہاتے خوش الحان پرندے قدرت کی صناعی کا شاہکار ہیں۔ بلاشبہ یہ جنت بے نظیر ہے۔ اس گاؤں میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احترام ہے۔

گاؤں آنے کے بعد ابو نے مجھے گاؤں کے اسکول میں آٹھویں میں داخل کروا دیا۔ میرا بھائی وحید جو کہ مجھ سے تین سال بڑا تھا۔ ابو کا ہاتھ بٹاتا کام وغیرہ کرواتا تھا۔ گاؤں کے قریب ہی ہماری تھوڑی سی زمین تھی جس پر ابو نے فصل لگا دی۔

ابو نے کھیتی باڑی پر اکتفا نہیں کیا۔ گھر کے ساتھ ہی کریانے کی دکان بنالی۔ وہ دونوں کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ دکان بھی چلاتے تھے۔ ہماری گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔

میں اسکول سے چھٹی کے بعد اکثر ان کے پاس دکان پر ہی بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دن میں نے ابو سے پوچھا۔ ''بابا سب بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ میری ماں کہاں ہے؟''

وہ کچھ دیر چپ رہے پھر گہری سانس لے کر بولے۔ ''بیٹا وہ اللہ کے پاس چلی گئیں۔''

مجھے امی کا چہرہ ہلکا ہلکا سا یاد ہے بیں اس وقت صرف چھ سال کا تھا۔ جب امی ایک رات کے لیے اپنے میکے گئی تھیں۔ وہ مجھے اور وحید کو ابو کے پاس چھوڑ گئی تھیں۔ میرے نانا اور نانی کا گھر ہمارے گاؤں سے کئی کلو میٹر دور چھوٹی سی ایک بستی میں تھا۔ ایک رات بھارتی فوجیوں نے وہاں دھاوا بول دیا۔ وہ بستی جو پندرہ بیس گھروں پر مشتمل تھی۔ اسے آگ لگا دی۔ میری امی، نانا ابو، نانی امی، دو ماموں آگ میں جل کر شہید ہو گئے تھے۔

اس وقت مجھے اس سانحے کا صحیح ادراک نہ تھا لیکن اب جب میں ہوشمند ہوں تو اپنی بے بسی کا احساس ہوا ہے۔ وقت نے خود بتایا ہے کہ ہمیں کس طرح سے ستایا جا رہا ہے۔ اس درد کا احساس تب ہوا جب میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

ابو جان مجھے آگے پڑھانا چاہتے تھے لیکن ان دنوں وادی کے حالات خراب تھے۔ میں اس رات کو تو بھول ہی نہیں سکتا۔

اس رات ہم گھر کے صحن میں سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ ابو بھی جاگ گئے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

انہوں نے ایک پاؤں میں چپل پہنی اور بیساکھی کے

سہارے چلتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔ میں اور وحید بھی اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

انہوں نے دروازہ کھولا تو چار مسلح افراد گھر میں داخل ہو گئے۔

وہ چاروں ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ابو کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ بڑھی ہوئی شیو، لمبے بالوں اور میلے لباس والے آزادی کے متوالے تھے۔ یہ مجاہد تھے۔ انہیں خود سے نہیں اپنے کاز سے عشق تھا۔ وہ اپنی آخری سانس اور آخری گولی تک لڑنے کا عہد کر چکے تھے۔

انہیں اپنے لباس اور حلیوں کی پروا نہیں تھی۔ وادی کو غاصب درندوں کے ناپاک وجود سے پاک کرنا ان کا نصب العین تھا۔ یہ اپنے لہو کے چراغ جلا کر وادی میں ظلم و بربریت کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے والے لوگ تھے۔ وہ نزدیک میں کوئی کارروائی کرتے تو ستانے کے لیے ہمارے گھر آ جاتے تھے۔ ابو جان انہیں ہنسی خوشی پناہ دے دیتے۔

ان کے کھانے پانی کا انتظام کر دیتے۔ وہ لوگ مجھے اپنا آئیڈیل لگتے اسی لیے میں وحید کو ساتھ لے کر اندر والے کمرے میں آ گیا۔

وہ چاروں ابو کے ساتھ کمرے میں بچھی چٹائی پر بیٹھے تھے۔

''وحید بیٹا! تم کھانے پینے کا بندوبست کرو۔'' ابو، وحید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''اچھا بابا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ماشاء اللہ۔ جنید تو اب کافی بڑا ہو گیا ہے۔ مونچھیں بھی آ گئی ہیں۔'' ان میں سے ایک مجاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پہچان گیا اور ''چاچا باسط! آپ.....'' کہہ کر ان سے لپٹ گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگا لیا۔ کمانڈر باسط ابو کے دوست تھے۔ میں انہیں چاچا ہی کہتا تھا۔

وہ ایک جری کمانڈر تھے۔ بھارتی درندے ان کا نام سن کر کانپتے تھے۔ انہوں نے بھارتی آرمی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ پچھلے سات سال سے ان کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔

تین سال بعد میں نے انہیں دیکھا تھا گو کہ ان کا حلیہ اب کافی بدل چکا تھا۔ میں ان سے حال احوال پوچھنے لگا۔ وہ مجھے بتاتے رہے، پھر انہوں نے تینوں مجاہدوں کا تعارف کروایا۔

اتنی دیر میں وحید دال اور چاول گرم کر کے لے آیا۔ پہلے کھانا ابو بناتے تھے مگر کچھ عرصے سے یہ ڈیوٹی وحید نے سنبھال لی تھی۔

رات کا کھانا ابو ہمیشہ زیادہ بنواتے۔ ان کا کہنا تھا۔ اگر رات کو کوئی مجاہد آ جائے تو مسئلہ نہ ہو۔

وہ چاروں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے بعد وحید چائے بنا کر لے آیا۔ ابو نے چائے کی کیتلی اور پیالیاں لے کر اسے چھت پر بھیج دیا۔ وہ رائفل اٹھا کر چھت پر چلا گیا۔

ابو پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگے۔ میں اٹھا اٹھا کر انہیں دیتا گیا۔

کمانڈر باسط چائے پیتے ہوئے ابو کو اپنی تازہ کارروائی کے بارے میں بتانے لگے۔ ''کل رات ہمیں اطلاع ملی کہ صبح دس اسلحے سے بھرے ٹرک سرینگر آ رہے ہیں۔ ہم نے جلدی سے پلان ترتیب دیا۔ بعد ازاں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ اس مشن میں تین کمانڈرز سمیت اٹھارہ بندے تھے۔ ہم سرینگر روڈ پر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ آخر وہ دس ٹرک تباہ کر دیے۔ ان پر موجود بھارتی فوجیوں کو بھی جہنم واصل کر دیا۔'' ذرا توقف کے بعد بولے۔ ''اس خونی معرکے میں دو مجاہدوں نے شہادت کی سعادت حاصل کی ہے۔ ہم بمشکل سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انڈین آرمی کے دو ہیلی کاپٹر آ گئے تھے۔'' ذرا خاموش ہونے کے بعد بولے۔ ''بھارتی کتوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے، اسی لیے صبح وہ اردگرد کی بستیوں میں ظلم و بربریت کا بازار گرم کریں گے۔ ہمارا اگلا وار بہت کاری ہو گا۔ یہ اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔ بلبلاتے رہیں گے۔''

بابا جانی شدت جذبات سے مغلوب لہجے میں گویا ہوئے۔ ''باسط تم بہت جی دار ہو۔ اس دھرتی ماں کو تمہارے جیسے بہادروں کی ضرورت ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تم میرے دوست ہو۔ اگر میری ٹانگ ساتھ دیتی تو تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر ان درندوں پر قہر بن کر نازل ہوتا۔ ہم دشمنوں کی صفوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے۔ تاہم اب جنید کو تمہارے ساتھ بھیجوں گا۔''

کمانڈر باسط نے ان کی پشت پر تھپکی دی، وہ بولے۔

''غلام محمد! میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ دل سے قدر کرتا ہوں۔ تم نے ان بھارتیوں کو ماضی میں کافی نقصان پہنچایا ہے۔ اب بھی مجاہدین کی مالی و اخلاقی مدد کرتے ہو۔ یہ بھی جہاد ہے۔''

اس رات ہم فجر کی اذان تک جاگتے رہے۔ پھر وضو کیا اور کمرے میں ہی نماز ادا کی۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ کمانڈر باسط اور ان کے تینوں ساتھیوں نے ناشتا کیا اور نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔

اچانک وحید بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ''باسط چاچا! دو فوجی ٹرک اور دو جیپیں ہماری گلی کے سرے پر آ کر رک گئی ہیں۔''

ابھی اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ میگافون پر اعلان ہونے لگا۔

''گاؤں والو! اس گاؤں میں کچھ اگروادی آشرے لیے ہوئے ہیں۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو ورنہ جس گھر سے وہ پکڑے گئے۔ اس گھر اور اس میں رہنے والوں کو زندہ جلا دیئے جائے گا۔''

وقفے وقفے سے یہ اعلان تین مرتبہ دہرایا گیا۔

یہ مخدوش صورتِ حال تھی۔ باسط چچا مقابلے کی ٹھان چکے تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک اور انکشاف بھی کیا۔ ان کے علاوہ گاؤں میں پانچ مجاہد اور بھی ہیں۔ ان کے ساتھ کمانڈر مطیع اللہ بھی ہیں۔ گویا اس وقت نو مجاہد گاؤں میں تھے۔

بابا جانی، واجد انہیں سمجھانے لگے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ ہم کتوں کو روکیں گے۔

مگر وہ مسلسل انکار کرتے رہے۔

''کمانڈر میں سمجھتا ہوں۔ اس وقت ہم مجاہدین کو اور خاص طور پر کشمیر کی دھرتی کو آپ کی ضرورت ہے۔'' واجد نے شدتِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اگر سب یہاں رہتے تو بھی موت...... اگر نکلتے وقت نظروں میں آجاتے تب بھی موت...... کمانڈر باسط نے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر اپنے ساتھیوں شاہ زین اور محسن کو اشارہ کیا۔ ہم چاروں گھر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ جبکہ وحید اور واجد سب مشین گنیں اٹھائے سیڑھی کی جانب جا رہے تھے۔

ہمارا گھر گاؤں کے آخر میں تھا۔ اس کے عقبی دروازے سے پانچ منٹ کی مسافت پر ڈھلان تھی۔ جس سے اتر کر ہم پہاڑوں میں چھپ سکتے تھے۔

ہم دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اسی اثنا میں ہمارے گھر سے اگلی گلی کے مکان کی چھت سے فائرنگ کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ نعرۂ تکبیر ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بابا جانی، بھائی اور واجد چھت پر پہنچنے والے تھے۔ اوپر پہنچتے ہی انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج رہی تھی۔ یہ حق و باطل کا معرکہ تھا۔ مقتل سج چکا تھا۔

''لگتا ہے کمانڈر مطیع اللہ اور اس کے ساتھی بھی مقابلے پر اتر آئے ہیں۔'' کمانڈر باسط نے کہا اور ڈھلان کی طرف دوڑنے لگے۔

میں پوری رفتار سے ان کے ساتھ دوڑتا رہا۔ ہم کھلی جگہ پر تھے۔ اگر کسی بھارتی فوجی کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو ہماری موت یقینی تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ موت کسی وقت بھی ہمیں دبوچ سکتی تھی۔ ہم اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔

اچانک فائرنگ کی آواز تیز ہو گئی۔ پھر سماعت شکن دھماکا ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارا گھر جلتا نظر آیا۔ دشمنوں نے راکٹ فائر کیا تھا۔

تب تک ہم پہاڑوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔

کمانڈر باسط نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ محسن ذرا آگے تھا اور شاہ زین چند قدم پیچھے۔

ہم چاروں بھاگ رہے تھے۔ کمانڈر باسط کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ اس کے لمبے بڑھے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرا۔ میرا سر ایک ابھرے ہوئے پتھر سے ٹکرایا اور میرے ہوش و حواس کھونے لگے۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ میرے دائیں جانب موم بتی جل رہی تھی۔ فرش پر ایک بڑی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ اس کے پاس ہی کچھ برتن اور گھی کے کنستر تھے۔ غالباً ان میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر تین چار بندے بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے نظر آئے۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ یہ گنبد نما چھت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ کوئی غار تھا۔ یہ مجاہدانہ زندگی کی جھلک تھی جو میں نے پہلی بار دیکھی۔

اب آہستہ آہستہ مجھے سب یاد آنے لگا۔ ابو اور بھائی کی یاد آئی تو میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں سسک سسک کر رونے لگا۔

میری رونے کی آواز سن کر چاچا باسط میرے پاس آ گئے۔

''جنید چپ ہو جاؤ۔'' انہوں نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر میری پیشانی چوم کر کہا۔ ''بیٹا! تمہارے ابو اور بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں۔ انہیں اس کا عظیم اجر ملے گا۔ اگر وہ بچ کر نکل گئے ہیں تو بھی وہ غازی بن کر ثواب کے حقدار ہیں۔''

ایک پل خاموش ہوئے پھر بولے۔ ''میں تمہاری دلی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ اپنوں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پھر بھی صبر کرو۔ تمہارے رونے اور چلّانے کی آواز سن کر کوئی بھارتی درندہ ادھر آ سکتا ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ وہ جو بات سمجھانا چاہتے تھے۔ شاید میں سمجھ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد کھانا تیار کیا جانے لگا۔ انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، میرے گال تھپتھپائے اور غار سے باہر نکل گئے۔

کھانا تیار ہوا تو سب اکٹھے ہو گئے۔ دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ مجھے بھوک نہ تھی اس لیے میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ایک بندے نے قہوہ بنا لیا۔ یہ الائچی والا قہوہ خوش ذائقہ اور مزے دار تھا۔

میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ مجھے ابو کے ساتھ گزرے لمحے یاد آنے لگے۔ اچھا وقت پل میں گزر جاتا ہے لیکن برے وقت کا ہر لمحہ صدیوں کے برابر لگتا ہے۔

کمانڈر باسط اپنے ساتھیوں سے دبی دبی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ میرے پاس آ گئے۔

''جنید بیٹے! ہم مجاہدین کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''آج رات ہم ایک اہم مشن پر نکلیں گے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایک جاننے والے کے پاس چھوڑ دوں۔''

میں چپ چاپ اُن کی بات سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں بولا۔ ''نہیں چاچا میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔ ''بیٹے ابھی نہیں۔ ابھی تم اس کٹھن سفر میں ہمارے ساتھ چل نہیں پاؤ گے۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

میں چپ رہ گیا۔

دس، پندرہ منٹ بعد ہم غار سے باہر نکل آئے۔ کمانڈر باسط اور مجھ سمیت کل دس بندے تھے۔

چاندنی رات تھی۔ ہم سب ایک طرف روانہ ہو گئے۔ گھنی جھاڑیوں اور درختوں سے لدی ہوئی پہاڑیوں میں بل کھاتے راستوں پر ہم آگے بڑھتے گئے۔

ہمارا یہ سفر رات بھر جاری رہا۔ کہیں کہیں وہ ٹارچ بھی جلا لیتے۔ میں ان کے ساتھ ہانپتا، لڑکھڑاتا چلتا رہا تھا۔ وہ کئی بار سستانے کے لیے رکے۔ ایک چشمے پر رک کر ہم سب نے فجر کی نماز ادا کی۔

دن کا اجالا پھیلنے سے قبل ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ اب راستہ ہموار تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بیس منٹ بعد ہم ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں تین جھونپڑیاں اور بھی تھیں...... جو کہ خالی نظر آئیں ہم گھاس پھونس، گارے اور لکڑی سے بنے اس جھونپڑے کے سامنے کھڑے تھے۔

''فیضو بابا۔'' کمانڈر باسط نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا۔

اگلے ہی لمحے ایک بوڑھا آدمی جس کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔ جھونپڑے کے دروازے سے باہر نکلا۔ فیضو بابا نامی وہ شخص تیزی سے ہماری جانب بڑھا۔ وہ سیدھا کمانڈر باسط کے پاس آیا اور اسے گلے سے لگا لیا۔

''بیٹا کافی عرصے بعد آئے ہو۔'' بوڑھا ان کی پیشانی چوم کر بولا۔

''ہاں بابا۔ کچھ کام نمٹانے تھے۔ اب ادھر ایک مشن پر آیا ہوں۔''

''اللہ تم سب کو کامیاب کرے گا میرے بیٹو۔'' بوڑھے نے صدقِ دل سے دعا دی۔ سب نے زیرِ لب آمین کہا۔

''آؤ بیٹا اندر چلتے ہیں۔''

سب ان کی رہنمائی میں چلتے ہوئے جھونپڑے میں داخل ہوئے۔ جھونپڑی کے فرش پر ایک طرف گھاس پھونس کا بستر بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک چادر بچھی ہوئی تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر عورت اور لڑکا سو رہا تھا۔ وہ لڑکا میرا ہم عمر تھا۔

''بیٹا تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر فیضو بابا بڑے جھونپڑے میں چلے گئے۔ جب لوٹے تو ان کے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔

ہم سب جھونپڑی میں بچھے گھاس کے بستر پر بیٹھے

تھے۔
کمانڈر باسط انہیں میرے بارے میں بتا رہے تھے۔
آخر میں انہوں نے کہا۔ ”بابا میں چاہتا ہوں کہ جنید کو آپ اپنے پاس رکھ لیں۔“
”باسط بیٹے! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔“
فیضو بابا نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنے میں وہی میرا ہم عمر لڑکا کھانا لے کر آ گیا۔ جھونپڑی میں کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو پھیل گئی۔ کھانے میں تلے ہوئے انڈے اور چپاتیاں تھیں۔ ہم سب نے جی بھر کر کھانا کھایا۔
کھانے کے بعد وہ چائے لے آیا۔ چائے پی کر سب لیٹ گئے۔ فیضو بابا جاتے ہوئے کہنے لگے۔ ”آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں جگا دوں گا۔“
رات بھر سفر کی وجہ سے سب تھکے ہوئے تھے۔ جلد ہی سب سو گئے۔
عصر کے بعد میری آنکھ کھلی تو فیضو بابا اور باسط چچا باتیں کر رہے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”علی۔“ فیضو بابا نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔
”جی بابا۔“ اس لڑکے کی آواز سنائی دی، پھر وہ جھونپڑی میں آ گیا۔
”اپنے بھائی کو چشمے پر لے جاؤ۔ منہ ہاتھ دھولے گا۔“ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔
وہ لڑکا بولا۔ ”آؤ بھائی۔“
میں اٹھا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ ایک طرف پچیس، تیس مرغیاں دانہ دنکا چگ رہی تھیں۔ ان کے پاس ہی پانچ چھ بکریاں تھیں۔
ہم چشمے کی طرف چل پڑے۔ اس نے راستے میں بتایا کہ اس کا نام علی حیدر ہے۔ بابا اسے پیار سے علی کہہ کر بلاتے ہیں۔ میں چپ چاپ چلتا رہا۔ ہم دس منٹ بعد چشمے پر پہنچ گئے۔
میں نے شلوار کے پائنچے اوپر کیے اور چشمے میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا اور شفاف تھا۔ علی کنارے پر موجود ایک پتھر پر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی منہ ہاتھ دھو کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
اب سورج قدرے مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ چشمے کے کناروں پر چنار کے درخت کافی تعداد میں تھے۔ ان پر خوش رنگ پرندے چہچہا رہے تھے۔
ہمیں وہاں بیٹھے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی اور جنوب کی طرف بادلوں کی گھٹا اٹھی۔ آن واحد میں بادل پورے آسمان پر چھا گئے۔
”لگتا ہے آج بارش ہوگی۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اور پھر اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا جھونپڑے میں آ گیا۔
اتنی دیر میں آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔
کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ بارش کی وجہ سے باسط مضطرب ہو گئے ہیں۔ وہ بار بار جھونپڑی کے دروازے کے پاس جا کر آسمان کی طرف دیکھتے، لگ بھگ دو گھنٹے بعد بارش رک گئی۔
شام ہو گئی تھی۔ فیضو بابا کھانا تیار کروانے لگے۔
کھانے کے بعد کمانڈر باسط اور ان کے ساتھی مجھے بابا فیضو کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ تاہم جانے سے قبل چاچا باسط نے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا اور کہا۔ ”بیٹا تم آرام سے یہاں رہو۔ میں تمہیں ملنے آتا رہوں گا۔“
میں نمناک نگاہوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرا دل افسردہ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس رات میں فیضو بابا کے ساتھ ان کی جھونپڑی میں سویا۔ ان کی بیوی رابعہ بہت اچھی تھیں۔ بعد ازاں علی کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ وہ ان کا پوتا ہے۔ میرا اور علی کا درد مشترک تھا۔ اس کے ماں باپ بھی بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے اسی لیے دادا، دادی کے پاس آ گیا تھا۔
وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ دن کے اجالے رات کے اندھیروں کو نگلتے رہے۔
علی اور میں مرغیوں کا خیال رکھتے یا پھر بکریوں کو چرانے چشمے پر لے جاتے تھے۔ وہاں ہری بھری گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ فیضو بابا قریبی گاؤں میں مرغیوں کے انڈے بیچ کر گھر کا سودا سلف لے آتے تھے۔ باسط چچا بھی کبھی کبھار آ جاتے۔ ایک بار وہ آئے تو مجھے اور علی کو دو پستول دے گئے۔ ان کے چلانے کا طریقہ بھی سکھا دیا تھا۔ رہی سہی کسر فیضو بابا نے پوری کر دی۔ وہ ہر قسم کا اسلحہ چلا لیتے تھے۔
وقت دبے پاؤں چلتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ دن، رات کا لباس پہنتے رہے۔ رات صبح کے اجالے میں بدلتی رہی۔ مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ سال گزر گئے۔ اب میں اور علی بڑے ہو چکے تھے۔ ہم چشمے کے کنارے

بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کرتے تھے۔ اپنے ماں باپ کے ناحق قتل کی باتیں، کشمیری مسلمانوں پر مظالم کی باتیں۔

☆......☆......☆

وقت کبھی نہیں رکتا۔ یہ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ مجھے فیضو بابا اور ان کی بیوی رابعہ جنہیں میں اماں کہتا تھا، کے ساتھ رہتے ہوئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے پوتے سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔
سردیوں کی آمد آمد تھی۔ صبح میں بیدار ہوا تو اماں نے بتایا کہ رات تمہارے بابا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں تیز بخار ہے۔ تم دونوں گاؤں چلے جاؤ۔ حکیم سے دوائی لے آؤ اور انڈے بھی دکان پر دے کر سودا سلف لے آنا۔
میں فیضو بابا کے پاس چلا گیا۔ انہیں واقعی بہت تیز بخار تھا۔ میں نے ان سے طبیعت کے بارے پوچھا۔
وہ بولے۔ ”بیٹا! رات اچانک بخار ہو گیا ہے۔ تم دونوں ناشتا کر لو۔ علی ابھی اٹھ کر چشمے کی طرف گیا ہے۔ تم بھی منہ ہاتھ دھو آؤ۔ پھر گاؤں جا کر حکیم رمضان سے دوائی لے آنا۔“
”اچھا بابا جو آپ کا حکم۔“ یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ موسم کافی خنک تھا۔ میں چشمے کی طرف چلا گیا۔ علی ابھی وہیں تھا۔
میں نے فطری ضرورت سے فراغت کے بعد منہ ہاتھ دھویا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔
اماں نے رات کے بچے ہوئے چاول اور قہوہ بنا کر دے دیا۔ ہم نے ناشتا کیا۔ بکریوں کو چارا ڈالا۔ علی نے انڈوں کی ٹوکری اٹھا لی۔ ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔
ہم حفظ ماتقدم کے طور پر پستول بھی ساتھ لیتے آئے تھے جو ہمارے نیفوں میں اڑسے ہوئے تھے۔
ہم اونچے نیچے پہاڑوں، دشوار گزار راستوں پر سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔
ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ آخر ہم ایک پگڈنڈی پر پہنچ گئے۔ آگے بڑی سڑک تھی۔ جسے عبور کر کے گاؤں پہنچ جا سکتا تھا۔ تبھی علی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔ وہ پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔
مجھے وہاں رکے چند منٹ گزرے تھے کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میرا ہاتھ بے اختیار نیفے میں اڑسے پستول کی طرف رینگ گیا۔ اگلے ہی پل پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ تاہم اب ہر طرف خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد دبی دبی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ اب کی بار میں آواز کی سمت کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ میں پہاڑ کی اوٹ لے کر آگے بڑھنے لگا۔ تاہم اب قدرے محتاط تھا۔ اچانک عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
میں تیزی سے پلٹا۔ سامنے علی نظر آیا۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے بائیں جانب نشیب میں اتر گیا۔
میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ جونہی پہاڑ کی اوٹ سے نکلا، میری آنکھوں نے عجب منظر دیکھا۔ ایک بھارتی فوجی معصوم سی لڑکی سے گتھم گتھا تھا۔ اس رذیل کی پشت میری جانب تھی۔ وہ لڑکی کے اوپر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اسے بے لباس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اوپر کے لباس کو پھاڑ دیا۔
اب مزید رکنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا، پھر ٹھٹک کر رکا۔ اس کی وجہ لڑکی کا حلیہ تھا۔ وہ ہندو تھی۔ اس کے ماتھے پر بنی سرخ بندیا ہندو ہونے کا ثبوت تھا۔ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی، دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھا، بھارتی فوجی کی پوری توجہ لڑکی کی طرف تھی شاید اسی لیے وہ مجھے نزدیک آتے دیکھ نہ سکا۔ میں نے قریب جاتے ہی پستول کا دستہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر مارا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور وہ لڑکی کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ ہوس کا پجاری بے خبری میں مار کھا گیا۔ وہ لڑکی پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب تھا، پھر اس نے فوجی کو پرے دھکیلا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر نفرت سے اس پر تھوکا۔ وہ مڑی تھی کہ اسے اپنی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنے لباس کے پھٹے ہوئے حصے کو پکڑ کر ستر پوشی کر لی، پھر اس نے بائیں ہاتھ سے قریب پڑا وزنی پتھر اٹھایا جو اٹھ نہیں پایا تب اس نے کپڑے چھوڑ کر دوسرے ہاتھ کی مدد لی اور اس رذیل کے سر پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز ابھری اور کھوپڑی پھٹ گئی۔
وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ ”کتے تم نے یہ وردی دیش کی رکھشا کے لیے پہنی تھی۔ لیکن کوشش کی وردی پہن کر تو بھکشش بن گیا۔ ہندو ناریوں کی عزت لوٹنے لگا۔“
اس نے نفرت سے اس کے مردہ جسم پر پھر تھوکا۔
اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سن کر میں بجلی کی

تیزی سے گھوما......وہ علی تھا۔

"سڑک کے کنارے کھڑی جیپ سے اتر کر ایک فوجی ادھر آرہا ہے۔" اس نے قریب آکر بتایا۔

"اے لڑکی...... تم یہاں کھڑی رہو۔ ہم قریب ہی رہیں گے۔ اسے قابو کرنا ضروری ہے۔"

لڑکی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر ہم ایک دوسرے کی مخالف سمت میں قریبی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

"کیپٹن سر...... آپ کہاں ہیں؟" اگلے ہی لمحے آنے والے کی آواز سنائی دی۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ اب وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دبی رائفل کا رخ لڑکی کی طرف تھا۔ اگر میں چاہتا تو آرام سے گولی مار دیتا۔ تاہم احتیاط لازم تھی۔ اس کی وجہ ہمیں ان خبیثوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں تھا۔ فائر کی آواز سن کر اس کا کوئی ساتھی ادھر آسکتا تھا۔ اگر ان کی تعداد زیادہ ہوتی تو ہمارے لیے یہاں سے زندہ نکلنا مشکل ہو جاتا۔

"کیپٹن صاحب کو کیا ہوا ہے؟" وہ لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔

بس یہی وقت تھا جب علی نے چیتے کی طرح اس پر جست لگائی۔ آن واحد میں اس کے آگے اپنی ٹانگ کی اور اس کے سر پر پستول کا دستہ مار دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ میں نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ ایک پل میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ابھی وہ اٹھا بھی نہیں تھا کہ ہم دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ تبھی وہ لڑکی آگے بڑھی اور اس کی رائفل اٹھا لی۔

اتنی دیر میں ہم دونوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اصل میں جب وہ گرا تھا تو اس کی پیشانی پتھر سے ٹکرا گئی تھی۔ رہی سہی کسر ہم نے پوری کر دی۔ علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس کا چہرہ لہو لہان ہو چکا تھا۔

"مم...... مجھے شما کر دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولا۔

"خاموش کتے۔ بتاؤ کہ تم دونوں کے علاوہ اور کتنے کتے ہیں؟"

"بس یہ دونوں ہیں۔" کافی دیر سے خاموش کھڑی وہ لڑکی بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ اب یہ گن مجھے دے دو۔" علی نے رعب دار لہجے میں کہا۔ اس نے چپ چاپ گن اس کی طرف بڑھا دی۔ علی نے گن کی نال پکڑی اور پورے زور سے گھما کر بٹ بھارتی فوجی کے سر پر مار دیا۔ اس کے منہ سے "اوغ" کی آواز نکلی۔ وہ زمین پر گرتے ہی لمحے میں ساکت ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہم نے دونوں کو گہری کھائی میں پھینک دیا۔ ان کا انجام گدھ اور کووں کی ضیافت بن گیا تھا۔

"اب تم جا سکتی ہو۔" علی نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھوٹ کر رونے لگی پھر روتے روتے بولی۔ "میں خود بھی فوج کے نرسنگ شعبہ میں ہوں۔ جاؤں گی تو وہ لوگ پوری تفتیش کریں گے۔ میں ان کے تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھے مروا دیں گے۔"

یہ عجیب صورت حال تھی۔ آخر تھوڑی دیر گفتگو اور سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا۔

علی نے کہا۔ "جنید تم واپس گھر جاؤ۔ اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ میں گاؤں چلا جاتا ہوں۔"

وہ انڈوں کی ٹوکری کی جانب بڑھ گیا جو کہ کچھ فاصلے پر رکھی تھی۔

علی چلا گیا تو لڑکی نے بتایا کہ اس کا بیگ جیپ میں پڑا ہے۔ جس میں کپڑے وغیرہ ہیں۔ میں وہ بیگ اٹھا لایا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں واپس چل پڑے۔ بھارتی فوجی کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ مقتول کیپٹن رمیش کا پستول اور گولیاں میں نے بیگ میں رکھ لی تھیں جو کہ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ گھر واپس جا کر لڑکی سے پوچھ کچھ کروں گا۔ لڑکی نے جھاڑیوں کی آڑ میں جا کر لباس تبدیل کر لیا تھا۔

ہم دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان بھارتی درندوں کی ہوس کا شکار صرف مسلمان عورتیں ہی بنتی ہیں مگر آنکھوں دیکھا منظر کچھ اور کہانی بیان کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ہمیں واپس آئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ فیضو بابا کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی۔ میں نے انہیں رادھا اور بھارتی درندوں کی اموات کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔ وہ ہمارے کارنامے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ رادھا اماں کے پاس بیٹھی تھی۔

"لڑکی تم اپنے بارے میں سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ کہاں رہتی ہو؟ کیپٹن رمیش اور اس کے ساتھی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

فیضو بابا تشکیک آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

میں جانتا تھا کہ وہ جب تک مطمئن نہیں ہوں گے۔ انہیں چین نہیں آئے گا۔ ان کی زندگی بھارتی فوجیوں کے درمیان گزری تھی۔ وہ ان کی مکاریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ ہمیں بتاتے تھے۔ "ان بھارتی فوجیوں کا سب سے بڑا ہتھیار عورتیں ہیں۔ اگر کوئی خاص مقصد حاصل کرنا ہو تو اپنی عورتوں کو اس مشن پر بھیجتے ہیں۔ وہ اپنی مظلومیت کا قصہ سنا کر اور بھارت سرکار کو برا بھلا کہہ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں۔ ان کے گھروں میں رہ کر مجاہدین کی مخبریاں کرتی ہیں۔ اگر کسی کے ساتھ راتیں بھی گزارنی پڑیں تو اپنی عزت کا خیال نہیں کرتیں۔"

یہ سب باتیں ان کی مجاہدانہ زندگی کا حاصل تھیں۔ اب وہ اس کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔

لڑکی جو چپ چاپ بیٹھی تھی، بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میری زندگی کی کہانی بس عام سی ہے۔ آپ سن کر کیا کریں گے؟"

"لڑکی تم بھی یہاں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ اگر سب صاف صاف بتا دو تو ہم تمہارے بارے میں سوچیں گے۔"

اچانک رادھا نے عجیب سوال کیا۔ "کیا میں آپ کو دادا جی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہوں؟"

انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہمارے مذہب نے بڑوں کے احترام اور چھوٹوں سے شفقت کا درس دیا ہے۔ تم دادا کہہ سکتی ہو۔ بہر کیف جو پوچھا ہے۔ پہلے وہ بتاؤ۔"

وہ کچھ پل خاموش رہی پھر بولی۔ "دادا جی اگر آپ میرا ماضی جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنیے......"

پھر وہ اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگی۔ ہم تینوں خاموشی سے سنتے رہے۔

اس نے جو کہانی سنائی اس کا مختصر خلاصہ یہ تھا کہ اس کا نام رادھا تھا۔ اس کے ماں باپ دہلی کے مضافات میں رہتے تھے۔ خوشحال گھرانا تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس کے باپ نے اسے دہلی کے ایک کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ وہاں اس نے گریجویشن کیا۔ تعلیم کے دوران ایک لڑکا جو اسی کالج میں پڑھتا تھا۔ جس کا نام وکرم تھا۔ وہ بگڑا ہوا عیاش امیر زادہ تھا۔ کالج کی کئی لڑکیوں کو شادی کا جھانسا دے کر ان کی عزت لوٹ چکا تھا۔ وہ رادھا کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کی وجہ رادھا کا غیر معمولی حسن تھا۔ اس نے کئی بار اس کا راستہ روکا۔ وہ برداشت کرتی رہی۔ آخر اس نے کالج انتظامیہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ مگر انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ ایک دن جب وہ لائبریری کی طرف جا رہی تھی۔ وکرم اس کا راستہ روک کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ رادھا نے اسے کھری کھری سنا دیں۔ وہ دست درازی پہ اتر آیا۔ جب اس نے رادھا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو رادھا نے تھپڑ مار دیا۔ وکرم ہکا بکا رہ گیا۔ اتنی دیر میں کچھ اور لڑکے آگئے۔ وہ چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے کہا اس تھپڑ کا بدلہ مع سود نہ لیا تو میرا نام بھی وکرم نہیں۔ پانچ چھ ماہ بعد وہ امتحان سے فارغ ہو گئی۔ اس دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس آگئی۔ اس کا خیال تھا کہ وکرم اب تک وہ واقعہ بھول گیا ہوگا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتایا۔ یہی اس کی سنگین غلطی تھی۔ ایک رات وکرم نے اپنے تین دوستوں کے ساتھ ان کے گھر دھاوا بول دیا۔ اس کا باپ مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ بعد ازاں رادھا کی ماں کو بھی قتل کر دیا۔

تاہم وہ اپنی جان اور عزت بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ اسی رات اپنے ماموں سنیل کے پاس دہلی آگئی۔ اس کے ماموں نے وکرم اور اس کے دوستوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ انہیں جیل ہو گئی۔ کیس ابھی چل ہی رہا تھا کہ وکرم کی جیل میں موت واقع ہو گئی جبکہ اس کے دوستوں کو عدالت نے دس دس سال قید کی سزا سنا دی۔ وقت گزرتا رہا۔ رادھا کے ماموں نے اسے آرمی اسپتال دہلی میں شعبہ نرسنگ میں بھرتی کروا دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے کشمیر بھیج دیا گیا۔ وہ کیپٹن رمیش کے ماتحت تھی۔ اس نے رادھا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ انکار نہ کر سکی کیونکہ وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ان کی دو چار ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ سرینگر سے واپس چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ روانہ ہونے سے قبل کیپٹن کا پرس جیپ کے فرش پر گرا اس نے جھک کر اٹھا لیا۔ ایک تصویر پرس سے پھسل کر اس کی گود میں آگری۔ اس نے تصویر اٹھالی۔ وہ تصویر وکرم کی تھی۔ اس نے کیپٹن سے تصویر کے متعلق پوچھا۔ وہ تسلی بخش جواب نہ دے پایا مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے وہ بار بار پوچھتی رہی اور کیپٹن ٹال مٹول

سے کام لیتا رہا۔ پھر جب وہ اس سنسان مقام پر پہنچا تو اس نے کہا۔ ”ڈرائیور سب سن رہا ہے آگے جھرنا ہے وہاں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

پھر اس نے ڈرائیور سے جیپ سڑک سے نیچے اتار کر روک لینے کو کہا اور رادھا کو اس طرف لے آیا۔ وہاں اس نے بتایا کہ دکرم اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

رادھا یہ سب بتا کر رونے لگی، پھر بولی۔ ”جنید جی بر وقت وہاں آ گئے ورنہ وہ بھیڑیا میری عزت لوٹ کر مجھے مار دیتا۔“

اماں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت ہی عورت کا درد سمجھتی ہے۔

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر اماں کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

فیضو بابا نے رادھا سے کہا کہ اگر وہ واپس جانا چاہے تو جہاں کہے چھوڑ دیں گے۔ اگر یہاں رہنا ہے تو جب تک دل چاہے رہ سکتی ہے۔

رادھا نے دل فگار لہجے میں جواب دیا۔ ”دادا جی مجھے بھگوان کے بعد آپ لوگوں پر وشواش ہے۔ میں اب آپ کے پاس رہوں گی۔“

اسی اثنا میں اماں نے کھانا بنا لیا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد میں کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ دوبارہ میری آنکھ مغرب کے وقت کھلی تھی۔

میں نے نماز ادا کی اور فیضو بابا کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ آسمان دبیز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر سو اندھیرا چھا گیا تھا۔

”لگتا ہے آج بارش ہوگی۔“ انہوں نے دروازے سے نظر آنے والے آسمان کی طرف دیکھا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”علی ابھی تک نہیں آیا۔ اللہ خیر کرے۔“

”بابا وہ بچہ نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کیا کریں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جنید بیٹا بھارتی درندے وادی میں جو آگ اور خون کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ ان کی نظر میں مرد، عورت، جوان، بوڑھے اور بچے برابر ہیں۔“

فیضو بابا کی یہ بات بالکل سچ تھی۔ میرے ذہن میں تفکرات کے ناگ پھن پھیلائے سرسرانے لگے۔ میں جانتا تھا۔ اگر رمیش اور اس کے ساتھی کی ڈھنڈیا پڑ گئی تو بھارتی بھیڑیے جیپ تک پہنچ جائیں گے، شاید لاشیں بھی ڈھونڈ نکالیں۔ اس صورت میں ہم کا ان کے ہاتھ آ جانا یقیناً خطرے سے خالی نہ ہوتا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ سامنے پگڈنڈی پر اک سایہ سا آتا دکھائی دیا۔ وہ علی تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

”بیٹے بہت دیر کر دی۔ ہم پریشان ہو گئے تھے۔“ فیضو بابا نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

”بابا مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔“ اس نے سودا سلف کا تھیلا رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب میں وہاں آیا تو بھارتی آرمی کے دو ٹرک اور ایک جیپ اس جگہ کھڑی تھی جہاں ہم نے رادھا کو دیکھا تھا۔ فوجی وہاں سے گزرنے والوں پر بے انتہا تشدد کر رہے تھے، وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا ہے ان درندوں نے لاشیں دیکھ لی ہیں۔ میں پہاڑوں میں چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا ہوں۔“

”جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بہرکیف احتیاط ضروری ہے۔ تم دونوں کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد رادھا کو ساتھ لے کر پہاڑی والے غار میں چلے جانا۔“

”اچھا بابا ٹھیک ہے۔“ علی نے سامان میں سے دوائی نکالتے ہوئے کہا۔

اسی اثنا میں اماں اور رادھا نے کھانا تیار کر لیا۔ ہم کھانا کھانے لگے، کھانے سے فراغت کے بعد علی دوسری جھونپڑی میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رمیش کے ساتھی والی رائفل تھی۔ باقی اسلحہ اس نے کپڑے کے ایک تھیلے میں ڈال کر کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔

”جنید بھائی اب چلنا چاہیے۔“ میں کھڑا ہوا تو رادھا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا بابا ہم چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر میں جھونپڑی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں بھی میرے پیچھے چل پڑے۔

ابھی ہم باہر نکلے ہی تھے کہ چشمے کی طرف روشنی نظر آئی۔ یہ ٹارچ کی روشنی تھی۔ علی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ آن، آف کی۔ یہ مخصوص اشارہ تھا۔

اگر کوئی مجاہد رات کو آتا تو اسی طرح کر کے آگے آتا تھا، تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ آنے والے اپنے لوگ ہی ہیں۔

دوسری طرف سے کوئل کی آواز ابھری۔

”لگتا ہے کمانڈر سیف خان آ گیا ہے۔“ عقب میں فیضو بابا کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی دروازے پر آ گئے تھے۔ وہ

بتانے لگے کہ آج صبح ہمارے جانے کے بعد ایک مجاہد کمانڈر باسط کا پیغام لے کر آیا تھا کہ رات کچھ مجاہدین آئیں گے۔ جن کے ساتھ کمانڈر سیف خان بھی ہوگا۔ ابھی انہوں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ کمانڈر سیف خان ہمارے پاس آ گیا۔ اس کے ساتھ پانچ بندے تھے۔

فیضو بابا آگے بڑھ کر گلے ملے۔ ہم نے بھی ہاتھ ملائے۔ پھر وہ انہیں صبح والے واقعے سے آگاہ کرنے لگے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”جنید تم اور رادھا پہاڑی پر چلے جاؤ۔ علی تمہیں وہاں پہنچا آئے گا۔“

”اچھا بابا..... پھر ہم چلتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رادھا بھی میرے ساتھ تھی۔ ہمیں وہاں سے نکلے بمشکل دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ابھی کچھ سفر باقی تھا۔ میں تیز چلنے لگا۔ رادھا چند قدم پیچھے تھی۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ بلند و بالا پہاڑ کالے دیوؤں جیسے لگ رہے تھے۔ بادلوں کے گرجنے کی آوازیں ماحول کی ہولناکی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ آسمان پر گاہے بگاہے بجلی چمک رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو پل بھر کے لیے ہر طرف روشنی پھیل جاتی۔ ہم پہاڑی پر پہنچ گئے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دو منٹ بعد ہم غار کے سامنے تھے۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور غار میں داخل ہو گیا۔

غار میں گہرا اندھیرا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی اور ہم آگے بڑھتے گئے۔ ایک کونے میں دھان کی چھال کا بستر بنا ہوا تھا۔ رادھا کو وہاں بیٹھنے کا کہہ کر میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔

باہر آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو روشنی پل بھر کے لیے غار کے اندر تک آ جاتی تھی۔ میں نے رادھا کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کے آدھے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے گٹھڑی سے کمبل نکالا۔ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو اور لیٹ جاؤ۔“

کمبل بڑا تھا۔ اس نے آدھا نیچے بچھایا اور آدھا اوڑھ کر لیٹ گئی۔ ہمیں آئے ہوئے گھنٹا ہو چکا تھا۔ علی اور دیگر ساتھی پہنچے نہیں تھے۔ میں صرف ایک کمبل لایا تھا۔ باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ بارش رک جائے مگر کبھی کبھی دعائیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہو رہا تھا۔ جتنی دعا مانگتا بارش اتنی ہی تیز ہو رہی تھی۔ میں گھٹنے سینے سے لگائے دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”جنید...! کیا آپ کو سردی نہیں لگ رہی؟“

رادھا نے استفسارانہ انداز میں پوچھا۔

”علی آتا ہی ہوگا۔ وہ کوئی چادر لے آئے گا۔“

”ایسے موسم میں کسی کا نکلنا مشکل ہے۔“

”آپ آرام سے سو جائیں۔ میں جیسے تیسے رات گزار لوں گا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بولی۔ ”مطلب آپ رات ایسے گزاریں گے۔“ اس کے لہجے میں حیرت در آئی تھی۔

میں ہنسا، پھر بولا۔ ”تو کیا ہوا۔ یہ رات آخر گزر ہی جائے گی۔“

”اچھا ایک بات بتائیں۔“ وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

”پوچھو۔“

”کشمیر میں بھارتی فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جبکہ ان کے مقابلے میں آتنک وادی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔“ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ لوگ پھر بھی مقابلے پر ڈٹے ہوئے ہو۔ کیا ڈر نہیں لگتا؟“

”کیسا ڈر؟“ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

”موت کا ڈر۔“

”موت کا ڈر۔“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے پھر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں موت کا کوئی خوف نہیں۔ ہم مسلمان حق کی خاطر جان کی پرواہ نہیں کرتے۔“

”ہم مظلوم اور زخموں سے چور ہیں پھر بھی بھارتیوں کے لیے لوہے کا چنا ہیں جسے نہ چبایا جا سکتا ہے اور نہ نگلا جا سکتا ہے۔“

رادھا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”سنو رادھا۔ کشمیر کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ یہ کوئی نئی قوم نہیں ہے اور نہ کل وجود میں آئی کوئی ریاست ہے۔ کشمیر کی اپنی تاریخ ہے۔ اس کا تابناک ماضی ہے۔ اس کی اپنی تہذیب ہے۔ اس دھرتی نے ایسے ایسے بہادروں کو جنم دیا ہے جن کی فتوحات کی داستانیں ہزاروں سالوں پر محیط ہیں۔ یہ غلامی تو کل کی بات ہے۔“

”میں کشمیریوں کا درد اب کسی حد تک سمجھ چکی ہوں۔ بھارت سرکار خوامخواہ مظلوم بننے کی کوشش کرتی ہے۔ حالانکہ وہ خود ان نہتے اور بے بس کشمیریوں پر ظلم کے

پہاڑ ڈھا رہی ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے کیمپ میں وقت گزارا ہے۔ آرمی کے افسران انتہائی سیکیورٹی کے باوجود مجاہدین سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں اسلحے کا ذخیرہ بھی ہے۔"

کیمپ کا سن کر یاد آیا کہ پچھلے دنوں کمانڈر باسط بھی کسی کیمپ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔

"کس کیمپ میں؟" میں نے متجسس انداز میں پوچھا۔

وہ کیمپ کے بارے میں بتانے لگی۔

یہ وہی کیمپ تھا۔ جس کا ذکر چاچا باسط نے کیا تھا۔ یہ سرینگر سے گلمرگ روڈ پر پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ رادھا نے شاید میری ذہنی کیفیت کا انداز لگالیا تھا، بولی۔ "اس کیمپ میں ایک سو کے لگ بھگ فوجی ہیں۔ جن میں افسر بھی شامل ہیں۔ اس میں اسلحے کا بہت بڑا ڈپو ہے۔ یہ اسلحہ پچھلے دنوں آیا ہے۔"

وہ کھسک کر میرے قریب آگئی اور مجھے بھی کمبل میں چھپالیا۔ ہم دونوں گردنوں تک کمبل اوڑھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے جسم کی خوشبو میرے حواس پر چھارہی تھی۔ تاہم یہ وقت ایسا نہیں تھا۔ میں بار بار سر جھٹک کر ذہنی رو کو بہکنے سے بچاتا رہا۔ مجھے جو معلومات درکار تھیں۔ وہ حاصل کر چکا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہماری گفتگو جاری تھی۔ کمبل گوکہ پرانا تھا تاہم گرم تھا۔ جسم کو حدت ملی تو نیند آنے لگی۔ مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں ان لوگوں کا نکلنا بھی مشکل تھا۔ اچانک میں بے چین ہوگیا۔ اک بے نام سی الجھن میرے ذہن پر حملہ آور ہوئی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ رادھا باتیں کرتے کرتے سوگئی۔ میرا ذہن مختلف خیالوں اور وہموں میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ الجھتا رہا پھر نجانے کب نیند کی دیوی مجھ پر حملہ آور ہوئی اور میں سوگیا۔

☆.....☆.....☆

بھارتی درندوں کے ہاتھوں میں موجود رائفلیں شعلے اگل رہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ باہر نکل کر دیکھا تو نیچے وادی میں قیامت آچکی تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ لاتعداد لاشیں تھیں۔ لوگ مر چکے تھے، مر رہے تھے۔ میں نے رادھا کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف دوڑ پڑا۔ ہم دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اچانک ہم پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے دائیں، بائیں اور اوپر سے گزر رہی تھیں۔ دوڑنے کے درمیان رادھا کو ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں رک گیا اور رادھا کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھوں کے بل اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا، پیشانی سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا۔ وہ بمشکل اٹھی۔ پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اچانک ایک طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ رادھا کا ہاتھ پھر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ نیچے گر پڑی۔ پورا برسٹ اس کے سینے پر لگا تھا۔ پھر اک ساعت شکن دھماکا ہوا۔

میں ہذیانی انداز میں چیخا۔ "نن.....نہ.....نہیں۔"

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ رادھا میرے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ وہ بھی جاگ گئی۔

"کک.....کیا ہوا؟" اس نے جلدی سے سر اٹھایا تو سیاہ گھٹاؤں میں چاند سا چہرہ چھپ گیا۔ اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا، بال پیچھے چلے گئے۔

"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے غار کے دہانے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ صبح ہونے والی تھی۔ بارش بھی رک چکی تھی۔ اسی اثنا میں ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ اور پھر زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اٹھا اور دہانے کی طرف بڑھا۔ اسی اثنا میں جواس باختہ علی غار میں داخل ہوا۔ ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر سنبھل گئے۔ اس کے پیچھے کمانڈر سیف خان اور اس کے دو ساتھی بھی اندر آگئے۔

"جنید بھائی۔ بابا اور اماں شہید ہوگئے ہیں۔" اس نے مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے بتایا۔

"علی.....! حوصلہ کرو۔ اس سے پہلے کہ دن کا اجالا پھیل جائے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" کمانڈر سیف خان ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا۔

پھر ہم وہاں سے نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دوران علی نے بتایا کہ جب تم نکلے اسی وقت حملہ آور فوجیوں کی مدد کے لیے ایک ہیلی کاپٹر آگیا۔ دیگر مجاہدین اور سیف آواز سن کر چھپ گئے تھے۔

ہیلی کاپٹر لمبا چکر کاٹنے کے بعد جھونپڑی کے اوپر منڈلانے لگا۔ اسی دوران کمانڈر سیف خان کے تین ساتھی جو کہ جھونپڑی سے باہر نکل رہے تھے۔ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ وہ مقابلہ کر ہی رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر سے گرنیڈ پھینکا گیا۔ جھونپڑی میں موجود ہر چیز جل کر خاکستر ہوگئی۔ وہ چاروں مشکل سے جان بچا کر ہمارے پاس آئے ہیں۔

جب ہم غار سے نکلے تو صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ دور پہاڑیوں میں دھواں بلند ہو رہا تھا۔ میرا سینہ غم سے بھر گیا۔ آہ.....فیضو بابا چلے گئے۔ اماں بھی نہ رہیں۔ ان کے ساتھ گزرے شب و روز یاد آئے تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم جانتے تھے۔ یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم چھپتے چھپاتے آگے بڑھتے گئے۔ کم و بیش دو گھنٹے بعد ہم ایک دوسرے کھوہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔ خدا خدا کر کے دن گزرا تو ہم مغرب کے بعد ایک بار پھر عازم سفر ہوئے۔ ہم چلتے چلتے ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ جس پر نیچے جاتی ایک پگڈنڈی تھی۔ ہم اس پر چلنے لگے۔ پگڈنڈی کافی تنگ تھی۔ ہم نے ڈھلان میں اترنا شروع کردیا۔ آگے راستہ مزید تنگ ہوگیا۔ تاہم کہیں کہیں تھوڑا سا کھلا تھا۔ ڈھلان سے اتر کر کمانڈر سیف خان نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد ہمارا سفر ایک بار پھر جاری ہوگیا۔

ہماری رفتار پہلے سے سست تھی۔ پہاڑوں کے درمیان سرکتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

ہم پہاڑوں کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے ایک چشمے پر پہنچ گئے۔ سب نے جی بھر کر پانی پیا۔ وہاں کچھ دیر رکنے کے بعد ایک بار پھر چل پڑے۔ آخر اونچی نیچی ڈھلوانوں سے گزرتے ہوئے خاصی بلندی پر آگئے۔ اسی وقت دو بندے اچانک جھاڑیوں سے نکلے اور ہم پر رائفلیں تان لیں۔

"رک جاؤ.....اپنے ہاتھ سر سے اوپر کرلو۔" ان کا لب و لہجہ کشمیری تھا۔

کمانڈر سیف خان مسکرانے لگا، پھر بولا۔ "جاؤ کمانڈر مطیع اللہ سے کہو۔ سیف خان آیا ہے۔"

انہوں نے رائفلیں جھکا لیں۔ پھر وہ سیف خان سے گلے ملے..... ہم ان کی رہنمائی میں ڈھلان میں اترنے لگے۔ اترائی کے بعد ہم سب ایک پہاڑ کی طرف بڑھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ایک جھونپڑی میں لے گئے۔

جھونپڑی پتھروں سے تیار کی گئی تھی۔ اس کی چھت پتھریلے ٹکڑوں اور درختوں کی ٹہنیوں سے بنی تھی۔ یہ چٹان کی دو عمودی دیواروں کے درمیان شگاف میں واقع تھی۔ جھونپڑی میں کوئی بھی نہیں تھا۔

ہمیں ساتھ لانے والے دونوں مجاہدین آگے بڑھے اور دیوار کے ساتھ رکھی گھاس اور جھاڑیاں ہٹانے لگے۔ سامنے شگاف تھا۔ وہ اس میں داخل ہوگئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ یہ سرنگ نما راستہ تھا۔ ایک مجاہد نے ٹارچ جلالی۔ ہم سب آگے پیچھے محو سفر تھے۔ کہیں کہیں ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ تاہم راستہ کشادہ تھا۔ کم و بیش آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچے پھر ہم چٹانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک غار میں داخل ہوئے۔ وہاں دس بارہ بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کمانڈر سیف کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور والہانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا۔ وہ کمانڈر مطیع اللہ تھا۔ کمانڈر مطیع اللہ دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ ہم لوگوں سے بھی سلام دعا کی۔ وہ رادھا کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

ایک طرف مٹی کے تیل والا چولہا جل رہا تھا۔ دو بندے کھانا بنارہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا تیار ہوگیا۔ سب کھانا کھانے لگے۔

کھانا سادہ اور لذیذ تھا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد کشمیری قہوے کا دور چلا۔ اس کے بعد ہم آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ رات بھر کے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ شاید باقی لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ میں سوگیا۔ مجھے سوئے ہوئے نجانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

"سیف خان..! اس کے ماتھے پر بندیا دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ ہندو ہے۔" کمانڈر مطیع اللہ کی سرگوشی سنائی دی پھر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم جانتے ہو کہ یہ ہمارا خفیہ ٹھکانا ہے۔ اگر یہ لڑکی بھارتی فوجیوں کی مخبر نکلی تو ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

میں چپ چاپ لیٹا ان کی گفتگو سننے لگا۔ "یار۔ فیضو بابا نے رات اس کے بارے بہت کچھ بتایا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ دشمن کی جاسوس ہے۔ یہ تو خود حالات کی ستائی ہوئی لڑکی ہے۔"

"اچھا یار کچھ سوچتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر میں لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مثانے پر بوجھ محسوس کر رہا تھا اس لیے میں کھڑا ہوگیا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔

"جنید کہاں جا رہے ہو؟" کمانڈر سیف خان کی عقب سے آواز سنائی دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا اشارہ کیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ سورج مغربی افق کی جانب جھک رہا تھا۔ ماحول میں اک بے نام سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ میں

ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہاں سے اٹھا تو... سیدھا جھیل پر پہنچا۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ چاروں اطراف پہاڑ تھے۔ پہاڑ کشمیر کا حسن ہیں اور مجاہدین کی پناہ گاہیں بھی۔

میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کمانڈر مطیع اللہ کی باتوں نے ذہن میں بھونچال برپا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رادھا جاسوس نہیں ہے۔ وہ تو خود بھارتی فوجیوں کی ستائی ہوئی ہے۔

تب میں نے ایک فیصلہ کیا اور واپس غار میں آگیا۔

علی اور رادھا جاگ رہے تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ رادھا کی متجسس آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا کر معدوم ہوگئے۔ تب میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''رادھا فکر نہ کرنا۔ میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالتا ہوں۔''

وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے کوئی فکر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔''

اس کی بات سن کر میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے پھر رادھا نے کہا کہ وہ ذرا باہر جانا چاہتی ہے۔

میں، علی اور رادھا غار سے باہر جانے لگے تو ایک مجاہد نے ہمیں روک لیا۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کمانڈر مطیع اللہ کا حکم ہے کہ اس لڑکی کو باہر نہ جانے دیا جائے۔ اس کی بات سن کر مجھے غصہ آگیا۔ ''کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

''وجہ تو کمانڈر صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔'' وہ سب مشین گن کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''کیا رفع حاجت کے لیے غار میں کوئی جگہ بنائی گئی ہے؟'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''اچھا پھر میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ساتھ چل پڑا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے جھیل کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں اس مجاہد نے جس کا نام ظفر علی تھا، بتانے لگا۔ ''آج عشا تک کمانڈر باسط بھی پہنچ جائیں گے۔''

میں یہ سن کر مطمئن ہوگیا۔ ہم جھیل سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئے جبکہ رادھا آگے بڑھ گئی۔ پندرہ، بیس منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر لوٹ آئی اور ہم واپس غار میں آگئے۔ وقت گزرتا رہا پھر دن کے اجالے کو رات نے نگل لیا۔ ہم رات کا کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ چاچا باسط بھی آگئے۔ مجھے اور علی کو گلے لگا کر حال چال پوچھا۔

رادھا کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اس کے بعد فیضو بابا کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے ان کی شہادت کا بتایا تو ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''باسط چاچا میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی بیٹا بولو۔ میں سن رہا ہوں۔'' میں نے انہیں رادھا والے واقعے یعنی اسے اپنے ساتھ لانے سے لے کر غار میں اپنے اور رادھا کے درمیان ہونے والی خفیہ کیمپ والی باتوں سے آگاہ کیا اور موجودہ صورتِ حال بتا دیا۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''رادھا بیٹی۔ کیا یہ سب حقیقت ہے؟''

''ہاں۔ بھگوان کی سوگند یہ بالکل سچ ہے۔ تاہم یہ سب میں نے جنید کو سرسری طور پر بتایا تھا۔'' ایک پل کی خاموشی کے بعد بولی۔ ''میں آپ کو تفصیل بتاتی ہوں۔''

پھر وہ اس کیمپ کی لوکیشن اور وہاں کی صورتِ حال بتاتی چلی گئی۔ آخر میں دل فگار لہجے میں بولی۔ ''کمانڈر صاحب۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں ہندو ہوں اور فوج جس طرح کشمیریوں پر ظلم کر رہی ہے اس کی چشم دید گواہ بھی ہوں۔ بلکہ ان کی حامی بھی تھی لیکن جب جنید اور علی بھائی سے ملی تو ان کے احسانوں تلے دب گئی۔ انہوں نے مجھے کیپٹن رمیش سے بچایا تو میرے دل میں مسلمانوں کی قدر بڑھ گئی۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی، پھر بولی۔ ''میں اپنا انجام جانتی ہوں۔ جس دن بھی آرمی والوں کے ہتھے چڑھ گئی، بے موت ماری جاؤں گی تو کیوں نہ اپنے محافظوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان کے کندھوں سے کندھا ملا کر لڑتے ہوئے مروں۔ میں بنتی کرتی ہوں کہ مجھے بھی آپ آزادی کی اس جنگ میں اپنے ساتھ شامل کر لیں۔''

چاچا باسط نے شدت جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ''بیٹی میں آپ کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہو گی۔ باقی مطیع اللہ سے میں آج بات کرتا ہوں۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کمانڈر مطیع اللہ اور سیف خان بھی آگئے۔ وہ آپس میں گلے ملے پھر چاچا باسط انہیں موجودہ صورتِ حال بتانے لگے۔

کمانڈر مطیع اللہ نے رادھا سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ وہ متاثر ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ جس پر معافی مانگی جائے۔ اگر کوئی عورت بھارتی فوجیوں کے ہاتھ لگ جاتی تو اب تک وہ نہ جانے اس کا کیا حشر کر دیتے اور اس کی لاش کسی گہری کھائی میں پھینک دیتے۔''

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اسی رات کیمپ پر حملے کا از سرِ نو منصوبہ تشکیل دیا گیا۔ رات دس بجے کے لگ بھگ چاچا باسط اور ان کے تین ساتھیوں کے ساتھ ہم ان کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئے جو کہ ضلع پونچھ کے پہاڑوں میں تھا۔ ساری رات سفر میں گزری۔ جب صبح کاذب کے آثار نمودار ہوئے تو ہم ایک چشمے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہی وقت تھا جب ہمارے کانوں میں ٹرکوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم فوراً جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

یہ بھارتی فوجیوں کا کانوائے تھا جو کہ چار ٹرکوں اور دو جیپوں پر مشتمل تھا۔ ہماری تعداد سات تھی۔ اسلحے میں پانچ سب مشین گنیں اور دو پستول تھے۔ چاچا باسط نے مختصر وقت میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور پشت سے بیگ اتار کر کھول لیا۔ اس میں دستی بم تھے۔ انہوں نے ہمیں اس کی تکنیک سمجھا دی۔ دو مجاہدوں کو اپنے ساتھ لے کر وہ سرکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ تبھی نعرۂ تکبیر کی صدا گونجی۔ یہ صدا چشمے کے دوسری سمت سے آئی تھی۔ فوجی ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ ہم نے بھی حملہ کر دیا۔ گولیاں چلاتے ہوئے میں نے رادھا کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے والے ٹرک پر دستی بم پھینکا تھا۔ جس سے افراتفری مچ گئی۔ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چاروں ٹرک آگ کی لپیٹ میں آگئے۔ کچھ بھارتی فوجی ہماری چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

چشمے کے دوسرے کنارے سے بھی آگ برس رہی تھی۔ دو طرفہ حملے نے کانوائے کا صفایا کر دیا تو چاچا باسط واپس آگئے۔

اس جنگل میں پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک غار تھا۔ ہم اس میں داخل ہوگئے۔

☆......☆......☆

وہ بہت بڑا غار تھا۔ وہاں آٹھ بندے پہلے سے موجود تھے۔

ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد ایک مجاہد جس کا نام ناصر تھا وہ ہمیں غار کے اندرونی حصے میں لے گیا پھر بولا۔ ''آج تم تینوں بڑے اسلحے کا استعمال سیکھو گے۔''

پھر وہ ہمیں مشین گن اور دوسرا اسلحہ چلانے کی تربیت دینے لگا۔

وہ یہ سب بغیر فائر کیے سکھا رہا تھا۔ ہم کافی کچھ جان گئے کہ بڑی مشین گن کیسے لوڈ ہوتی ہے کیسے چلائی جاتی ہے۔ راکٹ کیسے چلایا جاتا ہے۔

پھر ہم کھانا کھانے باقی مجاہدین کے پاس آگئے۔ کھانا کھا کر ایک بار پھر اندرونی حصے میں جمع ہوئے۔ یہاں ایک بات بتاتا چلوں کہ غار میں قدرتی طور پر دو حصے بنے ہوئے تھے۔ ایک حصہ مجاہدین نے اپنے قیام و طعام کے لیے مختص کیا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے میں اسلحہ رکھا گیا تھا۔ یہاں ہی نئے بندوں کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔

ان دونوں نے ہمیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ ویسے زندگی، وقت اور حالات انسان کو وہ کچھ سکھا دیتے ہیں جو کسی کتاب میں نہ ہوں۔ کسی استاد نے نہ پڑھائے ہوں پھر وہ ہمیں سمجھانے لگے کہ خدانخواستہ اگر کبھی پھنس جائیں تو کس وقت تک رکنا ہے، کہاں رکنا ہے یا مقابلہ کرنا ہے، کہاں فرار ہونا ہے؟

☆......☆......☆

شام نے اندھیرے کا نقاب اوڑھ لیا تھا۔ رات سہمے سہمے انداز میں وادی کے برفیلے پہاڑوں پر زینہ زینہ اترنے لگی۔ ہم نے کھانا کھا لیا تو ناصر نے بتایا کہ آج رات پھر ہم نے لمبا سفر طے کرنا ہے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ ناصر اور عباس سب سے آگے تھے۔ باقی لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ رادھا میرے برابر تھی۔ راستہ دشوار تھا۔ ہمارا سفر رات بھر جاری رہا۔ فجر کی اذان کے وقت ہم ایک کھوہ میں آرام کرنے کے لیے رک گئے، کیونکہ آگے کا علاقہ خطرناک تھا۔ سارا دن وہیں گزرا۔ پھر رات ہوتے ہی سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔

ہم دن کو آرام اور رات بھر سفر کرتے تھے۔ آخر دو دن اور تین راتوں کے بعد ہم مخصوص ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے موسم قدرے خنک ہو گیا تھا۔

ہمارے لیے ناشتے کا انتظام کیا گیا۔ ابھی ہم ناشتا

کر ہی رہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی جو کہ ابتدا میں ہلکی ہلکی پھر موسلا دھار برسنے لگی۔

ہم نے ناشتا کرلیا تو چاچا باسط نے ہمیں آرام کرنے کے لیے غار کے اندرونی حصے میں بھیج دیا۔

ہم ایسا سوئے کہ شام کو ہی جاگے۔ یہ بلند و بالا پہاڑوں میں چھپا ہوا ٹھکانا تھا جس کے قریب ایک جھیل تھی۔ ہم نے وہیں منہ ہاتھ دھویا۔ بارش رک چکی تھی۔ تاہم مطلع ابر آلود تھا۔ فریش ہونے کے بعد ہم واپس آگئے۔ رات کا کھانا تیار تھا۔ سب نے اکٹھے کھانا کھایا۔ رادھا سمیت ہم بیس بندے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈر باسط نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ضلع کپواڑہ کے علاقے مڑھل میں کمانڈر سیف خان نے مجاہدین کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ اس گوریلا کارروائی میں بھارتی فوج کے کئی اہلکار جہنم واصل ہوئے ہیں۔ آخری اطلاع کے مطابق مجاہدین فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ زخمیوں کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بادامی باغ فوجی اسپتال میں منتقل کردیا گیا ہے۔ چھپن راشٹریہ رائفلز کی مدد کے لیے پیرا کمانڈوز کو علاقے میں بھیج دیا گیا ہے۔ دوسری طرف کمانڈر مطیع اللہ اور ان کے کچھ ساتھیوں نے ضلع کولگام کے علاقے کیموہ میں پولیس کی دو چوکیوں پر حملوں کے بعد جموں سرینگر بائی وے پر ڈگڈول کے مقام پر فوجی قافلے پر حملہ کر کے چار ٹرک تباہ کردیے ہیں۔" ذرا توقف کے بعد وہ بولے۔

"مجاہدین کے ایک جانباز دستے نے گزشتہ شب سرینگر کے کدل چوک پر پل کے قریب بھارتی اہلکاروں پر دستی بموں سے حملہ کیا۔ اس کارروائی میں کئی بھارتی فوجیوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد وہ بحفاظت اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہیں۔"

یہ سب بتا کر وہ خاموش ہوگئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ بلاشبہ یہ مجاہدین کی بڑی کامیابی تھی۔ کسی جانی نقصان کے بغیر انہوں نے دشمنوں پر کاری وار کیا تھا۔

"ساتھیو......! ہر عمل کا ردعمل بھی ہوتا ہے۔ بھارتی درندے وادی میں جو آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہم اس کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ اب وہ بوکھلا چکے ہیں۔" کمانڈر باسط بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "بھارتی فوج کی چودہ اور ستائیس راشٹریہ رائفلز اور سات پیرا کمانڈوز رجمنٹ اور پیراملٹری فورسز نے ضلع بانڈی پورہ کے علاقوں چانٹھولہ، کوڈرا، سریندر، کوٹا پتھری اور گابی پتھری میں ایک بڑی کارروائی شروع کی ہے۔" پھر لمحاتی توقف کے بعد سرد لہجے میں کہا۔ "اب اس کا جواب ناگزیر ہو گیا ہے۔ کچھ دیر میں کمانڈر سیف خان اور کمانڈر مطیع اللہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیں گے۔ گو کہ ہمارا منصوبہ کافی خطرناک ہے لیکن ہم نے یہ مشن پورا کرنا ہے۔" پھر رادھا کی طرف مڑ کر بولے۔ "رادھا بیٹی اس مشن کی کامیابی کا دارومدار تمہاری معلومات پر ہے۔ اگر کوئی بات ذہن میں ہے تو بتادو۔"

"سر میرے پاس جو معلومات تھیں۔ آپ سب کو بتادی ہیں۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

کچھ دیر مزید اس مشن کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ پھر آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اس مشن میں بیس بندوں نے حصہ لینا تھا جنہیں تین پارٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔ جن کی قیادت کشمیر دھرتی کے تینوں کمانڈروں چاچا باسط، مطیع اللہ اور سیف خان نے کرنی تھی۔ مجھے، رادھا اور علی کو چاچا باسط والی پارٹی میں شامل کیا گیا۔ جس جگہ ہم موجود تھے۔ وہاں سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر مذکورہ کیمپ تھا۔ جہاں پر آگ اور بارود کا کھیل کھیلنے کے لیے ہم سب پُرعزم تھے۔

ہم تیاری کرنے لگے۔ اب پچیس بندے چار گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک گروپ کمانڈر سیف خان کا تھا۔ اس کے ساتھ پانچ بندے ریحان، دانیال، شاہد، زریاب اور آصف تھے۔ جبکہ دوسرے گروپ کی کمان کمانڈر مطیع اللہ کر رہے تھے۔ تیسرا گروپ ہمارا تھا جو کہ چاچا باسط کی سرپرستی میں تھا۔ چوتھا گروپ قیصر اور اس کے ساتھیوں عاطف، خضر، محمد رافع اور اطہر پر مشتمل تھا۔ اس کارروائی میں شامل ہونے والے ہر گروپ کے ذمے مختلف کام لگا دیے گئے اور اشارے مقرر کردیے گئے۔ چاروں کمانڈرز نے سب کو تاکید کی کہ کوشش کریں کہ کیمپ والا اسلحہ اپنے ساتھ لاسکیں۔

تینوں گروپ چلے گئے۔ اب ہماری باری تھی۔ ہم سات بندے تھے۔ ہم سب کو مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک مخصوص مقام پر اکٹھا ہونا تھا۔

ہم بھی چل پڑے۔ پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ چار گھنٹے کی مسافت کے بعد طے ہوا۔ چاروں گروپ اکٹھے ہوگئے۔ ہر گروپ کے کمانڈر نے اپنے ساتھیوں کو مشن کے بعد کہاں جانا ہے بتادیا پھر سب ہدف کی طرف بڑھنے لگے۔

ٹھنڈی ٹھار رات اور دور دور تک پھیلا سناٹا اور

خاموشی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہم چھ بندے چچا باسط کے ہمراہ کیمپ کے عقب میں موجود تھے۔ جنریٹر چل رہا تھا۔ عقب میں دو بلب روشن تھے۔ کمانڈر سیف کو کیمپ کے دائیں جانب اور کمانڈر مطیع نے بائیں جانب سے حملہ کرنا تھا پھر کمانڈر قیصر اور اس کے ساتھیوں کو سامنے سے ہلا بولنا تھا۔ اسی اثنا میں چچا باسط نے چند قدم اور آگے بڑھائے۔ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سب مشین گن کو بائیں سے دائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور پیچھے چل پڑا۔ میری عقابی نگاہیں ٹارگٹ پر مرکوز تھیں۔ رادھا کی معلومات کے مطابق فوجی سرشام ہی بیرکوں میں بستروں پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے رات کا وقت ایکشن کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ کارروائی کا وقت دس سے گیارہ کے درمیان رکھا گیا۔ ہم کیمپ کی خاردار باڑ کے بالکل قریب پہنچ گئے اور کرالنگ کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ رادھا سب سے آگے تھی۔ ہم حفاظت پر مامور دو سنتریوں تک پہنچے اور ان پر خاموشی سے چاقو کا استعمال کرکے ... بیرکوں میں گھس گئے۔

باقی پارٹیوں کو دیا گیا وقت پورا ہو چکا تھا کہ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ مجاہدوں نے بیرونی ہٹس کو نشانہ بنایا تھا۔ بیرکوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دو تہلکہ خیز لمحات تھے۔

چونکہ حملہ چاروں طرف سے بیک وقت ہوا تھا اس لیے بھارتی فوجی بوکھلا گئے۔ ہم نے بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر بے دریغ فائرنگ شروع کردی۔ میں، رادھا اور بابر عباس نامی مجاہد ایک کمرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو پانچ بھارتی فوجی باہر نکلے۔

میں نے ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری اور گولیوں نے دو فوجیوں کی پیشانی میں سوراخ کردیے۔ رادھا اور بابر کی طرف سے چلائی گئی گولیاں باقی تینوں کے سینوں میں اتر گئیں۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔ ہم نے ان کی گنیں اٹھا کر کندھوں کے ساتھ لٹکا لیں۔ میرے دوسرے ساتھی جگہ جگہ ڈائنامائٹ لگا رہے تھے کہ الارم بج اٹھا۔

کام مکمل ہو چکا تھا اس لیے ہم باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ رادھا بھی فائرنگ کرتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ اچانک تین بھارتی فوجی سامنے آگئے۔ دو ہماری گولیوں کا نشانہ بن گئے جبکہ تیسرا بھاگنے لگا لیکن موت سے بھاگنا بہت مشکل ہے۔ رادھا کے ہاتھ میں دبی سب مشین گن گرجی اور وہ بھی گر پڑا۔ ہم اس کے تڑپتے وجود کے قریب سے گزرتے ہوئے پہاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر پوزیشن سنبھال لی۔ اس دوران دو ہیلی کاپٹر ادھر آنکلے۔

دونوں ہیلی کاپٹر عین سروں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ موت کسی کو بھی آسکتی ہے۔ یہ دوست یا دشمن نہیں دیکھتی۔ ایک ہیلی کاپٹر چکر کاٹ کر پلٹ آیا پھر آتشِ آہن برساتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ جلد یا بدیر واپس آجائے گا۔ ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ ہیلی کاپٹر سے کیمپ کے آس پاس فائرنگ نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ کیمپ میں موجود اسلحے کا ڈپو تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دوسرا ہیلی کاپٹر ایک طرف سے آتا دکھائی دیا۔ میرے دل میں خواہش ابھری کاش راکٹ لانچر ہوتا۔ پہلے والا ہیلی کاپٹر بھی لوٹ آیا۔ یہ بہت سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہمارے ساتھی بھی وقفے وقفے سے فائرنگ کر رہے تھے کیمپ کے اندر سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ مجھے یہاں سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن لگنے لگا تھا۔

اسی وقت ایک طرف سے راکٹ فائر کیا گیا۔ یہ راکٹ پہاڑی پر سے فائر کیا گیا تھا جو کہ یقیناً ہمارے کسی ساتھی نے کیا تھا۔ راکٹ سیدھا بھارتی کیمپ پر گرا۔ اس کے بعد تین اطراف سے راکٹ فائر کیے گئے۔ ایک ہیلی کاپٹر تباہ ہوکر پہاڑوں میں جا گرا۔ دوسرا کیمپ سے دور چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر سیکنڈ کے بعد دھماکے ہونے لگے۔ بھارتی کیمپ میں اسلحے کا گودام دھماکوں سے تباہ ہو رہا تھا۔ فضا میں نعرہ تکبیر کی صدا بلند ہوئی۔

ہم نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ حتی الامکان تیزی سے بھاگتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اب بازی پلٹ گئی۔ ہم ان پر غالب آگئے۔ گو کہ سردی ہماری ہڈیوں کو منجمد کر رہی تھی لیکن ہمارا جذبہ ہمیں حرارت پہنچا رہا تھا۔ اس بھارتی پوسٹ پر سو سے زائد بھارتی فوجی تھے۔ جن میں بہت کم باہر نکل پائے تھے۔ زیادہ تر اندر ہی جل مرے لیکن ہمارا مشن ادھورا رہ گیا۔ اگر وہ اسلحہ ہمارے ہاتھ لگ جاتا تو ہمارا کافی فائدہ ہوتا۔ اس مشن میں چار ساتھیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ کارروائی مکمل کرکے تمام ساتھی رات تین بجے تک اپنے اپنے طے شدہ ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو بس دلوں میں چپکے سے بسیرا کرلیتی ہے۔ دو مختلف مذاہب ہونے کے باوجود، یہ جانتے ہوئے بھی رادھا ہندو ہے اور میں

مسلمان... مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔ تاہم میں نے اظہار نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگی ہے۔

اس کا چاند سا پُرنور چہرہ، متجسس آنکھیں، یاقوتی لب بہ زبانِ خاموشی بہت کچھ کہنے لگے تھے۔

عاشق ان کہی باتوں کو سمجھتے ہیں، جان لیتے ہیں۔ میں بھی جان گیا۔

اس دن موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے سارا دن بارش ہوتی رہی۔

میں نے ڈائری میں گزرے واقعات لکھے پھر وضو کیا۔ جب دوبارہ کمرے کے دروازے میں داخل ہوا تو نظر رادھا پر پڑی۔

خوابیدہ حسن اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ سامنے بکھرا پڑا تھا۔ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے نظریں جھکالیں پھر دیوار پر ٹنگی جائے نماز اتاری اور ایک کونے میں بچھا کر رب کے حضور کھڑا ہوگیا۔

نماز ادا کرکے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اسی اثنا میں رادھا جاگ گئی ہے۔ میں نے دعا مانگی اور جائے نماز دیوار پر ٹانگ کر واپس پلٹا تو دیکھا۔ وہ چارپائی پر لیٹی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا، اس کے قریب دوسری چارپائی پر آکر بیٹھا تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ ”جنید میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔“

میرا دل خوشی سے بے قابو ہوگیا۔ میں شدید خواہش کے باوجود یہ بات نہیں کہہ پایا۔ جو آج اس نے خود کہہ دی تھی۔

”رادھا۔“ میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا۔ وہ بولی۔

”جنید! میں کچھ دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ مسلمان ہوجاؤں۔“ لمحاتی توقف کے بعد بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”تم کہتے ہو کہ اس جنگ میں لڑتے ہوئے اگر ہم لوگ مرجائیں تو شہید کہلائیں گے۔ تم ہی بتاتے ہو کہ قرآن پاک میں اللہ فرماتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔“ ایک پل خاموش ہوئی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تم لوگوں کے ساتھ اس کاز میں اپنی خوشی سے شامل ہوئی ہوں۔ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس سعادت سے محروم رہ جاؤں۔ میں آج ہی کلمہ پڑھنا چاہتی ہوں۔“

جونہی اس نے بات ختم کی۔ میں اٹھ کر اس کی چارپائی پر جا بیٹھا۔ ”تم نے آج میرے دل کی بات اپنی زبان سے ادا کرکے دل خوش کردیا ہے۔ میرے دل میں سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ تم اسلام قبول کرلو۔ وہ پوری ہوگئی۔“

وہ بھرپور نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”جنید! میرا جینا مرنا اب تمہارے ساتھ ہے۔“

اسی اثنا میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص آواز سنائی دی۔ میں چوکنا ہوگیا۔

وہ آواز کسی مجاہد کی تھی۔ میں نے پستول کو لوڈ کیا اور دروازے کی سمت چل پڑا۔ میرا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ دروازے کے باہر کھڑے مجاہد کے آنے کے دو مقصد ہوسکتے تھے۔ وہ کوئی پیغام لایا ہے یا پھر کسی خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ میں دروازے کے پاس جا کر رک گیا پھر ایک مخصوص آواز نکالی۔

”دروازہ کھولیں۔“ باہر والے نے سرگوشی کی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ علی اور محمد رافع تھے۔ میں دروازہ بند کرکے انہیں ساتھ لے کر کمرے میں آگیا۔ ان دونوں نے رادھا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ چائے بنانے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد علی بولا۔ ”جنید بھائی! ہم کمانڈر باسط کا پیغام لے کر آئے ہیں۔“

”ہاں بولو۔“

”دو دن بعد ایک مشن پر نکلنا ہے۔ جس میں آپ اور رادھا دونوں کو شامل کیا گیا ہے۔ آج رات ہم چاروں نے کمانڈر باسط کے پاس پہنچنا ہے۔“

”ہم تیار ہیں۔“

رادھا چائے لے کر آگئی تھی۔ ہم چائے پینے لگے۔ اس دوران باتیں بھی کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ رادھا اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ سب خوش ہوگئے۔ ممتاز اٹھ کر باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مولوی صاحب کو ساتھ لے آیا۔ مولوی صاحب کا نام عبداللہ تھا۔ انہوں نے رادھا کو کلمہ پڑھا دیا۔ وہ بڑا روح پرور منظر تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پھر میں نے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ مولوی صاحب نے رادھا کا اسلامی نام خدیجہ رکھ دیا تھا۔ وہ اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”خدیجہ بیٹی! کیا تم راضی ہو؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ مولوی صاحب نے ان چاروں کی موجودگی میں ہمارا نکاح پڑھا دیا۔

پھر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ممتاز محمود اپنی جگہ سے اٹھا۔ کمرے میں موجود ایک الماری سے سب مشین گن نکال کر لے آیا۔

وہ خدیجہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ”جب بھائی اپنی بہنوں کو گھر سے رخصت کرتے ہیں تو جہیز دیتے ہیں۔ تم بھی میری بہن ہو لیکن بھائی کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ لمحاتی توقف کے بعد بات آگے بڑھائی۔ ”یہ لو میری بہن۔ تمہیں خالی ہاتھ رخصت نہیں کرسکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی سب مشین گن اس کی طرف بڑھا دی۔

خدیجہ نے سب مشین گن پکڑ کر اسے چوم لیا، بولی۔ ”بھائی آپ کا یہ تحفہ مجھے جان سے پیارا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس تحفے کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ آخری سانس اور آخری گولی تک بھارتی غاصب درندوں پر یہ گن آگ برساتی رہے گی۔“

وہ بہت جذباتی لمحے تھے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مغرب کی اذان ہوچکی تھی۔

خدیجہ اور ممتاز کی بیوی کھانا بنانے چلی گئیں۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اس کے بعد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دوران تین مجاہد اور بھی آگئے۔ ہم ساتوں رات کی تاریکی میں سرینگر سے باہر نکل آئے۔ ساری رات سفر کرتے رہے۔ صبح کے پانچ بجے ہم راجواری سے سرینگر والے روڈ پر پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

ہمیں وہاں پہنچے دو گھنٹے ہوگئے۔ کمانڈر باسط کو جب میں نے رادھا کے اسلام قبول کرنے اور اپنے نکاح کے بارے بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے اگلے مشن کا بتا دیا۔ اگلا مشن سرینگر سے آنے والے کانوائے پر حملہ کرنا تھا۔ جس میں اسلحہ اور راشن لایا جانے والا تھا۔ وہ تفصیل بتانے کے بعد گویا ہوئے۔ ”ہم نے یہ مشن ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ بھارتی فوجیوں تک اسلحہ اور راشن کسی صورت میں بھی نہیں پہنچنے دینا۔“

”چاچا ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔“ خدیجہ جھٹ سے بولی۔ اس کے لہجے میں بلا کا عزم تھا۔

خدیجہ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ وہ کانوائے راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا اور اس مشن میں سب سے آگے رہی تھی۔

دن گزرتے چلے گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نکاح کو چار ماہ ہوگئے تھے کہ ایک صبح خدیجہ نے وہ خوشخبری سنائی، جسے سن کر میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

میرے منہ سے بے ساختہ دعا نکلی۔ ”اے مالک ارض و سما بیٹیاں بھی تیری رحمت ہیں لیکن ہمیں بیٹا عطا کرنا تاکہ اس دھرتی پر ایک مجاہد کا اضافہ ہوجائے۔“

”آمین۔“ خدیجہ نے کہا۔ ”میری بھی خواہش ہے بیٹا ہی ہو۔“

☆......☆......☆

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ اگر کسی مشن پر جانا ہوتا تو میں خدیجہ کو چھوڑ جاتا۔ وہ اکثر ناراض ہوجاتی لیکن میں واپس آکر منالیتا۔

وہ اپریل کا مہینا تھا۔ میں اور خدیجہ گھر میں ہی تھے۔ ایک مجاہد کمانڈر باسط کا پیغام لے کر آگیا۔

ہمیں اسی رات ان کے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ میں نے خدیجہ کو گھر چھوڑا اور اس مجاہد کے ساتھ رات کو روانہ ہوگیا۔ ہم دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے رات کے تین بجے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ میں پہلی بار اس جگہ پر آیا تھا۔

وہ ایک بہت بڑا غار تھا۔ اس غار میں کم و بیش پچاس مجاہد موجود تھے۔

کمانڈر باسط خدیجہ کا حال چال پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا۔

”چاچا میں چاہتا ہوں کہ خدیجہ کو آزاد کشمیر چھوڑ دوں۔ کیونکہ یہاں کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔ باقی کارگل کے محاذ کے بعد اسے واپس لے آؤں گا۔“

انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ مظفرآباد میں اپنے ایک رشتے دار کا ایڈریس بھی دے دیا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج دور مغربی افق میں ڈوب گیا تھا۔ ہمیں اب رات کا انتظار تھا۔ ہم پانچوں کھنڈر میں چھپے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ علی، شفقت محمود، خدیجہ اور جیا زبیری تھے۔ علی اور شفقت عصر کے وقت جیا کو لے آئے۔ ہم نے کھانا کھایا اور چل پڑے۔ دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے اس کھنڈر میں آکر چھپ گئے۔ ہم سب مسلح تھے۔ وہ دونوں مضبوط جسامت کے مالک اور جوشیلے نوجوان تھے۔ ان میں ہر قسم کی خطرناک صورتِ حال سے نمٹنے کی خداداد

صلاحیت تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہر طرف گھور اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنی گن پر گرفت مضبوط کی اور مخصوص اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے ہم کھنڈر سے باہر نکل کر کھلے آسمان کے نیچے کھڑے اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ تاریک شب اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

''انڈین آرمی کا کیمپ یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' علی کی سرگوشی ابھری۔

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اس سے قبل میں کچھ بولتا۔ عقب سے دو تین اوپر تلے فائر ہوئے۔ جن کی گونج رات کے سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔

میں نے خدیجہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم آگے بڑھنے لگے۔ چونکہ بارڈر ایریا تھا۔ یہاں فائرنگ معمول کی بات تھی۔

ہماری منزل کیرن گاؤں تھی۔ یہ گاؤں دریائے نیلم کے کنارے واقع تھا جو کہ دریا پار آزاد کشمیر کے علاقے میں تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں دریا کے اس کنارے والا گاؤں بھی کیرن کہلاتا ہے۔

ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ جنگل شروع ہو گیا۔ راستہ بہت پر خطر تھا۔ جنگلی درندوں اور بھارتی فوجیوں سے بچتے بچاتے ہم نے کنٹرول لائن عبور کرلی۔ ہم نوسیری سے چکوٹ پہنچ گئے۔ کچھ دیر ایک گھر میں آرام کیا۔ پھر گاڑی سے... مظفرآباد آگئے۔

ہم گھر آگئے۔ ان سے ملے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی عمر پچاس کے قریب ہے جو کہ درست ثابت ہوا۔ وہ حال چال پوچھنے لگے۔ نواز نے مجھے آرام کرنے کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد خدیجہ بھی آگئی۔

میں نے شولڈر بیگ سے ڈائری نکالی۔ اس پر اب تک کے تمام واقعات لکھنے لگا۔ یہ ڈائری مجھے جان سے بھی پیاری رہی ہے۔ مشن کے دوران اسے محفوظ جگہ رکھتا رہا ہوں۔ اس میں میری زندگی کی تلخ و شیریں یادیں ہیں۔ خدیجہ کی باتیں ہیں۔ میں اس ڈائری کو خدیجہ کے پاس ہی رہنے دوں گا۔ کارگل کا محاذ اصل میں ہم کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

ڈائری پر لکھتے لکھتے میں نے ایک نظر خدیجہ پر ڈالی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی نظر آئی۔ میں جانتا ہوں وہ جاگ رہی ہے۔ میرے دور جانے پر افسردہ ہے لیکن مجھے چاہ کر بھی نہیں روک سکتی کیوں کہ انہیں کشمیر آزاد کرانا ہے۔ بس مجھے علی اور شفقت کا انتظار ہے۔ وہ آگئے تو ہم آج رات واپس چلے جائیں گے۔ اپنے ساتھیوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑیں گے۔ میری ڈائری کا آخری صفحہ بچ گیا ہے۔ سوچ رہا ہوں اب اس پر کیا لکھوں؟

☆.....☆.....☆

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ باہر بارش تیز ہو گئی۔ دور مشرقی افق پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مشرقی افق جہاں مقبوضہ کشمیر ہے۔ جہاں سرینگر ہے۔ جہاں جنید اور میری محبت پروان چڑھی۔ جہاں ہم چاہتوں کے بندھن میں بندھے تھے۔ جہاں ہم نے پہاڑوں میں محبت بھرے لمحات گزارے۔ جہاں میں رادھا سے خدیجہ بنی، اسلام قبول کیا۔ جہاں بھارتی درندوں سے ہم برسر پیکار رہے۔ شاید وہاں کی مٹی میں میرے جنید کا خون جذب ہوا ہو کیونکہ کارگل کے محاذ کے بعد جنید کی کچھ خبر نہ مل سکی۔ پھر کارگل پر قبضے کی خوش [illegible] کے حوصلے بلند کر دیے لیکن وہ [illegible] مجاہدین کامیاب ہو چکے تھے۔ جب [illegible] کیا۔ پاک فوج اور مجاہدین نے [illegible] بل پر قبضہ تھا۔ یہ واحد زمینی راستہ تھا جو بھارت کو کشمیر سے ملاتا ہے۔ سری نگر روڈ ٹائیگر ہل کی اس چوکی کے نیچے ہے۔ اگر اوپر سے صرف وزنی پتھر لڑھکائے جاتے تو نیچے سے گزرنے والی گاڑیاں تباہ ہو سکتی تھیں۔ کارگل کا محاذ سیاسی توتوں کی وجہ سے کامیابی سے ناکامی میں بدل گیا۔ اہل کشمیر کو من چاہی کامرانی نہ مل سکی۔ وہ مجھے مظفرآباد چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ جب تک جاتے ہوئے دکھائی دیتا رہا۔ میں کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کے جانے کے چار ماہ بعد علی حیدر پیدا ہوا جو اب جواں سال کا ہو چکا ہے۔ میرا ہر لمحہ عذاب انتظار میں گزرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جنید کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گا۔ کسی صبح کے اجالے میں، کسی سنہری دوپہر میں، کسی ڈھلتی سہ پہر میں یا پھر کسی شام کے ملگجے اندھیرے میں، جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ ہم دس پندرہ دن بعد کیرن گاؤں چلے جاتے ہیں۔ وہاں دریائے نیلم کے کنارے ایستادہ کسی پتھر پر میں اور علی حیدر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم دونوں ماں بیٹا کنٹرول لائن کے پار دیکھتے ہیں، شاید جنید کی جھلک نظر آ جائے۔